اسفارِ ہند

مولانا وحید الدّین خاں

اسفارِ ہند

مولانا وحید الدین خاں

Asfar-e-Hind
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1999

This book does not carry a copyright.
The Islamic Centre, New Delhi being a non-profit making institution, gives its permission to reproduce this book in any form or to translate it into any language for the propagation of the Islamic cause.

Distributed by
AL-RISALA
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4625454, 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

Distributed in U.K. and Europe by
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

Distributed in U.S.A. by
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439, Ocean Ave., # 4C, Brooklyn, New York, NY 11230
Tel. 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed by Nice Printing Press, New Delhi.

فہرست

تمہید	۴
پونہ کا سفر	۵
ناگپور کا سفر	۴۲
شانتی یاترا	۷۳
ودیشا کا سفر	۱۰۸
سفر ورندابن	۱۱۵
بمبئی کا سفر	۱۳۴
مدراس کا سفر	۱۵۲
سیواگرام کا سفر	۱۶۸
بنگلور کا سفر	۱۸۴
پٹنہ کا سفر	۱۹۹
بمبئی کا سفر	۲۰۸
اندور کا سفر	۲۱۹
اورنگ آباد کا سفر	۲۵۸
بمبئی کا سفر	۲۸۱
رشی کیش کا سفر	۳۱۲
بنگلور کا سفر	۳۳۷
ناگپور کا سفر	۳۵۷
شملہ کا سفر	۳۸۰
بڑودہ کا سفر	۴۱۵
گوہاٹی کا سفر	۴۳۶
میرٹھ کا سفر	۴۶۹
پونہ کا سفر	۵۱۶
راجستھان کا سفر	۵۴۲

تمہید

اس مجموعہ میں راقم الحروف کے وہ ملکی سفرنامے شامل کیے گئے ہیں جو خاص طور پر غیر مسلموں کے جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کے بعد لکھے گئے۔ اس قسم کے ملکی اسفار کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم ان کا ایک ضروری حصہ اس مجموعہ میں شامل کیا جارہا ہے۔

یہ سفرنامے سادہ طور پر سفرنامے نہیں ہیں بلکہ وہ وسیع تر ہندستان کا مطالعہ ہیں۔ ان میں دوسرے فرقوں اور مذہبوں کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا سفرنامہ کی صورت میں ملک کی تاریخ کا ایک مطالعہ ہے۔

راقم الحروف کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس ملک میں مختلف فرقے مل جل کر امن کے ساتھ رہیں۔ تاکہ ملک ترقی کرے کیوں کہ امن ہر ترقی کے لیے بالکل لازمی ہے۔ امن کے بغیر کسی بھی قسم کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

اسی کے ساتھ راقم الحروف کا ایک مستقل مشن یہ رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرے اور اسلام کا مثبت تعارف لوگوں تک پہنچائے۔ اس کے نمونے بھی زیر نظر مجموعہ میں قاری کے سامنے آئیں گے۔

یہ سفرنامے بظاہر وقتی ہیں۔ مگر ان میں جن باتوں کو شامل کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی ہیں۔ یہ وقتی حالات کی زبان میں ابدی قدروں کا بیان ہے۔ اس کی افادیت کسی زمانہ کے ساتھ بندھی ہوئی نہیں۔

وحید الدین

۱۱/۹/۱۹۹۷ء

پونہ کا سفر

پونہ میں مسیحی چرچ کے تحت ایک بہت بڑا ادارہ De Nobili College ہے۔ اس کے تحت ایک مذہبی مطالعہ کا ادارہ (Institute for the Study of Religion) قائم ہے۔ اس ادارہ نے ایک امریکی ادارہ کے تعاون سے پونہ میں ۲ - ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ایک کل مذاہب کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کی تھیم تھی: "ریلیجن اینڈ سوسائٹی" اس کانفرنس کی دعوت پر پونہ کا سفر ہوا اور اس کے بعد بمبئی وغیرہ کا سفر۔ ذیل میں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲ نومبر کو گھر سے نکل کر ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا تو انسانی تاریخ کا نقشہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ موجودہ زمانہ میں سفر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ کر پختہ سڑکوں سے گزرتا ہوا اسٹیشن یا ایر پورٹ پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے لئے ایک اور سواری موجود ہوتی ہے جو اس کو لے کر تیزی سے آگے روانہ ہوتی ہے اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ منزل پر دوبارہ یہی سارے انتظامات ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے آخری مطلوب مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

چند ہزار سال پہلے انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ انسان نیم حیوانات کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ شہری زندگی کا وہ دور آگیا جس کو مدنیت (Urbanization) کہا جاتا ہے۔ مسلم عہد سے پہلے یہ رفتار بہت سست تھی۔ مسلم عہد میں انسانی تہذیب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بغداد کی جس طرح تعمیر کی وہ ماضی کے شہروں سے اتنا مختلف ہے کہ شہری تاریخ میں وہ ایک چھلانگ معلوم ہوتا ہے۔

اربن پلاننگ کے پروفیسر ایگل (Ernst Arnold Egli) نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں جنت کی زندگی اور جنت کے مکانات کا جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کے اندر عمدہ مکانات اور اعلیٰ تمدن کے بارہ میں ایک خیالی تصویر (dream image) بنائی۔ انھوں نے اس خیالی تصویر کو واقعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلم دنیا کے جدید شہر وجود میں آگئے (EB-18/1071)

مسلم تاریخ کے ان واقعات کو مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر قومی فخر کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کو مسلمانوں کے پر فخر کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کو آلاء اللہ کے طور پر بیان کیا جانا چاہئے۔

اس دنیا کی ہر ترقی اصلاً امکانات قدرت کو ظہور میں لانے کا نام ہے۔ انسان ان امکانات کو ایجاد کرنے والا نہیں، وہ صرف ان کو استعمال کرنے والا ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم کو چاہئے کہ ان ترقیوں کو دیکھ کر ہم خدا کے گیت گائیں نہ کہ ان کو خود اپنے خانہ میں ڈال کر فخر اور ناز کرنے لگیں۔

گھر سے دہلی ایرپورٹ جاتے ہوئے راستہ میں ایک معاملہ پیش آیا۔ اس میں ایک بہت بڑا سبق تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا: لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا واحد آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی انا سے نہ ٹکرائیں۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو آپ اپنے دشمنوں کے درمیان بھی دوست کی طرح رہ سکتے ہیں۔

دہلی ایرپورٹ پر ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective

ان سے دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل میں مسلمانوں کی فکری تاریخ پر ایک کتاب کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ اقبال کی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو پڑھا ہے۔ وہ ایک اچھی کتاب ہے۔ مگر میں اقبال کے بعض نظریات سے متفق نہیں۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ مثلاً اقبال کے مرد کامل (Perfect man) کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ پرفکٹ انسان مستقبل میں پیدا ہوگا۔ یہ تصور اسلام کے عقیدۂ رسالت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ عقیدۂ رسالت کے مطابق، کامل اور پرفکٹ انسان پیغمبر کی صورت میں پیدا ہو چکا۔ اب مسئلہ پرفکٹ مین کی پیروی کرنے کا ہے نہ کہ پرفکٹ مین کے انتظار کا۔

ایرپورٹ کی کھڑکی پر اپنا بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد مجھے اسی قسم

کا ایک قصہ یاد آگیا جو میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔ ایک انگلش مین ایک بار کسی ایر لائن کے رزرویشن کاؤنٹر پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹی عورت تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کے لئے تھا۔ مگر کلرک نے غلطی سے اس کو عام درجہ کا بورڈنگ پاس دے دیا تھا۔ عورت دوبارہ ہجوم کرکے کھڑکی پر پہنچی اور اپنا بورڈنگ پاس درست کرا کے فاتحانہ واپس ہوئی۔

عورت سے دھکا لگنے کی بنا پر لائن میں کھڑے ہوئے انگریز کا ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا ٹکٹ زمین سے اٹھایا اور سنجیدگی کے ساتھ خاتون سے کہا کہ میڈم، فرسٹ کلاس ایک بورڈنگ پاس کا نام نہیں۔ فرسٹ کلاس ایک طریق زندگی ہے:

Madam, first class is not a boarding pass.
It is a way of life.

دہلی سے پونہ کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۴۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے انگریزی اور ہندی میں مختلف چیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک صنعتی میگزین (Industrial Products Finder) تھا۔ یہ اس کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ تھا۔ ۲۳۲ صفحہ کے اس میگزین کے چار حصے تھے:

1. Industrial News Briefs
2. Commercial Info Exchange
3. Technical Articles
4. Product Index

یہ میگزین بزنس پریس (Business Press) کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ پورا میگزین صنعتی خبروں یا صنعتی سامانوں کے اشتہار سے بھرا ہوا تھا۔ عنوان نمبر ۲ کے تحت بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ہم فلاں صنعتی شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ربط (contact) قائم کرنا چاہتے ہیں جو اس شعبہ میں ہم سے تعاون کریں یا فنی جانکاری (Technical know-how) دے سکیں۔

میں نے سوچا کہ مادی شعبوں میں لوگ دوسروں کا تعاون تلاش کر رہے ہیں۔ اور دینی شعبوں میں یہ حال ہے کہ دوسروں سے کٹ کر ہر آدمی اپنی الگ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ صنعت کار کا بنیادی مقصد کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے اور مذہبی رہنماؤں کا بنیادی مقصد شخصیت کو بڑھانا۔

چڑیوں کو بالائی فضا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر قدیم زمانہ سے انسان یہ خواہش کرتا رہا ہے کہ وہ فضا میں اڑے۔ قدیم اسپین میں ایک مسلمان عباس بن فرناس (م ۸۸۸ء) تھا۔ اس کے اندر نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کا شوق تھا۔ اس نے خاص طرز کی ایک بڑی سی چادر بنائی اور پھر چھتری کی مانند اس میں اپنے آپ کو باندھا اور بلندی پر چڑھ کر فضا میں چھلانگ لگائی۔ تھوڑی دور جا کر وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کا معاملہ قاضی سلیمان بن اسود الغافقی کی عدالت میں پیش کیا۔ قاضی نے اس کو غیر معتدل قرار دے کر حکم دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے تجربات نہ کرے۔

احمد شریف الرفاعی کا مضمون (المدینة ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹) نظر سے گزرا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ اگر عباس بن فرناس پر روک نہ لگائی جاتی تو یقیناً ہم ہوا بازی کے طریقہ کو ہزار سال پہلے جان لیتے۔ (لقد أعدموه علمياً ... ولو تركوه لشأنه لعرفنا الطيران قبل أكثر الف سنة)

عرب مضمون نگار نے اپنا یہ مضمون "من طرفات التراث" کے عنوان کے تحت شائع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ جان سکے کہ ہوائی جہاز کا بننا طویل علمی تحقیق اور بے شمار تجربات کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اس میں پوری انسانیت کا سفر شامل ہے۔ وقت کی حکومت اگر عباس بن فرناس کے لئے ساری سہولتوں کا ڈھیر لگا دیتی تب بھی یہ ناممکن تھا کہ جو ہوائی مشین بیسویں صدی میں بنی، وہ اچانک نویں صدی میں بن کر تیار ہو جاتی۔

میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آیا ہے کہ میں ٹکٹ کے باوجود سفر نہ کر سکا۔ مثلاً ایک بار میرے پاس لمبے عالمی سفر کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے مجھے اپنے سفر کو مختصر کرنا پڑا۔ میں نے ٹکٹ کی بچی ہوئی رقم کا واوچر بنوا لیا جو اس کے بعد کئی سفروں میں کام آیا۔

آخر میں میرے پاس دہلی ۔ بمبئی کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس ٹکٹ کو دوبارہ رقم کی صورت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف سفر ہی میں اس کو استعمال کرنا ممکن تھا۔ مگر بار بار ایسے حالات پیش آئے کہ میں بمبئی کا سفر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ٹکٹ کی مدت آخری طور پر ختم ہو گئی، اور وہ استعمال کے قابل

نہ رہا۔

تھوڑی دیر کے لئے احساس ہوا کہ ایک ٹکٹ بلاوجہ ضائع ہوگیا۔ مگر جلد ہی میرے اندر ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ میری زبان سے نکلا "خدایا، میں اس ٹکٹ کو دنیا کے سفر کے لئے استعمال نہ کرسکا۔ تو اپنی رحمت سے اس کو میرے لئے آخرت کا ٹکٹ بنا دے"۔ اس کے بعد نقصان کا احساس جاتا رہا اور دل میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا۔

جہاز دہلی سے روانہ ہوکر منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رکے بغیر مسلسل اڑ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹہ اور ۵۰ منٹ پر اناونسر نے اعلان کیا کہ اب ہم پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھے محسوس ہوا جیسے اناؤنسر یہ کہہ رہا ہو کہ جہاز کے پرواز کی آخری حد آگئی۔ پھر میں نے سوچا کہ مختلف جہازوں کی مختلف حد ہوتی ہے۔ کوئی جہاز آدھ گھنٹہ اڑ کر اتر جاتا ہے کوئی ایک گھنٹہ اور کوئی دو گھنٹہ اور کوئی دس گھنٹے اڑنے کے بعد نیچے اترتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک شخص پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ گویا اس کے جینے کی حد چند منٹ یا چند گھنٹے تھی۔ اسی طرح کوئی شخص چند سال گزار کر مرتا ہے۔ کوئی جوانی میں مرجاتا ہے۔ اور کوئی بوڑھا ہوکر مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمر موت کی عمر ہے۔ آدمی کا ہر لمحہ اس کا آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت آدمی اپنی آخری حد پر کھڑا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ معاملہ اتنا عجیب ہے کہ آدمی اگر اس کو سوچے تو پر عیش محل میں بھی اس کی زندگی بے عیش ہوکر رہ جائے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہمارا جہاز پونہ ایرپورٹ پر اترا۔ کانفرنس کے نمائندے جو میری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ تو حسب قاعدہ ایرپورٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ مگر حلقہ الرسالہ کے لوگ ایرپورٹ کے اندر مجھ سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ اندر کیسے آگئے۔ کیونکہ اندر آنا تو منع ہے۔ جناب عبد الصمد صاحب نے بتایا کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے ایرپورٹ کے آدمی نے ان کو روکا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہمارے "دھرم گرو" آرہے ہیں۔ یہ سن کر آدمی نے ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ مذہب میں آج بھی وہ طاقت ہے جو کسی دوسری چیز میں نہیں۔ بشرطیکہ مذہب کو ماننے والے اپنے آپ کو اشتعال انگیز کارروائی سے دور رکھیں۔

کانفرنس والوں نے بلیو ڈائمنڈ ہوٹل (پونہ) میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ سب لوگوں کے ساتھ پہلے ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل شہر کے باہر ہے۔ چنانچہ ہوٹل پہنچنے کے بعد ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کرکے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرا قیام شہر میں ان لوگوں کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ ملاقات کی صورت نکل سکے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس کے منتظمین اگر اجازت دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ منتظمین نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ہم سب لوگ ہوٹل سے شہر واپس آگئے۔

اس کے بعد میرا قیام پہلے مسٹر پی اے انعام دار کے مکان پر رہا۔ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق، میٹنگوں میں شرکت کے لئے روزانہ ڈائمنڈ ہوٹل جاتا اور پھر دوبارہ انعام دار صاحب کے یہاں واپس آجاتا۔ آخر میں میرا قیام جناب عبد الصمد صاحب کے مکان پر تھا۔

پونہ اور بمبئی کے درمیان ایک تیز رفتار ٹرین چلتی ہے۔ اس کا نام "دکن کوئن" ہے۔ ٹرین کا نام پونہ کے نام پر ہے۔ مرہٹواڑہ کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر ہونے کی بنا پر پونہ کو دکن کوئن کہا جاتا تھا۔ اسی کے نام پر اس ٹرین کا مذکورہ نام رکھا گیا۔

سترھویں صدی میں مرہٹہ حکومت نے پونہ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ مگر ۱۷۰۴ سے دوبارہ مرہٹوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۷ میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا جو ۱۹۴۷ تک قائم رہا۔

برٹش دور میں پونہ میں تعلیم کا رواج کافی بڑھا۔ یہاں سب سے زیادہ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ چنانچہ جواہر لال نہرو نے ایک بار پونہ کو "انڈیا کا آکسفرڈ اور کیمبرج" کا نام دیا تھا۔ ۱۹۶۱ میں یہاں ایک ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا۔ پنشیت ڈیم کسی وجہ سے منہدم ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پونہ کا ایک حصہ اس کی زد میں آکر بہہ گیا۔

دہلی سے پونہ ۱۶۰۰ کیلو میٹر دور ہے۔ قدیم زمانہ میں دہلی سے پونہ پہنچنے کے لئے ۱۶ دن سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔ مگر آج یہ سفر صرف دو گھنٹے میں طے ہوجاتا ہے۔ ۲ نومبر کو میں نے عصر کی نماز دہلی (نظام الدین) کی کالی مسجد میں ادا کی۔ مغرب کی نماز دوبارہ دہلی ایرپورٹ پر پڑھی۔ اور عشاء کی نماز کے وقت میں پونہ پہنچ چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو پیروں کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ چل سکے۔ پھر اس کو گھوڑا دیا

جو گویا سواری کی زندہ مشین ہے۔ اس کے بعد انسان پر اسٹیم اور پٹرول کی طاقت منکشف کی جس کے نتیجہ میں ٹرین اور کار بنے۔ اور آخر میں ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواری اس کو عطا کی۔

اس تدریجی طریق کار کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے لئے کار اور ہوائی جہاز پر بیٹھنا ممکن نہ ہو سکا۔ پیغمبر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ مگر ان کے تمام تر تقدس کے باوجود خدا نے ان کے لئے اپنے قانون تدریج کو نہیں توڑا۔ اس سے خدا کی سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تدریج اس دنیا کے لئے خدا کا اٹل قانون ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اور کسی کے لئے بدلا نہیں جاتا۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی۔ اگر دونوں جلوس ایک دن نکلتے تو یقینی تھا کہ پونہ میں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے اور جشن کا دن غم کے دن میں تبدیل ہو جائے۔ پونہ کی سیرت کمیٹی نے مشورہ کرکے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن مؤخر کرکے ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعہ پر پولیس کے لوگ اور ہندو حضرات بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانشمندی کی تعریف کی۔ اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

سیرت کمیٹی پونہ نے اپنے فیصلہ کی اطلاع مراٹھی اخباروں میں شائع کرا دی تھی۔ اس سے پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ کئی مقامات پر مسلمانوں نے یہی کیا کہ اپنے جلوس کی تاریخ بدل دی۔ اس طرح پورا مہاراشٹر فساد کے خطرہ سے بچ گیا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ ردعمل کی پالیسی ترک کر رہے ہیں اور اس کے بجائے اعراض کے طریقہ کو اپنی پالیسی کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔

پونہ میں ایک صاحب نے کہا کہ مجھے "شتم رسول" کے مسئلہ پر آپ سے سوال کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ فرمائیے۔ اس کے بعد جب وہ بولے تو انھوں نے ایک پوری تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے اپنے مفروضہ مخالفین کے اوپر الزام تراشی بھی کی۔ ان کی پرجوش تقریر ختم ہوئی تو میں نے نرمی کے ساتھ کہا: یہ اسلام نہیں ہے کہ آدمی تحقیر رسول کے مسئلہ کو جانے مگر وہ تحقیر مسلم کے مسئلہ سے بے خبر ہو۔

تقسیم ملک (۱۹۴۷) سے پہلے ایک بار کسی سفر کے دوران میں پونہ ریلوے اسٹیشن سے گزرا

تھا۔ اس وقت میں نے چلتی ہوئی ٹرین سے پونہ شہر کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ریلوے لائن کے کنارے مجھے کچھ بنگلے دکھائی دئے جن کے اوپر پھول دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس مشاہدہ میں پونہ مجھے ایک افسانوی شہر نظر آیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ پونہ خوب صورت مکانات کا ایک شہر ہے جو چاروں طرف پھول اور سبزہ سے ڈھکا ہوا ہے۔

مگر ۱۹۹۱ میں جب پہلی بار میں نے پونہ کا سفر کیا اور شہر کے اندرونی حصوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پونہ بھی ویسا ہی ایک شہر ہے جیسا کہ ہندستان کے دوسرے شہر۔ دوسرے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی اگر خوبصورت مکانات ہیں تو اس کے ساتھ تنگ اور بے کشش مکانات کی قطاریں بھی۔

یہی بات انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ کسی انسان سے ابتدائی ملاقات میں وقتی طور پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ اکثر حالات میں نہایت ناقص بلکہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تجربہ کی بنا پر کبھی کلی رائے قائم نہ کی جائے۔ اسی قسم کی رائے کو شریعت میں ظن کہا گیا ہے۔ کسی شہر کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرلی جائے تو اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ مگر انسان کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرنا بے حد سنگین ہے۔ کیوں کہ اس میں اخلاقی پہلو شامل ہے اور وہ آدمی کو گناہ کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے (الحجرات ۱۲)

۲ نومبر کی شام کو انعام دار صاحب کے مکان پر دیر تک نشست ہوئی۔ جناب انیس چشتی صاحب اور دوسرے صاحبان آ گئے تھے۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ انیس چشتی صاحب تحریک پیام انسانیت سے وابستہ ہیں اور انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں کا سفر کیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ملک میں کوئی شخص یا ادارہ ایسا ہے جو مخصوص طور پر غیر مسلموں میں دین پہنچانے کا کام کر رہا ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں۔

یہ بلاشبہ انتہائی سنگین صورت حال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان دوسری سرگرمیاں تو جاری ہیں مگر وہی اصل کام انجام نہیں دیا جا رہا ہے جو ہماری امت محمدی ہونے کی حیثیت کو مستحق کرتا ہے۔

انعام دار صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے کئی قیمتی باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں اقرأ کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔

چودہ سو سال پہلے ایک انسانی مصلح اگر عرب میں اٹھتا تو وہ صرف حال کے دائرہ میں سوچتا، جب کہ اقرأ ابدی دائرہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حال کے اعتبار سے عرب میں یہ مسائل تھے کہ وہاں پانی نہیں۔ وہاں محفوظ راستے نہیں۔ ایک شخص جس کو صرف انسانی نظر حاصل ہو وہ اسی قسم کے قریبی مسائل میں الجھ جائے گا۔ مگر رسول نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق کے اعتبار سے دوسرے تمام شعبوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کی مختلف نشستوں میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی کئی پروگرام ہوئے۔ ان سب کا تذکرہ یکجائی طور پر آئندہ کیا جائے گا۔

فیروز پونہ والا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے سودی تجارت کے پرجوش مبلغ ہیں۔ انھوں نے پونہ میں بینک سے پندرہ لاکھ روپیہ سودی قرض لے کر ایک انڈسٹری لگائی۔ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انھوں نے سامان وغیرہ بیچ کر بینک کا قرض ادا کیا اور سود کے بغیر انڈسٹری چلانے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ کامیابی کے ساتھ اپنی انڈسٹری چلا رہے ہیں۔

وہ بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بوہرہ فرقہ کے لوگ تجارت میں بہت کامیاب ہیں۔ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا —— سادہ زندگی اور کم خرچ۔ ۲۴ نومبر کو مجھے انھوں نے اپنا کارخانہ دکھایا اور اپنے گھر بھی لے گئے۔ ان کی زندگی کو میں نے اس اصول کا معیاری نمونہ پایا۔ ان کا فلیٹ ۳۰ لاکھ روپیہ کا ہے۔ اور ان کی انڈسٹری ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی ہے۔ مگر ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہے۔

پونہ کے قریب پیر قمر علی درویش (م ۶۳۲ ھ) کی درگاہ ہے۔ یہ درگاہ ۱۹۵۱ سے باقاعدہ رجسٹرڈ طور پر قائم ہے۔ ساتھیوں کے کہنے پر اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔

یہاں "سوچنا بورڈ" پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے: دنیا زادر دوسرے پروگرام مسلم طریقہ سے کرائیں۔ یہاں صحن میں کالے رنگ کا ایک گول پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس کا وزن تقریباً ساٹھ کیلو ہے۔ طاقت ور آدمی اس کو اکیلا اٹھا سکتا ہے۔

اس پتھر کے لئے یہاں روایت ہے کہ قمر علی درویش کا نام لے کر اٹھانے سے وہ اپنے آپ

اٹھ جاتا ہے۔ طریقہ کے مطابق ،گیارہ آدمی پتھر کے چاروں طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ایک انگلی پتھر سے لگاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک لمبا سانس کھینچ کر کہتا ہے" قمر علی درویش . . . " اس کے بعد پتھر اٹھ جاتا ہے۔ اور اس وقت تک اٹھا رہتا ہے جب تک سانس نہ ٹوٹے۔

میرے سامنے کئی بار لوگوں نے اس تدبیر پر عمل کرکے پتھر کو اٹھایا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک سادہ فطری واقعہ ہے نہ کہ کوئی پراسرار واقعہ۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کے اجلاس بلیوڈائمنڈ ہوٹل میں ہوئے۔ ۳۰ نومبر کو کانفرنس کے شرکاء تین مختلف گروپ میں بانٹ دئے گئے۔ میرے گروپ میں ایک درجن افراد تھے جو اسلام، ہندوازم اور مسیحیت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک نے مذہب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ذریعہ اظہار یہاں صرف انگریزی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عام طور پر اپنے آبائی مذہب کے بارہ میں بے یقینی کا اظہار کررہے ہیں۔ مثلاً ہندو صاحبان نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذہب میں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ یہ بات میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ مسیحی حضرات نے اپنے بارہ میں بتایا کہ مسیح کی ابنیتِ خدا کا عقیدہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وغیرہ

میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اصلاً اسلامی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی میں نے بعد کو پرائیویٹ طور پر پڑھی۔ مگر جو اسلام مجھے خاندانی وراثت یا مدرسہ کے ماحول میں ملا تھا۔ اس سے میرے اندر بغاوت پیدا ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا باقاعدہ طور پر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اسلام کی صداقت از سرنو میرے اوپر منکشف ہوئی اور میں نے دوبارہ شعوری طور پر اسلام کو قبول کیا۔ اس طرح اسلام میرے لئے ایک ذاتی دریافت ہے نہ کہ محض قومی عقیدہ۔

میں نے کہا کہ اسلام کی فطری تعلیمات کے علاوہ اسلام کی جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ اسلام کا تاریخی پہلو تھا۔ دوسرے مذاہب کی کوئی معلوم اور مستند تاریخ نہیں۔ جب کہ اسلام مکمل طور پر اور مسلّمہ طور پر ایک تاریخی مذہب ہے۔ اسلام کو خصوصی اور امتیازی طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو

حاصل نہیں۔

۳ نومبر کی شام کی میٹنگ میں بعض لوگوں نے کہا کہ اسلام جہاد (قتال) کا مذہب ہے ہیں مے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ صرف بطور دفاع ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ پیغمبر اسلام نے پھر کیوں لڑائی لڑی۔ میں نے کہا کہ اس کا تعلق اس فیکٹر سے ہے نہ کہ خود اسلام کی تعلیمات سے۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہر مذہب کو تشدد کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ اب آزادی کا زمانہ ہے۔ اس لئے اب عام حالات میں اس قسم کی صورت پیش آنے کا موقع بھی نہیں۔

کانفرنس تین دن کے لئے تھی۔ ہر روز پہلا پروگرام عبادت سے متعلق ہوتا تھا۔ پہلے دن ہندو عبادت، دوسرے دن اسلامی عبادت، تیسرے دن کریسچین عبادت۔ ۲ نومبر کی صبح کو عبادتی رقص (prayer dance) کا مظاہرہ تھا۔ چھ آدمیوں کی پارٹی اسٹیج پر آئی۔ اس کے پانچ ممبر ساز اور نغمہ میں مصروف ہوگئے۔ ایک ممبر نے اسٹیج پر رقص کی صورت میں اس کو مجسم کرنا شروع کیا۔

میں نے اپنے قریب کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا کہ میں طبعی طور پر ان چیزوں سے انجوائے نہیں کرسکتا۔ مگر آج میں خاص طور پر واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس عبادتی پروگرام کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ طریقہ عبادت کو "اسٹیج کا شو" بنا دیتا ہے۔ ایک یا چند آدمی عبادت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بقیہ لوگ تماشائی کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں آیا کہ اسلام کے سوا ہر مذہب میں عبادت زیادہ تر "غیر" کا ایک فعل ہے۔ وہ "میرا" اپنا فعل نہیں۔ ان طریقوں میں ہر آدمی اپنے آپ کو عمل عبادت میں شامل نہیں کر پاتا۔ وہ گویا اپنے لئے دوسرے سے عبادت کرواتا ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص عبادت کو "اسٹیج" کرتا ہے اس کے لئے بھی عبادت زیادہ تر ایک آرٹ ہوتا ہے نہ کہ عبادت میں ذاتی شمولیت۔

اسلام میں چونکہ عبادت اپنی اصل فطری حالت میں محفوظ ہے، اس لئے اسلام کا طریق عبادت ہی وہ واحد طریقہ ہے جس میں ہر آدمی ذاتی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی اپنی عبادت خود کرتا ہے۔

چونکہ اس کانفرنس کو امریکہ کے ایک مسیحی ادارہ نے اسپانسر کیا تھا۔ وہ گاڈ کانفرنس

(God conference) کے نام سے دنیا کے مختلف ملکوں میں کانفرسیں کر رہے ہیں۔ انڈیا میں یہ ان کی پہلی کانفرنس تھی۔ موجودہ زمانہ میں ہر مذہبی گروہ میں اس کی روایات کا احیاء ہو رہا ہے۔ دوسرے مذاہب میں بھی اور اسلام میں بھی۔ البتہ یہاں ایک فرق ہے۔ لوگوں سے گفتگو کے دوران میں نے پایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عمومی احیاء مذہب کی اس لہر کو زمانہ سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اس کو اپنے اپنے اکابر کے کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

اسلامی عبادت کا پروگرام ۴ نومبر کی صبح کو جناب فیروز پونہ والے نے کیا۔ اس میں انھوں نے صرف تلاوت قرآن کو لیا۔ پہلے قرآن کا ایک حصہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھا۔ اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ سنایا۔ مزید انھوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور اس کا انگریزی ترجمہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اس کے بعد انھوں نے اسلامی عبادت کی تشریح کی۔ اور عبادت کی مختلف صورتوں کی تفصیل بیان کی۔ تمام حاضرین نہایت غور کے ساتھ اس کو سنتے اور دیکھتے رہے۔ بعد کو کانفرنس کے کئی شرکا نے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ظاہر کی اور قرآن کا انگریزی ترجمہ طلب کیا۔

۵ نومبر کی صبح کو مسیحی عبادت (christian prayer) کا دن تھا۔ سب سے پہلے ایک بڑے شمع دان پر کئی موم بتیاں جلائی گئیں۔ اس کے بعد اسٹیج پر ایک مسیحی مرد اور دو مسیحی خاتون آئیں۔ انھوں نے باری باری انجیل (انگریزی) کے کچھ حصے پڑھے۔ اس کے بعد ملے ہوئے کمرہ سے ایک مرد اور ایک خاتون برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ ہارمونیم اور طبلہ تھا۔ انھوں نے ہندی اور بنگالی میں بھجن گائے اور ہارمونیم اور طبلہ بجایا۔

آج بھی مجھے دوبارہ وہی احساس ہوا جو ہندو عبادت کے دن ہوا تھا۔ مسیحی عبادت مجھے عبادت سے زیادہ ایک سماجی تقریب نظر آئی۔ ایک فرد کی فطرت اپنے آپ کو خدا کی پرستش میں شامل کرنا چاہتی ہے، مگر یہ مقصد ان عبادتی تقریبات کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا۔

آج صبح کی میٹنگ میں مذہبی قدروں کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اصل اہمیت "اسپرٹ" کی ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں انھیں باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن کا تعلق روح یا اسپرٹ سے ہے۔ ظاہری نوعیت کی احکامی آیتیں قرآن میں نسبتاً کم

ہیں۔ اس میں وہ آیتیں زیادہ ہیں جن کا تعلق اسپرٹ سے تعلق رکھنے والی باتوں سے ہے۔

۴ نومبر کی صبح کی میٹنگ میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کی آفاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اسلام کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پایا کہ اسلام کی بنیاد دو بنیادی پرنسپل پر ہے۔ ایک خدا پر ایمان۔ دوسرے انسان کے لئے مفید بننا۔ پہلے پرنسپل کے لئے میں نے قل ھو اللہ احد کی تشریح کی۔ اور دوسرے پرنسپل کے لئے میں نے واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کی تشریح بیان کی۔

ایک اور مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام کے تمام اصول کامن سنس پر مبنی ہیں۔ کامن سنس خدا کی تخلیق ہے۔ اسی طرح قرآن بھی خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ چنانچہ دونوں میں کامل مطابقت ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے کامن سنس کو اس کی فطری حالت پر قائم رکھے تو وہ اسلام کو عین اپنے کامن سنس کے مطابق پائے گا۔

کانفرنس کے ساتھ ایک بک اسٹال لگا ہوا تھا۔ یہاں مختلف مذاہب سے متعلق انگریزی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ایک کتاب حسب ذیل تھی:

God, The Self and Nothingness by Robert E. Carter

اس کتاب کے مختلف حصے دیکھے۔ دوسرے مذاہب پر کافی تفصیل گفتگو تھی۔ مگر اسلام کے بارہ میں صرف چند مختصر حوالے تھے۔ مصنف نے ایک جگہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کے حوالے سے حسب ذیل تاثر نقل کیا تھا:

> For many years I have studied thoroughly the normative texts of Islam and Christianity. There appears to be no evidence in the texts for ... esoteric ecumenism (p.14).

برسوں تک میں بہت غور سے اسلام اور مسیحیت کی بنیادی کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ بظاہر ان کتابوں میں سرّی عالمگیریت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اس اسٹال پر انگریزی الرسالہ کا شمارہ بھی نظر آیا۔ ہم نے یہ الرسالہ انھیں فراہم نہیں کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے الرسالہ کہاں سے حاصل کیا۔

کانفرنس کی ایک ڈیلی گیٹ ایک ۳۶ سالہ جرمن خاتون Mrs. Ursula McLackland تھیں۔ انھوں نے ایک میٹنگ میں اپنا تجربہ بتایا جو بہت سبق آموز تھا۔ ان کے الفاظ میں، وہ تجربہ یہ تھا:

> The highest value in the eyes of the German youths is to become independant. Personally I don't agree. I was educated to look forward to lead an independant life away from my family as soon as I entered university. But, to my surprise, I was lonely and miserable, missing the interaction with my family. I,therefore, came back to my family. I also joined the German Unification Church to fill the gap in my life. However, I think I am rather an exception. Those of my generation are also not happy but they do not know why that is so. They have lost the conviction, becoming skeptics. One reason of the ever-increasing tourism industry lies in the restlessness found in our generation. It is this dissatisfication with their lives that they are attracted to travelling, in search of some happiness, fulfillment in life.

جرمن نوجوانوں کی نظر میں سب سے زیادہ قابل قدر چیز آزاد ہونا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ابتداءً میری تعلیم اسی ڈھنگ پر ہوئی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے خاندان سے باہر اپنے لئے ایک زندگی حاصل کروں۔ مگر جب میں نے ایسا کیا تو تعجب خیز طور پر میں نے پایا کہ میں تنہا ہوگئی ہوں اور مصیبت میں پڑگئی ہوں۔ میرے خاندان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

آخر کار میں اپنے خاندان کی طرف واپس آئی۔ مزید میں یونی فیکیشن چرچ سے وابستہ ہوگئی تاکہ میں اپنی زندگی کے خلا کو پر کرسکوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں جرمنی میں ایک استثناء ہوں۔ میری نسل کے اور جو لوگ ہیں وہ خوش نہیں ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے یقین کو کھو دیا ہے۔ وہ شک میں مبتلا ہیں۔

آجکل مغربی سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہیں، اس لئے وہ اپنے مقامات سے نکل کر ادھر ادھر جارہے ہیں تاکہ وہ زندگی میں خوشی اور اطمینان کو تلاش کرسکیں۔ منشیات میں اضافہ کا سبب بھی یہی ہے۔

پونہ کانفرنس میں ڈاکٹر محمد اقبال جیل سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں ایک تعلیمی طریقہ کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ اس میں پڑھنے سے زیادہ مشاہدہ پر زور ہے۔ چنانچہ اس کو تعلیم بذریعہ فطرت (Teaching through the study of nature) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق بچوں کو کتابوں کے ذریعہ پڑھانے کے بجائے فطرت کے مظاہر کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً علم نباتات کو

براہ راست پودوں اور درختوں کے مطالعہ کے ذریعہ۔

عرب کے صحرا میں جب ہاجرہ اور اسماعیل کو بسایا گیا اور ان کے ذریعہ صحرا کے ماحول میں ایک نئی نسل بنائی گئی تو وہ گویا اس طریق تعلیم کا پہلا تجربہ تھا۔ کھلے میدان، پہاڑ، سورج، چاند، تاروں کے ماحول میں بنو اسماعیل کو بسانا دراصل ان کو فطرت کی درس گاہ میں داخل کرنا تھا۔ اس درس گاہِ فطرت میں تربیت پاکر جو اعلیٰ نسل تیار ہوئی اسی سے خیر امت کا وہ انسانی مجموعہ نکالا گیا جس کو صحابہ کرام کہا جاتا ہے۔

پونہ کے ایک مسلمان بزرگ نے بابری مسجد کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ ہماری نااہل لیڈرشپ ہے جس نے اپنی غلط پالیسیوں سے بابری مسجد کو ایک مسئلہ بنادیا۔ انھوں نے کہا کہ اب جب کہ معاملہ بگڑ چکا ہے، اب اس کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو صرف ایک حل ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان اس محاذ سے ہٹ جائیں اور ہندوؤں کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا کام کرنے کا موقع دیں۔ ہندوؤں میں پچاس فیصد سے زیادہ لوگ اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر جب ہم کسی مسئلہ کو ہندو قوم کے وقار کا مسئلہ بنادیں تو اس طبقہ کے لئے اپنا عمل کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

پونہ میں الرسالہ کے ایک قاری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشہور عربی درس گاہ کے فارغ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے انگریزی اقتباسات میں بعض اوقات اردو ترجمہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ میں شکایت کرتا تھا کہ دیکھو، انھوں نے انگریزی نقل کردی مگر اس کا ترجمہ شامل نہیں کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود انگریزی پڑھ ڈالوں۔ اس سے مجھے دوہرا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے اب میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ انگریزی اقتباسات کو ترجمہ کی مدد کے بغیر سمجھ لیتا ہوں۔

یہ واقعہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس مزاج کا تعلق صرف انگریزی سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی شکایت کرنے کے بجائے خود اپنی لیاقت کو بڑھائے۔ یہی تعمیری مزاج ہے۔ یہ مزاج اگر لوگوں کے اندر آجائے تو بہت سے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں۔

تقریباً دو ہفتہ کے اس سفر میں پونہ، بمبئی اور شولاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ کافی تعداد میں

لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ رہائش گاہ پر صبح و شام لوگ جمع ہوتے رہے۔ اس طرح دوران سفر ہر روز غیر رسمی انداز میں لوگوں سے دعوتی، تربیتی اور تعمیری باتیں کہنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ باقاعدہ اجتماعات کا پروگرام بھی جاری رہا۔

۴ نومبر کی شام کو پونہ میں جناب انعام دار صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر ایک اجتماع ہوا۔ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہوا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے اِنّ مع العسر یسرا کی تشریح کی۔ میں نے کہا کہ زمین کے نیچے پٹرول کے خزانے ہیں۔ یہ قیمتی خزانے جہاں موجود ہوں وہاں زمین کے اوپر کچھ خاص علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان علامتوں کو دیکھ کر ماہرین سمجھ لیتے ہیں کہ یہاں پٹرول ہے۔ چنانچہ وہاں کھدائی کی جاتی ہے اور پٹرول کے زیر زمین چشموں کو حاصل کرکے ملک کو دولت سے مالامال کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت کے مطابق، عسر گویا یسر کی علامت ہے۔ جہاں عسر پایا جائے تو ہم کو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں اس کے قریب ہی ضرور یسر چھپا ہوا ہے۔ اور پھر یسر کو تلاش کرکے اس کا بھرپور استعمال کرنا چاہئے۔ یہی قرآن کے مطابق کامیاب عمل کا صحیح طریقہ ہے۔ یہ قرآنی اصول بیان کرنے کے بعد میں نے تفصیل سے بتایا کہ موجودہ عسر والے حالات میں کس طرح ہمارے لئے یسر موجود ہے۔

۵ نومبر کی شام کو جناب عبدالصمد صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے کھلی زمین پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک گھنٹہ کی تقریر میں میں نے بتایا کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے۔ اور اتحاد پیدا ہونے کا واحد راز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا مزاج پیدا ہو جائے۔ صحابہ کی مثال سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیا گیا۔

۶ نومبر کی صبح کو پونہ کی مکہ مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد پندرہ منٹ کے لئے تربیت کے انداز کی تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ حدیث میں ہے کہ من صَلّی الصبح فھو فی ذمّۃ اللّٰہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز پراسرار طور پر آپ کی محافظ بن جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے نماز کے ذریعہ وہ اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو آدمی کے اندر تسخیری طاقت پیدا کرتے ہیں اور اس کو لوگوں کی طرف سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

صلّوا خلف کل برّ و فاجر کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ برے لوگوں کو لاکر امام کی جگہ کھڑا کردو۔ اس حدیث کا خطاب حقیقۃً امام کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ مقتدیوں کی طرف ہے۔ یعنی مسجد میں کسی کو امام بنادیا گیا۔ اب ایک شخص کے اندر خیال پیدا ہوا کہ اس کے اندر تو فلاں خرابی ہے۔ تو جس شخص یا جن لوگوں کے دل میں اس طرح کا خیال آئے انھیں اپنے اس خیال کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہئے بلکہ اس کو نظر انداز کرکے امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہئے۔

۶ نومبر کی دوپہر میں لیڈی حوا بائی اسکول پونہ کے ہال میں شہر کا پڑھا لکھا طبقہ جمع ہوا۔ ان لوگوں کے سامنے خطاب کا موقع ملا۔ موضوع تھا: تعلیم اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ اور باشعور آدمی ہی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ باتوں کی گہرائی کو سمجھے اور مختلف مواقع پر صحیح فیصلہ لے سکے۔ قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ نیز تاریخ عالم کی مثالوں سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا بھی ویڈیو کیسٹ لیا گیا۔

۶ نومبر کی سہ پہر کو انعام دار صاحب کے مکان پر خواتین کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کی تعلیم یافتہ خواتین جمع ہوئیں۔ اس موقع پر میں نے عورت کے بارہ میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کیا۔ میں نے کہا کہ عورت کا مقام عمل (workplace) گھر ہے نہ کہ باہر۔ اسلام میں عزت اور احترام کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کا درجہ یکساں ہے۔ مگر مقام عمل کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے۔ عورت کا مقام عمل بنیادی طور پر اندر ہے اور مرد کا مقام عمل بنیادی طور پر باہر۔

پھر میں نے کہا کہ عورت کا اہم ترین کام اگلی نسل کی تیاری ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے مسلسل صالح انسان ملتے رہیں۔ یہ کام گھر کی تربیت گاہ میں انجام پاتا ہے۔ عورت یہ کام کرے تو اس کا درجہ مرد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے ایک نئی نسل بنائی تو حج اور عمرہ میں مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کے نقش قدم کی پیروی کریں۔ مغرب میں لیڈیز فرسٹ کے صرف الفاظ ہیں اور اسلام میں سعی بین الصفا والمروۃ کی صورت میں عملاً یہ درجہ عورت کو دیدیا گیا ہے۔

۷ نومبر کو کونا اکسپریس کے ذریعہ پونا سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ جناب فاروقی فیصل صاحب ساتھ تھے۔ ان سے راستہ بھر دعوتی اور علمی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس طرح چار گھنٹہ کا یہ سفر بہت آسانی سے گزر گیا۔

ہماری ٹرین کلیان سے آگے بڑھی تو متوازی لائن پر ایک اور ٹرین آگئی۔ ہماری ٹرین کی طرح وہ

ٹرین بھی بمبئی کے رخ پر جارہی تھی۔ متوازی لائن پر اس ٹرین کے آنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری ٹرین پیچھے کی طرف جارہی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا محسوس ہوا کہ مقابل کی الکٹرک ٹرین آگے جارہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف سفر کر رہی ہے۔

یہ صرف نگاہ کا دھوکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ٹرینیں ایک ہی رخ پر بمبئی کی طرف دوڑ رہی تھیں مگر مقابل کی ٹرین کی رفتار چوں کہ تیز تھی اس لئے ظاہری تقابل میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹرین آگے کی طرف جارہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری مشاہدہ اور حقیقی واقعہ میں بعض اوقات کتنا بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ایک چیز مشرق کی طرف جارہی ہوتی ہے اور بظاہر دیکھنے والے کو ایسا نظر آتا ہے گویا کہ وہ چیز مغرب کی طرف چل جارہی ہے۔ اس لئے آدمی کو محض ظاہری مشاهده کی بنیاد پر کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

۷ نومبر کی شام کو ۸ بجے ہماری ٹرین بمبئی وی ٹی پہنچ گئی۔ یہاں سے ساتھیوں کے ہمراہ ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب کے مکان (مجگاؤں) پہنچا۔ بمبئی میں میرا قیام انھیں کے یہاں رہا۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے حالات سن کر معلوم ہوا کہ ان کو ایک بڑا نقصان پیش آیا۔ جس کا ان کے اوپر اتنا اثر ہوا کہ ان کی صحت تباہ ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ قبول کریں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ پھر ان کی اجازت سے میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر یہ جملہ لکھ کر انھیں دیدیا —— آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

روزانہ صبح اور شام کو مقامی احباب رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے سوال وجواب کی صورت میں گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں میں انتہائی پرامید ہوں۔ ان کے بارہ میں قرآن کی یہ آیت صادق ہوتی نظر آتی ہے: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں خدا کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ فئۃ قلیلہ اکثر فئۃ کثیرہ پر غالب آتا ہے۔ ایک عرصہ تک مسلمان سیاسی جوش وخروش میں اپنی قوتیں ضائع کرتے رہے۔ اب حالات کا دباؤ مسلمانوں کو صحیح رخ دے رہا ہے۔ وہ سیاست کے محاذ سے ہٹ کر تعمیر کے میدان میں

سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اس وقت ہم مکی دور میں ہیں اور ہم کی دور میں اترنے والے احکام کے مخاطب ہیں۔ آپ کس بنیاد پر ایسا کہتے ہیں جب کہ اب مکمل قرآن اتر چکا ہے اور وہ آج مکمل صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات قرآن کے اصول تکلیف (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا) سے نکلتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان یا کسی جماعت کے اوپر قرآن کے احکام کا انطباق باعتبار وسع ہے نہ کہ باعتبار تنزیل۔ حج اور زکوٰۃ کے احکام اتر چکے ہیں۔ مگر ان احکام کی فرضیت صرف ان افراد کے اوپر ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔ یہی معاملہ تمام احکام کا ہے۔ آدمی جس حکم کی تعمیل کی استطاعت رکھتا ہو اس کا وہ مکلف بن جائے گا۔ اور جس حکم کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اس کا وہ مکلف نہیں بنے گا۔

۶ نومبر کو مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد پونہ کی مکہ مسجد میں عمومی خطاب ہوا۔ موضوع رکھا گیا تھا: حالات حاضرہ اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ اس عنوان کا میرے نزدیک دو پہلو ہے۔ ایک، مشکلات حاضرہ اور مسلمان۔ اور دوسرا، امکانات حاضرہ اور مسلمان۔ اس کے بعد تفصیل سے میں نے بتایا کہ بلاشبہ ہمارے لئے کچھ مشکلات ہیں۔ مگر اس قسم کی مشکلات ہر سماج میں اور ہر ملک میں ہمیشہ رہتی ہیں۔ مزید مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ امکانات کی مقدار مشکلات کی مقدار سے ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور آج بھی بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ امام صاحب نے نماز پڑھانے پر اصرار کیا۔ مگر میں نے نماز نہیں پڑھائی۔ بلکہ امام صاحب کو پکڑ کر انھیں آگے کر دیا۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے پیچھے نماز ادا کی۔

میرے ساتھ ایسا بار بار پیش آتا ہے۔ جب بھی میں کہیں جاتا ہوں تو جس مسجد میں نماز کے لئے داخل ہوتا ہوں اس کے امام صاحب نماز پڑھانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں۔ زیادہ درست طریقہ یہ ہے کہ مقامی امام ہی نماز پڑھائے۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد میں کتاب الصلاۃ کے تحت امامۃ الزائر کا ایک مستقل باب ہے۔ ابوعطیہ تابعی کہتے ہیں کہ مالک بن حویرث ہماری مسجد میں آئے۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو ہم نے ان سے کہا کہ آگے آیئے اور نماز پڑھائیے۔ انھوں نے کہا کہ تم اپنے میں سے کسی شخص کو کھڑا کرو اور وہ نماز پڑھائے۔ پھر میں تم کو بتاؤں گا کہ میں کیوں ایسا کرتا ہوں۔ اس کے بعد

انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی قوم میں جائے تو وہ ان کی امامت نہ کرے بلکہ خود ان میں کا کوئی شخص ان کی امامت کرے (مَنْ زارَ قوماً فلا یؤمُّہم ولیؤمّھم رجل منہم) حدیث نمبر ۵۹۶

انڈیا میں پارسیوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ان میں سے زیادہ بڑی تعداد بمبئی میں ہے۔ اس کے بعد ان کی زیادہ تعداد پونہ میں ہے۔ پارسیوں کا اصول ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے اپنے بچوں کے اندر خود اعتمادی کا مزاج پیدا کرتے ہیں۔

ایک پارسی نے اپنے چھوٹے بچہ کو گھر کے چبوترے پر کھڑا کیا۔ خود چبوترہ کے نیچے کسی قدر فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ہاتھ بڑھا کر بچہ سے کہا بیٹے میری گود میں آجاؤ۔ بچہ بڑھتا مگر نیچے گرنے کے ڈر سے چبوترہ پر ٹھہر جاتا۔ اسی طرح کئی بار کرنے کے بعد باپ اور قریب آگیا اور بچہ کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بچہ اپنے باپ کو قریب دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ مگر جیسے ہی بچہ آگے بڑھا، باپ پیچھے ہٹ گیا۔ بچہ چبوترہ کے نیچے منھ کے بل گر گیا۔ اب باپ نے جلدی سے اس کو اٹھالیا اور کہا، بیٹے دیکھو باپ پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔

پونہ میں بمبئی کے ہفتہ وار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (۲ - ۸ نومبر ۱۹۹۱) کا شمارہ دیکھا۔ اس کے آخری صفحہ پر آشا کرشنا کمار کا مضمون نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں فرقہ پرست ہندوؤں کی ایک بات کا جواب تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی آبادی ہندستان میں تیزی سے بڑھ رہی ہے اور مستقبل میں ان کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو جائے گی۔ مضمون میں اس فرضی پروپگنڈے کا نہایت طاقت ور جواب دیا گیا تھا۔ ایڈیٹر نے مضمون کے آغاز میں اس کے بارہ میں یہ الفاظ لکھے تھے:

> That the minority Muslim community is reproducing at a faster rate as compared to the Hindus and would thus outnumber them, was one of the mainstays of the BJP's communal politics. This simplistic statement is one more example of the Party's brand of Hindutva, based on deliberate distortion and vicious misinterpretation of facts, argues Asha Krishnakumar in an in-depth analysis.

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا پڑھا لکھا طبقہ اپنے سائنٹفک مزاج کی بنا پر مسلمانوں کا زبردست حامی ہے۔ مگر مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔

وہ جلسہ جلوس کی سیاست کے ذریعہ ہندو عوام کو بھڑکاتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا معاملہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ سے نکل کر ہندوؤں کے جاہل طبقہ کے پاس چلا جاتا ہے اور جاہل طبقہ خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا غیر ہندوؤں کا وہ عقلی بنیاد پر سوچ کر اپنا طرز عمل متعین نہیں کرتا بلکہ اندھے جذبات کے تحت اپنا طرز عمل متعین کرتا ہے۔ یہی وہ غلط سیاست ہے جس کا برا انجام اس وقت مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مولانا سید نور ابراہیم (۲۸ سال) پونہ کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ ۱۹۸۷ میں یہ واقعہ ہوا کہ انھوں نے ایک مطبوعہ اردو اعلان مسجد میں پڑھ کر سنایا۔ اس اعلان میں "آرگنائزیشن" کا لفظ تھا وہ اس کا صحیح تلفظ نہ کر سکے۔

اس کے بعد انھیں احساس ہوا کہ میں نے مدرسہ سے عالم کی فراغت حاصل کر لی مگر انگریزی سے میں اتنا زیادہ بے بہرہ ہوں کہ انگریزی کا ایک لفظ جو اردو خط میں چھپا ہوا ہے اس کو میں پڑھ نہیں سکتا۔ یہ سوچ کر ان کے اندر غیرت آئی۔ بازار سے انھوں نے انگریزی کتابیں حاصل کیں اور بطور خود انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ اب ذاتی کوشش سے انھوں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ وہ الرسالہ انگریزی پورا کا پورا سمجھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ وہ ہر مہینہ باقاعدہ طور پر انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

ناپسندیدہ واقعہ سے اگر منفی اثر لیا جائے تو وہ تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اور اگر ناپسندیدہ واقعہ سے مثبت اثر لیا جائے تو وہ آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔

پچھلے ماہ میں تقریباً دو ہفتہ کے لئے لاہور میں تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ تقریباً ہر مسلمان کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام مسٹر محمد علی جناح کا کارنامہ ہے۔ پاکستانی دانشوروں کے نزدیک ہندو لیڈرشپ کسی طرح پاکستان بننے دینا نہیں چاہتی تھی۔ یہ مسٹر جناح کی عظیم قیادت تھی کہ انھوں نے ہندو لیڈروں کو پاکستان کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

مگر ہندستان کے مسلم دانشوروں کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کو مسلمانوں نے نہیں بنوایا بلکہ ہندوؤں نے بنوایا۔ بمبئی کے زمانۂ قیام میں یہاں کے ایک اخبار (انقلاب ۹ نومبر ۱۹۹۱) نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا ـــــــ مشہور ماہر قانون ایچ ایم سیروائی نیز دیگر محققین نے اپنی متعدد تصانیف میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی وجہ سے

نہیں بلکہ درحقیقت جن سنگھی ذہنیت اور انگریزوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔"

بمبئی کے اردو اخبار کے مذکورہ اداریہ کا عنوان تھا : "مسلمان کیا کریں" اس کو دکھاتے ہوئے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ جو مسلم دانشور پچاس برس میں یہ بھی طے نہ کر سکے کہ پاکستان کس نے بنوایا وہ "مسلمان کیا کریں" کے بارہ میں قوم کو کیسے کوئی درست رہنمائی دے سکتے ہیں۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۳ نومبر ۱۹۹۱) میں ایک جرنلسٹ راج دیپ سار ڈیسائی کے قلم سے ایک دلچسپ مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— طاقتور تلوار، اس سے بھی زیادہ طاقتور قلم :

Mighty sword, mightier pen.

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ شیوسینا نے ایک عرصہ تک تلوار (تشدد) کے وسیلہ پر اعتماد کیا۔ مگر یہ ذریعہ اس کے لئے زیادہ مفید نہ ہو سکا۔ چنانچہ اب خود شیوسینا کے اپنے اخبار مارمِک نے لکھا ہے کہ ہمیں پریس کی طاقت کو استعمال کرنا چاہئے۔ شیوسینا کے آرگن نے اردو شاعر کے شعر کو کسی قدر فرق کے ساتھ نقل کیا ہے کہ کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو، گر توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو :

Do not remove a sword, When even a cannon becomes useless, bring out a newspaper. (p.13)

۱۰ نومبر کو ۱۰ بجے بمبئی میں ایک خطاب کا پروگرام تھا۔ اس کا انتظام پاٹکر ہال میں کیا گیا اور اس کا عنوان تھا "محمدؐ ——— پیغمبر انقلاب"۔ اس موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک سوال وجواب کا پروگرام تھا۔ حاضرین میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود تھے۔

آج کا دن کسی سنجیدہ اجتماع کے لئے بہت غیر موزوں تھا۔ کیوں کہ آج اتوار تھا اور آج ہی کھیل کا میچ تھا اور جب اس قسم کا میچ ہو تو تمام لوگ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ جناب ہارون رشید (چیف اڈیٹر بلٹز) نے کہا کہ یہ منظر دیکھ کر مجھے تعجب انگیز خوشی ہو رہی ہے۔ اس پروگرام کی پروفیشنل انداز میں معیاری ویڈیو ریکارڈنگ کرائی گئی۔ اس کا ویڈیو اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (بمبئی) کے پاس موجود ہے۔

۱۰ نومبر کی سہ پہر کو پالی کی مسجد میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً آدھ گھنٹہ کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے جو حالات ہیں وہ بہت امید

افزا ہیں۔ اس میں ہمارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ اس کو میں نے قرآن و حدیث سے اور تاریخ کی مثالوں سے واضح کیا۔

۷ نومبر کی صبح کو میں بمبئی میں تھا۔ یہاں ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ ان کے مکان کے قریب جلسمین اپارٹ منٹس کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ یہاں فجر کی نماز کے بعد مختصر طور پر نماز سے متعلق ایک حدیث کی تشریح بیان کی۔ مولانا ممتاز احمد قاسمی اس مسجد کے امام ہیں۔

۸ نومبر کو صبح ۱۱ بجے آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے میری ایک ٹاک کو ریکارڈ کیا۔ یہ ٹاک چند دن کے بعد براڈ کاسٹ کی جائے گی۔ اس کا عنوان تھا ــــ قومی یک جہتی کا مسئلہ۔ یہ تقریر ان شاءاللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ بمبئی میں باندرہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد مسجد میں عبادت کے موضوع پر میری تقریر ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ نماز جمعہ کے بعد یہاں بہت کم لوگ ٹھہریں گے۔ مگر اتنے زیادہ آدمی ٹھہرے کہ وسیع مسجد بالکل بھری ہوئی تھی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تک نماز کی روشنی میں اسلامی عبادت کی تشریح کی۔

انگریزی روزنامہ فری پریس جرنل نے ٹیلی فون کیا تھا کہ وہ مجھ سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ مقررہ وقت کے مطابق ان کی خاتون نمائندہ مسز سپرو نے میری رہائش گاہ پر مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے مسلمانوں سے متعلق تھا۔ کچھ سوالات اسلام کے بارہ میں بھی تھے۔ یہ انٹرویو ۸ نومبر کو نماز عصر کے بعد ریکارڈ کیا گیا۔

۸ نومبر کو نماز مغرب کے بعد قارئین الرسالہ کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ایک ہال میں تھا۔ پہلے قارئین الرسالہ کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے الرسالہ مشن کی وضاحت پر ایک مفصل تقریر کی۔

۸ نومبر کی رات کو ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ احمد اظہار اور ہندستان ڈیلی کے نمائندہ عبدالرحمٰن صدیقی نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں دو قسم کے سوالات کئے گئے۔ الرسالہ مشن اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل۔ الرسالہ مشن کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا مشن لوگوں کو باشعور بنانا ہے۔ مسائل کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کہا کہ

مسئلہ اس صورت حال کا نام ہے جس کا حل بروقت موجود نہ ہو۔ مسلمانوں کے مسائل کا حل چوں کہ موجود ہے، اس لئے میں ان کو مسئلہ نہیں سمجھتا۔ مثلاً فساد کے مسئلہ کا یقینی حل اعراض ہے۔ سروس کے مسئلہ کا یقینی حل محنت ہے۔ معاشی پسماندگی دور کرنے کا یقینی حل صنعت و تجارت میں آگے بڑھنا ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ ظالم حکمرانوں کے خلاف چیلنج کے نام پر بے معنی سیاسی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں اور اس کو حسینی نمونہ کی پیروی کہتے ہیں۔ یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازی ہے۔ کیوں کہ تاریخی شواہد کے مطابق حضرت حسین کے اقدام کی یہ نوعیت ثابت ہی نہیں ہوتی۔

حضرت حسین مکہ سے اس لئے نکلے ہی نہیں تھے کہ وہ یزید کو چیلنج کریں اور یزید کی فوجوں سے لڑیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مکہ سے دمشق جاتے۔ وہ اپنے خاندان کو لے کر، نہ کہ فوج کو لیکر، اس خبر کی بنیاد پر نکلے تھے کہ کوفہ کے لوگوں نے عمومی طور پر آپ کے حق میں بیعت کر لی ہے۔ جب وہ کوفہ کے قریب پہنچے اور معلوم ہوا کہ خبر صحیح نہ تھی۔ نیز یہ کہ کوفہ کے جن لوگوں نے بالواسطہ طور پر آپ کے لئے بیعت کی تھی، وہ سب کے سب اپنی بیعت سے پھر گئے ہیں تو آپ نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ کسی بھی تاریخی ریکارڈ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ یزید کے لشکر سے لڑنا چاہتے تھے۔ مگر یزید کو اس کی خبر نہ ہو سکی اور کوفہ کے مقامی حاکم نے حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کو گھیر کر انھیں لڑنے پر مجبور کر دیا، اس لئے کربلا کی لڑائی پیش آئی۔ گویا کربلا کی جنگ مجبورانہ دفاع کے لئے تھی نہ کہ ظالموں کے خلاف جنگی اقدام کے لئے۔

موجودہ زمانہ میں جو "نظریہ جہاد" حضرت حسین کے واقعہ سے نکالا جا رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک خود ساختہ نظریہ ہے، اس کا حضرت حسین کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۹ نومبر کو فجر کی نماز کے بعد مسجد میں درس حدیث کا پروگرام تھا۔ تین حدیثوں کی روشنی میں دین کی حقیقت کو واضح کیا۔ میں نے بتایا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ربانی انسان بن جائے۔ ربانی انسان وہ ہے جس کو عظمت خداوندی کے احساس نے عجز و فروتنی کے درجہ پر پہنچا دیا ہو۔ جس کا ایمان اس سے سرکشی کا احساس چھین لے۔ جس کا حال یہ ہو کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد کوئی چیز اس کے لئے اعتراف حق میں رکاوٹ نہ بنے۔

۹ نومبر کو ۱۰ بجے جامعۃ البنات میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کا پروگرام تھا۔ کسی قدر

تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اسلام میں کس طرح عورت کو عزت کا مقام دیا گیا ہے۔ البتہ عملی تقاضے کی بنا پر اسلام میں عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن میں کچھ وقت گزارا۔ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے یہ ادارہ قائم کیا ہے۔ اور اس کو اعلیٰ معیار پر چلا رہے ہیں۔ انگریزی ماہنامہ آئی لینڈ (Island) کے شمارہ اگست ۱۹۹۱ میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں اس ادارہ کا تعارف کراتے ہوئے جو سرخی قائم کی گئی تھی وہ اس کا بہترین تعارف ہے۔ اس کا عنوان تھا ـــــ پرانے خیالات، نئے طریقے :

Old ideas, new techniques.

اس ادارہ کے پیچھے سب سے زیادہ ڈاکٹر ذاکر نائک اور ڈاکٹر محمد نائک کا ذہن کام کر رہا ہے۔

۹ نومبر کی سہ پہر کو فیمینا (Famina) کی خاتون نمائندہ مسز شالینی پردھان نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر مسلم خواتین کے رول کے بارہ میں تھے۔

۹ نومبر کو نماز مغرب کے بعد انڈین مرچنٹس چیمبر میں تقریر ہوئی۔ موضوع تھا: اسلام داعیٔ امن۔ تقریباً سوا گھنٹہ کی تقریر کے بعد سوال و جواب ہوا۔ اس اجتماع میں بمبئی کے اعلیٰ اذہان شریک ہوئے ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

تقریر کے بعد سوال و جواب کا وقفہ ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ اعراض کی تلقین کرتے ہیں پھر اعراض کب تک۔ میں نے کہا کہ اعراض اس وقت تک جب کہ اعراض کرنے کا امکان ہی سرے سے ختم ہو جائے۔

۹ نومبر کو عشاء کی نماز کے بعد سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر جاوید آنند سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف تعصب (Prejudice) ہے۔ اس کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو لوگ تعصب کہتے ہیں، اس کو میں چیلنج کہتا ہوں۔ اور یہ چیلنج ہمیشہ رہے گا۔ کیوں کہ زندگی میں چیلنج کا ہونا کسی انسان کا منصوبہ نہیں۔ یہ خدا کا منصوبہ ہے۔ پھر وہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ ہم چیلنج کی صورت حال کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ چیلنج کا مقابلہ کرکے اپنے لئے زندگی کی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

۱۰ نومبر کو نماز فجر کے بعد جیسین اپارٹمنٹس کی مسجد میں حدیث کا درس دیا۔ یہ مسجد اپنی ظاہری

صورت کے اعتبار سے مسجد نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں گنبد اور مینار جیسی چیزیں موجود نہیں ہیں۔ بمبئی میں نئے عبادت خانہ کی تعمیر کی اجازت مشکل سے ملتی ہے۔ اس بنا پر لوگوں نے ایسا کیا ہے کہ وہ مدرسہ کے نام پر ایک ہال بنا لیتے ہیں اور اس کے اندر تعلیم کے ساتھ نماز بھی ادا کرتے ہیں۔

بمبئی والوں کا یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ آدمی جس ماحول میں ہو وہاں کا ماحول اگر ایک چیز دینے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو اشو بنا کر اس کے لئے ٹکرانا نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ آدمی کو چاہئے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو لے لے اور بقیہ کے لئے پرامن طور پر اپنی تعمیری کوشش جاری رکھے۔

بمبئی میں کئی پروگرام ہوئے۔ یہاں کے حلقۂ الرسالہ نے تمام پروگراموں کو جس طرح آرگنائز کیا وہ یقیناً قابل تعریف تھا۔ تمام لوگوں نے ایک ٹیم کے انداز میں کام کیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائک، ڈاکٹر محمد نائک، ڈاکٹر ذاکر نائک، مسٹر افضل لادی والا، ہارون بھائی ہوزری والا، مسٹر فاروق فیصل، مسٹر نسیم علی خاں، مولانا امت انزقاسمی، مسٹر جی ایم صدیقی، مسٹر آفتاب احمد صدیقی وغیرہ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے ہر چیز کو پیشگی طور پر منصوبہ بند انداز میں طے کیا اور اس کو حسن و خوبی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔ آخر میں ان لوگوں نے تمام پروگرام کا پریس ریلیز انگریزی میں تیار کیا اور اس کو بمبئی کے ۳۶ میگزین اور اخباروں کے نام روانہ کیا۔ کئی پروگراموں کے ویڈیو کیسٹ تیار کرائے، جو لوگ ویڈیو کیسٹ بہ قیمت لینا چاہیں وہ ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں:

Islamic Research Foundation, Masalawala Building, 2nd Floor, 56 Tandel Street North, Dongri, Bombay 400009, India. Tel. 864968

بمبئی کے پروگراموں میں مقامی اخباروں کے نمائندے بھی آتے رہے۔ مسٹر بال ٹھاکرے کے مراٹھی اخبار "سامنا" کا نمائندہ بھی شریک ہوا۔ اس طرح مسٹر بال ٹھاکرے کو میری باتوں کی رپورٹ پہنچتی رہی۔ چنانچہ بال ٹھاکرے نے سامنا کے شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ میں پورا ایڈیٹوریل اسی کے بارہ میں لکھا۔ جناب فاروق فیصل صاحب نے اس ایڈیٹوریل کا تراشہ اس کے اردو ترجمہ کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ اس مفصل ایڈیٹوریل کا ایک حصہ یہ ہے:

" نئی دہلی، اسلامی مرکز کے فاؤنڈر، الرسالہ کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین خاں، انھوں

نے کچھ دن پہلے بمبئی میں آکر یہ کہا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے جھگڑا کرنے سے اوائڈ کرنا چاہئے۔ جھگڑے کو اوائڈ کرنے کا مطلب اپنے حق پر پانی ڈالنا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے ـــــ آگے بڑھنے کا موقع ڈھونڈھ لو۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان لیڈر آج تک فرقہ وارانہ معاملوں پر بحث کرتے رہے لیکن اس دیش میں مسلمانوں کے لئے آگے بڑھنے کے کتنے مواقع حاصل ہیں اس بارہ میں کبھی چرچا نہیں کی جاتی۔ تعلیم اور روزگار یہ اصلی مسائل آج ہماری قوم کے سامنے کھڑے ہیں لیکن ہمارے لیڈر کئی فالتو مسئلوں پر بڑی سرگرمی سے اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ ہندستان میں مسلمان صرف ایک پروٹسٹ کرنے والی اقلیت بن گئے ہیں۔ اس طرح کی امیج کو بدل دینا چاہئے۔ دیش کی ترقی کا کام کرنے والی جماعت، یہ امیج بنانا چاہئے۔ آج تک مسلمان مانگنے والی جماعت بنے رہے۔ اب اس سے آگے بڑھ کر دینے والی قوم کی امیج بنانا چاہئے۔ ترقی کے ہر ایک میدان میں سب سے اچھا کام کرنے والی قوم، یہ امیج بنانا چاہئے۔ اس طرح کے خیالات مولانا وحید الدین خاں صاحب نے ظاہر کئے ہیں۔ مہاراشٹر کے مسلمان ان خیالات سے کتنا اثر لیتے ہیں اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا"

ہارون بھائی ہوزری والے نے ایک سبق آموز واقعہ بتایا۔ ۴ نومبر کو ایک ہندو بھائی ان کے یہاں سامان خریدنے کے لئے آئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی ایک پریشانی کا ذکر کیا۔ ان کو بمبئی سے اندھیری جانا تھا۔ مگر بجلی میں کچھ گڑبڑ ہو جانے کی وجہ سے الکٹرک ٹرینیں رک گئی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑا قالین تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں قالین لے کر گھر پہنچنا ہے۔ اگر ہم ٹیکسی کریں تو وہ سو روپیہ سے زیادہ کرایہ لے گا۔

ہارون بھائی نے کہا کہ آپ قالین ہماری دکان پر رکھ دیں اور کل اس کو یہاں سے منگوا لیں۔ انھوں نے کہا کہ کل دیوالی ہے اور اس قالین کو کل تک اندھیری پہنچ جانا ہے۔ ہارون بھائی نے چاہا کہ ریلوے انکوائری میں ٹیلی فون کر کے ٹرین کی تازہ پوزیشن معلوم کریں۔ مگر بار بار ڈائل کرنے کے باوجود ٹیلی فون سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آخر کار ہارون بھائی نے سائیکل کے ذریعہ اپنا آدمی ریلوے اسٹیشن بھیجا۔ وہ پتہ کر کے آیا کہ ٹرینیں چل رہی ہیں۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور اپنا قالین لے کر چلے گئے۔

اس دوران میں جب کہ وہ ہارون بھائی کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے، ہارون بھائی نے انگریزی الرسالہ

کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ انھیں پڑھنے کے لئے دیا۔ اس میں ایک حدیث پڑھ کر انھوں نے کہا :

You have followed this (Hadith). It should be in practice. It should not be only in books.

فاروق فیصل صاحب (پیدائش ۱۹۵۵) نے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میری پیدائش سے قبل تقسیم ہند ہوئی۔ حیدر آباد پولیس ایکشن، ملک کے فسادات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر مجھے ایسا احساس ہوتا تھا کہ ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی تاریخ کا آخری حصہ ہیں۔ چنانچہ ایک طرح کی مایوسی دل و دماغ پر طاری ہوگئی تھی لیکن الرسالہ پڑھ کر احساس ہوا کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ کی تباہی و بربادی دیکھنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی نئی تاریخ "کا باب شروع کرنے کے لئے اس دور میں پیدا کئے گئے ہیں۔ کیا اب بھی لوگ یہ کہیں گے کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے ــــ میں سمجھتا تھا کہ میں تاریخ کا آخری حصہ ہوں لیکن الرسالہ پڑھ کر احساس ہونا شروع ہوا کہ میں تاریخ کا اول حصہ بننے والا ہوں۔ تاریخ میرے عمل سے بنے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ الرسالہ اقدام اور حوصلہ مندی سکھاتا ہے نہ کہ بزدلی اور پسپائی۔

بمبئی سے ایک انگریزی اخبار انڈپنڈنٹ چھپنا شروع ہوا ہے۔ یہ کافی آزاد اور غیر جانب دار اخبار ہے اور اعلیٰ حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ٹائمس آف انڈیا گروپ سے ہے۔ اس کے بارہ میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے جناب نسیم علی خاں صاحب نے کہا : انڈپنڈنٹ مسلمانوں کے مسائل سمیت تمام ضروری باتیں غیر جانب دارانہ انداز میں شائع کرتا ہے۔ اب کسی مسلمان لیڈر کو علیحدہ سے مسلمانوں کا انگریزی اخبار نکالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود لکھنا چاہیں تو وہ انڈپنڈنٹ کے صفحات کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

بمبئی میں کئی اخبار کے نمائندوں نے انٹرویو لیا۔ ان میں اردو، مراٹھی، انگریزی اخبارات شامل تھے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا بمبئی کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ انھوں نے سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" کے جواب میں ایک کتاب محمدؐ اور قرآن (انگریزی) لکھی۔ اس کتاب کو رشدی کی کتاب ہی کے پبلشر پنگوئن (Penguin Books) نے شائع کیا

جس کی شاخیں امریکہ، برطانیہ اور ہندستان میں ہیں۔ یہ کتاب آج پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر فروخت ہورہی ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا کرم ہے کہ اس کتاب کا خود پنگوئن والوں پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ انھوں نے معاہدہ کے باوجود رشدی کی کتاب کا پیپر بیک اڈیشن نکالنے سے انکار کردیا (نئی دنیا ۱۳ اپریل ۱۹۹۲)

اس سے مثبت انداز کار کی غیر معمولی اثر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال کے مطابق سلمان رشدی کی بیہودہ کتاب کے جواب میں اسلام پر ایک صحیح تعارفی کتاب تیار کی گئی۔ اس کتاب کو "شیطانی آیات" کے پبلشر ہی نے اپنے یہاں سے شائع کیا اور پھر ہر جگہ اس کو پڑھا جانے لگا۔ مزید یہ کہ خود پبلشر پر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شیطانی آیات کی مزید اشاعت سے باز آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مثبت طریق کار میں معجزاتی تاثیر چھپی ہوئی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

"گاڈ ارائزز" کا ترجمہ مراٹھی زبان میں ایک ہندو پروفیسر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں فاروق فیصل صاحب نے بتایا کہ یہ ترجمہ اب بمبئی میں جی ایم صدیقی صاحب کے پاس پہنچ چکا ہے۔ توقع ہے کہ انشاءاللہ وہ جلد ہی شائع ہو سکے گا۔

سفر سے واپسی کے بعد بمبئی سے کچھ لوگوں کے خطوط موصول ہوئے۔ جناب محمد یٰسین تاڑے (Tel. 6115718) لکھتے ہیں: الحمدللہ بندہ آپ کے بمبئی کے پروگرام میں حاضر تھا۔ اور آپ کی تقریر سے بے حد متاثر ہوا۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ اور اسی طرح امت مسلمہ آپ کی کاوشوں سے بہرہ ور رہو، آمین۔

جناب محمد افضل لادی والا (کرلا) اپنے خط میں لکھتے ہیں: بمبئی میں آپ کا پروگرام الحمدللہ بے حد کامیاب رہا۔ اللہ رب العزت کے کروروں احسانات ہیں کہ سارے پروگرام حسب منشا خوب سے خوب تر رہے۔ لوگوں کے دماغ ہی نہیں روح تک کو آپ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کئی لوگ ایسے بھی آئے کہ ہم کو مولانا کا پروگرام رکھنا ہے۔ مگر وقت کی کمی کے سبب یہ ممکن نہ تھا۔ انشاءاللہ آپ کے اگلے دورہ میں اس سے بہتر پروگرام رکھیں گے۔ آئندہ آپ کو کم از کم دس روز بمبئی کے لئے دینا ہوگا۔ آپ کے ساتھ بمبئی میں سہ روزہ پروگرام کے دوران جو وقت گزرا وہ مجموعی طور پر زندگی کا بہترین وقت

گزرا ہے۔ جو روحانی کیفیت ان اجتماعات میں حاصل ہوئی اس کا بیان قلم سے ممکن نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت بیانی ہے۔"

حسب پروگرام ۱۰ نومبر کی شام کو ۱۰ بجے سدیشور ایکسپریس کے ذریعہ بمبئی سے سولاپور کے لئے روانگی ہوئی۔ بمبئی میں مسلسل پروگرام کی وجہ سے دماغ بالکل تھک گیا تھا۔ رات کو بہت اچھی نیند آگئی۔ صبح اٹھا تو ابھی دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ یہ سفر ایک رفیق سفر کی وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ طے ہوگیا۔ یہ ایک ریلوے افسر تھے جو پونہ سے رات کے وقت سوار ہوئے تھے اور وہ بھی سولاپور جارہے تھے:

P.K.A. Narayan, Divisional Personnel Officer, Central Railway, Solapur.

موصوف کے ساتھ دو اور ریلوے افسر تھے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے وہ بار بار لطیفے بیان کرتے تھے۔ خود بھی ہنستے رہے اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اس قسم کے لطیفے صرف لوگوں کو ہنسانے کے لئے بیان کرتے ہیں یا اپنا ٹنشن نکالنے کے لئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا ٹنشن نکالنے کے لئے۔

مزید گفتگو کے دوران انھوں نے کہا "مجھ کو قرآن کی ایک کاپی ہونا" میں نے سولاپور کے ایک ساتھی سے کہا کہ وہ موصوف سے ملیں اور ان کو قرآن کا انگریزی یا ہندی ترجمہ پہنچادیں۔

موصوف نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ آپ کوئی کاغذ لے کر اس کو فولڈ کریں۔ سات موڑ کے بعد اس کو مزید موڑنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ کاغذ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہم نے پہلے ایک چھوٹا کاغذ (لیٹر ہیڈ) سے لے کر موڑنا شروع کیا۔ وہ سات موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ پھر انگریزی اخبار کا بڑا کاغذ لیا۔ وہ بھی سات موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ دوسرے ریلوے افسر مسٹر گرگ نے کہا کہ ہر چیز کی ایک تکمیل حد (Saturating point) ہے۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد انسان آگے نہیں جاسکتا۔ کاغذ کی فولڈنگ کی ایک حد ہے۔ اسی طرح ہر چیز کی ایک حد ہے۔

سولاپور کی وجہ تسمیہ کے بارہ میں کئی رائیں ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ سولہ پور ہے۔ ابتداءً یہاں سولہ گاؤں تھے۔ ان سب کو ملاکر شہر بنایا گیا۔ اس طرح اس کا نام سولاپور ہوگیا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ ابتداءً شعلہ پور تھا۔ اس کے بعد وہ شولاپور بنا، اور پھر سولاپور ہوگیا۔

سولاپور میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عبد الواحد عبد الغفور شیخ اور زاہد علی خاں وغیرہ سے مسلسل ربط رہا۔ جناب زاہد علی خاں صاحب (پیدائش ۱۹۴۱) نے ایک موقع پر بہت بامعنی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ "حکمت بھوک میں رکھی گئی ہے اور لوگ حکمت کو شکم سیری میں ڈھونڈ رہے ہیں"۔

قدیم زمانہ میں شولاپور میں دیوگری یادو کا راج تھا۔ پھر وہ مسلم بہمنی سلطنت کا جزء بنا۔ اس کے بعد اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ تقسیم کے بعد بننے والے ملک (بھارت) کا ایک حصہ ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ایام کو ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (آل عمران ۱۴۰)

حکومتی اقتدار اس دنیا میں کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے۔ یہ خدا کی سنت ابتلاء کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی ایک گروہ کو سیاسی غلبہ دیتے ہیں اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ کسی گروہ کو سیاسی اقتدار ملے تب بھی وہ اس کے لئے امتحان ہے اور کسی گروہ سے سیاسی اقتدار چھین جائے تب بھی وہ اس کے لئے امتحان۔ آدمی کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دے۔ نہ کہ اقتدار ملنے پر احساس برتری میں مبتلا ہو اور اقتدار چھنے تو احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۱ کی صبح کو میں سولاپور پہنچا۔ یہاں میرا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا۔ مقامی ساتھیوں سے کچھ دیر ملاقات کرنے کے بعد ہوٹل کنارہ گیا۔ وہاں پریس کانفرنس ہوئی۔ ایک درجن سے زیادہ اخبارات کے ایڈیٹر اور نامہ نگار جمع ہوگئے۔ ان میں سے ایک اردو اخبار کے اڈیٹر تھے۔ بقیہ مرہٹی اخبارات سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک مرہٹی اخبار کے نمائندہ نے کہا کہ سب سے ضروری کام مذہبی نفرت کو ختم کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو مذہبی منافرت کہا جاتا ہے وہ حقیقۃً قومی منافرت کا دوسرا نام ہے۔ اس کو ہم ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ حسن تدبیر سے اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ اور وہ حسن تدبیر رواداری (tolerance) ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

شولاپور کا ایک خصوصی پروگرام روٹری کلب کے زیر انتظام ہوا۔ روٹری کلب یا روٹری انٹرنیشنل (Rotary International) ایک سروس کلب ہے۔ اس کو ۱۹۰۵ میں شکاگو کے ایک اٹارنی مسٹر پال ہیرس (Paul P. Harris) نے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بزنس اور پروفیشن میں اعلیٰ اخلاقی معیار پیدا کیا جائے۔ اور تاجروں اور پروفیشنل لوگوں کے درمیان عالمی روابط قائم کئے جائیں۔ اس وقت ڈیڑھ سو ملکوں میں اس کے تقریباً سات لاکھ ممبر پائے جاتے ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر امریکہ کے شہر ایونسٹن (Evanston) میں ہے۔

روٹری کے موجودہ عالمی پریسیڈنٹ راجندر سابو (Rajendra K. Saboo) ہیں۔ روٹری نظریہ کے مطابق، روٹرین (Rotarian) سے ان کا کہنا ہے کہ اپنے آپ سے آگے دیکھو (Look beyond yourself) روٹری نیوز کے شمارہ اگست ۱۹۹۱ میں ان کا پیغام چھپا ہے۔ اس کا خلاصہ اُن کے اِن الفاظ میں ہے ـــــ اپنے کام کا نقشہ بناؤ اور اپنے نقشہ کو عمل میں لاؤ:

Plan your work, work your plan.

۱۱ نومبر کو مجھے سولاپور کے قمر النساء ویمنس اسکول میں جانا ہوا۔ وہاں کے ایک بڑے کمرہ میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی دیوار پر دنیا کا ایک بڑا نقشہ بنایا گیا تھا۔ اس میں سوویت یونین کے اوپر لکھا ہوا تھا: متحدہ سوویت سوشلسٹ جمہوریت۔ میں نے کہا کہ برسوں پہلے جب یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت وہ مطابق واقعہ تھے۔ مگر اب وہ خلاف واقعہ بن چکے ہیں۔ کیوں کہ اب سوویت یونین سوویت ڈس یونین میں تبدیل ہو چکا ہے۔

گویا یہ دیوار ابھی تک گزرے ہوئے دور میں جی رہی ہے۔ وہ زمانۂ حاضر میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی حال مسلم دانشوروں کا ہے۔ وہ زمانہ حاضر سے بے خبر ہیں۔ وہ صرف گزرے ہوئے ماضی کو جانتے ہیں اور اسی کو سوچ سوچ کر اس سے اپنے لئے فخر کی غذا لیتے ہیں۔

۱۱ نومبر کو ۳ بجے خواتین کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ویمنس کالج کے احاطہ میں ہوا۔ اپنی تقریر میں میں نے کہا کہ ہمارے یہاں پچاس سال سے سماجی لیڈر اٹھ رہے ہیں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ کیوں کہ ان کی سوچ تمام تر مبنی بر نظام (system-based) ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک حکومت کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ حکومت بدل جاتی ہے مگر سماج نہیں بدلتا۔

میں نے کہا کہ صحیح سوچ وہ ہے جو مبنی برفرد (individual based) ہو۔ یعنی فرد کو اصلاح یافتہ بنانا۔ یہ کام سب سے زیادہ عورتوں کے کرنے کا ہے۔ کسی قوم کی نسل سب سے پہلے عورت کی تحویل میں آتی ہے۔ اگر عورت یہ فیصلہ کرلے کہ ہمیں قوم کے افراد میں کیریکٹر پیدا کرنا ہے تو ہر گھر اصلاح افراد کا کارخانہ بن جائے۔ اس طرح کے افراد جب سماج کا مجموعہ بنیں گے تو ان کے ذریعہ پورا سماج بہتر سماج بن جائے گا۔

۱۱ نومبر کو نماز مغرب کے بعد جامع مسجد میں تقریر ہوئی۔ موضوع تھا: روشن مستقبل۔ میں نے ایک گھنٹہ کی تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کا مستقبل اس ملک میں دینی اعتبار سے بھی روشن ہے اور معاشی اعتبار سے بھی۔ دینی اعتبار سے اس لئے کہ اسلام غیر محرف مذہب ہونے کی بنا پر اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ اور معاشی اعتبار سے اس لئے کہ صنعتی انفجار کے بعد معاشی ذرائع اتنے زیادہ بڑھ چکے ہیں کہ اب کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی آپ کو معاشی ترقی سے روک نہیں سکتی۔

۱۱ نومبر کو عشاء کی نماز کے بعد ہوٹل پرتھم میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور سائنس یہ اجتماع روٹری کلب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی نشست ہوٹل کے خوب صورت لان میں ہوئی۔ وسیع لان مکمل طور سے بھرا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ایسا اجتماع یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان سائنس میں پچھڑ گئے ہیں۔ مگر اس کا تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام تو جدید سائنس کا خالق ہے۔ پھر وہ اس کا مخالف کس طرح ہو سکتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس کو واضح کیا۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کے وقفہ میں ایک صاحب نے کہا کہ سائنس میں پچھڑ جانے کے بعد کیا مسلمان ترقی کر سکیں گے۔ میں نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا: زندہ تو رہیں گے، مگر ترقی نہ کر سکیں گے۔

۱۲ نومبر کو سولا پور کی مودی مسجد میں نماز ظہر کے بعد ایک تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا: اسلامی دعوت کے جدید امکانات۔ میں نے سادہ انداز میں بتایا کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح دعوت کی اشاعت کے لئے موثر امکانات پیدا ہو گئے ہیں جن کو استعمال کر کے دین کو وسیع پیمانہ پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

۱۲ نومبر کی سہ پہر کو ایک سمپوزیم کا پروگرام تھا۔ اس کا اہتمام قومی ایکتا کمیٹی کی طرف سے کیا گیا تھا۔

یہ اجتماع دمانی ہال میں کیا گیا۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ۳۰ سال پہلے نیشنل انٹگریشن کونسل قائم ہوئی۔ مگر وہ مکمل طور پر فیل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح میتھڈالوجی نہیں۔ ایکتا کا راز انیکتا کو گوارا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کی بنیاد انٹگریشن نہیں ہے بلکہ ٹالریشن ہے۔

۱۲ نومبر کو نماز مغرب کے بعد مکہ مسجد میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: "داعی کی ذمہ داریاں، قرآن اور سنت رسول کی روشنی میں اس کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ داعی کو مدعو کا خیر خواہ ہونا چاہئے۔ جس کو قرآن میں ناصح کہا گیا ہے۔ اور داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو امین سمجھے۔ وہ مدعو پر احسان کرنے والا نہیں ہے بلکہ وہ مدعو کی امانت ادا کرنے والا ہے۔ اسی کے ساتھ داعی کے اندر صبر کی صفت ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ مدعو کی زیادتیوں کو نظر انداز کرکے اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرسکے۔

۱۲ نومبر کو عشاء کے بعد سوشل ہائی اسکول میں تقریر ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: اسلام میں تعلیم کی اہمیت۔ یہ تقریر زیادہ مفصل تھی۔ دور اول کی مثالوں سے میں نے بتایا کہ اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کرکے اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

۱۳ نومبر کی صبح کو سولا پور سے پونہ کے لئے واپسی ہوئی۔ راستہ میں عزیز الحق صاحب کا ساتھ تھا۔ وہ ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک درزی گھرانے سے تھا۔ ان کے بڑے بھائی پونہ میں ایک مسجد میں امام تھے۔ عزیز الحق صاحب سلائی، کٹائی کا کام سیکھنے کے بعد روزگار کی تلاش میں ۱۹۶۱ میں پونہ آئے۔ یہاں دو مہینہ تک کام کی تلاش میں پھرتے رہے۔ مگر کام نہ ملا۔ آخر کار انھوں نے ارادہ کیا کہ اپنے وطن ٹونک واپس چلے جائیں۔ مگر بڑے بھائی نے روکا اور کہا کہ چند دن اور کوشش کرلو۔

ایک روز وہ پونہ کے بازار میں نکلے۔ ایک جگہ ایک گجراتی ہندو کی ٹیلرنگ کی بڑی دکان تھی۔ وہ دکان میں داخل ہوئے" سیٹھ" سے کہا کہ ہم کو کام چاہئے۔ اس نے پوچھا، کیا تم سوٹ کی کٹنگ کا کام جانتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مگر اس وقت عزیز الحق صاحب کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ سیٹھ کو یقین نہیں آیا کہ وہ اچھی کٹنگ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ان کو لینے میں اسے تأمل ہوا۔ عزیز الحق صاحب نے سیٹھ سے کہا کہ آپ مجھ کو فی الحال عارضی طور پر رکھ لیں۔ اس کے بعد آپ جس سوٹ کی کٹنگ اور سلائی کا کام مجھے دیں اس کے کپڑے کی پوری قیمت ضمانت کے طور پر میری طرف سے رکھ لیں۔ اگر میرا تیار کیا ہوا سوٹ آپ کو

ور گاہک کو پسند نہ آئے تو ضمانت کی رقم آپ کی اور سوٹ میرا۔

اگلے دن عزیز الحق صاحب پانچ سو روپیہ لے کر دوبارہ مذکورہ ٹیلرنگ ہاؤس میں پہنچے اور سیٹھ کو روپیہ پیش کیا۔ مگر سیٹھ نے روپیہ نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ پیسہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم کام شروع کر دو ــــ عزیز الحق صاحب کا یہ اعتماد انداز ان کی ظاہری کمی کی تلافی بن گیا۔

محمد عمر (۲۳ سال) ہمارے ڈرائیور تھے۔ وہ سولاپور کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ چار سال سے گاڑی چلا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کبھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ سڑک پر ایکسیڈنٹ نہ ہونے کی تدبیر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: آگے کو دیکھتے رہنا اور گاڑی پر کنٹرول رکھنا ــــ یہی وسیع تر معنوں میں سفر حیات کی کامیابی کا راز ہے۔

۴ا نومبر اس سفر کا آخری دن تھا۔ مغرب کی نماز نیو ایرا کالونی (پونہ) کی مسجد میں پڑھی۔ یہ پونہ کی ایک کھلی ہوئی صاف ستھری کالونی ہے۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ مغرب سے پہلے حاجی یونس دم صاحب کی رہائش گاہ پر کچھ لوگ جمع ہوگئے۔ یہاں تذکیری انداز میں کچھ باتیں عرض کی گئیں۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ انڈیا میں مسلمانوں کی انتخابی سیاست کیا ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ تقریباً بیس سال سے میں یہ کہتا رہا ہوں کہ اس معاملہ میں ملکی سطح پر مسلمانوں کی کوئی واحد سیاسی پالیسی ہونا ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مقامی حالات کے اعتبار سے اپنی پالیسی بنائیں اور مقامی اعتبار سے جو نمائندہ انھیں اپنے لئے موزوں اور مفید نظر آئے اس کو ووٹ دیں۔

اس کے بعد میں نے دو حدیثوں کی روشنی میں ایک تذکیری درس دیا۔ ایک حدیث: لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال۔ دوسری حدیث: کل محدث بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔

۱۴ نومبر کی شام کو واپسی ہوئی۔ پونہ سے دہلی کا سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۵۰۴ کے ذریعہ طے ہوا۔ ایرپورٹ پر میں جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ٹیلیفون لگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پاس کی سیٹ سے ایک صاحب اٹھے۔ وہ چلتے ہوئے ٹیلیفون تک پہنچے۔ اس کو ڈائل کرکے س کے اندر ایک روپیہ کا سکہ ڈالا اور پھر خاص انداز میں کھڑے ہوکر بات کرنے لگے۔ ان کی ہر حرکت سے تحانہ تبختر کا انداز جھلک رہا تھا۔ ان کی ہیئت بظاہر یہ کہہ رہی تھی ــــ میری جیب میں پیسہ ہے،

میں ٹیلی فون کرسکتا ہوں۔

موجودہ زمانہ میں جو چیز سب سے زیادہ اٹھ گئی ہے وہ شکر ہے۔ صنعتی انفجار کے بعد چاہئے تھا کہ انسان ہمیشہ سے زیادہ شکر کرنے والا بن جائے، مگر اس کے بعد وہ ہمیشہ سے زیادہ ناشکری کرنے والا بن گیا۔

دوران پرواز کھانے کی سروس شروع ہوئی تو ایئر ہاسٹس نے پوچھا ـــــ ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین۔ میری زبان سے نکل گیا نان ویجیٹیرین۔ جب کھانا سامنے آیا اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سالن کی پلیٹ فوراً ہٹادی اور روٹی اور کھیر کھانے پر اکتفا کیا ـــــ اختیار کے دائرہ میں بھی انسان کتنا زیادہ بے اختیار ہے۔

"تھوڑی دیر میں ہم دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں" اناونسر کی آواز کان میں آئی۔ میں نے سوچا کہ اب میں پونہ سے دور اور دہلی سے قریب ہوں۔ پھر اس حقیقت کی طرف دھیان گیا کہ اب میری عمر ۷۶ سال ہو چکی ہے۔ خیال آیا کہ میں بھی زندگی سے دور اور موت سے قریب پہنچ چکا ہوں۔ دنیا میرے پیچھے ہے اور آخرت میرے آگے۔ انسانوں کے درمیان کچھ دن گزار کر اب میں وہاں پہنچنے والا ہوں جہاں میرا سامنا رب العالمین سے ہوگا۔

دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، جس طرح تونے موجودہ منزل تک حفاظت کے ساتھ پہنچایا ہے اسی طرح اگلی منزل تک بھی حفاظت کے ساتھ پہنچا دے۔ دنیا سے آخرت تک میرے ساتھ خیریت کا معاملہ فرما۔

واپسی کے بعد شولاپور سے جناب زاہد علی خاں صاحب کا خط ملا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: شولاپور میں آپ کے پروگرام کی رپورٹ مرہٹی میں مقامی اخبارات کو دے دی ہے۔ آپ سے شولاپور میں مختصر سی ملاقات ایک حقیقی خواب کی تعبیر دے گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سنجیدہ مشن ہی پیغمبرانہ مشن کی صحیح اتباع ہے۔ اللہ اور رسول کی مرضی حاصل کرنے کی کوشش پر چاہے کتنی ہی سخت مخالفت ہو ہر مومن کو آپ کا ساتھ ثابت قدمی کے ساتھ دینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ آپ کو الرسالہ مشن کے سفر کی اعلیٰ ترین کامیابیاں صحت کاملہ کے ساتھ نصیب کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ شولاپور کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں جن لوگوں کا تعاون حاصل ہوا ان میں حسب ذیل حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں

شری بالاصاحب جادھو ، شری موہن پسنور ، شری کے سی مڈسے ، شری شانتی لال بٹڈا ، شری رمیش گروال ، وغیرہ۔

ڈاکٹر رمیش ایشور داس اگروال (سکریٹری روٹری کلب ، سولاپور) کی طرف سے ایک خط مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ موصول ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے :

We were very pleased to hear you on a rather rare subject – Islam and science. Your lecture has really clarified the doubts from the minds of the audience so for as Islamic contributions to the development of science is concerned.

ناگپور کا سفر

ناگپور کے روزنامہ اردو سماچار نے "قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرزم" کے موضوع پر ایک کنونشن کیا۔ اس کی دعوت پر ناگپور کا سفر ہوا۔ ذیل میں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۸ نومبر ۱۹۹۲ کی دوپہر کو گھر سے ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ اسی راستہ میں نئی دہلی کا امریکی سفارت خانہ واقع ہے۔ یہ سفارت خانہ غیر معمولی طور پر بہت بڑا ہے۔ یہ سرد جنگ (کولڈ وار) کے زمانہ کی یادگار ہے۔ سابق سوویت یونین نے چونکہ دہلی میں ایک بڑا سفارت خانہ قائم کیا تھا اس لیے امریکہ نے بھی اس کے جواب میں یہاں بہت بڑا سفارت خانہ بنایا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد نئی دہلی میں اس قسم کے بڑے امریکی سفارت خانہ کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اس سفارت خانہ کو دیکھ کر میرا ذہن خدا کی اس نشانی کی طرف مڑ گیا جس کو کمیونسٹ ایمپائر کا خاتمہ کہا جاتا ہے۔ امریکہ اس کو اپنے قومی فخر کے خانہ میں لکھے ہوئے ہے۔ تمام دنیا کے لکھنے اور بولنے والے مسلمان اس کو افغانی سورماؤں کا کارنامہ شمار کر رہے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جس کو اس انقلابی واقعہ کے بعد قرآن کی یہ آیت یاد آئی ہو: قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران ۲۶)

ایرپورٹ میں داخل ہوا۔ وہاں وہی فضا نظر آئی جس کو بار بار میں دیکھتا رہا ہوں۔ انتظار گاہ میں ایک صاحب میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف میں نے دیکھا تو ان کے چہرے کا اطمینان خاموش زبان میں کہہ رہا تھا: میرے پاس ٹکٹ ہے، مجھے منزل کی طرف سفر کرنے سے کون روک سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ کاش لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ جو اپنی جیبوں میں ٹکٹ لیے ہوئے ہیں وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے بے ٹکٹ ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ جن کی سیٹیں رزرو ہیں ان کی سیٹیں بھی ابھی تک رزرو نہیں ہوئیں۔ جو منزل پر پہنچنے کا یقین کیے ہوئے ہیں ان کا منزل پر پہنچنا بھی اتنا ہی مشتبہ ہے جتنا کہ کسی دوسرے شخص کا۔

جہاز کے اندر انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (نومبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس میں ایک

باتصویر مضمون سندربن کے بارہ میں تھا۔ یہ ہندستان اور بنگلہ دیش کے درمیان واقع بہت بڑا جنگل ہے۔ مضمون کو پڑھتے ہوئے میں اس جملہ پر پہنچا کہ کہا جاتا ہے کہ سندربن کا حوالہ مہابھارت کی رزمیہ کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اس جنگل کا پہلا تاریخی اندراج ٹوڈرمل کی کتاب آئین اکبری میں ہے جو شہنشاہ اکبر کے واقعات حکومت کو بیان کرتی ہے :

The Sunderbans is said to have had mention in the epic tales of the Mahabharata but it found its first historical record in Todarmal's account in the Ain-i-Akbari, which records the rule of the great Emperor Akbar. (p. 16)

اس کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ دوسرے مذاہب کی کتابیں اہل علم کی نظر میں محض قصے کہانیاں ہیں۔ جب کہ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ہر چیز مکمل طور پر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس فرق پر سوچتے ہوئے خیال آیا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے۔ اللہ نے دوسرے مذاہب کو علمی اعتبار سے غیر معتبر بنا دیا تاکہ انسان کے لیے دین حق کا انتخاب کرنا آسان ہو جائے۔

دہلی سے ناگپور کے لیے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۶۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے آج کے اخبارات موجود تھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۲) میں ایک خبر کی سرخی یہ تھی کہ انڈین ایر لائنز کے ہوا باز کی چوکسی نے ہوائی حادثہ کو بچالیا :

IA pilot's alertness prevents crash.

خبر میں بتایا گیا تھا کہ انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۷ گوا ایر فیلڈ میں داخل ہو کر نیچے اترنے والی تھی۔ مگر ایر ٹرافک کنٹرول کے زمینی دفتر کی طرف سے اس کو یہ پیغام ملا کہ تم ابھی نیچے نہ اترو، بلکہ تین ہزار فٹ کی بلندی پر رہو۔ کیونکہ انڈین نیوی کا جہاز پرواز کرنے والا ہے۔ دوسری طرف ٹرافک کنٹرول نے انڈین نیوی کے جہاز سے کہا کہ وہ دو ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہ جائے۔

مذکورہ جہاز حسب ہدایت تین ہزار فٹ کی بلندی پر تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ انڈین نیوی کا جہاز بھی غلط طور پر فضا میں بلند ہو کر تین ہزار فٹ کی بلندی پر آگیا ہے۔ اور اب وہ بالکل اس کے سامنے ٹکراؤ کے راستہ (Collision course) پر ہے۔ عین ممکن تھا کہ ایک لمحہ بعد دونوں میں براہ راست تصادم ہو اور دونوں کے دونوں تباہ ہو جائیں۔ لیکن گوا جانے والے جہاز کے پائلٹ نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اچانک اپنا پاور بند کر دیا اور اس کا جہاز فی الفور ۳۰۰ فٹ نیچے

آگیا۔ اب انڈین نیوی کا جہاز ٹکرائے بغیر اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اس طرح دونوں جہاز بچ گئے۔

یہ واقعہ بظاہر ہوابازی کی دنیا کا واقعہ ہے۔ مگر اس میں انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا سفر بھی عین اسی اصول کے تحت طے ہوتا ہے جس کا نمونہ مذکورہ فضائی واقعہ میں نظر آتا ہے۔

مذکورہ واقعہ میں دو جہاز عین ٹکراؤ کے راستہ پر آگئے۔ چند منٹ میں دونوں کے دونوں تباہ ہو جانے والے تھے۔ اس وقت ایک جہاز نے اپنے آپ کو نیچے اتار لیا۔ اس "پسپائی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے دونوں تباہی سے بچ گئے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ زندگی کی کامیابی کے لیے جس طرح آگے بڑھنا ضروری ہے اسی طرح پیچھے ہٹنا بھی ضروری ہے۔ اس دنیا میں بعض اوقات اقدام کے بجائے وہ چیز مطلوب بن جاتی ہے جس کو عام طور پر "پسپائی" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ اقدام میں ٹکراؤ کا اندیشہ ہوتا ہے اور پسپائی کی صورت میں آدمی مہلک ٹکراؤ سے بچ کر دوبارہ مہلت عمل پالیتا ہے۔

زندگی کی دوڑ میں جن لوگوں کو صرف اقدام کا سبق معلوم ہو اور پسپائی کی حکمت سے وہ ناآشنا ہوں، ایسے لوگ صرف تاریخ میں بربادی کے چیپٹر کا اضافہ کریں گے۔ ان کا نام نہاد اقدام قوم کو ابدی پسپائی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

انڈین ایرلائنز مسلسل گھاٹے میں چل رہی ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے وہ عالمی اسٹینڈرڈ سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا حل ایک تبصرہ نگار مسٹر سوبیر رائے نے یہ بتایا ہے کہ انڈین ایرلائنز میں کرایہ اور تنخواہ کا معیار دونا کر دیا جائے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲)

یہ ایک سطحی رائے ہے جو معاملہ پر گہرائی سے غور کیے بغیر تجویز کی گئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انڈین ایرلائنز میں گھاٹا حقیقی نہیں ہے بلکہ مصنوعی ہے۔ انڈین ایرلائنز کا تعلق پبلک سکٹر سے ہے اور پبلک سکٹر کے تمام ادارے انڈین ایرلائنز کی طرح گھاٹے میں چل رہے ہیں۔ اس کی وجہ پبلک سکٹر میں بڑھا ہوا کرپشن ہے۔ نہرو کی قیادت میں آزاد ہندستان میں جو سب سے بڑی برائی داخل کی گئی وہ اسٹیٹ اکونومی تھی۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ اسٹیٹ اکونومی کے اصول کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ یہ بات تقریباً یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پبلک سکٹر کے تجارتی اداروں کو اگر

پرائیویٹ سکڑ میں دے دیا جائے تو سب کے سب نفع کے ساتھ چلنے لگیں گے۔

سوا گھنٹہ سفر کرنے کے بعد جہاز ناگپور کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہ بوئنگ ۷۳۷ تھا۔ مگر غالباً وہ پرانا ہو چکا ہے۔ کیونکہ کیبن کے اندر شور اتنا زیادہ تھا کہ اناؤنسر کی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایک مقرر مدت کے بعد جہاز بدل دیے جاتے ہیں۔ مگر جن ملکوں کے پاس زرمبادلہ کم ہے، وہ جہاز کو اس وقت تک چلاتے رہتے ہیں جبکہ اس کا چلانا ہی ناممکن ہو جائے۔

ایرپورٹ سے جناب محمد حفظ الرحمٰن صاحب اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ شہر پہنچا۔ حفظ الرحمٰن صاحب الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں اور اس سے مکمل طور پر اتفاق رکھتے ہیں۔ ناگپور میں میرا قیام ہوٹل ہردیو (روم ۵۰۸) میں تھا۔ ملنے والے مسلسل آتے رہے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ عصر کے وقت سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک لوگوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ آخری دن تک جاری رہا۔ چنانچہ ہوٹل والوں نے میرے کمرہ میں مزید کرسیوں کا انتظام کر دیا تاکہ آنے والوں کے لیے سہولت رہے۔

۸ نومبر ۱۹۹۲ کو میں نے فجر کی نماز نظام الدین کی سات سو سالہ قدیم کالی مسجد میں پڑھی تھی۔ ظہر کی نماز میں نے دہلی ایرپورٹ پڑھی، اور عصر کی نماز ناگپور پہنچ کر ادا کی۔ بظاہر یہ ایک سادہ سا واقعہ ہے جو ہر روز بہت سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مگر جب میں نے غور کیا تو مجھے اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق چھپا ہوا نظر آیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں دہلی میں بھی اسلامی عبادت کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اسی طرح میں راجدھانی کے ایرپورٹ پر بھی اسلامی عبادت آزادانہ طور پر کر سکتا تھا۔ اور دہلی سے گیارہ سو کیلومیٹر دور ناگپور میں بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ میں اطمینان کے ساتھ اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اللہ کی عبادت کروں۔

پھر اس کا مقابلہ میں نے قدیم مکی دور سے کیا جب کہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کو یہ آزادی حاصل نہ تھی کہ کھلے طور پر وہ نماز ادا کر سکیں۔ حتی کہ نماز باجماعت ادا کرنے کے مواقع بھی اس وقت موجود نہ تھے۔ مگر آج تمام مسلمانوں کو مکمل طور پر دینی آزادی حاصل ہے۔

یہ واقعہ میرے لیے ایک علامت بن گیا جس میں مجھے اسلام کی تاریخ آگے کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مجھے دکھائی دیا کہ آج مسلمانوں کی حالت لائق شکر ہے نہ کہ لائق شکایت۔ آج ہم اسلام کے حوصلہ افزا مرحلہ میں ہیں نہ کہ حوصلہ شکن مرحلہ میں۔

ملے ہوئے پر شکر کا جذبہ آدمی کے اندر حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نہ ملے ہوئے پر شکایت کا ذہن آدمی کو جھنجلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ناگپور کا لفظ سب سے پہلے شہر کے پھل والوں کے ذریعہ میرے کان میں پڑا جو بلند آواز سے "ناگپوری سنترے" کہہ کر سنترا بیچتے تھے، غالباً ۵۲ سال پہلے جب پہلی بار میں بذریعہ ٹرین ناگپور سے گزرا تو پلیٹ فارم پر پھل فروشوں کی آواز نے بتایا کہ ہماری ٹرین اس وقت ناگپور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ہے جو سنترے کے لیے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔

برنا ٹیکا کے بیان کے مطابق، سنترا ابتداءً جزائر ملایا میں پایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی امتیازی خصوصیت کی بنا پر ساری دنیا میں پھیل گیا۔ آرنج کلچر کے پھیلاؤ میں اسلام کا بھی خصوصی حصہ ہے۔ عربوں کے تجارتی سفر اور اسلام کی توسیع کے ساتھ سنترے کی کاشت بھی مختلف ملکوں میں پھیلتی رہی:

> Contributing to the spread of orange cultivation were... the development of the Arab trade routes, and the expansion of Islam. (VII/561)

وہ بھی کیسا عجیب دور تھا جب مذہبی اصلاح اور علمی تحقیق سے لے کر زراعت اور باغبانی تک تمام عالمی ترقیاں اسلام کے زیر سایہ انجام پا رہی تھیں۔

ناگپور ریاست مہاراشٹر کا ایک شہر ہے جو ناگ ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس کو گونڈ راجہ نے اٹھارویں صدی میں آباد کیا۔ وہ بھونسلے حکمرانوں کی راجدھانی تھا۔ ۱۸۱۷ میں وہ برطانیہ کے زیر اثر آیا۔ ۱۸۶۷ میں یہاں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ناگپور میں ایک برطانی قلعہ ہے جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور کی یاد دلاتا ہے۔ ایک قابل ذکر چیز یہاں کا میوزیم ہے جس میں قدیم تاریخی چیزیں رکھی گئی ہیں۔

ناگپور مہاراشٹر کے اس علاقہ میں واقع ہے جس کو ودربھا کہا جاتا ہے۔ ودربھا کو علاحدہ ریاست بنانے کی تحریک عرصہ سے چل رہی ہے۔ حال میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں اس کو نادانی کا ایک جوش سمجھتا ہوں۔ کیونکہ بالفرض اگر ودربھا بقیہ مہاراشٹر

سے الگ ہو تو وہ بمبئی سے بھی الگ ہو جائے گا۔ بمبئی کی شمولیت کی وجہ سے اس کو جو اقتصادی حیثیت حاصل ہے، وہ اس سے علاحدگی کے بعد باقی نہ رہے گی۔

ناگپور میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ یہاں ان کے کئی مدرسے اور تعلیمی ادارے ہیں مگر یہاں مسلمانوں کا کوئی ڈگری کالج نہیں۔ میرے خیال سے یہ ایک بہت بڑی کمی ہے۔ تاہم مسلم کالج سے میری مراد یہ نہیں کہ ایسا کالج جہاں مسلمانوں کو داخلہ کی سہولت ہو۔ میرے نزدیک مسلم کالج اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو یہاں تعلیم کے میدان میں بھی اپنی نفع رسانی کا ثبوت دینا چاہیے۔

ناگپور کو یہ فخر حاصل ہے کہ دسمبر ۱۹۲۰ میں یہاں کانگریس کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں کانگریس نے پہلی بار سوراج کو اپنا گول قرار دیا۔ اس سے پہلے اس کے لیڈر برطانی اقتدار کے تحت ڈومینین اسٹیٹس کے الفاظ بولتے تھے۔

ایک صاحب سے اس مسئلہ پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پچھلے سو سال کے اندر اس ملک میں جو لیڈر اٹھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن کو سوراج یا آزادی کے نام پر لیڈریاں ملیں۔ مثلاً گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ دوسرے وہ تھے جنھوں نے یہ کہا کہ سوراج یا آزادی کا مسئلہ ثانوی ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم وقت کے مطابق اہل ملک کو تعلیم یافتہ بنائیں۔ مثلاً مدن موہن مالویہ، تیج بہادر سپرو، سر سید وغیرہ۔

اگر آپ تاریخ میں پیچھے کی طرف دیکھیں تو دوسری عالمی جنگ کے بعد عین اسی زمانہ میں ٹھیک یہی واقعہ جاپان میں پیش آیا جو امریکی غلامی کے مسئلہ سے دوچار تھا۔ وہاں بھی دو قسم کے لیڈر اٹھے۔ مگر دونوں ملکوں میں ایک فرق تھا۔ ہندستان میں آزادی پسند لیڈروں کو بڑائی ملی اور تعلیم پسند لیڈروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے برعکس جاپان میں تعلیم پسند رہنماؤں کو اہمیت دی گئی اور آزادی پسند لیڈروں کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

آج دونوں پالیسیوں کا انجام دنیا کے سامنے ہے۔ برصغیر ہند میں چند لیڈروں کو ذاتی شہرت و عظمت ملی۔ مگر قوم عالمی بساط پر بے عظمت ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف جاپان میں کوئی لیڈر "قائد اعظم" کا لقب نہ پا سکا۔ مگر قوم عالمی نقشہ میں ممتاز ترین درجہ کو پہنچ گئی۔

ہندستان نے آزادی کو مسئلہ نمبر ایک قرار دیا۔ اس کے مقابلہ میں جاپان نے تعلیم کو مسئلہ نمبر ایک بنایا۔ ہندستان پیچھے رہ گیا۔ اور جاپان تمام قوموں سے آگے بڑھ گیا۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے "تاریخ ناگپور" کے نام سے ۱۲۰ صفحہ کی ایک کتاب شائع کی ہے جس کی ایک کاپی انھوں نے مجھے عطا کی۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ۱۶۶۹ء میں راجہ کوکب سنگھ اس علاقہ کا حکمراں تھا۔ کوکب سنگھ کی وفات کے بعد گونڈ شہزادوں میں تخت کی جنگ ہوئی۔ اس خانہ جنگی کے زمانہ میں شہزادہ بخت بلند دیوگڑھ سے بھاگ کر اورنگ زیب کے یہاں پہنچ گیا جو اس وقت دکن کے علاقہ میں تھا۔

بخت بلند تقریباً آٹھ سال (۹۱-۱۶۸۲) تک اورنگ زیب کے ساتھ رہا۔ اس درمیان میں اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی مدد سے بخت بلند نے راج گدی کے دوسرے دعویداروں کو زیر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اورنگ زیب نے ۱۶۹۱ میں اس کو راجہ کا خطاب دے کر دیوگڑھ واپس روانہ کیا۔

معاہدہ کے مطابق، راجہ بخت بلند نے اورنگ زیب کو سالانہ خراج ادا کرنا شروع کیا مگر جلد ہی بعد مرہٹوں کے ساتھ اورنگ زیب کی جنگی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر بخت بلند نے بغاوت کر دی اور اورنگ زیب کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ اورنگ زیب کو جب اس ناخوش گوار واقعہ کی خبر ملی تو اس نے بگڑ کر ۱۶۹۹ء میں یہ فرمان جاری کیا کہ اب سرکاری کاغذات میں بخت بلند کو نگوں بخت لکھا جائے (صفحہ ۴۵)

اورنگ زیب نے بخت بلند کی سرکوبی کے لیے ایک فوج بھیجی۔ ابتداءً اس نے کامیابی بھی حاصل کی۔ لیکن اورنگ زیب کی فوج جو فیروز جنگ کی سرداری میں بھیجی گئی تھی، اس کے واپس آتے ہی بخت بلند نے دوبارہ دیوگڑھ پر قبضہ کر لیا۔ مصنف لکھتے ہیں "بخت بلند نے اورنگ زیب کو بے حد پریشان کیا۔ جب اورنگ زیب کے آخری دور حکومت میں مرہٹوں سے مسلسل جنگ کے نتیجہ میں مغلوں کی طاقت کمزور ہو گئی تو بخت بلند کو آزادی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی حکومت کی ترقی اور توسیع کے لیے کئی کارنامے انجام دیے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ناگپور کی تشکیل جدید ہے (صفحہ ۴۸)

اس واقعہ میں اورنگ زیب کے لیے اصل سبق یہ نہیں تھا کہ بلند بخت کو نگوں بخت (بدنصیب) کا لقب دے دیا جائے۔ اصل سبق یہ تھا کہ ـــــــــــ دہلی کی سلطنت کو دکن تک وسیع کرنا اس کے لیے ایک ایسا غیر پختہ اقدام ہے جس میں دکن بھی نہ ملے اور آخر کار دہلی بھی ہاتھ سے چلا جائے۔

ناگپور ہندستان کے ان شہروں میں ہے جہاں ابتدائی دور میں صنعتیں قائم ہوئیں۔ ہندستان میں قدیم زمانہ میں صنعت کے نام سے صرف ایک چیز کی صنعت پائی جاتی تھی، اور وہ کھڈی پر کپڑا بننے کی صنعت تھی، اسٹیم پاور کی دریافت کے بعد غالباً پہلا قابل ذکر صنعتی کارخانہ ۱۸۱۸ میں کلکتہ میں قائم ہوا۔ بمبئی میں پہلی کاٹن مل ۱۸۵۴ میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ میں ناگپور میں جے این ٹاٹا نے کپڑے کی پہلی مل قائم کی جس کا نام ایمپرس مل تھا۔ ناگپور چونکہ کپاس پیدا کرنے کا علاقہ تھا۔ اس لیے کپڑے کی صنعت کے لیے وہ ایک موزوں مقام سمجھا گیا۔

تعلیم کے میدان میں بھی ناگپور آگے رہا ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے ۱۹۱۰ میں ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن قائم کیا۔ تاہم ۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۸ میں جنگ ختم ہوئی تو اس کے بعد ملک میں متعدد یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ ان میں سے ایک ناگپور یونی ورسٹی بھی ہے جو ۱۹۲۳ میں قائم ہوئی۔

ناگپور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جغرافی حیثیت سے وہ ملک کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ ناگپور ہندستان کا قلب ہے۔ اس اعتبار سے وہ کسی آل انڈیا تحریک کے لیے ایک آئیڈیل مقام ہے۔

میں نے کہا کہ معاف کیجئے، آپ ابھی تک حجری دور میں سوچ رہے ہیں۔ اب ہم کمیونی کیشن کے دور میں ہیں۔ آج جغرافی جائے وقوع نہیں بلکہ اتصال کے ذرائع یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کونسا مقام کس عمومی تحریک کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ جو لوگ اس قسم کی بات کہتے ہیں وہ اپنے طرز فکر کے اعتبار سے ماضی میں جی رہے ہیں۔ وہ ابھی تک حال کے باشندے نہیں بنے۔

ناگپور سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ ۱۹۲۰ میں ناگپور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ میں بریلی میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ جمعیۃ کے بڑے بڑے علماء، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ اس

اجلاس میں موجود تھے۔ اجلاس کی کارروائی کا ایک جزء وہ ہے جس کو بریلی کے ماہنامہ سنی دنیا (نومبر ۱۹۹۲) نے "ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست" نامی کتاب سے لے کر نقل کیا ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر ابوالکلام آزاد کی دعوت پر بریلوی جماعت کے کچھ ذمہ دار بھی اجلاس میں شریک ہوئے اور علماء کے خلاف اپنے اعتراضات پیش کیے۔ مسٹر ابوالکلام آزاد نے کہا کہ میرے خلاف یہ الزامات غلط ہیں۔ اس کے بعد مفتی برہان الحق رضوی نے گرجدار آواز میں کہا :

آں جناب نے ابھی ابھی اپنی جوابی تقریر میں زور دے کر فرمایا کہ مجھ پر تمام الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ میری گزارش یہ ہے کہ اخبار زمین دار لاہور کے فلاں نمبر، فلاں تاریخ میں نہایت جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ "ناگپور میں خلافت کانفرنس کے پنڈال میں امام الہند ابوالکلام آزاد صاحب نے جمعہ پڑھایا اور خطبۂ جمعہ میں مہاتما گاندھی کی صداقت وحقانیت کی شہادت دی" ایک مشرک کی صداقت وحقانیت کی شہادت خطبۂ جمعہ میں! —— یہ کیسا اسلام ہے؟" یہ سنتے ہی مولانا آزاد کا چہرہ فق ہوگیا۔ ایک دومنٹ تک مفتی برہان الحق کو دیکھتے رہے، پھر بولے "لعنة الله على قائله"

مولانا نعیم الدین رضوی نے مفتی برہان الحق کا ہاتھ پکڑ کر ارشاد فرمایا : برہان میاں، آپ کے ابتدائی دو سوالوں نے تو ابوالکلام کو بالکل مبہوت کر دیا (صفحہ ۵۳-۵۴)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو شخص بھی کوئی اصلاحی کام کرنے کے لیے اٹھا، اس کا استقبال ہمیشہ برے انداز میں کیا گیا۔ اس میں کسی بھی مسلم شخصیت کا کوئی استثناء نہیں۔ یہ معاملہ اس وقت اور بھی زیادہ افسوس ناک بن جاتا ہے جب کہ ایک آدمی کو اس کی زندگی میں تو مطعون کیا جائے، اور جب وہ مر جائے تو اس کے بعد مبالغہ آمیز انداز میں اس کی قصیدہ خوانی شروع کر دی جائے۔

مشہور سیواگرام بھی ناگپور سے قریب واقع ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جس کا قدیم نام سیگاؤں تھا۔ ۱۹۳۶ میں مہاتما گاندھی نے اس کو اپنی قیام گاہ بنایا اور اس کا نام سیواگرام رکھا۔ یہاں سیواگرام آشرم اب بھی ان کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ یہ آشرم گویا ایک تربیت گاہ تھی جہاں مہاتما گاندھی اپنی پسند کا انسان بنانا چاہتے تھے۔

مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح عمری کا آخری باب ہے : ناگپور میں (At Nagpur) ۔ اس باب کے آخری الفاظ جو کتاب کے بھی آخری الفاظ ہیں ، وہ یہ ہیں ——— میں قاری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ سچائی کے خدا سے یہ دعا کرنے میں شریک ہو کہ وہ مجھے اہنسا کی نعمت عطا کرے ، میرے ذہن میں اور میرے لفظ میں اور میرے عمل میں :

I ask him to join with me in prayer to the God of Truth that He may grant me the boon of Ahimsa in mind, word and deed. (p. 420)

یہ سطریں بتاتی ہیں کہ مہاتما گاندھی اہنسا (عدم تشدد) کو کتنا محبوب رکھتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ شخصی اعتبار سے تو مہاتما گاندھی قوم کے باپو بن گئے۔ مگر ان کا آدرش کسی بھی درجہ میں ملک کے اندر رائج نہ ہو سکا۔ سیواگرام یا خود مہاتما گاندھی کے شیدائیوں میں بھی سیوا کی اسپرٹ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہی معاملہ تقریباً تمام مشہور رہنماؤں کا موجودہ زمانہ میں ہوا ہے۔

انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ سیشن دسمبر ۱۹۲۸ میں کلکتہ میں ہوا تھا۔ گاندھی جی ٹرین سے سفر کرتے ہوئے ناگپور سے گزرے۔ ریلوے اسٹیشن پر لوگ گاندھی جی سے ملے۔ لوئی فشر کی رپورٹ کے مطابق ، انھوں نے سوال کیا کہ آزادی کی تحریک اگر تشدد کا انداز اختیار کر لے تو آپ کیا کریں گے۔ گاندھی جی نے مطمئن لہجہ میں جواب دیا کہ میں اس میں حصہ نہیں لوں گا۔ میں لوگوں کو یہ سکھا رہا ہوں کہ وہ ایک قومی بحران کا مقابلہ غیر متشددانہ طریقوں سے کس طرح کریں :

I am teaching the people how to meet a national crisis by non-violent means. (p.257)

آج ۶۵ سال بعد ملک دوبارہ وہیں کھڑا ہوا ہے۔ دوبارہ ہم بڑے پیمانہ پر قومی بحران سے دوچار ہیں۔ دوبارہ ہمیں اپنے مسائل میں غیر متشددانہ طریقہ کا تجربہ کرنا ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ نادانی کے تحت متشددانہ طریقہ آزمانا چاہتے ہیں۔ مگر تاریخ اس کی تردید کے لیے کافی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پلاسی ، بالاکوٹ ، شاملی اور بہت سے مقامات پر لوگوں نے تشدد کے ذریعہ انگریز کو ملک سے نکالنا چاہا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد گاندھی میدان میں آئے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کو تشدد کے بجائے عدم تشدد کے اصول پر چلایا اور آخر کار کامیابی

حاصل کی۔ حتیٰ کہ "مسلح جہاد" کی باتیں کرنے والے لوگ بھی مہاتما گاندھی کے پیرو بن گئے۔

ناگپور کے زمانہ قیام میں کثرت سے لوگ ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ امریکہ کے صدارتی الکشن کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس سے دو خاص سبق لیے ہیں۔ ایک یہ کہ ۴ نومبر ۱۹۹۲ کو جیسے ہی ٹی وی پر آگیا کہ بل کلنٹن جیت گئے۔ تو اگرچہ اس سے پہلے جارج بش نے ان کے خلاف بہت سخت سخت ریمارک دیے تھے، انھوں نے فوراً کہا کہ امریکی عوام نے فیصلہ دے دیا ہے، اور ہم اپنی ہار کو تسلیم کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جارج بش ہمیشہ ہائی پروفائل میں بولتے تھے۔ وہ اپنی انتخابی تقریروں میں امریکی گلوری کی بات کرتے تھے۔ ان کا نعرہ تھا کہ امریکہ اول (America first) اس کے مقابلہ میں بل کلنٹن لو پروفائل میں بولتے تھے۔ انھوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا ٹائٹل تھا :

the economy, the economy and the economy.

مگر امریکی عوام نے ہائی پروفائل میں بولنے والے کو رد کر دیا اور لو پروفائل میں بولنے والے کو قبول کر لیا۔

ان دونوں باتوں کا تقابل ہندستان جیسے ملکوں سے کیجیے۔ ہمارے یہاں ہائی پروفائل میں بولنے والے کو مقبولیت ملتی ہے اور لو پروفائل میں بولنے والے کو رد کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں جو پارٹی الکشن میں ہار جاتی ہے وہ کبھی اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتی۔ الکشن کے بعد اس کی ساری کوشش اس میں لگ جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح جیتنے والی پارٹی کو ناکام بنا دے۔ پاکستان کے اسلامی لیڈروں نے بھی ٹھیک اسی سطحی کردار کا ثبوت دیا ہے اور ہندستان کے سیکولر لیڈروں نے بھی۔

یہ علم اور جہل کا فرق ہے۔ مغربی ملکوں میں لوگ تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے وہ لوگ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہیں اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ ہندستان جیسے ملکوں میں بیشتر لوگ جاہل یا نیم جاہل ہیں۔ وہ باتوں کو صرف سطحی طور پر دیکھ پاتے ہیں۔ وہ محض جذبات کے تحت فیصلے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا میں ابھی تک اعلیٰ معیار کی سیاست پیدا نہ ہو سکی۔

تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میں تبلیغی جماعت کی قدر کرتا ہوں۔ حتی کہ میں خود بھی جماعت میں کئی بار گیا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ تبلیغی جماعت عوام کی اصلاح کے لیے مفید ہے۔ مگر وہ خواص کی اصلاح میں کارگر نہیں ہو سکتی۔ تبلیغی جماعت فضائل کی بنیاد پر چلائی جارہی ہے۔ اور فضائل کا طریقہ صرف عوام کو متاثر کر سکتا ہے، خواص کو متاثر کرنے کی طاقت اس کے اندر نہیں۔

الرسالہ مشن اس کے مقابلہ میں خواص کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کی بنیاد پر چلایا جارہا ہے اور خواص کا طبقہ بڑی تعداد میں اس سے متاثر ہے۔ عوام کے طبقہ میں بلاشبہہ تبلیغی جماعت زیادہ پھیلی ہوئی ہے، مگر خواص کے طبقہ میں، الرسالہ مشن کا نفوذ تبلیغی جماعت سمیت، تمام تحریکوں اور جماعتوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الرسالہ مشن کا اسلوب آج کے انٹلکچول کلاس کو متاثر کرتا ہے۔

تبلیغی جماعت میں اگر خواص کو داخل کیا جائے تو موجودہ حالت میں وہ تعمیم خواص کے ہم معنی ہوگا۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ عوام کو تبلیغی جماعت کے ساتھ جوڑا جائے اور خواص کو الرسالہ مشن سے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو بزدلی سکھا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ بزدلی تو نہیں، البتہ ہم مسلمانوں کو صبر و اعراض سکھاتے ہیں۔ اور اب مسلمان اس کو سیکھ چکے۔ آپ جیسے فرضی مجاہدین کو اب مسلمان بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔

پچھلے دو سال کے اندر وہ واقعات کثرت سے ہوئے جن واقعات پر سوال اس سے پہلے بھڑک جاتے تھے۔ مگر اس مدت میں انھوں نے اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ فسادات بھی حیرت انگیز طور پر بہت کم ہوئے۔

اس سلسلہ میں اخبارات و رسائل میں متعدد سروے آچکے ہیں۔ تازہ ترین سروے انڈیا ٹوڈے (۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲) کا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ مسلم نوجوان اب ایک نئے دور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جذباتی رہ نماؤں کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ مثبت انداز میں اپنے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔ انڈیا ٹوڈے نے اس کو مسلم نوجوانوں کے

رجحان میں ایک کیفی تغیر (sea change in attitudes) سے تعبیر کیا ہے (صفحہ ۴۴)

میں نے کہا کہ آپ لوگ چونکہ قرآنی تعلیمات کے بجائے عوامی رجحان کو دیکھتے رہے ہیں۔ اس لیے اب عوامی رجحان میں اس تبدیلی کے بعد آپ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بھی اس کے مطابق تبدیل کرلیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ فلاں بزرگ بھی آپ ہی کی طرح تقریر و تحریر کے ذریعہ دعوت و اصلاح کا کام کر رہے ہیں۔ مگر وہ تنقید نہیں کرتے۔ اگر وہ تنقید کے بغیر اپنا کام کر سکتے ہیں تو آپ تنقید کے بغیر کیوں نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا کہ یہ سادہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ تنقید نہ کرنے کے لیے تضاد میں جینا پڑتا ہے۔ مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تضاد میں نہیں جی سکتا۔ آپ نے جن صاحب کا نام لیا، ان کا مسلک یہ ہے کہ وہ حاضرین کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے بولتے ہیں۔ اس لیے تنقید ان کی ضرورت نہیں۔ مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ تنقید میری ضرورت ہے۔ کیوں کہ تضاد میں جینا میرے لیے ممکن نہیں۔

مثلاً اگر آپ ایک طرف دعوت کی بات کریں۔ دوسری طرف مسلمان غیر مسلموں کے جلوس پر روک ٹوک کر کے باہمی منافرت کی صورت پیدا کریں تو وہاں آپ مسلمانوں کی حمایت کرنے لگیں۔ یہ میرے نزدیک تضاد میں جینا ہے۔ کیونکہ دعوتی عمل کو زندہ کرنے کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کیا جائے تاکہ وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں دعوت کا عمل جاری ہو سکے۔

جس آدمی کا مسلک یہ ہو کہ ہر حلقہ اس سے خوش رہے۔ اس کی یہ ضرورت نہیں کہ وہ مسلمانوں کے مشتعل ہو جانے پر انھیں نصیحت کرے۔ مگر جس آدمی کے سامنے صرف دعوت کا مسئلہ ہو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یک طرفہ صبر کی تلقین کرے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کی تحریک سے متفق ہوں۔ آپ اپنی تحریک علّم بالقلم کے اصول پر چلا رہے ہیں۔ مگر آپ خود کہتے ہیں کہ اب میرا وقت قریب آگیا، جب کہ ابھی بہت زیادہ کام باقی ہے۔ پھر آپ کے بعد کون سا "قلم" ہوگا جو اس تحریک کو مزید جاری رکھے۔

میں نے کہا کہ کسی بھی تحریک کو چلانے والا یا جاری رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ تاہم جہاں

تک انسانی تدبیر کا تعلق ہے تو میں عرض کروں گا کہ الرسالہ کے آغاز (۱۹۷۶) سے میرا اصول ہے کہ ہر مہینہ میں میں تقریباً دو پرچہ کے مضامین تیار کرتا ہوں۔ ایک پرچہ کا مضمون الرسالہ میں شائع ہوتا ہے، اور ایک پرچہ کا مضمون ہر ماہ بچ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی میں الرسالہ جتنے سال نکلے گا، میرے بعد بھی کم از کم اتنے ہی سال تک الرسالہ مزید اسی طرح نکلتا رہے گا۔ اس طرح میری موت کے بعد بھی انشاء اللہ تعلیم بالقلم کا سلسلہ منقطع نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں آپ کو اس قسم کا اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

محمد حنیف صاحب اور محمد اسماعیل صاحب دونوں تاجر ہیں اور دونوں برسوں سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان میں تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ دونوں کو چونکہ دیرپا دوستی کا تجربہ ہے، آپ یہ بتائیں کہ دوستی کو دیر تک باقی رکھنے کا راز کیا ہے۔ محمد حنیف صاحب نے کہا کہ ——— کوئی مادی غرض نہ رکھنا۔

یہ بات مجھے پسند آئی۔ دوستی کے ساتھ غرض شامل کی جائے تو دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ دوستی کو غرض سے پاک رکھا جائے تو دوستی باقی رہتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے ہندستان ٹائمس (۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲) میں یہ خبر پڑھی کہ آپ دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے جلسہ میں شریک ہوئے اور اس میں تقریر کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی سے بھی آپ کا تعلق ہے، حالانکہ بھارتیہ جنتا پارٹی تو مسلمانوں کی دشمن سمجھی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ مشہور انقلابی نیتا سبھاش چندر بوس ۱۹۴۰ میں ناگپور آئے تھے اور یہاں انھوں نے آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر کیشو راؤ بلی رام ہیڈگوار سے ملاقات کی تھی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سبھاش چندر بوس آر ایس ایس کے ممبر تھے۔ اصل یہ ہے کہ سبھاش چندر بوس کا ایک سیاسی مشن تھا۔ اس مشن کے لیے انھوں نے ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اسی طرح انھوں نے ڈاکٹر ہیڈگوار سے بھی ملاقات کی۔ وہ ڈاکٹر ہیڈگوار تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ملے تھے نہ کہ ڈاکٹر ہیڈگوار سے ان کا پیغام لینے کے لیے۔

میرا بھی ایک مشن ہے۔ اور وہ توحید ہے۔ اس کے لیے میں ہر گروہ کے پاس جاتا

ہوں ۔تاکہ حسب حالات انھیں اپنا پیغام دوں اور اسی کے ساتھ یہ کوشش کروں کہ باہمی نفرت اور بدگمانی ختم ہو اور دعوت کے حق میں موافق فضا پیدا ہو سکے ۔ یہ کام میں مسلسل طور پر ہندستان کے اندر بھی کر رہا ہوں اور ہندستان کے باہر بھی ۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں ، خود اپنا پیغام دوسروں کو دینے کے لیے جاتا ہوں نہ کہ دوسروں سے ان کا پیغام لینے کے لیے ۔

الرسالہ مشن کے سلسلہ میں کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ہمیشہ صبر کی تلقین کی جاتی ہے جو بے غیرتی کی بات ہے ۔ میں نے کہا کہ اس اعتراض پر غور کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صبر و اعراض کی جس پالیسی کو ہم غیر مسلموں کے سلسلہ میں اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں ، اسی صبر و اعراض کو تبلیغی جماعت مسلمانوں کے سلسلہ میں عملاً بہت بڑے پیمانہ پر اختیار کیے ہوئے ہے ۔ اس کے باوجود تبلیغی جماعت کے بارہ میں کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ وہ مسلمانوں کو بزدلی سکھاتی ہے ، جبکہ ہمارے اوپر تمام معترضین یہی الزام عائد کر رہے ہیں ۔

اس فرق کے پیچھے ایک گہرا سبب چھپا ہوا ہے ۔ وہ یہ کہ تبلیغی جماعت قوم خویش کے مقابلہ میں صبر و اعراض کی تلقین کرتی ہے ، جب کہ ہم قوم غیر کے مقابلہ میں صبر و اعراض کی تلقین کر رہے ہیں ۔ اپنی قوم کے مقابلہ میں صبر و اعراض لوگوں کو درست معلوم ہوتا ہے مگر جب معاملہ دوسری قوم کا ہو تو اس کو وہ عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو تبلیغی جماعت سے شکایت نہیں مگر ہم سے انھیں زبردست شکایت ہے ۔

ایک صاحب نے الرسالہ کے تنقیدی اسلوب پر اعتراض کیا ۔ میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض صحیح نہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے مشرکین کے سامنے تنقیدی انداز میں دعوت پیش کی (سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۶۹ ـ ۲۷۵) صحابہ کرام کے درمیان عام طور پر تنقید کا رواج تھا ۔ بعد کے دور میں بھی علماء میں اس کا مسلسل رواج رہا ۔ مثلاً امام محمد اور امام ابو یوسف نے اپنے استاد امام ابو حنیفہ پر ۱۸۲ مسائل میں تنقید کی ۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے لوگ تنقید کو برا سمجھتے ہیں ۔

اس کی وجہ لوگوں کا بگڑا ہوا مزاج ہے ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اکابر پرست قوم بن گئے ہیں ۔ اسی بنا پر وہ شخصیتوں کے خلاف تنقید کو برداشت نہیں کر پاتے ۔ یہ بگڑے ہوئے

مزاج کا معاملہ ہے نہ کہ کسی واقعی اصول کا معاملہ۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر لکھتے رہتے ہیں کہ موجودہ دور میں مسلم رہنما کوئی حقیقی دینی کام نہ کر سکے۔ یہ تو مسلمانوں کی پوری جدید تاریخ پر پانی پھیر دینا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صرف میری بات نہیں۔ آپ کے محبوب شاعر علامہ اقبال کہہ چکے ہیں کہ :

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

حال میں اعظم گڑھ کی ایک عربی درسگاہ میں "آل انڈیا تعلیمی سیمینار" کیا گیا۔ اس کی مفصل رپورٹ دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۵ نومبر ۱۹۹۲) میں چھپی ہے۔ یہ رپورٹ ایک شریک سیمینار کے قلم سے ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایک مشہور اسلامی جماعت کے ذمہ دار عالم نے اپنے مقالہ میں کہا :

"گذشتہ دو سو سال میں مسلمانوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر فخر کیا جا سکے۔ اصل کام امت میں بیداری پیدا کرنے کا ہے"

ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے رہنماؤں نے فکری تبدیلی لانے سے پہلے عملی اقدام شروع کر دیا۔ اس لیے بے پناہ قربانیوں کے باوجود کوئی حقیقی کامیابی نہ ہو سکی۔ اب ہمیں یہ غلطی نہیں کرنا ہے۔ اب ہم کو اپنی ساری قوت فکری انقلاب برپا کرنے پر لگا دینا ہے۔ جب تک یہ ابتدائی کام نہ ہو جائے، عملی اقدام کی بات کرنا ایک لغو حرکت ہے نہ کہ فی الواقع کوئی کام۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج کشمیر سے لے کر بوسنیا تک ہر جگہ دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو ذبح کر رہے ہیں اور آپ ان مظالم پر کچھ نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ یہ نہ کہیے۔ بلکہ یوں کہیے کہ میں آپ جیسے لوگوں کی عقل سے نہیں لکھتا بلکہ اس عقل سے لکھتا ہوں جو اللہ نے ہم کو قرآن میں سکھائی ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ دوسری کون سی عقل ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سلیمان نے جب ملکہ سبا کے نام اطاعت کا خط بھیجا تو اس نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ درباریوں نے جنگ کا مشورہ دیا۔ اس وقت ملکہ سبا کی زبان سے قرآن میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں :

قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وكذلك يفعلون (النمل ٣٤)

اس نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی یہ لوگ کریں گے۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہر جگہ وہ "ملوک" کو اپنی بستی میں داخل ہونے کا موقع دیتے ہیں اور جب وہ داخل ہو کر وہ کچھ کرتے ہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے تو اس کے بعد شور کرتے ہیں کہ دیکھو یہ ہمارے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآنی عقل یہ بتاتی ہے کہ ملوک کے لشکر کو اس کا موقع ہی نہ دو کہ وہ تمہاری بستیوں میں داخل ہو کر ظلم و فساد کرنے لگے۔ لوگوں کی توجہ ظلم پر ہے۔ جب کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ ظلم کے سبب پر ساری توجہ دی جائے۔

۹ نومبر کی ملاقات میں ایک صاحب نے کہا کہ آپ امریکہ کی مثالیں دیتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ امریکہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ جارج بش نے واشنگٹن کی ایک میٹنگ میں کہا ہے کہ اب کسی ملک میں ہماری مرضی کے بغیر کوئی شخص صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔

میں نے کہا کیا چند دن پہلے ۵ نومبر کے اخبارات کی یہ خبر آپ نے نہیں پڑھی کہ جارج بش اپنی ساری کوشش کے باوجود دوسری ٹرم کے لیے امریکہ کے صدر نہیں بن سکے۔ جارج بش نے واحد سپر پاور کی حیثیت سے اپنی ساری طاقت لگا دی کہ صدام حسین کو عراق کا صدر نہ رہنے دیں۔ مگر صدام حسین بدستور عراق کی صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جارج بش کو خود صدر کا منصب چھوڑ دینا پڑا۔ جو انسان اتنا کمزور ہو اس کی دھمکیوں یا سازشوں سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت۔

کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کی سیاست کے فیصلے کرے۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے نہ کہ اس میں الجھ کر اپنے وقت کو ضائع کیا جائے۔

ایک مجلس میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی مشن کو موثر انداز میں کام کرنے کے لیے ہمیشہ ظاہری مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستان میں دو تحریکیں خاص طور پر کامیاب رہی ہیں۔ ایک دیوبند تحریک، اور دوسرے تبلیغی جماعت۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں کے پاس ایک ظاہری مرکز موجود تھا جس سے لوگ بہ آسانی وابستہ ہو سکتے تھے۔

دیوبند تحریک مبنی مدرسہ (madras-based) تحریک تھی۔ اس کے کارکنوں کے سامنے ایک متعین کام تھا کہ وہ ہر جگہ مدرسہ بنائیں۔ مدرسہ بننے کے بعد مقامی طور پر ہی اس کو ہر قسم کے ضروری افراد مل جاتے تھے اور تحریک کو ایک محسوس مرکز حاصل ہو جاتا تھا۔

تبلیغی تحریک ایک مبنی بر مسجد (masjid-based) تحریک کے طور پر اٹھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی اس کو ہر جگہ کام کا مرکز حاصل ہو گیا۔ کیوں کہ ہر جگہ مسجد پہلے سے موجود تھی۔ تبلیغی جماعت کو پھیلاؤ ملنے کا خاص سبب یہی ہے کہ اس نے مسجد کو بنیاد بنا کر کام کیا۔ اور اس بنا پر لوگوں کو جوڑنا اس کے لیے نہایت آسان ہو گیا۔

الرسالہ مشن میں علم کا پہلو غالب ہے۔ اس لیے ہمیں تعلیم گاہ کو مرکز بنا کر اس کام کو آگے بڑھانا ہے۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ ہر جگہ وہ یا تو قائم شدہ تعلیم گاہ سے جڑ کر کام کریں یا خود اپنے وسائل کے تحت کوئی تعلیم گاہ بنائیں۔ اس طرح ہر جگہ یہ کام ایک محسوس صورت اختیار کرے گا اور اس کے ساتھ لوگوں کا جڑنا آسان ہو جائے گا۔

الرسالہ سے وابستہ افراد جگہ جگہ یہ کام کر رہے ہیں۔ کوئی مدرسہ کی صورت میں یہ کام کر رہا ہے اور کوئی اسکول کی صورت میں۔ ضرورت ہے کہ یہ سب کام مزید اضافہ کے ساتھ منظم ہو جائیں۔ اور پورے ملک کی سطح پر ایک تعلیمی ایمپائر کی صورت اختیار کر لیں۔

جس کنونشن میں شرکت کے لیے میں ناگپور گیا، اس کے داعی سید قمر زماں صاحب ہیں۔ وہ روزنامہ اُردو سماچار کے مالک اور ایڈیٹر ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک ٹریڈ یونین لیڈر ہیں۔ ان کا خاص دائرہ کار اس علاقہ کی کول مائنز کے کارکن ہیں جن کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار ہے۔

ٹریڈ یونین ازم دراصل لیبر موومنٹ کا ایک جزء ہے۔ یہ صنعتی دور کے مظاہر میں سے ایک ہے۔ وہ اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ میں شروع ہوئی اور پھر ساری دنیا میں پھیل گئی۔

ٹریڈ یونین تحریکوں کا مقصد صنعتی مزدوروں کی حالت اور ان کی معاشیات کو بہتر بنانا ہے۔

ٹریڈ یونین مومنٹ عام طور پر ایک پروٹسٹ مومنٹ سمجھی جاتی ہے۔ تاہم قمر زماں صاحب نے اس کو مثبت تعمیری رخ دینے کی کوشش کی ہے۔

ناگپور کے قیام کے زمانہ میں میں نے دیکھا کہ ان کے حلقہ کے لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اس تحریک کو احتجاجی تحریک سے اٹھا کر ایک تعمیری تحریک بنا دیا۔

ناگپور کا یہ کنونشن روزنامہ اردو سماچار کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس اخبار کے مینجنگ ایڈیٹر مسٹر ایس کیو زماں ہیں۔ یہ "وسط ہند کنونشن برائے قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرزم" ناگپور کے وسنت راؤ دیش پانڈے ہال میں ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ کو منعقد کیا گیا۔ مقررین اور مقالہ نگار حضرات کو حسب ذیل تین عنوان دیے گئے تھے:

سیکولرزم اور قومی یک جہتی کے استحکام میں حکومت کا کردار

قومی اتحاد اور یک جہتی کے استحکام میں مذہب کا کردار

قومی یک جہتی اور سیکولرزم کے تحفظ میں اردو کا کردار

میں نے دوسرے موضوع پر تقریر کی صورت میں اپنے خیالات پیش کیے۔ اس تقریر کو مرتب کرکے ان شاء اللہ آئندہ شائع کر دیا جائے گا۔

ایک صاحب ملاقات کے لیے میرے ہوٹل کے کمرہ میں آئے۔ وہ "خوش پوشاک" تھے اور نہایت مرصع انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ تاہم وہ الرسالہ کے قاری نہ تھے، اس لیے میری بات کو سمجھنے کے لیے ان کا ذہن تیار نہ تھا۔

انھوں نے مقامی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو امید تھی کہ آپ جو کنونشن کے تحت یہاں آئے ہیں، آپ حکومت کے ذمہ داروں کو اصلاح حال کی طرف متوجہ کریں گے، مگر آپ نے اپنی تقریر میں خود مسلمانوں ہی کو صبر کی نصیحت کی۔ میں نے کہا کہ کسی گروہ کی حالت خود اپنی غفلت سے بگڑتی ہے اور دوبارہ اپنی ہی دانش مندانہ کوششوں سے وہ درست ہو سکتی ہے۔ مگر میری بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔

وہ کچھ دیر تک تیز و تند انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ گئے: "یہاں کے لوگوں نے آپ کو اس طرح پروجکٹ کیا تھا جیسے کہ آپ کوئی اعلیٰ فکر رکھنے والی شخصیت ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ اسی طرح کے ایک نرے مولوی ہیں جیسے کہ تمام مولوی ہوتے ہیں۔"

ان کا انداز نہایت تحقیر آمیز اور اشتعال انگیز تھا، مگر مجھے ان پر غصہ نہیں آیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ میری ذات کو کوئی برا کہے تو مجھے کبھی غصہ نہیں آتا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ان کے حق میں دعا کی۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی نفرت پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ان کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے تیار ذہن (prepared mind) نہیں ہیں۔ اگر انھوں نے اس سے پہلے الرسالہ پڑھا ہوتا تو یقیناً ان کا ردعمل بالکل مختلف ہوتا۔

یہاں ایک بہت بڑا صحافتی ادارہ ہے جو تین زبانوں (انگریزی، ہندی، مراٹھی) میں اخبار نکالتا ہے۔ اس کے ہندی روزنامہ لوک مت سماچار کے ایڈیٹر شری ایس ایم ونود سے ۹ نومبر کو ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا کہ "لوگ حقیقت میں نہیں جاتے ہیں۔" میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کے لوگوں کی یہ بنیادی خرابی ہے جس نے تمام معاملات کو بگاڑ رکھا ہے۔ اگر لوگ باتوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے لینے لگیں تو بیشتر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

انھوں نے بتایا کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو جب پابندی کے باوجود کچھ رام سیوک اجودھیا میں داخل ہو گئے تو صبح کو یہاں کے ایک ہندی اخبار نے پہلے صفحہ پر یہ سرخی لگائی: "آسینا کی گولیوں کی بوچھار کے بیچ اسنکھیہ رام سیوک مندر (بابری مسجد) میں گھس گئے۔" یہ اخبار لوگوں میں پھیلا تو شہر میں زبردست تناؤ پیدا ہو گیا۔

مگر اسی دن ٹیلی پرنٹر پر پی ٹی آئی کی خبر آئی جس میں صحیح بات بتائی گئی تھی۔ مسٹر ونود نے فوراً کارروائی کی اور اسی دن اپنے اخبار کا اسپشل بلیٹن نکالا اور اس کو سارے شہر میں پھیلا دیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مذکورہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ اس بلیٹن کے پھیلتے ہی فضا بدل گئی۔ اس کے بعد پولیس کمشنر نے مسٹر ونود کو خط لکھا۔ اس میں انھوں نے اس بات پر مسٹر ونود کا شکریہ ادا کیا کہ ان کے بلیٹن نے شہر کو فساد سے بچا لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افواہیں جو اکثر سنگین فساد برپا کرنے کا باعث بن جاتی ہیں، ان کا دفعیہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جیسے ہی اس قسم کی کوئی افواہ پھیلے، فوراً میڈیا کو استعمال کرکے صحیح خبر لوگوں تک پہنچا دی جائے۔

جناب جلیل ساز صاحب (۶۲ سال) نے بتایا کہ ناگپور میں ۵۰ مندر ہیں۔ ان میں سے صرف تین مندر کا کیس مقامی عدالت میں ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہاں ۸۸ مسجدیں ہیں اور ان میں سے ۵۴ مسجدوں کا کیس عدالت میں زیر سماعت ہے۔ یہ کیس مسلمانوں نے مسجد کے متولی یا مینجنگ کمیٹی کے اوپر بدعنوانی کے الزام میں قائم کیے ہیں۔ یہی حال تقریباً ہر مقام پر پایا جاتا ہے۔ اس دور کا یہ عجیب ظاہرہ ہے کہ توحید پرست متفرق ہو رہے ہیں اور تعدد پرست متحد ہوتے نظر آتے ہیں۔

سید ظریف الدین صاحب انجینیر ہیں اور کول مائنز میں سروس کرتے ہیں۔ انھوں نے کوئلہ کی کانوں کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں۔ پہلے کانوں سے کوئلہ نکالنے کے لیے انڈر گراؤنڈ مائن (U.G.) کا طریقہ رائج تھا۔ مگر اب دھیرے دھیرے اوپن کاسٹ مائن (O.C.) کا طریقہ رائج کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اگر کسی کارکن کے ساتھ برسر ڈیوٹی حادثہ (injury on duty) کا واقعہ ہو جائے۔ تو اس کے علاج کا تمام خرچ گورنمنٹ دیتی ہے اور اس دوران کی تنخواہ بھی مکمل طور پر اس کو ادا کی جاتی ہے۔

اس کو سن کر میں نے سوچا کہ اگر انسانوں کے یہاں یہ اصول ہے کہ ڈیوٹی دیتے ہوئے کوئی نقصان پیش آجائے تو حکومت اس کی مکمل تلافی کی ذمہ داری لے لیتی ہے۔ تو یہی قاعدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر خداوند ذوالجلال کے یہاں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ فی الواقع خدا کے کام کے لیے اٹھ جائے تو یقینی ہے کہ اس خدائی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے اگر اس کو نقصان یا حادثہ پیش آئے گا تو خدا کی طرف سے ضرور اس کی تلافی کی جائے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلمانوں میں اتنے زیادہ دینی کام ہو رہے ہیں، مگر مسلمانوں میں کوئی واقعی بیداری اب تک پیدا نہ ہو سکی۔ میں نے کہا کہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی جس طرح اس کے ابتدائی حصہ کی اصلاح ہوئی تھی۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ امت کے حصہ اول (صحابہ کرام) کو اسلام بطور معرفت (ڈسکوری) ملا تھا۔ اب دوبارہ ہمیں یہی کرنا ہے کہ موجودہ مسلم نسلوں کو معرفت کے درجہ میں اسلام عطا کریں۔ ان کے لیے اسلام کو

ری ڈسکوری بنادیں۔ اس کے بعد ہی موجودہ مسلمانوں میں کوئی بڑا دینی انقلاب آسکتا ہے۔

ناگپور میں آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ۹ نومبر کی شام کو اسے دیکھا۔ ایک بہت بڑا چوکور میدان ہے۔ اس کے ایک کونے پر انگریزی حرف ایل (L) کی صورت میں وسیع اور بلند عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ پوری عمارت گیروے رنگ میں نظر آتی ہے۔ دہلی میں ایک صاحب سے جب میں نے ناگپور کے سفر کا ذکر کیا تو فوراً انھوں نے کہا: آپ ناگپور جارہے ہیں، وہ تو آر ایس ایس کا گڑھ ہے۔ مگر جب میں ناگپور کی سڑکوں اور بازاروں میں چلا تو معلوم ہوا کہ ناگپور صرف ایک چیز کا گڑھ ہے، اور وہ "مادی مفاد" ہے۔

یہی حال ہر شہر اور بستی کا ہے۔ لوگ محدود معلومات کی بنا پر شہروں اور بستیوں کے مختلف نام رکھ لیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی کا واحد مذہب مفاد پرستی ہے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں تو ان کے بہت سے اندیشے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

آر ایس ایس ۱۹۲۵ میں ناگپور میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی کیشو بلی رام ہیڈگواڑ تھے۔ ان کو مہاسبھا کے بانی ڈی وی ساورکر کی حمایت حاصل تھی۔ آر ایس ایس کے تحت ہر روز ملک بھر میں ۳۰ ہزار شاکھائیں قائم ہوتی ہیں۔ ۱۰ ہزار مقامات پر ہفتہ میں دو بار اس کی میٹنگیں کی جاتی ہیں۔ اس کے ایگزیکٹیو ممبروں کی تعداد ۱۰ لاکھ اور ۱۵ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

ناگپور میں ہر سال بابا تاج الدین (م ۱۹۲۵) کے عرس کے موقع پر صندل کا جلوس نکلتا ہے۔ یہ بہت بڑا جلوس ہوتا ہے۔ اور باجے اور شور کے ساتھ نہایت دھوم کے ساتھ چلتا ہوا عین اسی سڑک سے گزرتا ہے جس پر آر ایس ایس کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ مگر آر ایس ایس کے لوگ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتے۔ اور نہ یہاں اس بنیاد پر کبھی فساد ہوا۔ یہ بات جناب جلیل ساز صاحب (ممبر مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکیڈمی) نے بتائی۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ آر ایس ایس کی تنظیم ہے۔ کیوں کہ اس کا قیام ہی مسلم دشمنی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہو تو یہ عین خدا کی نعمت ہے۔ اس پر گھبرانے کے بجائے ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالے جس سے محبت فرماتے ہیں اس پر مصیبت

بھیج دیتے ہیں۔ یہ بات فرد کے لیے بھی ہے اور بحیثیت مجموعی قوم کے لیے بھی۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مسائل ہی کو ترقی کا زینہ بنایا ہے۔ آدمی جب مسائل ومشکلات میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی روح میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذہن کی سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ معمولی انسان سے اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ وہ زیادہ بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں دشمن ہی کسی انسان کا سب سے بڑا دوست ہے۔ دوست غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور دشمن آدمی کو چوکنا کر دیتا ہے۔

ناگپور کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ تجارت کا کام کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے تعلقات کثرت سے آر ایس ایس کے لوگوں سے ہیں۔ وہ ان کے گھروں تک کے حالات سے واقف ہیں۔ انھوں نے آر ایس ایس والوں کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔

ایک بات یہ تھی کہ آر ایس ایس والے سادگی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کے یہاں سادگی کی باقاعدہ روایات قائم ہو گئی ہیں۔ مثلاً ان کا کوئی شخص امیر ہو یا غریب، ہر ایک کے یہاں روزانہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کی عورت ایک ایک شخص سے پوچھتی ہے کہ آپ کتنی روٹی کھائیں گے۔ ہر آدمی بے تکلف بتا دے گا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص مہمان ہو تب بھی اس سے پوچھا جائے گا اور وہ خوشی کے ساتھ اپنی مقدار بتا دے گا۔ اس طرح ان کے یہاں بالکل بقدر ضرورت کھانا پکایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں کبھی کھانا ضائع نہیں کیا جاتا۔

زندگی میں روایت کی بے حد اہمیت ہے۔ نومبر ۱۹۹۲ میں امریکہ کے صدارتی الکشن میں کلنٹن جیت گئے اور جارج بش ہار گئے تو جارج بش نے فوراً اعلان کیا کہ ہم اپنی ہار کو تسلیم کرتے ہیں:

We accept defeat.

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ ان کے یہاں اس قسم کی روایات قائم نہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے رہنما اس معاملہ کی اہمیت سے اتنے ناواقف ہیں کہ وہ روایات کے توڑنے کو قیادتی کارنامہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۵ میں پاکستان میں صدارتی الکشن ہوا۔ ایک طرف محمد ایوب خان تھے اور دوسری طرف مس فاطمہ جناح۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے محمد ایوب خان کی مخالفت کی اور فاطمہ جناح

کی حمایت میں اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ مگر نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ فاطمہ جناح الکشن ہار گئیں اور محمد ایوب خاں بھاری ووٹوں سے جیت گئے۔ لیکن سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ نہ کہہ سکے کہ "ہم ہار گئے اور ایوب خاں جیت گئے"۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اصل جیت تو ہماری ہونے والی تھی۔ لیکن ایوب خاں نے الکشن میں دھاندلی کرکے اپنے آپ کو کامیاب بنا لیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام رہنما اسی طرح روایتیں توڑتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلم معاشرہ کا حال یہ ہو گیا کہ اس کے اندر اب کسی بھی معاملہ میں کوئی روایت نہیں۔ اور جو معاشرہ روایات سے خالی ہو جائے وہ کٹے ہوئے پتنگ کی مانند ہو جاتا ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔

۹ نومبر کو شہر دیکھنے کے لیے نکلا۔ واپس آیا تو گھڑی میں شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ہوٹل کے مغربی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ پانچویں منزل سے افق کا منظر نہایت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سورج اپنا دن بھر کا سفر پورا کرکے زمین کے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ سرخ رنگ کے گولے کی صورت میں دھیرے دھیرے ڈوبتا ہوا نظر آیا۔ میں مسلسل اس منظر کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ زمین کے پیچھے غائب ہو گیا۔

ایسا محسوس ہوا جیسے کہ افق کا یہ واقعہ خاموش زبان میں کہہ رہا ہو کہ اے انسان، تیرا آفتاب بھی اسی طرح ایک دن غروب ہونے والا ہے۔ تمہاری زمینی زندگی بھی اسی طرح ایک روز ختم ہو جائے گی۔ تمہارا سورج بھی اسی طرح ایک دن ماند ہو کر رہ جائے گا۔

۹ نومبر کی شب کو انجمن حامیٔ اسلام (ناگپور) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس کا انتظام جناب رزاق سیٹھ اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ رزاق سیٹھ صاحب نہ صرف الرسالہ کے قاری ہیں۔ بلکہ راقم الحروف کی ادارت کے زمانہ کے الجمعیۃ ویکلی کا بھی مکمل فائل ان کے پاس موجود ہے۔ اس اجتماع میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے۔ اس کا موضوع ہندستانی مسلمان (Muslims in India) مقرر کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ بطور عقیدہ ہم مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے نمونہ ہیں۔ مگر جب "ہندستانی مسلمان" کے مسائل پر بات ہوتی ہے تو ہر آدمی خود اپنی عقل سے بولنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں کرتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور آپ کی سیرت

میں اس کا جواب تلاش کرے۔ حالانکہ ایسی روش ہمارے ایمان کے مطابق نہیں۔

پھر میں نے ایک گھنٹہ کی تقریر میں رسولؐ اور اصحاب رسول کے واقعات سے بتایا کہ کس طرح دور اول میں ہمارے لیے کامل رہنمائی موجود ہے۔

جسٹس ایم ایم قاضی (Tel: 533006) نے آئی پی سنگھ کی کتاب (Reverted Revolution of India) کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ مصنف نے اس کتاب میں اقلیتوں کے مسائل کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ اقلیت دوسرے درجہ کے قائد کا تحمل نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اول درجہ کا قائد ہونا ضروری ہے:

> Minority cannot afford to have a 2nd rate leader. It must necessarily have a 1st rate leader.

میں اس میں اضافہ کروں گا کہ یہ اقلیت اور اکثریت دونوں کا مسئلہ ہے۔ دونوں ہی کے لیے یہ تباہی کی صورت ہے کہ دوسرے درجہ کا آدمی ان کا قائد بن جائے۔ دوسرے درجہ کے قائد سے بہتر یہ ہے کہ سرے سے کوئی قائد ہی موجود نہ ہو۔ کسی گروہ کا قائد نہ ہو تو اس کی فطرت اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر دوسرے درجہ کا قائد اپنی نادانی سے قوم کو غلط رخ پر دوڑا دیتا ہے۔ اور پھر وہ اس کو بربادی کی خندق کے سوا اور کہیں نہیں لے جاتا۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۲ کو مذکورہ کنونشن تھا جو قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرزم کے عنوان پر کیا گیا تھا۔ اس کی کارروائی ناگپور کے سب سے بڑے ہال (وسنت راؤ دیش پانڈے ہال) میں ہوئی۔ اس کنونشن کے روح رواں مسٹر ایس کیو زماں تھے۔

وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ یہاں زیادہ تر مراٹھی زبان کے پروگرام ہوتے رہے ہیں۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ اس ہال میں ایک اردو پروگرام اتنے بڑے پیمانہ پر کیا گیا۔ پوری کارروائی کا ویڈیو ٹیپ لیا گیا۔ آکاش وانی، دور درشن اور اخبارات کے نمائندے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ راقم الحروف کے علاوہ کئی ممتاز افراد نے تقریر یا مقالہ کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مثلاً مسٹر کلدیپ نائر، مسٹر موہن چراغی، جسٹس بھاو وہانے، مسٹر شمیم طارق، جسٹس ایم ایم قاضی، مسٹر تیج سنگھ راؤ بھونسلے ایم پی، وغیرہ۔ اگلی صبح کو یہاں کے تمام اخباروں نے اس کنونشن کی رپورٹ نمایاں طور پر شائع کی۔

میں نے اپنی تقریر میں ایک بات یہ کہی تھی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو رہ نمائی دے کر امامت کا درجہ حاصل کریں۔ مگر اس امامت کی قیمت صبر تھی۔ برادرانِ وطن کی طرف سے اگر ناخوش گواریوں کا تجربہ ہو تب بھی انھیں صبر کرنا تھا۔ چونکہ انھوں نے صبر کا ثبوت نہیں دیا، اس لیے انھیں امامت کا مقام بھی حاصل نہ ہوسکا۔ مقامی اُردو اخبار" اُردو سماچار" نے اپنے شمارہ ۱۱ نومبر میں کنونشن کی رپورٹ دیتے ہوئے اسی کی سرخی بنائی۔ اس نے لکھا : قیادت اسے ملتی ہے جو صبر کرتا ہے۔

ناگپور کنونشن کے بعد ایک صاحب میرے ہوٹل کے کمرہ میں آئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ان کو حکومت کے سامنے طاقت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے کہا کہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کے مسائل پیش کرنے کا کام تو پچھلے پچاس سال سے ہو رہا ہے۔ مگر اس کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس لیے اب ہمیں اپنی تعمیر آپ کے اصول پر عمل کرنا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر دوسروں سے مطالبہ کرتے رہنا۔

میں نے کہا کہ دس سال پہلے ایک مسلمان لیڈر دہلی آئے۔ انھوں نے سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ اس میمورنڈم کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں معاشی دوڑ میں پچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس وقت تک خصوصی رعایت دی جائے جب تک وہ ہندوؤں کے برابر نہ ہو جائیں۔

مذکورہ مسلمان لیڈر کے ذاتی حالات سے میں واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ خود ان کا بہت اچھا بزنس ہے جس سے انھیں کافی آمدنی ہوتی ہے۔ جب کہ ان کے ایک سگے بھائی نہایت خستہ حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے مذکورہ لیڈر سے کہا کہ آپ اپنے اصول کا آغاز خود اپنے گھر سے کیجئے۔ آپ کے فلاں بھائی معاشی دوڑ میں آپ سے پچھڑ گئے ہیں۔ آپ اپنی ماہانہ آمدنی کا آدھا حصہ ان کو دینا شروع کیجئے اور اس وقت تک دیتے رہیئے جب تک وہ آپ کے برابر نہ ہو جائیں۔ میری اس تجویز کو سن کر وہ ہنسنے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ جو کام آپ اپنے سگے بھائی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس کا مطالبہ آپ اندرا گاندھی سے کرنے جا رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں پابندی سے الرسالہ پڑھتا ہوں۔ یہاں آپ کی تقریر بھی سنی۔ مجھے اس کی باتیں بہت پسند آتی ہیں۔ مگر ابھی تک آپ نے کوئی عملی پروگرام پیش نہیں کیا۔ ہم لوگ جو الرسالہ

کے مقصد سے اتفاق رکھتے ہیں آخر ہم لوگ عملی طور پر کیا کریں۔

میں نے کہا کہ عملی پروگرام ہمیشہ عملی حالات کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے۔ اس وقت جو حالات ہیں وہ یہ ہیں کہ مسلمان ایک بے شعور قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ صحیح انداز فکر ان کے اندر تقریباً مفقود ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں فطری طور پر ہمارا عملی پروگرام یہی ہوگا کہ قوم کے افراد کو باشعور بنایا جائے۔ الرسالہ کے ذریعہ اس وقت یہی کام انجام دیا جارہا ہے۔ الرسالہ قوم کے افراد کو باشعور بنانے کی مہم ہے۔ اس مہم میں آپ حضرات کا تعاون یہ ہونا چاہیے کہ آپ ہر ممکن طریقہ سے الرسالہ کو پھیلانے کی کوشش کریں۔

فکری بیداری پیدا کرنے کی اس مہم میں شرکت کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً ہر ماہ الرسالہ کے کچھ شمارے خرید کر اس کو تقسیم کرنا، لائبریریوں میں الرسالہ جاری کرانا۔ کتب فروش حضرات کو تیار کرنا کہ وہ اپنی دکانوں پر الرسالہ منگا کر رکھیں۔ ایجنسی لے کر الرسالہ کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس طرح کے مختلف طریقے ہیں اور ہر آدمی اپنے حالات کے اعتبار سے کوئی طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔ اور وہی اس کے لیے عملی پروگرام ہوگا۔ یہی ہمارے عمل کا نقطۂ آغاز ہے۔

مسٹر کلدیپ نائر نے اپنی کنونشن کی تقریر میں کہا کہ تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد جب میں سیالکوٹ سے نکل کر دہلی آیا تو یہاں میری ملاقات مولانا حسرت موہانی سے ہوئی۔ ان سے میں کافی قریب ہوگیا۔ اس وقت میں اُردو شاعری کیا کرتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے "من نکردم شما حذر بکنید" کے اصول پر مجھ سے کہا کہ تم اردو شاعری چھوڑ دو اور انگریزی جرنلزم میں محنت کرو۔ مولانا موہانی کی اس نصیحت کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔

ناگپور میں ایک بات میں نے یہ دیکھی کہ یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمان بات بات پر اردو کا شعر پڑھتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور ان کی سوچ پر شاعرانہ اسلوب غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاراشٹر میں کثرت سے اردو اسکول ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت انھیں اردو اسکولوں سے پڑھ کر آتی ہے۔ اردو چونکہ بنیادی طور پر شاعری اور ادب کی زبان رہی ہے، اس لیے ان حضرات کے ذہن پر بھی اسلوب چھا گیا ہے۔

ہندستان کے تمام رہنما اردو کی بقا پر زور دیتے رہے ہیں۔ یہ بات یقیناً بہت اہم ہے۔

مگر اردو زبان کو جب تک ترقی نہ دی جائے، اردو کے ساتھ وابستگی مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ مفید نہیں ہوسکتی۔ ضرورت ہے کہ اردو کو ادب کے بجائے تحقیق کی زبان بنایا جائے۔ اس میں شاعرانہ اسلوب کے بجائے سائنٹفک اسلوب کو رواج دیا جائے۔ اس کے بعد ہی اردو زبان سے تعلق ہمارے لیے زندگی اور ترقی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اردو خواں مسلمانوں میں حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

کئی نوجوانوں نے اپنی نوٹ بک دی اور کہا کہ اس پر نصیحت کا کوئی کلمہ لکھ دیجئے۔ ایک نوجوان کی نوٹ بک پر میں نے لکھا: زندگی نام ہے ناموافق حالت کو موافق حالت میں تبدیل کرنے کا۔

ایک اور نوجوان کی نوٹ بک پر میں نے یہ جملہ لکھا —— آپ اپنی زندگی کا مشن یہ بنائیے کہ دوسرے لوگ جہاں تک پہنچ چکے ہیں، آپ اس سے آگے جائیں گے۔ آپ داستانِ حیات کا اگلا پیراگراف تحریر کریں گے۔

میری کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ نوجوانوں میں زندگی کا حوصلہ پیدا کردوں۔ ان کو مایوسیوں کی تاریکی سے نکال کر امید کی روشنی میں لے آؤں۔ اس لیے میں ہمیشہ اپنی گفتگو یا ملاقات میں اسی قسم کے پہلوؤں کو ابھارتا ہوں۔ کسی شخص کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت حوصلہ کی ہے۔ البتہ حوصلہ مندی کو حقیقت پسندی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے۔ حوصلہ مندی اگر حقیقت پسندی سے جڑی ہوئی ہو تو وہ ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ حوصلہ مندی اگر حقیقت پسندی سے جدا ہو جائے تو وہ تباہی کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔

۱۱ اکتوبر کو آکاش وانی ناگپور نے میری ایک تقریر ریکارڈ کی جو ریڈیو پر نشر کی جائے گی۔ اس تقریر کا موضوع یہ تھا کہ ملک کو ترقی کی طرف کس طرح آگے بڑھایا جائے۔ یہ تقریر ان شاء اللہ بعد کو شائع کردی جائے گی۔ اس تقریر میں خاص طور پر ایڈجسٹمنٹ کے اصول پر زور دیا گیا تھا۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب یہاں کی ممتاز دینی شخصیت ہیں۔ دوسری خدمات کے علاوہ وہ پچھلے چالیس سال سے ایک مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ چلا رہے ہیں جس سے ہزاروں لوگوں کو فائدہ ہوا ہے۔ ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات ۱۰ نومبر کی شام کو اور دوسری ملاقات

۱۱ نومبر کی صبح کو۔ موصوف نے اپنے بہت سے قیمتی تجربے بتائے۔ انھیں میں سے ایک یہ تھا کہ ہندستان میں غیر مسلموں میں تعارف اسلام کا کام کرنے کے بہت مواقع ہیں۔ موصوف خود بھی اس میدان میں قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں۔

مولانا پاریکھ نے اپنی کچھ کتابیں دیں۔ ان میں سے ایک کتاب تھی : گائے کا قاتل کون۔ اس میں موصوف نے اپنا ایک واقعہ لکھا تھا کہ ”میں الٰہ آباد سے بذریعہ ٹرین آرہا تھا۔ بیچ راستہ میں ٹرین کے فیل ہوجانے پر ہمیں ایک جنکشن پر مجبوری سے اتر جانا پڑا۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا۔ پُل پار کرتے ہوئے سیڑھیوں سے جیسے ہی اترا۔ دیکھا کہ ریلوے پل کی سیڑھیوں کے پاس ایک مری ہوئی گائے پڑی ہے۔ جگہ جگہ سے اس کی ہڈی پسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور اس کے جسم سے خون نکل کر جم گیا ہے۔ سو پچاس لوگوں نے اسٹیشن کے آس پاس چیخ پکار، نعرے بازی اور مسلمانوں کے خلاف گالی گلوچ شروع کردی۔ بلوائیوں کی بھیڑ لوٹنے اور جلانے پر اندھادھند ٹوٹ پڑی۔ اتنے میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے چند ریلوے قلی آگے آئے۔ انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا کہ بھائیوں یہ جھوٹی افواہ ہے۔ اصل میں یہ بیل ہے۔ وہ آج صبح ریلوے شنٹنگ سے ٹکرا کر ہلاک ہوگیا۔ بس اللہ نے خیریت کی اور فساد رک گیا“ (صفحہ ۷۴-۷۵)

اکثر فساد افواہ سے شروع ہوتے ہیں۔ اور اگر بروقت افواہ کی موثر تردید کر دی جائے تو فساد کی آگ بھی یقیناً ٹھنڈی ہوجائے گی۔ افواہ اگر فساد ہے تو تردیدِ افواہ فساد کا خاتمہ۔

۱۱ نومبر کو واپسی تھی۔ ساتھیوں کے ہمراہ ہوٹل سے نکل کر ایرپورٹ پہنچا۔ انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۹۹۴ کے ذریعہ ناگپور سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ حسب معمول جہاز کچھ دیر ایرپورٹ پر کھڑا رہا۔ اسٹاف اور مسافروں کی ہماہمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ جہاز کے سب دروازے بند کر دیے گئے۔ اب جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔

پائلٹ نے ایک سوئچ دبائی اور جہاز زمین پر رینگنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوسری سوئچ دبائی تو اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کے بعد ایک اور سوئچ دبائی اور جہاز زمین سے اوپر اٹھ کر فضا میں اڑنے لگا۔

یہ دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آئی جو قرآن میں سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں ہے۔ قرآن میں ہے کہ ہم نے ہواؤں کو ان کے حکم کے تابع کر دیا۔ وہ ان کی کشتیوں کو لے کر ان کے امر کے تحت

سمندر میں چلتی تھی جہاں وہ ان کو لے جانا چاہتے تھے (ص ۳۶) یہ کوئی پُر اسرار معاملہ نہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ تاریخ بشری میں پہلی بار اللہ تعالے نے سلیمان علیہ السلام کو یہ فن سکھایا کہ وہ لوہے کو پگھلا کر اس کو اپنے کام میں لائیں اور بادبانی نظام کو ترقی دے کر ہوا کو اس طرح کنٹرول کر سکیں کہ ان کے سمندری جہاز کسی رکاوٹ کے بغیر لمبے لمبے سفر طے کرنے لگیں۔

یہ انسان کے اوپر اللہ تعالے کا ایک خصوصی انعام ہے جس کا نمایاں آغاز سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ ہوا۔ پہلے گھوڑا امر انسانی کے تحت زمین پر چلتا تھا۔ اس کے بعد سمندری جہاز امر انسانی کے تحت پانی پر چلنے لگے۔ اب میکانیکل دور میں کار امر انسانی کے تحت سڑک پر دوڑتی ہے اور ہوائی جہاز امر انسانی کے تحت فضا میں اڑتے ہیں۔

میں جب سڑک پر دیکھتا ہوں کہ ایک شخص موٹر سائیکل پر سوار ہے۔ اور موٹر سائیکل اس کے "امر" کے تحت اس کو اِدھر سے اُدھر لے جا رہی ہے تو قرآن کی آیت تجری بامرہ یاد آجاتی ہے۔ اس وقت میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ لمحہ کتنا سخت ہوگا جب وَلَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ کے تحت ان نعمتوں کے بارہ میں انسان سے سوال کیا جائے گا۔

راستہ میں ناگپور کا انگریزی اخبار لوک مت ٹائمس (۱۱ نومبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس میں کل شام کے کنونشن کی تفصیلی رپورٹ موجود تھی۔ راقم الحروف کی تقریر کی رپورٹنگ ان الفاظ میں کی گئی تھی :

The President of the Islamic Centre and Editor, Al-Risala, New Delhi, Maulana Wahiduddin Khan, said that there was need for introspection, as to why the India of our dreams could not be realised. Blaming both the Hindu as well as Muslim communities, Mr. Khan said that there was almost an obsessive attempt to create a unicultural India. He flayed the Muslim community for not having played a creative role in the post-independence period. He said that the feeling of insecurity, that had crept into the minority community, had prevented them from playing a creative role. He said that they should stop being only a 'taker group' and become, on the contrary, the 'giver group.'

۱۱ نومبر کی شام کو دہلی واپس پہنچا۔ دنیا کا ہر سفر قابل واپسی ہوتا ہے۔ مگر ایک سفر ایسا ہے جو قابل واپسی نہیں۔ یہ موت کا سفر ہے۔ مگر جب میں لوگوں کے چہروں کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید ناقابل واپسی سفر کی اتنی فکر بھی نہیں کہ جتنی فکر انھیں قابل واپسی سفر کی ہوتی ہے۔

ناگپور سے واپسی کے بعد وہاں سے کچھ خط اور ٹیلی فون موصول ہوئے۔ ان میں سے ایک جناب جلیل ساز صاحب کا خط مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۲ ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں دوسری کئی باتوں کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ "ناگپور میں آپ کی تقریروں کا کافی چرچا اور اثر ہے"۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کی آواز جہاں بھی پہنچ رہی ہے، وہ لوگوں کے لیے فکر انگیزی کا سبب بن رہی ہے۔ لوگ از سر نو سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ میں اس وقت جو آواز سب سے زیادہ موضوع بحث بنی ہوئی ہے وہ الرسالہ کی آواز ہے۔

الرسالہ مشن نے پہلا مرحلہ طے کر لیا ہے، یہ مرحلہ کہ لوگوں کے درمیان اس کا چرچا ہونے لگے۔ غالباً وہ وقت زیادہ دور نہیں جب کہ یہ مشن اپنے اگلے مرحلہ میں پہنچ جائے۔ یعنی لوگوں کے ذہنوں پر اسی فکر کا غلبہ ہو جائے اور دوسرے تمام افکار پس منظر میں چلے جائیں۔

(وما ذلک علی اللہ بعزیز)

شانتی یاترا

دسمبر۱۹۹۲ کے نصف آخر میں ایک سفر پیش آیا۔ یہ "شانتی یاترا" کا سفر تھا۔ دہلی۔ بمبئی۔ پونہ۔ ناگپور۔ بمبئی۔ دہلی کے درمیان بہت سی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں مجموعی طور پر تقریباً چھ ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کرنا پڑا۔ یہ میری زندگی میں اپنی نوعیت کا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

یہ سفر ایک ٹیم کی صورت میں تھا۔ میرے علاوہ اس میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں — اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، شانتی لال موتھا، انا صاحب ہزارے، جسٹس چندر شیکھر دھرما کاری۔

اچاریہ منی سوشیل کمار ہندستان کی ایک غیر نزاعی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی امن کے پرچار میں لگا رکھی ہے۔ اجودھیا کے حادثہ نے انھیں بے چین کر دیا۔ نئی دہلی میں ان کے آشرم میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر مذہب کے رہنماؤں کی میٹنگیں ہوئیں۔ آخر کار طے ہوا کہ امن کے فروغ کے لئے اس سلسلہ میں کچھ عملی قدم اٹھائے جائیں۔

اس سلسلہ کا آغاز ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ کو ٹی وی پروگرام سے ہوا۔ پہلے ڈیفنس کالونی (نئی دہلی) کے آشرم میں مختلف مذہبوں کے لوگ جمع ہوئے۔ ٹی وی کی ٹیم یہیں آگئی تھی۔ اس نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا "موجودہ حالات میں آپ دیش کے لوگوں کو کیا سندیش دینا چاہیں گے"۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے کہا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ امن قائم ہو اور نفرت کا خاتمہ کیا جائے۔ میں نے بھی یہی بات اپنے انداز سے کہی۔

میں نے مزید کہا کہ جب کچھ لوگ مل کر رہیں، تو خواہ وہ ایک گھر میں ہوں یا ایک ملک میں، بہر حال ایسے مواقع آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لئے عملی طور پر امن اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ اختلافی بات پیش آنے کے باوجود امن و محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

آج ہی ٹی وی پر دوسرا پروگرام پینل کی صورت میں تھا۔ اس میں اچاریہ سوشیل کمار ،

بشپ گرگیریوز (Dr Paulos Mar Gregorios) اور راقم الحروف نے حصہ لیا۔ ہر ایک نے ریلیجن اینڈ پیس (مذہب اور امن) کے موضوع پر اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میں نے کہا کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی شخصیت کو پاک کرنے کا ایک روحانی سسٹم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی زوال کی بنا پر لوگ باہر کی چیزوں پر زیادہ زور دینے لگے ہیں، اس لئے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں میں سچی مذہبی اسپرٹ ہو تو وہ اندر کی صفات پر زیادہ زور دیں گے اور پھر جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

ٹی وی کے ان پروگراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ دوردرشن نے یہ بہت اچھا کیا کہ آپ لوگوں کو وقت کے حالات پر بولنے کا موقع دیا۔ اس سے پہلے دوردرشن والے ان موضوعات پر لیڈروں یا سیکولر لوگوں کو سامنے لاتے تھے۔ مگر مذہب اور انسانیت کے بارہ میں سیاسی لیڈروں یا سیکولر دانشوروں سے کہلوانے کا کوئی خاص عملی فائدہ نہیں۔ ان باتوں کو تو مذہبی لوگوں کی طرف سے سامنے آنا چاہئے۔ اس پروگرام کا لوگوں کے اوپر یقیناً اچھا اثر ہوگا۔

ٹیلی وژن کا اصول ابتدائی طور پر اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں دریافت ہو چکا تھا۔ مگر جدید ٹی وی سیٹوں کی تیاری اور ٹی وی کا باقاعدہ نظام دوسری عالمی جنگ کے بعد قائم ہو سکا۔ ٹی وی کو ایک طاقت ور میڈیا سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر چیز آخر کار ایک تجارتی انڈسٹری بن جاتی ہے۔ اور اس بنا پر ان کا استعمال زیادہ تر غیر مفید کاموں میں ہو رہا ہے۔

مثلاً دسمبر ۱۹۹۲ میں برصغیر کے فرقہ وارانہ فسادات کا سب سے بڑا سبب ٹی وی، خاص طور پر بی بی سی ہے۔ بی بی سی کے کارکن جدید ترین آلات سے لیس ہو کر ۶ دسمبر کو اجودھیا میں موجود تھے۔ انھوں نے مسجد پر ہندو انتہا پسندوں کی یلغار کا اور اس کو ڈھائے جانے کا مسلسل فوٹو لیا۔ اس تصویری رپورٹ کو پاکستان میں بڑے پیمانے پر ٹی وی پر دیکھا گیا۔ اس درمیان میں حکومت پاکستان نے مزید نادانی یہ کی کہ ۷ دسمبر کو یوم سیاہ منانے کا اعلان کر دیا۔ یوم سیاہ کے مظاہروں نے پاکستانی عوام کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ انھوں نے پاکستان میں ہندو مندروں پر بلڈوزر چلائے، کئی ہندوؤں کو مار کر درخت سے لٹکا دیا۔ وغیرہ۔ اس قسم کے مختلف سنسنی خیز مناظر دوبارہ بی بی سی نے ٹی وی پر دکھائے۔ ان مناظر کو دیکھ کر انڈیا کے ہندو بھڑک اٹھے۔ اس طرح ۸ دسمبر کو ہندستان کے مختلف

علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگیا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل کر ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ فضا میں ہر طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات کو میں نے ایک اردو پرچہ میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــ "ہر طرف اندھیرا" اس میں دکھایا گیا تھا کہ آج ہر جگہ کے مسلمان ظلم وزیاتی کا شکار ہورہے ہیں۔ ملت کے افق پر ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

میں نے سوچا کہ اس زمین پر خدا مسلسل یہ کر رہا ہے کہ وہ ہر ۲۴ گھنٹہ کے اندر شام کو صبح میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ہر روز رات کی تاریکی کو ختم کر کے دن کا اجالا پھیلا رہا ہے۔ اس طرح خدا دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کے حاملین "اندھیرا ہی اندھیرا" کی فریاد کیوں کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فکری اعتبار سے وہ اس حالت کو پہنچ گئے ہوں جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ان قومی اتخذوا هٰذا القرآن مهجورا (الفرقان ۳۰)

ہمارے امن مشن کو دہلی سے پونہ پہنچنا تھا۔ مگر رات کو معلوم ہوا کہ پونہ کی فلائٹ کینسل ہوگئی ہے۔ فوری طور پر رات ہی کو جہاز تبدیل کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ دہلی سے بمبئی جائیں اور وہاں سے پونہ پہنچیں۔ چنانچہ ایئر پورٹ پر خلاف معمول سناٹا تھا۔ بڑی تعداد میں انڈین ایئر لائنز کے جہاز گراؤنڈ پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔

انڈین ایئر لائنز کے پائلٹوں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ ایئر پورٹ پر میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اسٹرائک کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ان پائلٹ لوگوں کو فی گھنٹہ بارہ سو روپیہ ملتا ہے۔ وہ سات ہزار روپیہ روز کماتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانا رہنا سب فری ہے۔ تب بھی وہ خوش نہیں۔ انھیں مہینہ میں اس سے بھی زیادہ چاہیے۔

انڈین ایئر لائنز کے پائلٹوں نے جب اسٹرائک کر دی تو سول اوی ایشن منسٹر نے فوراً متبادل انتظام کی تلاش شروع کر دی۔ پرمسرت تعجب کے ساتھ انھیں معلوم ہوا کہ روس کے ۵۰۰ ہوائی جہاز ازبکستان میں خالی پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے روسی حکومت سے ربط قائم کیا اور آسان شرطوں پر چھ ہوائی جہاز فوری طور پر منگوا لئے۔ اس طرح ٹرنک روٹ (دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس) کی

پروازیں بحال کریں۔

انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ اول پر اس خبر کی سرخی کا عنوان تھا کہ اب روسی جہاز اسٹرائک زدہ انڈین ایئرلائنز کی مدد پر :

Now, Russian aircraft to the rescue of strike hit IA

میں نے سوچا کہ اگر مجھ کو اس خبر کی سرخی بنانا ہوتو میں لکھوں گا کہ ـــــــ ہر کھوئی ہوئی چیز کا بدل اس دنیا میں موجود ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو صبح ۸ بجے دہلی سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک روسی ساخت کا جہاز ہے۔ اس کا تمام ٹکنیکل عملہ روسی ہے۔ صرف میزبان عملہ میں کچھ ہندستانی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاز کی پرواز خوشگوار تھی۔

جہاز میں انڈین اکسپریس (۱۵ دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ اس میں بھوپال کی ڈیٹ لائن کے ساتھ مسٹر این ڈی شرما کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ۱۹۔ ۲۱ دسمبر کو ہونے والا تھا۔ توقع کے مطابق اس اجتماع میں دو لاکھ آدمی شریک ہوتے۔ مگر فسادات کی وجہ سے بھوپال میں ابھی تک کرفیو چل رہا ہے، اس لئے ریاستی انتظامیہ کو تشویش ہوئی۔ مدھیہ پردیش کی حکمراں پارٹی (بی جے پی) نے بدل کے طور پر یہ تجویز کیا کہ اجتماع کو مختصر طور پر غیر نمایاں انداز میں کیا جائے۔ اور تبلیغی جماعت کے لوگ راضی ہو گئے :

As an alternative, the ruling party leaders have requested the organisers to keep it a low-key affair and they have agreed (p. 12).

یہ نہایت صحیح فیصلہ ہے۔ اس طرح کے نازک مواقع پر اگر اس طرح ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بیشتر سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اسی مومنانہ مزاج کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مومن کی مثال میدان میں اگی ہوئی گھاس کی مانند ہے۔ اِدھر کی ہوا چلی تو اُدھر جھک گیا اور اُدھر کی ہوا چلی تو اِدھر جھک گیا۔

جہاز میں انڈین ایئرلائنز کا فلائٹ میگزین سواگت کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۲ مطالعہ کے لئے موجود تھا۔ اس کے ہندی سکشن میں ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا : گوپال نرائن پبلک لائبریری۔ یہ

لائبریری بھرت پورہ (بہار) میں واقع ہے۔ مضمون میں اس کا تفصیلی تعارف تھا۔ بتایا گیا تھا کہ اس میں بہت سے قدیم مخطوطات ہیں۔ ان میں سے کئی چیزوں کے فوٹو بھی دئے گئے تھے۔ ایک فوٹو سے معلوم ہوا کہ اس لائبریری میں بہت سے قدیم کتبات ہیں۔ ایک کتبہ میں یہ فارسی شعر تھا کہ بلند ہمت آسمان سے بھی اوپر اٹھ جاتا ہے اور آدمی ہمت کے ذریعہ فرشتہ سے آگے چلا جاتا ہے:

ہمت عالی زفلک بگذرد　　مرد بہ ہمت زملک بگذرد

صبح تقریباً ساڑھے نو بجے ہم بمبئی ایئرپورٹ پر اتر گئے۔ لینڈنگ اتنی اسموتھ تھی کہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ جہاز زمین پر اتر گیا ہے۔ بمبئی ایئرپورٹ میں داخل ہوا تو وہی مانوس منظر تھا جو ہر ایئرپورٹ پر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ مخصوص گاڑی سنبھال کر اپنا اپنا سامان لینے کے لئے کنویر بیلٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔

ایئرپورٹ سے ہم سب کو مسٹر رویندر کمار کی رہائش گاہ پہنچنا تھا۔ میں جس گاڑی میں تھا اس کو خود مسٹر رویندر کمار چلا رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بمبئی کا ایک مسلمان میکانک جس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ وہ اس فساد میں مارا گیا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔ مجھ سے بہت پریم تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بٹوارہ کے بعد دونوں فرقوں میں جو کڑواپن آیا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ نئی پیڑھی کو ان پرانی باتوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اجودھیا کے جھگڑے کے بعد وہی دوری دوبارہ لوٹ آئی۔

یہ بہت صحیح ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی یا دو گروہ میں کچھ شکایت کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ مگر فطرت بہت جلد ان کو بھلا دیتی ہے۔ پہلے جھگڑے کے بعد اگر دوسرے جھگڑے سے بچنے کا اہتمام کیا جائے تو فطرت خود مرہم کا کام کرتی ہے۔ اور تعلقات نارمل حالت پر آجاتے ہیں۔

۶ دسمبر کے واقعہ کے بعد بمبئی کے بعض علاقوں میں شدید فساد ہوا۔ مگر یہاں کا سب سے زیادہ حساس علاقہ بھیونڈی فساد سے مکمل طور پر بچا رہا۔ سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ چنانچہ بھیونڈی ایڈمنسٹریشن کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ پڑھی۔ رپورٹر کا نام پرکاش چندر تھا اور اس کا عنوان یہ تھا:

ACPs study Bhiwandi's technique of peace

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۶ دسمبر کے بعد بھیونڈی کی حالت مثالی (exemplary) رہی۔ بھیونڈی ایک حساس ٹاؤن سمجھا جاتا تھا مگر یہاں بالکل کوئی فساد نہیں ہوا۔ چنانچہ ریاست مہاراشٹر کے مختلف مقامات سے انتظامیہ کے لوگ کیس اسٹڈی کے لئے بھیونڈی آئے۔ انھوں نے ہر جگہ معلومات حاصل کیں اور پانچ لاکھ روپیہ خرچ کرکے فلمس ڈویژن نے ایک ڈاکومنٹری تیار کی۔

اس معجزاتی واقعہ کا سادہ سبب صرف ایک تھا۔ ۶ دسمبر کے بعد جب تناؤ پیدا ہو تو دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے "دفاع" کے اصول پر تیاریاں کیں۔ یہ دفاع عملاً فرقہ وارانہ فساد بن کر ظاہر ہوا۔ اس کے برعکس بھیونڈی کے مسلمانوں نے کئی محلہ کمیٹی بنائی۔ ان محلہ کمیٹیوں نے خود دفاع کرنے کے بجائے یہ کیا کہ جہاں کہیں کشیدگی کی صورت پیدا ہوئی فوراً وہاں پہنچ کر لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور حسب ضرورت پولیس کو اطلاع دی۔ جب بھی انھوں نے ایسا کیا، پولیس صرف چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی اور فوری کارروائی کرکے معاملہ کو ختم کر دیا۔ بم پر بم مارنا فساد پیدا کرتا ہے۔ بم کو ڈیفیوز کرنا فساد کو ابتدا ہی میں ختم کر دیتا ہے۔

بمبئی میں دو گھنٹہ قیام کے بعد بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ نظر آیا کہ دو ٹرک سڑک کے اِدھر اُدھر الٹے پڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دونوں آمنے سامنے سے آرہے تھے غالباً ڈرائیور نشے میں تھا۔ اس نے گاڑی کو کنارے نہیں کیا۔ اور ٹکر ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو ایک ٹرک کے پیچھے ہندی میں لکھا ہوا تھا: سنڈے ہو یا منڈے، روز کھاؤ انڈے۔

میں نے سوچا کہ ٹکر ہونے سے پہلے دونوں اس بھرم میں ہوں گے کہ میرا ٹرک میرا ٹرک ہے اس کو نقصان ہونے والا نہیں۔ اگر کچھ ہوا تو صرف دوسرے کا ہوگا۔ مگر جب ٹکر ہوئی تو دونوں کے دونوں تباہ ہوگئے۔ یہی عام جھگڑوں میں ہوتا ہے۔ دو فریق جب لڑتے ہیں تو پیشگی طور پر دونوں میں سے ہر ایک اپنے کو فاتح سمجھتا ہے۔ مگر لڑائی ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی دونوں کے حق میں تباہ کن تھی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں پہنچا۔

پونہ کی حد میں داخل ہوئے تو ریزرو بینک آف انڈیا کی بلڈنگ کے پاس ڈرائیور نے کسی وجہ سے گاڑی روکی۔ ہم تین آدمی (اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند اور میں) تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہاں سے اپنے میزبان کو ٹیلیفون کر دیں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم پونہ میں پہنچ چکے ہیں۔

بینک کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تو سوامی چیدانند نے گیٹ کے چوکیدار سے ٹیلی فون کی بابت پوچھا۔ اس نے بہت رکھائی کے ساتھ جواب دیا اور کہا کہ باہر پبلک ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ چوکیدار کو چھوڑئے۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص اسکوٹر سے وہاں آگیا۔ چوکیدار نے کہا کہ یہ ہمارے افسر ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آنے والا ہم لوگوں کو دیکھ کر خود ہی اسکوٹر سے اتر گیا اور نرمی کے ساتھ بولا: میں آپ لوگوں کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم ٹیلیفون کرنا چاہتے ہیں تو فوراً اس نے کہا کہ آپ ہم کو اپنا نمبر دیدیجئے۔ میں خود ان کو ٹیلیفون کر کے بتا دیتا ہوں۔

یہی طریقہ ہر معاملہ میں درست ہے۔ نیچے کے لوگوں سے کبھی نہیں الجھنا چاہئے۔ ہمیشہ اوپر کے لوگوں سے ربط قائم کرنا چاہئے۔ کسی معاملہ کو حل کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

۱۵ دسمبر کی شام کو ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ رات یہاں گزاری گئی۔ پونہ ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی کچھ دنوں کے لئے پونہ میں ٹھہرے تھے۔ یہاں وہ ڈاکٹر ڈنشا مہتا کے زیر علاج تھے جو پونہ میں ایک کلینک (nature-cure clinic) چلا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر (Louis Fischer) نے جولائی ۱۹۴۶ میں ان سے پونہ میں ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران مہاتما گاندھی نے احمد آباد میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کا ذکر کیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ اصل مشکل یہ ہے کہ ایک فریق چھرا مارنا اور قتل کرنا شروع کرتا ہے۔ اور پھر دوسرا فریق بھی ایسا ہی کرنے لگتا ہے۔ اگر دوسرا فریق اپنی اموات پر انتقامی کارروائی نہ کرے تو اس قسم کی چیز رک جائے گی:

> The trouble is that one side begins stabbing and killing and then the other does likewise. If one side did not avenge its deaths the thing would stop (p. 424).

بظاہر یہ بہت مشکل ہے۔ مگر اس مسئلہ کا یہی واحد حل ہے، اس کے سوا اور کوئی اس مسئلہ کا حل نہیں۔ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک ہو۔ جب بھی ایک فریق کی طرف سے اشتعال انگیزی یا تشدد کا کوئی واقعہ ہو تو دوسرے فریق کو برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس کو روکنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ غلطی کو انتقام کا مسئلہ بنانا غلطی کو بڑھاتا ہے۔ غلطی کو عفو و درگزر کا مسئلہ بنانا

غلطی کی آگ کو پہلے ہی مرحلہ میں بجھا دیتا ہے۔

پونہ میں عبدالصمد صاحب نے بمبئی کے دو اخبار دکھائے۔ ایک روزنامہ انقلاب تھا۔ اس کے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے پر مختلف اصحاب فکر کا ردعمل شائع کیا گیا تھا۔ جناب محمود ایوبی صاحب کا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا:

"اس صورت حال کو پیدا کرنے میں یقیناً بی جے پی، وی ایچ پی، اور سنگھ پریوار کا ہاتھ ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بابری مسجد کے نام پر سیاسی دکان چمکانے والے مسلم لیڈروں نے بھی کافی اہم رول انجام دیا ہے۔ مسلم لیڈر صاحبان جو آج صبر کی تلقین کر رہے ہیں، وہی باتیں جب الرسالہ والے مولانا وحید الدین خاں لکھتے اور کہتے تھے تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بزدلی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان ہی لیڈروں نے لوگوں کو مشتعل کیا اور ہمیں آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ اچھی بات ہے کہ مسلمان صبر و ضبط کا ثبوت دے رہے ہیں۔"

ہفتہ وار بلٹز کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۲ میں اس کے اڈیٹر جناب ہارون رشید علیگ کا مضمون تھا۔ اس کا ایک پیراگراف یہ تھا:

"ہر چند کہ ملک میں فسادات کی لہر پھیلی ہوئی ہے، مسلمانوں نے بڑے صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا ہے۔ ورنہ تباہی و بربادی اور بھی زیادہ ہوتی۔ وہ نام نہاد مسلم لیڈر جو اشتعال انگیز بیان دینے میں بے مثال تھے، وہ بھی آج مولانا وحید الدین خاں کی بولی بول رہے ہیں (اور قوم کو صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں)"

پونہ میں لوگوں نے ایک ماروتی وین تیار کی تھی اس میں مجھ کو سفر کرنا تھا۔ میرے ساتھ پونہ کے چند مسلم احباب بھی شامل رہتے۔ اس طرح میں ایک علیحدہ گاڑی میں اپنے احباب کے درمیان سفر کرتا۔ ٹھہرنے کے مقام پر کسی مسلمان کے یہاں ٹھہرتا اور اجتماع کے وقت منچ پر جا کر تقریر کر دیتا اور پھر اپنے لوگوں میں واپس چلا آتا۔

یہ طریقہ مقصد سفر کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے مذکورہ ماروتی وین پونہ میں روک دی۔ مسلم احباب کو بھی سفر سے منع کر دیا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے شانتی یاترا کی بقیہ ٹیم کے ساتھ ہی اپنا پورا وقت گزارنا ہے۔ چلنا، اٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور کھانا۔ غرض اس دوران دن اور رات انھیں لوگوں کے

ساتھ رہنا ہے۔ تاکہ ایک طرف شانتی یاترا کے پروگراموں میں مکمل شرکت ہو اور اسی کے ساتھ برادران وطن سے قریبی تعارف بھی ہو سکے۔ چنانچہ یہ پورا سفر اسی طرح گزرا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ سامنے ایک جیپ میں شانتی گیت کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ پیچھے ہماری کاروں کا قافلہ تھا۔ یہی صورت آخر تک جاری رہی جیپ سے جو گیت نشر ہو رہا تھا وہ بڑا اثر انگیز تھا۔ گیت کا ایک شعر یہ تھا:

بدی بھلا کسی سے کر نہ سکو تو　　برا کسی سے مت کرنا

ایک اور گیت کے کچھ شعر یہ تھے:

آشا کی دیپک جلنے دو　　ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے دو
سب کو اک راہ دکھانا ہے　　بادھائیں دور ہٹانا ہے
اتہاس کے پنے لکھنے دو　　گنگا جمنا کو ملنے دو

آخری شعر سن کر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بات گیت بن کر سڑکوں پر گونج رہی ہے جس کو سوامی ویویکانند نے سو سال پہلے کہا تھا کہ میں اپنے مستقبل کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اسلام باڈی اور ہندو برین دونوں مل کر نئے شاندار انڈیا کی تعمیر کر رہے ہیں۔ دل میں یہ تمنا ابھری کہ گنگا اور جمنا کے یہ دھارے ایک ہو کر کاش ایک بڑا سیلاب بن سکیں۔

یہ شانتی یاترا جگہ جگہ سے گزرتی ہوئی ۱۵ دسمبر سے ۲۱ دسمبر تک جاری رہی۔ وہ پونہ سے شروع ہوئی پھر چاکن، منچر، سنگم نیر، ارادھنا، ادیان، نانڈگاؤں، مالیگاؤں، شری رام پور، نواسا، اورنگ آباد، جالنا، بیڑ، عثمان آباد، لاتور، احمد پور، نانڈیڑ، پربھنی، ہنگولی، آکولہ، امراوتی، سیواگرام، وردھا، ناگپور پہنچی۔ ناگپور اس یاترا کا آخری مقام تھا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو پونہ سے شانتی یاترا شروع ہوئی۔ اور ۲۰ اکتوبر کو ناگپور میں ختم ہوئی۔ ہر جگہ ٹیلی فون کے ذریعہ پیشگی طور پر تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس علاقہ میں تناؤ کی وجہ سے جلسہ جلوس بالکل ممنوع ہے۔ مگر پونہ کے مسٹر شانتی لال موتھا کے اثر و رسوخ اور ان کی کوششوں سے ہر جگہ کے لئے اجازت حاصل ہوگئی۔ اور یہ سب کچھ صرف چند دنوں میں انجام پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ بستی میں داخل ہو کر پہلے ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ تک پیدل سفر (پدیاترا) کی جاتی

अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना द्वारा आयोजीत

पुना से नागपुर शांतीयात्रा का अमरावती आगमन

मान्यवर,

विगत कुछ दिनोसे महाराष्ट्र राज्यमें हुई हिंसक घटनाओसे निर्माण हुये मनमुटाव के वातावरण को शांती और सद्‌भाव में बदलने हेतु और **जीयो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म** के तत्वोका संपुर्ण राज्यमें प्रसार करने हेतु **अखिल महाराष्ट्रीय जैन संघटना** द्वारा आयोजीत **पुना से नागपूर शांतीयात्रा** का **आगमन अमरावती महानगरमें** सोमवार दिनांक २१ दिसंबर को सुबह ८.०० बजे होरहा है। जिसमें निम्न महानुभाव

आचार्य सुशीलमुनीजी, दिल्ली

(जैन धर्म के जियो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म तत्व के विश्वप्रसारक)

स्वामी चिदानंदजी, दिल्ली(अध्यक्ष परमार्थ निकेतन , दिल्ली)

मौलाना वहीदुद्दीन खान (प्रेसीडेंट ऑफ इस्मामिक सेंटर)

शांतीलालजी मुथ्था (सर्वधर्मीय सामुहिक विवाह प्रणेते)

पद्मभूषण अण्णा हजारे ★ **अमरेंद्र मुनी, दिल्ली** ★ **अब्दुल करीम फारूख, नागपूर** ★ **माधव गडकरी** (माजी संपादक लोकसत्ता) ★ गोविंदभाई श्रॉफ (जेष्ठ समाजसेवक) ★ **तात्यासाहेब शिरवाडकर** (कुसुमाग्रज) ★ **गंगाधर पानतवणे** (साहित्यीक) ★ **डॉ. यु.म.पठाण** (साहित्यीक) ★ **प्राचार्य मुंगुडकर** एवं ★ **मुल्लेकार हुसेन** (अध्यक्ष फईज-ए-आम-ट्रस्ट) आदी मान्यवर भी ईस शांतीयात्रामें सहभागी होकर इंद्रपुरी नागरमें आगमन कर रहे है। जो सुबह ८.०० बजे बर्तन बाजार स्थीत श्री जैन श्वेतांबर मंदीर से निकलकर अमरावती महानगरमें **जीयो और जीने दो तथा अहिंसा परमोधर्म** ईस तत्वोंका प्रसार करने एंव **शांती** तथा **सद्‌भाव** का वातावरण बनाने निम्नो मार्गोसे भ्रमण करेंगे।

शांती यात्रा भ्रमण मार्ग

सक्करसाथ, छत्रपुरी खीडकी, ईतवारा बाजार चौक, जवाहर गेट, प्रभात चौक, सरोज चौक, जयस्तंभ से सामरा काम्पलेक्स होतेहुये नेहरू मैदान के शहीद समारक में पहुचेंगी।

इस अवसरपर शांती यात्रा का समापन एवं बीदाई समारोह

अमरावती जिलाकी पालकमंत्री **श्रीमती वसुधाताई देशमुख**

अमरावती महानगरके महापौर डॉ. श्रीमान देविसिंहजी शेखावत

अमरावती गृहनिर्माण मंडल के अध्यक्ष **अॅड.श्रीमान देवराजजी बोथरा**

की उपस्थितीमें संपन्न होगा। आपसे विनम्र अनुरोध है की, इस महान कार्यमें सहभागी होने आपभी शांतीयात्रामें अपने मित्रोंसह सामील होईये।

— विनीत —

पुनमचंद मुथा ★ अभय कोटेचा ★ राजेंद्र लुनावत ★ मोहनलाल ओस्तवाल ★ नेमीचंद जैन

★ सुदर्शन गांग ★ प्रदीप जैन ★ अनिल कोठारी ★ कोमल बोथरा ★ नविन चोरडीया ★ अमृत मुथा

★ राजेंद्र भंसाली ★ मेहाकुमार चोरडीया ★ दिलीप सकलेचा ★ विजय बोथरा ★ प्रकाश भंसाली ★ विजय आचलीया

★ विजय भंसाली ★ शांतीलाल बरडीया ★ कंवरीलाल ओस्तवाल

जीयो और जीने दो का नारा है।

اس دوران لوگ بڑی تعداد میں نکل نکل کر ہمارے قافلہ میں شریک ہو جاتے۔ اس طرح یہ شانتی یاترا چلتی ہوئی کسی متعین مقام پر پہنچتی۔ یہاں پہلے سے اسٹیج تیار رہتا تھا۔ یہاں ہم لوگ ٹھہر کر تقریر کرتے جس میں امن اور تعمیر کی طرف متوجہ کیا جاتا۔ یہی طریقہ پورے سفر میں تمام مقامات پر جاری رہا۔

ہر جگہ لوگوں میں غیر معمولی جوش تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر کوئی شکر یا شرینی لا کر ہم لوگوں کو دے رہا ہے۔ کوئی ہار لئے چلا آرہا ہے۔ کوئی پھول پیش کر رہا ہے۔ غرض لوگوں میں عجیب جوش تھا۔ شانتی یاترا کے آخر میں ہونے والے جلسہ میں ہر جگہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ امن اور شانتی کی آواز ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ امن اور شانتی کی آواز بلند کرنا گویا لوگوں کی فطرت کے تاروں کو چھیڑ دینا ہے۔ اور جو پکار فطرت انسانی کے مطابق ہو، اس کو لوگوں کی طرف سے لبیک ملنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

چاکن میں داخل ہونے کے بعد پدیاترا، جلسہ اور دوسرے پروگرام کئے گئے۔ ملاقات کے دوران چاکن کے ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا نکالنے سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا مقصد انسان کی فطرت کو جگانا ہے۔ اس وقت دیش میں جھگڑے کی جو فضا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے غلط باتیں کرکے انسان کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا ہے۔ ہم انسان کو دوبارہ اس کی فطرت کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں، فطرت سے ہٹنے ہی کا نام بگاڑ ہے، اور فطرت پر قائم ہونے کا نام بناؤ۔

پھر میں نے کہا کہ سکھ والا سماج بے سکھ کو برداشت کرنے سے بنتا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں یہ مزاج بنایا جائے کہ کبھی کوئی کڑوی بات سامنے آجائے تو اس کو نظرانداز کر دیا جائے۔ کیوں کہ کبھی کبھی کوئی خلاف مزاج بات تو بہر حال پیش آئے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ پھول میں بھی کانٹے ہوتے ہیں۔ پھر خدا کا باغ جب کانٹوں سے خالی نہیں تو ہمارا سماج کس طرح ایسی چیزوں سے خالی ہو سکتا ہے۔

منچر میں حسب پروگرام شانتی یاترا کی تمام کارروائی انجام پائی۔ کئی لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنی شانتی یاترا مہاراشٹر سے کیوں شروع کی۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ سوامی چیدانند نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ اس اسٹیٹ کا نام مہاراشٹر ہے۔ دوسری ریاستیں

اگر راشٹر ہیں تو یہ ہمارا راشٹر ہے۔ اس لئے بالکل نیچرل تھا کہ اس کو پہلے لیا جائے۔ کیوں کہ ہمارا راشٹر میں شانتی آجائے تو اس کا اثر سارے راشٹر پر پڑے گا۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک ہندو لیڈر سے ہوئی۔ وہ انتہا پسند ہندو گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کسی ریزرویشن کے بغیر مجھ سے بات کریں۔ وہ راضی ہوئے تو ہم دونوں ایک الگ کمرہ میں بیٹھے اور پھر دونوں میں بات شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ کہ (live or leave) یعنی بھارت میں رہنا ہے تو ہمارے کہنے کے مطابق رہو، ورنہ دیش چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیے کہ مسلمان اگر دونوں میں سے کوئی کام نہ کریں، وہ نہ آپ کے کہنے پر چلیں اور نہ دیش کو چھوڑ کر باہر جائیں، تو پھر آپ کیا کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو سبق سکھا دیں گے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ ہندو ابھی تک اپنی طاقت کو نہیں جانتا تھا۔ اب رام مندر موومنٹ کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہندو نے اپنی طاقت کو جان لیا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہندو طوفان کے مقابلہ میں بابری مسجد اور سپریم کورٹ کے فیصلے تنکے کی طرح بہہ گئے۔ پھر یہ مسلمان کس طرح اس سیلاب کا مقابلہ کریں گے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنی بات کہہ چکے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ اجودھیا کا اسٹرکچر پتھروں کا ڈھیر تھا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ کچھ لفظوں کا مجموعہ تھا۔ آپ پتھر کے ڈھانچہ اور لفظوں کے مجموعہ کو انسان سے برابر (equate) کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ ایکویشن غلط ہے۔ پتھروں کے ڈھانچے کسی طوفان میں گر سکتے ہیں۔ الفاظ کے اوراق کسی آندھی میں اڑ سکتے ہیں۔ مگر پندرہ کروڑ انسانوں کے اوپر رولر چلانا کسی طرح ممکن نہیں۔ میری یہ بات سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سنگم نیر میں داخل ہوئے تو ہماری آگے کی جیپ پر اس کے الفاظ گونج رہے تھے گنگا جمنا کو ملنے دو۔

ہماری پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ ہمارا دیش گنگا اور جمنا کا سنگم ہے۔ اسی طرح یہ دیش مختلف کلچر کا بھی سنگم ہے۔ سنگم نیر اگر دیش کے اس پہلو کی ایک مثال بن جائے تو یہ اس کے نام کے

لحاظ سے اس کے لئے سب سے اچھی بات ہوگی۔

ارادھنا ادیان میں ہم لوگ ایک جین مندر میں گئے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ اس کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ہم کو ایک چھوٹے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک بوڑھے آدمی لیٹے ہوئے تھے۔ چادر اٹھائی گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بالکل دبلے ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہڈی کے ڈھانچہ کے اوپر ایک سوکھی کھال لپٹی ہوئی ہے۔ بولنے کی طاقت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم آنکھ کھول کر وہ آنے جانے والے کو دیکھ سکتے تھے۔

پہلے میں نے سمجھا کہ بیماری کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا ہے۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جین مذہب کے مطابق وہ عمل کر رہے ہیں جس کو سنتھارا کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صرف جین دھرم میں ہے۔ اس میں آدمی خود اپنے ارادہ سے ہر قسم کا کھانا اور پانی مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اسی طرح بھوکا پیاسا پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن مر جاتا ہے۔ ایک جینی اچاریہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم مرتیو سے نہیں مرتے، ہم اپنی مرضی سے شریر چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرے جینی نے کہا: ڈسمس کئے جانے سے پہلے ہم خود ہی رزائن کر دیتے ہیں۔

اس دنیا میں کوئی شخص کتنا ہی زیادہ غیر معقول رویہ اختیار کرے، اس کو بہر حال اپنے عمل کو درست ثابت کرنے کے لئے الفاظ مل جائیں گے۔ اچاریہ منی سوشیل کمار نے یہ لطیفہ بتایا کہ غلام احمد قادیانی نے ایک عورت سے یہ کہہ کر نکاح کیا کہ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو میری جانشینی کرے گا۔ نکاح ہو گیا مگر اس خاتون سے کوئی لڑکا پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک اردو اخبار نے مرزا صاحب کی اس بات کو نقل کرتے ہوئے ان کا مذاق اڑایا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: اس عقل کے اندھے کو پتہ نہیں کہ دو اٹھنی مل کر ایک روپیہ بن جاتا ہے۔ تمثیل کے ذریعہ استدلال کتنا کمزور ہوتا ہے، یہ واقعہ اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

مالیگاؤں میں ۷ دسمبر کی رات گزاری۔ پدیاترا کے بعد ایک بڑا اجتماع ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ دوسرے لوگوں کی تقریروں کے ساتھ میری بھی تقریر ہوئی۔ اگلی صبح کو فجر کی نماز کے بعد کچھ لوگ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر آئے۔ جناب محمد لقمان صاحب نے وہاں کے ایک صاحب کے بارہ میں بتایا کہ کل وہ میرے ساتھ آپ کو سننے

کے لئے آئے تھے۔ راستہ میں وہ مجھ سے جہاد کی باتیں کرتے رہے۔ مگر جب آپ کی باتیں سن کر واپس ہوئے تو انھوں نے کہا کہ میرا دماغ بالکل دھل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جہاد کا وقت نہیں ہے بلکہ صبر کا وقت ہے۔ اور یہ کہ صبر کوئی منفعل حالت نہیں، وہ زبردست عمل ہے۔ اور آج اسی صابرانہ عمل کی ضرورت ہے۔

اس یاترا کے دوران ہم لوگ جہاں جہاں گئے، ہر جگہ نئے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ۱۶ دسمبر کو، ہم ناندگاؤں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں کئی دکانیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ ایک دکان سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا اور پائپ کے ذریعہ وہاں پانی ڈال کر اس کو آخری طور پر بجھایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر دل کو سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ اپنی دکان ہو تو آدمی اس کو نہایت شوق کے ساتھ سنوارتا ہے، اور جو دکان دوسرے کی ہو اس کو بے رحمی کے ساتھ آگ لگا دیتا ہے۔ خود غرضی کا دین بھی کیسا عجیب ہے۔

آگے بڑھے تو ایک اسکول کے چھوٹے بچے یونیفارم میں آگئے اور ہمارے ساتھ اپنے ننھے پیروں کے ساتھ چلنے لگے۔ ان کو دیکھ کر مجھے کسی کا یہ قول یاد آیا کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ خدا انسانوں سے مایوس نہیں ہوا۔ سوامی چیدانند نے اپنی تقریر میں کہا کہ ناندگاؤں میں اس قسم کا دنگا پہلی بار ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ لوگ یہ طے کریں کہ یہی پہلی بار بھی ہو اور یہی انتم بار بھی۔

مالیگاؤں میں پدیاترا بہت لمبی رہی۔ میرا گمان تھا کہ مالیگاؤں ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ کافی بڑا ہے اور بالکل شہر کی مانند ہے۔ مالیگاؤں میں ہم لوگ شام کو پہنچے۔ پدیاترا کے بعد تقریروں کا پروگرام تھا۔ کافی لوگ شریک ہوئے۔ صبح کو وہاں سے روانگی تھی۔ ابھی تک وہاں رات کا کرفیو چل رہا تھا۔ یہاں الرسالہ کے قارئین بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں سے ملاقات ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی پبلسٹی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو میری آمد کا علم نہ ہو سکا۔

شری رام پور میں حسب معمول تمام پروگرام ہوئے اور کافی کامیاب رہے۔ ملاقاتوں کے دوران شری رام پور کا ایک سبق آموز قصہ معلوم ہوا۔ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے۔ ۶ دسمبر کے بعد کسی شریر آدمی نے رات کے وقت قبر کو توڑ ڈالا۔ اس قسم کا ایک واقعہ عام طور پر دو فرقوں میں کشیدگی

اور پھر خونیں فساد کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر شری رام پور میں ایسا نہیں ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ قصہ پیش آیا تو فوراً ہی بستی کے ہندو اور مسلمان وہاں پہنچے۔ اور دونوں نے مل کر قبر کو پھر سے بنایا۔ اور پھر اس کے اوپر حسب قاعدہ چادر چڑھائی۔ اس طرح انھوں نے فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔ یہ واقعہ ۷ ادسمبر کو مجھے معلوم ہوا جب کہ میں شانتی یاترا کے تحت شری رام پور میں پہنچا تھا۔

۷ ادسمبر کی شام کو ہم نواسا پہنچے۔ یہاں پد یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا جس میں ہمارے ساتھیوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ زندگی میں کبھی کبھی اختلاف کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ خواہ وہ ایک سماج ہو یا کوئی دوسرا سماج۔ پھر اس کا حل کیا ہے۔

میں نے کچھ واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے حل کے لئے میں آپ کو دو آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ ایک یہ کہ —— دوری کو دور کیجئے۔ یعنی ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے لوگ آپس میں خوب ملیں۔ وہ باہمی دوری کو ختم کریں۔ اس کے بعد بہت سی غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

دوسرے یہ کہ جب جھگڑے یا اختلاف کی صورت پیدا ہو تو ایسے موقع پر آپ کا اصول ہونا چاہئے —— ٹکراؤ نہیں، تدبیر۔ یعنی ایسے مواقع پر آپ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ تدبیر کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ بم پر بم نہ ماریں بلکہ بم کو ڈیفیوز کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ جھگڑے کو اس کے پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیں گے۔

میری تقریر کے بعد کچھ ہندو نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اس طرح سوچا نہیں تھا۔ مگر آج سمجھ میں آیا کہ یہی اصل بات ہے اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔

میں نے بتایا کہ اس کی ایک مثال دسمبر ۱۹۹۲ میں ہونے والا دہلی کا فساد ہے۔ دہلی میں ۱۲ دسمبر کو میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے غصہ کے ساتھ کہا "اس وقت ایسٹ دہلی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں، یہ پولیس مسلم فساد ہے"

یہ بات انھوں نے ویلکم کالونی کے فساد کے بارہ میں کہی تھی۔ مگر جس ایسٹ دہلی میں ویلکم کالونی ہے، اسی ایسٹ دہلی میں عین اس کے پاس ہی گونڈہ کالونی ہے۔ اور گونڈہ کالونی میں نہ کوئی فساد ہوا اور نہ کرفیو لگا۔ حالانکہ وہاں بھی "سازش" کے وہی واقعات ہوئے جس کا حوالہ دوسرے مقامات

پر دیا جاتا ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو میری ملاقات مولانا محمد قاسم قاسمی سے ہوئی۔ وہ مدرسہ حسین بخش میں استاد ہیں اور گونڈہ کالونی میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ۸ دسمبر کو جب پرانی دہلی میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً وہ گونڈہ کالونی چلے گئے اور ایک ہفتہ تک مسلسل وہیں رہے۔ انھوں نے ذاتی واقفیت کے تحت کئی واقعات بتائے۔

انھوں نے بتایا کہ گونڈہ کالونی میں ایک ہندو کالج ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اس کالج میں ہتھیار جمع کئے گئے ہیں اور لڑکے وہاں اکٹھا ہو کر باقاعدہ فساد کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ کچھ مسلمانوں نے فوراً پولیس کے ذمہ داروں کو ٹیلی فون کیا اور انھیں بتایا کہ یہاں فساد کا خطرہ ہے، آپ لوگ اس کو روکنے کی کارروائی کریں۔ اس کے بعد پولیس کی ایک پارٹی کالج میں داخل ہوئی۔ اس نے تلاشی لی تو خبر صحیح نکلی۔ پولیس نے اسی وقت تمام ہتھیار اپنے قبضہ میں کر لئے اور لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔

اسی طرح گونڈہ کالونی کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہندو وکیل کے مکان کے اوپری حصہ میں گولہ بارود جمع ہے اور وہاں بم بنائے جا رہے ہیں۔ تحقیق کر لینے کے بعد کچھ سمجھدار مسلمان اس ہندو وکیل کے یہاں گئے اور اس سے کہا کہ آپ کے اوپر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب آپ یا تو سارا سامان ضائع کر دیں، ورنہ ہم پولیس کو بلاتے ہیں۔ ہندو وکیل نے معافی مانگی اور اسی وقت تمام سامان ضائع کر دیا۔

ایک رات کو کارسیوکوں کی ایک گاڑی گونڈہ کالونی میں آگئی۔ وہ ہر ہر مہادیو کے نعرے لگانے لگے۔ اس کو سن کر کچھ مسلم نوجوان باہر نکل آئے۔ انھوں نے بھی اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ اس وقت فوراً کچھ سنجیدہ مسلمان باہر آئے۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو روکا اور پولیس کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ پولیس نے اسی وقت کارروائی کر کے کارسیوکوں کو وہاں سے بھگا دیا۔

مولانا قاسم صاحب نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد جب کشیدگی پیدا ہوئی تو فوراً ہی گونڈہ کالونی والوں نے باہم مشورہ سے امن کمیٹی بنائی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کو شریک کیا۔

امن کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق ،کالونی کے ہندؤوں اور مسلمانوں کی ایک ٹیم پہرہ داری کے لئے مقرر کی گئی۔ اس میں کوئی نوجوان نہیں لیا گیا۔ سب ادھیڑ عمر کے لوگ شامل تھے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں عین فساد کے زمانہ میں بھی گونڈہ کالونی پوری طرح فساد سے محفوظ رہی۔ حتیٰ کہ وہاں کرفیو لگانے کی نوبت بھی نہیں آئی۔

فساد کے بم سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ دانشمندی کے ذریعہ فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا جائے۔ فرقہ وارانہ فساد کے نقصان سے بچنے کی اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں۔

اورنگ آباد میں شانتی یاترا کا پروگرام معمول کے مطابق مکمل کرنے کے بعد ہم نے یہاں کے گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری۔ مجھے یاد آیا کہ سر جادو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخی کتاب (Aurangzeb) میں لکھا ہے کہ ۱۶۵۸ء میں جب کہ انڈیا میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ اورنگ آباد میں اجناس کا ریٹ یہ تھا: گیہوں اور دال ایک روپیہ میں ڈھائی من، جوار اور باجرا ایک روپیہ میں ساڑھے تین من، گڑ ایک روپیہ میں آدھا من، گھی ایک روپیہ میں چار سیر (جلد ۱، صفحہ ۱۷۳)

یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت روپیہ مہنگا تھا اور چیزیں سستی تھیں۔ اب چیزیں مہنگی ہیں اور روپیہ سستا ہے۔ عام انسان کے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ یہ کہ قدیم انسان کے لئے مزید یہ تھا کہ اس کو سکون کی نعمت حاصل رہتی تھی۔ جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نہ کم والے کو سکون ہے اور نہ زیادہ والے کو۔

جالنہ میں پد یاترا کے بعد بہت بڑا اجتماع ہوا۔ دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ تقریروں میں شام ہوگئی۔ یہاں شام سے صبح تک کا کرفیو چل رہا ہے۔ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے۔ مگر کرفیو کے اندیشہ کی وجہ سے آخر میں اٹھنے لگے۔ جالنہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ منچ کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً اعلان کرایا کہ آپ لوگ کرفیو کا دھیان نہ کریں۔ آخر تک یہاں کے بیانات کو سنیں۔ اور اس کے بعد اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ چنانچہ جلسہ کی کارروائی مزید دیر تک جاری رہی۔

میں نے جالنہ کی تقریر میں کہا کہ یہاں اتنے آدمی ہیں جیسے کہ پوری بستی امنڈ آئی ہے۔ اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ امن وشانتی کے کتنے زیادہ خواہش مند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان امن وسکون ہی کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمارے درمیان دنگا ہوجاتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں جس کو بھلا وے کے خانہ میں ڈالنا تھا اس کو ہم عمل کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسی کے ساتھ اس نے ایک اور چیز پیدا کی جس کو آپ گلاب کہتے ہیں۔ گلاب کا پھول پھولوں کا راجہ ہے۔ کتنا اچھا ہوتا ہے وہ۔ لیکن گلاب کا پھول جس ڈنٹھل میں اگتا ہے، اس میں ساتھ ہی کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا فطرت کے ایک واقعہ کی زبان میں یہ پیغام دیا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوں گے۔ یہاں اگر پھول لینا ہے تو کانٹے کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ کانٹے کو نظر انداز کئے بغیر اس دنیا میں پھول جیسی قیمتی چیز نہیں مل سکتی۔ اسی اصول پر ہمیں اپنی سماجی زندگی کو چلانا چاہئے۔

۱۸ دسمبر کو بیڑ پہنچے۔ بے شمار لوگ شانتی یاترا میں شریک ہوگئے۔ آخر میں جب اجتماع ہوا تو اتنے آدمی اکٹھا ہوئے کہ دور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ میری بھی کسی قدر مفصل تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد بہت سے لوگوں نے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ایک مقامی ہندو جرنلسٹ راجندر منت نے بتایا کہ میں آگے منچ کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے قریب ہی یہاں کے کلکٹر مسٹر سنجے کمار شرما بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آپ کی تقریر بہت غور سے سن رہے تھے اور اس سے اثر لے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی تقریر سنتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

احمد پور میں شانتی یاترا کے پروگرام کی تکمیل کے بعد ایک ہندو لیڈر مسٹر کیدار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد کامپٹی میں کچھ واقعات ہوئے۔ اس میں ایک مندر بھی توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں ہندو اور مسلمان جمع ہوئے۔ سب نے اس کام کی مذمت کی اور طے کیا کہ دونوں مل کر دوبارہ مندر تعمیر کریں گے۔ چنانچہ دونوں فرقہ کے لوگوں نے مل کر خود اپنے ہاتھ سے مندر کی نئی تعمیر کی۔ اس میں کوئی بھی سرکاری امداد قبول نہیں کی گئی۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ کو دوپہر کے وقت ہمارا قافلہ لاتور پہنچا۔ لاتور (Latur) کا نام پہلے لتالور

تھا۔ لٹالور کا لفظ ادائگی میں مشکل تھا، اس لیے وہ دھیرے دھیرے لاتور ہو گیا۔ (Lattalur)
یہی مثال ہر معاملہ کی ہے۔ عوام ہمیشہ اس چیز کو قبول کرتے ہیں جو انھیں آسان معلوم ہوتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سطحی اسکیمیں، بہت جلد لوگوں کے درمیان مقبول ہو جاتی ہیں اور گہرے اور دور رس منصوبے لوگوں کو اپیل نہیں کرتے۔

لاتور جنوبی ہند کے اس علاقہ میں ہے جس کو دکن کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ یہاں مسلمان تقریباً ۲۵ فی صد کی تعداد میں آباد ہیں۔

حسب معمول لاتور کی سرحد پر پہنچ کر ہم لوگ گاڑی سے اتر گئے اور سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ پدیاترا کے دوران ہم ایک مقام پر پہنچے۔ یہاں ایک نیا منظر ہمارے سامنے تھا۔ یہ ایک بڑا مندر تھا، اس کے چاروں طرف دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ان دکانوں کی تعداد ۸۰ تھی۔ گویا یہ ایک مندر کامپلکس تھا۔ اس مندر کے چاروں طرف سولہ راستے تھے۔ یعنی ۱۶ سڑکیں جو مندر سے شروع ہو کر شہر کی طرف جا رہی تھیں اس قسم کا مندر میں نے پہلی بار دیکھا۔

اس مندر کے قریب ہی ایک مسجد کا نیا گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک زیر تعمیر مسجد تھی جو اب تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑی مسجد ہے۔ قدیم مسجد میں کافی توسیع کر کے تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اس کو از سر نو بنوایا جا رہا ہے۔

ہم نے پایا کہ یہاں اگرچہ دونوں پاس پاس ہیں مگر نہ مسجد والوں کو مندر سے کوئی شکایت ہے اور نہ مندر والوں کو مسجد سے کوئی شکایت۔ لاتور کے ہندو اور مسلمان دونوں مل جل کر امن کیساتھ رہ رہے ہیں۔ حالیہ ہنگامہ خیز دنوں میں بھی یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی جیسی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی۔

یہاں کے مسلمانوں کو پُر امن زندگی کی یہ قیمت ملی ہے کہ اس علاقہ میں وہ خوشحالی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ بڑی بڑی تجارتیں کر رہے ہیں۔ اس لیے لاتور اس بے بنیاد نظریہ کی تردید ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق دراصل اس بات سے ہے کہ لوگ اس حقیقت کو بھول جائیں کہ زندگی کا ایک لازمی اصول اعراض ہے۔ اجتماعی زندگی میں ناخوش گواریاں ضرور پیش آتی ہیں۔ ایسے مواقع پر اعراض نہ کرنے سے فساد ہوتا ہے، اور اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ہر فساد کو روک دیتا ہے۔

۱۹ دسمبر کا پروگرام مکمل کرنے کے بعد آج کی رات ناندیڑ میں گذاری۔ یہاں ایک ہندو تاجر

ہمارے میزبان تھے۔ ناندیڑ میں بڑی تعداد میں الرسالہ کے قارئین موجود ہیں۔ مگر شانتی یاترا کا پروگرام بہت کم وقت میں بنا تھا۔ اس لئے مقامی طور پر اس کی زیادہ پبلسٹی نہ ہوسکی۔ چنانچہ قارئین الرسالہ کی بہت تھوڑی تعداد سے ملاقات ہوسکی۔

آل انڈیا ریڈیو (ناندیڑ) کی ٹیم نے ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا موضوع اسلام تھا۔ انٹرویو رنے پوچھا کہ اسلام کیا ہے، اس کے بارہ میں آپ ہمارے سننے والوں کو بتائیں۔ میں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں ۱۰ منٹ تک کچھ بنیادی باتیں بتائیں۔ میں نے خاص طور پر دو آیتوں کی تشریح کی۔ ان مع العسر یسرا۔ اور و أما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

اس سفر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہندو صاحبان اسلام کے بارہ میں سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جب بھی میں نے اسلام کے حوالے کے بغیر عمومی انداز میں کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے تقاضا کیا کہ آپ اسلام کے حوالے سے ہمیں بتائیں۔ ہم ایک عالم کی زبان سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے۔

ناندیڑ میں ہمارا رات کا قیام مسٹر پرکاش چند سیٹھی کے نئے تعمیر شدہ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ وہ ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کی کمپنی کا نام سری شانتی روڈویز ہے۔ میری عادت ہے کہ میں ہر آدمی سے اس کے اپنے میدان کی بات کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ سنانے سے زیادہ سننے کا شوق رہتا ہے۔ میں نے مسٹر سیٹھی سے کہا کہ ہم نے اس سفر کے دوران سڑکوں پر چھ ٹرک الٹے ہوئے دیکھے۔ آخر سڑک کے یہ حادثات کیوں ہوتے ہیں۔ کیا اس کا سبب انجن کی خرابی ہے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ سڑک کا کوئی حادثہ انجن کی خرابی کی وجہ سے ہو۔ وہ تقریباً ہمیشہ ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو گاڑیاں اس وقت استعمال ہو رہی ہیں، ان کے بریک اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ بہت ہی کم اس کا چانس ہوتا ہے کہ وہ فیل ہوجائیں۔ اصل یہ ہے کہ ڈرائیور کبھی نشہ میں ہوتا ہے۔ کبھی رات کو گاڑی چلاتے ہوئے اس کو جھپکی آجاتی ہے۔ اس بنا پر حادثہ پیش آجاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ انسانی زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ عام انسانوں کی حیثیت گاڑی جیسی ہے، اور لیڈر کی حیثیت ڈرائیور جیسی۔ سماج میں جو فسادات پیش آتے ہیں وہ حقیقۃً عام انسانوں کی

کسی خرابی کی وجہ سے پیش نہیں آتے ۔ وہ ہمیشہ لیڈروں کی نالائقی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اگر یہ لیڈر اپنے گھروں میں چپ ہو کر بیٹھ جائیں تو موجودہ فسادات اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس کے بعد فطرت انسانوں کی رہنما ہوگی۔ اور فطرت کبھی رہنمائی میں غلطی نہیں کرتی۔

ناندیڑ میں ہم لوگ یہاں کا مشہور گوردوارہ دیکھنے گئے جو گرو گوبند سنگھ کے نام پر بنا ہے۔ یہ بہت بڑا اور بہت صاف ستھرا ہے۔ وہ ایک مکمل سکھ ادارے کے طور پر چلایا جارہا ہے۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں کے دسویں اور آخری گرو ہیں۔ وہ ۱۶۶۶ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خالصہ تنظیم قائم کی جو ایک مسلح سکھ تنظیم تھی۔ وہ پنجابی کے علاوہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے دسم گرنتھ کو مرتب کیا۔

ایک روز وہ اپنے مریدین کے درمیان تھے۔ لمبے مراقبہ کے بعد اچانک انھوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ میری تلوار ایک سر مانگتی ہے۔ تم میں سے کون یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ اضطراب اور خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد ایک شخص اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں اس قربانی کے لئے تیار ہوں۔ گوبند سنگھ اور وہ آدمی دونوں ایک بند خیمہ میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد گوبند سنگھ خون آلود تلوار کے ساتھ باہر آئے۔ اور دوبارہ اسی قسم کی قربانی کی مانگ کی۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک کے بعد ایک پانچ آدمی "قربان" ہو گئے۔ آخر میں پانچوں آدمی زندہ حالت میں باہر آئے۔ گرو گوبند سنگھ نے صرف ان کی وفاداری کو آزمایا تھا۔ اس کے بعد ان پانچ افراد کو "پنج پیارا" کا لقب دیا گیا۔ یہ اس خالصہ تنظیم کے بنیادی ارکان تھے جو انھوں نے ۱۶۹۹ میں قائم کی۔

گرو گوبند سنگھ سکھوں میں فائٹنگ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک طرف مغلوں سے اور دوسری طرف پہاڑی قبائل سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں انھوں نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ تاہم ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء میں وہ ناندیڑ میں قتل کر دئے گئے۔ ان کی قتل گاہ پر ناندیڑ کا موجودہ گوردوارہ بنا ہوا ہے۔

مغل دارو گیر کے زمانہ میں گوردواروں کی ایک بڑی تعداد ہندو مہنتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ برٹش دور میں سکھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کوشش کے بعد آخر کار برٹش حکومت

نے ۱۹۲۵ میں سکھ گورودوارہ ایکٹ پاس کیا۔ اس کے تحت تمام گوردوارے دوبارہ سکھوں کو واپس مل گئے۔
(IV/805)

یہی قصہ ایک اور شکل میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ برٹش دور میں مسلمانوں کی بہت سی مسجدیں اور مقبرے وغیرہ آرکیالوجی کے قبضہ میں چلے گئے۔ مگر مسلم رہنما انگریزوں کے خلاف سیاسی لڑائی لڑنے میں اتنا زیادہ مشغول ہوئے کہ ان کو یاد نہ رہا کہ کثیر تعداد میں مسجدیں اور دوسرے بڑے بڑے مسلم مقامات آثار قدیمہ کے قانون کے تحت سرکاری قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں واگزاری کی کوشش نہ کی۔ یہاں تک کہ ملک آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مزید شدید تر مسائل پیدا کر دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ انتہائی قیمتی جگہیں بدستور سرکار کے محکمہ آثار قدیمہ کے قبضہ میں باقی رہ گئیں۔

۲۰ دسمبر کو ساڑھے دس بجے ہم پربھنی میں داخل ہوئے۔ شانتی یاترا یہاں کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچی۔ یہاں کافی بڑا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر ہماری پارٹی کے مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۹۲) میں درمیانی صفحہ پر ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا:

The Disorientation Goes on

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اصل مسئلہ رخ سے بے رخ ہونے (disorientation) کا ہے۔ یہاں ہمارے لئے عمل کا رخ بگڑ گیا ہے۔ میں نے اس عنوان کو لے کر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اصل واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہمیں جس رخ پر اپنی کوششوں کو جاری کرنا چاہئے تھا، اس رخ پر ہم اپنی کوششوں کو جاری نہ کر سکے۔ اس لئے ہماری تمام کوششیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ آزادی کے بعد ہر ایک نے یہ کیا کہ دوسروں سے وہ اپنے جھگڑے نپٹانے میں لگ گیا۔ مثلاً اپنی زبان کو منوانا اور لسانی اسٹیٹ بنانا۔ اپنے مذہبی قانون کو منوانا اور اپنے لئے علیحدہ قانون بنوانا۔ اپنے تشخص کا مطالبہ لے کر اٹھنا اور دوسروں سے اس بات پر لڑنا کہ ہمارا تشخص بحال کرو۔

یہ سب کوششوں کے غلط رخ تھے۔ اصل رخ صرف ایک تھا، اور وہ تعلیم تھا۔ اگر ۱۹۴۷ کے بعد

سارا زور تعلیم پر دیا گیا ہوتا تو ہمارے بقیہ مسائل اپنے آپ حل ہو جاتے۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنانا قوم کو باشعور بنانا ہے۔ اور جو لوگ باشعور ہو جائیں ان کے بقیہ تمام مسائل اپنے آپ حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہنگولی میں شانتی یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمام مسلمان علامہ اقبال کے پرستار ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک حدیث کے حوالے سے کہا ہے کہ ہندستان وہ ملک ہے جس کے بارہ میں پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس کی طرف سے مجھ کو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے　　میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

میں نے کہا کہ ہمارے پیغمبر کو جس ملک میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں، وہاں رہ کر ہم کو بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ملنے چاہئیں۔ جہاں پیغمبر کو ٹھنڈی ہوا ملی وہاں ہم کو گرم ہوا ملے تو ہم کو اس جگہ سے شکایت نہیں ہونی چاہئے بلکہ خود اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ ایسا تو نہیں کہ خود ہماری کسی غلطی سے وہاں کی ٹھنڈی ہوا ہمارے لئے گرم ہوا بن گئی ہو۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک اصل معاملہ یہی ہے۔ ہم اس ملک میں پیغمبر والے احساس کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں۔ وہ صبر کے احساس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم بے صبری کے احساس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا ہے کہ ٹھنڈی ہواؤں کا دیش ہمارے لئے گرم ہواؤں کا دیش بن گیا ہے۔

۲۰ دسمبر کو ہم آکولہ میں تھے۔ پروگرام کی تکمیل کے بعد شام کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کے ایک تاجر مسٹر دلیپ کوٹھاری (Tel. 26688) کے یہاں کھایا۔ کھانے کے بعد واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک نوجوان تولیہ لے کر آیا۔ اس نے کہا: مولانا صاحب، میرا نام محبوب ہے، میرے لئے دعا کریں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تندرست اور خوش پوش نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ مجھ کو بہت مانتے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔

اس کے بعد مسٹر کوٹھاری نے کہا کہ ہمارے علاقہ میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ دیکھئے یہ مسلمان لڑکا ہمارے یہاں دس سال سے گھریلو ملازم کے طور پر ہے۔ مگر ہم اس کو اپنے بیٹے کی طرح رکھتے ہیں۔

ایک مسلمان لڑکی سے اس کی شادی بھی ہم نے خود کرائی ہے۔ دونوں خوشی خوشی ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں۔

انسان عام طور پر فطرت کی سطح پر جیتے ہیں۔ اور فطرت کی سطح پر ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان اچھے تعلقات ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے لیڈر جھوٹے اشولے کر لوگوں کی سوچ بگاڑ دیتے ہیں اور یہیں سے فساد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ نا اہل لیڈر فطرت کے نظام کو بگاڑنے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے: لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔

آکولہ میں ۶ دسمبر کے بعد کچھ فسادات ہوئے اور جان و مال کا نقصان بھی ہوا۔ مسٹر رویندر کمار نے بتایا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک درگاہ ہے۔ ۶ دسمبر کی صبح کو کچھ ہندوؤں نے درگاہ پر دھاوا کر دیا۔ اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ مگر اس کے بعد خود ہندوؤں نے اس پر افسوس ظاہر کیا۔ اسی دن شام کو بہت سے ہندو درگاہ پہنچے۔ انھوں نے اس کی مرمت اور تعمیر شروع کر دی۔ وہ لوگ ساری رات کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۸ دسمبر کی صبح طلوع ہوئی تو درگاہ دوبارہ بن کر تیار ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ درگاہ کی دوبارہ تعمیر حقیقۃً فطرت انسانی کا کارنامہ تھا۔ انسان کی فطرت میں شرمندگی (repentance) کا نہایت گہرا جذبہ ہے۔ انسان غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ پچھتاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر فریق ثانی دوبارہ غلطی کر کے انسانی فطرت کے عمل کو روک نہ دے تو یہ فطرت ضرور کام کرے گی ــــــ تخریب کے بعد خود شرمندہ ہو کر دوبارہ تعمیر کے کام میں لگ جائے گی۔

شانتی یاترا کے دوران ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہم لوگ امراوتی پہنچے تھے۔ حسب معمول سڑکوں پر پدیاترا کے بعد ہم ایک مقام پر ٹھہرے۔ یہاں ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اچاریہ منی سوشیل کمار اور سوامی چیدانند نے اپنی تقریریں میں لوگوں سے شانتی قائم رکھنے کی اپیل کی۔

میں کھڑا ہوا تو سفر کے دوران نفرت کا ماحول اور فساد کے مناظر دیکھنے کی وجہ سے میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ تقریر شروع کی تو میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: شانتی یاترا کس لئے نکلی ہے۔ یہ شانتی یاترا اس لئے نکلی ہے کہ جس آگ کو فائر بریگیڈ

کا پانی نہ بجھا سکا، اس کو سنت اور فقیر کے آنسوؤں سے بجھا دیا جائے۔

عجیب بات ہے کہ شانتی یاترا سے واپسی کے بعد ۲۹ دسمبر کا اخبار آیا تو اس میں یہی بات پرائم منسٹر نرسمہا راؤ کے حوالے سے چھپی ہوئی تھی۔ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۲ میں شکاگو کی کانفرنس میں ایک خطبہ دیا تھا۔ اس کے سوسالہ جشن کے طور پر کنیا کماری میں راشٹر چیتنا (قومی بیداری) کی تقریب منائی گئی۔ اس موقع پر پرائم منسٹر نرسمہا راؤ نے شرکت کی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

دیش آج بحران سے دوچار ہے۔ اس بحران کی گھڑی میں ہم کو روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ سیاست دانوں کے مقابلہ میں عوام کے جذبات کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ ملک رہنے کی زیادہ بہتر جگہ ہو جائے گا۔ مجھے اس حقیقی راستہ کی تلاش ہے جس پر آئندہ اس ملک کو چلنا چاہئے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ دسمبر ۱۹۹۲) کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ ایک ایسے پیاسے مسافر کی طرح ہیں جو پانی کی تلاش میں ہے۔ مگر افسوس کہ پانی کے بجائے میں ایک سراب میں جا پڑا:

> He was like a thirsty traveller looking for water. But instead of water, I stepped into a mirage (p. 4).

ایک جگہ مجھے معلوم ہوا کہ جلوس پر فساد ہوا۔ کچھ مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا۔ دوسرے فرقہ کے لوگوں نے روک ٹوک کی۔ اب دونوں طرف کے لوگ مشتعل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا میں سب سے بڑی بدعت جلوس ہے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ جلوس نکالنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ بالفرض اگر جلوس کو جائز سمجھا جائے تو وہ ان لوگوں کے لئے جائز ہوگا جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جمہوریت میں مظاہرہ کا حق ہے اور جلوس دراصل مظاہرہ کے لئے نکالا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ برداشت والے لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام مظاہرہ ہے، اور بے برداشت لوگ اگر جلوس نکالیں تو اس کا نام فساد۔ اور فساد کسی بھی قانونی نظام میں جائز نہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ مشن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن احیاء دین کا مشن ہے۔ الرسالہ کا مشن امت کو قرآن وسنت کی طرف بلانا ہے۔ الرسالہ کا مشن وہی ہے جو ہر دور میں مصلحین امت کا مشن رہا ہے۔ ایک مشہور دینی حلقہ کی طرف سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کے ٹائٹل کے صفحہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے: شعارنا التوحید الی الاسلام من جدید۔ ایک اور بڑے دینی حلقہ کی طرف دوسرا عربی ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ فقرہ درج ہوتا ہے ــــ دعوتنا: عودۃ بالامۃ الی الکتاب والسنۃ۔

تمام دینی حلقے اور تمام اسلامی جماعتیں اس قسم کے الفاظ میں اپنا مقصد ظاہر کرتی ہیں۔ الرسالہ مشن کے سامنے بھی عین یہی نشانہ ہے۔ ہمارے اور دوسروں کے درمیان جو فرق ہے وہ اصول کا نہیں طریقہ کا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں جو دین مسلم ہے وہی ہمارا دین بھی ہے۔ البتہ اس کو پیش کرنے کے لئے ہم نے عصری اسلوب اختیار کیا ہے۔

۶ دسمبر کے بعد ہونے والے بمبئی کے فساد میں دو سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہ سب کے سب سلم علاقے میں رہنے والے لوگ تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ بمبئی کے سلم علاقوں میں فساد ہوا، مگر یہاں کی کالونیوں میں فساد نہیں ہوا۔

انھوں نے جواب دیا کہ ایک سادہ سی مثال سے آپ اس کی وجہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ مکان جس میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں، اس میں ہر کمرہ کے ساتھ الگ الگ ٹائلیٹ موجود ہے، لیکن اگر آپ سلم علاقہ میں جائیں تو آپ پائیں گے کہ وہاں ایک سو آدمی پر ایک ٹائلیٹ کا اوسط ہے۔ ہر ٹائیلٹ پر آدمیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی ہے۔ فساد کی سب سے بڑی وجہ اسی قسم کی بھیڑ ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے۔ اگر لوگوں میں تعلیم بڑھ جائے اور لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے تو اس قسم کے لڑائی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یہ پورا سفر اتنے بندھے ہوئے پروگرام کے تحت ہوا کہ مشکل سے کہیں اس کا موقع ملا کہ کسی جگہ ٹھہر کر اخبار پڑھا جائے۔ چنانچہ اخبارات زیادہ تر سفر کے دوران گاڑی میں پڑھے گئے۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر ۱۹۹۲) میں صفحہ ۸ کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی:

Tirupati temple's income on the rise

خبر میں بتایا گیا تھا کہ آندھرا پردیش کی ترو کلا پہاڑیوں میں واقع وینکٹیشورکے مندر میں اس کے عقیدت مندوں کی طرف سے حاصل ہونے والی رقم میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ ۱۹۲۰ میں اس مندر میں ایک سال کے اندر ۱۰ لاکھ روپئے وصول ہوئے۔ مئی ۱۹۹۲ میں صرف ایک گم نام عقیدت مند نے ۲۷ لاکھ روپئے لاکر مندر کے بکس میں ڈال دیئے۔

زائرین کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ۱۹۹۱ میں صرف ایک دن میں پچاس ہزار آدمیوں نے آکر مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ یہاں آنے والے زائرین جو بال کٹواتے ہیں وہ خود اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ۹۲-۱۹۹۱ کے درمیان جمع ہونے والے بال کی مقدار دو لاکھ کیلوگرام سے زیادہ تھی۔ اور ان کو بیچ کر مندر کے ٹرسٹ کو ۱۸ ملین روپیہ حاصل ہوا۔ ریلوے کی طرف سے ۲۷ کنکٹنگ ٹرینیں تروپتی کے لئے چلائی گئی ہیں۔ اور اب مندر میں آنے والوں کا اوسط روزانہ ۶۰ سے ۷۰ ہزار تک ہوتا ہے۔

یہ تمام تر برکتی مذہب کا کرشمہ ہے جو ہر مذہب میں اور ہر مقام پر جاری ہے، اور اسی طرح خود مسلمانوں میں بھی۔ ہر مذہبی بھیڑ برکتی مذہب کی بھیڑ ہوتی ہے۔

ہماری پارٹی کے ایک فرد جسٹس چندر شیکھر دھرمادھیکاری (ریٹائرڈ) بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بتایا کہ آزادی سے پہلے ۱۹۲۰ کے لگ بھگ زمانہ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے ایک جلسہ میں ایک مسلمان بیرسٹر مسٹر عالم تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ بیرسٹر صاحب، آپ پہلے مسلمان ہیں یا پہلے ہندستانی ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے جواب دیا کہ میرے بھائی آپ نے سوال صحیح نہیں کیا۔ آپ کو ابھی سوال کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہئے۔ یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ پہلے اپنی ماں کے ہو یا پہلے اپنے باپ کے ہو۔ انھوں نے کہا کہ آدمی بیک وقت اپنے باپ کا بھی ہوتا ہے اور اپنی ماں کا بھی۔ اسی طرح میں بیک وقت مسلمان بھی ہوں اور اسی وقت ہندستانی بھی۔

جسٹس چندر شیکھر نے یہ تقریر ۲ دسمبر کو ناگپور میں اہنسا بھون کے جلسہ میں کی۔ اس کو سن کر میں نے کہا کہ اس سوال کا سب سے زیادہ فطری جواب یہی ہے۔ ہمارے بعض لیڈروں کا یہ کہنا کہ "میں پہلے مسلمان ہوں اور اس کے بعد ہندستانی ہوں" بلاشبہ ایک لغو بات ہے۔ اس کا تعلق نہ

اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ امن کارواں کئی گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ ایک گاڑی میں اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس گاڑی کا ڈرائیور ایک مسلمان تھا۔

منتظمین نے گاڑی کے اندر پھل، میوے، چائے وغیرہ کافی مقدار میں رکھ دیا تھا۔ راستہ میں جب بھی کوئی کھانے کی چیز نکالی جاتی تو میں نے دیکھا کہ سوامی چیدانند جی اصرار کے ساتھ مسلمان ڈرائیور کو اس میں شریک کرتے۔ پورے راستہ میں وہ اسی طرح ڈرائیور کے ساتھ بالکل برابری کا سلوک کرتے رہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ڈرائیور صاحب غلط راستہ پر مڑ گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہم غلط راستے پر آ گئے ہیں۔ پھر گھوم کر صحیح سڑک پر آئے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگ منزل پر پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئے اور پروگرام بھی گڑبڑ ہو گیا۔

اس وقت سوامی چیدانند جی نے نہایت تاکید کے ساتھ ہم لوگوں سے کہا کہ منزل پر پہنچ کر کوئی بھی شخص یہ لفظ منھ سے نہ نکالے کہ ہم لوگ تو صحیح وقت پر روانہ ہوئے تھے مگر ڈرائیور صاحب کی غلطی سے دیر ہو گئی۔ اس کی ذمہ داری ہم لوگ اپنے اوپر لے لیں۔ ڈرائیور پر ہرگز اس کی ذمہ داری نہ ڈالیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور ڈرائیور صاحب باز پرس سے بچ گئے۔

۲۱ دسمبر کو واردھا پہنچے۔ واردھا کا لفظ پہلی بار تقسیم ہند سے پہلے اس وقت میرے علم میں آیا جب کہ ظفر علی خاں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر لکھا تھا:

آئیں ابوالکلام جو واردھا سے گھوم کر

تحریک آزادی میں واردھا کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ کیوں کہ یہاں مہاتما گاندھی نے ایک بستی بسائی تھی جو سیواگرام آشرم کے نام سے مشہور ہوئی۔ مہاتما گاندھی کے بعد ان کے شاگرد ونوبا بھاوے ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے۔ دیکھنے سے پہلے واردھا کے بارے میں ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ مگر جب شانتی یاترا کے ساتھ میں اس کی سڑکوں سے گزرا تو وہ مجھے عام شہروں جیسا ایک شہر نظر آیا۔

یہاں سے ہم لوگ سیواگرام پہنچے۔ مہاتما گاندھی نے اپریل ۱۹۳۶ میں اس کو واردھا شہر کے

کنارے قائم کیا تھا۔ یہ ایک پرسکون مقام ہے جہاں کھلے میدانوں اور ہرے درختوں کے درمیان جگہ جگہ جھونپڑے (huts) بنے ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک گاندھی جی کا جھونپڑا ہے جو صرف لکڑی اور مٹی کا بنا ہوا ہے۔ تمام جھونپڑوں کے اوپر منگلور ٹائل لگے ہوئے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے جھونپڑے کو "باپوکٹی" کہا جاتا ہے۔ وہ انتہائی سادہ تھا۔ جنوری ۱۹۷۸ میں میکسیکو کے آئیوان ایلچ (Ivan Illich) یہاں آئے تھے۔ وہ باپوکٹی کی سادگی سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ روزانہ دیر دیر تک یہاں دھیان لگا کر بیٹھے رہتے تھے تاکہ اس سے روحانی فیض حاصل کریں۔ برٹش گورنمنٹ نے بطور خود یہاں ٹیلی فون لگوایا تھا تاکہ برطانی ذمہ دار مہاتما گاندھی سے بات کر سکیں۔

گاندھی جی کے ایک شاگرد مسٹر گنیش دتہ گادرے (۷۲ سال) نے بتایا کہ گاندھی جی کی اس غریبی پر امیرانہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر گادرے کے بیان کے مطابق، مسز سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹-۱۸۷۹) نے تقسیم سے پہلے ایک بار کہا تھا کہ گاندھی کی غریبی کو باقی رکھنے کے لئے برلا کو دو ہزار روپیہ روزانہ خرچ کرنا پڑتا ہے:

It takes Birla two thousand rupees per day to keep Gandhi poor.

واضح ہو کہ یہ پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دو ہزار روپیہ روزانہ آج کے لحاظ سے ۲۰ ہزار روپیہ روزانہ سے بھی زیادہ تھا۔

۲۱ دسمبر کو سیوا گرام کی ایک نشست میں میں نے کہا کہ یہاں کا پورا ماحول سکون اور شانتی کا ماحول ہے، ہم چاہتے ہیں کہ سکون اور شانتی کا یہی ماحول پورے ملک میں عام ہو جائے۔ میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے آزادی کی تحریک میں عوام کو نان وائیلنس (اہنسا) کی بنیاد پر موبیلائز کیا تھا۔ ہم تعمیر ملک کی تحریک کو دوبارہ نان وائیلنس کی بنیاد موبیلائز کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ میں جہاں مہاتما گاندھی کا مشن ختم ہوا تھا، وہیں سے دوبارہ ہمیں اپنے عمل کا آغاز کرنا ہے۔

شانتی یاترا میں میرے ساتھ ایک بڑے ہندو گرو بھی تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ لوگ ان کے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور ان سے آشیرواد (برکت) لے رہے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو لوگ اتنا زیادہ عظمت

دینے لگتے ہیں۔ یہی چیز خود مسلمانوں میں بھی "اکابر" کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ درحقیقت انسانی فطرت میں چھپے ہوئے جذبۂ عبودیت کا غلط استعمال ہے۔ عبودیت کا جذبہ ہر انسان میں نہایت طاقت ور صورت میں موجود ہے۔ وہ اس لئے تھا کہ خدا کو اس کا مرجع بنایا جائے۔ مگر نادان لوگ خود ساختہ اکابر کو اس کا مرجع بنا لیتے ہیں۔

جو لوگ انسانی اکابر کو اپنے جذبۂ عبودیت کا مرکز بناتے ہیں، ان سے آپ ملیں تو وہ ہمیشہ سکون اور آنند کی بات کریں گے۔ جب کہ اصحاب رسول کے یہاں ہم پاتے ہیں کہ ان کے ایمان باللہ نے ان کو بے چینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی اکابر کے یہاں احتساب (accountability) کا کوئی تصور نہیں ہوتا، جب کہ خدا کے یہاں احتساب کا تصور شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ عبودیت، احتساب کے بغیر آنند ہی آنند ہے، اور عبودیت، احتساب کے ساتھ درد ہی درد۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو تاجر نے کہا کہ مسلمانوں میں ایک کمزوری ہے، اور وہی ان کی ساری مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ مسلمان بہت آسانی سے کسی شوشہ کی بات پر بپھر جاتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے کہ مسلمان ترقی نہ کریں وہ مسلمانوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک ان کو شوشوں میں الجھائے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت جو اپنی ترقی میں لگنا چاہئے وہ دوسروں سے لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا حل صرف ایک ہے ــــ مسلمانوں کو اتنا زیادہ باشعور بنا دیا جائے کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی وہ مشتعل نہ ہوں۔ یہاں اشتعال انگیزی کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مشتعل ہونے والے لوگ مشتعل ہونا چھوڑ دیں۔

۲۱ دسمبر کی شام کو ہم ناگپور میں داخل ہوئے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک جگہ دیکھا کہ ایک بینر لگا ہوا ہے۔ اس پر ہندی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

رام للا ہم آئیں گے　　مندر وہیں بنائیں گے۔

دہلی کے مسلم محلہ میں اسی قسم کا نعرہ میں نے برعکس صورت میں دیکھا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے درمیان کالا کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ اس پر یہ لکھا ہوا تھا:

مورتیوں کو ہٹاؤ　　مسجد وہیں بناؤ

ایک آدمی پہلے نعرہ کو دیکھ کر ہندو کو برا کہے گا اور دوسرے نعرہ کو دیکھ کر مسلمان کو۔ مگر میں کہونگا کہ یہ نعرے ہندوؤں یا مسلمانوں کے نعرے نہیں ہیں۔ یہ نعرے صرف کچھ جاہلوں کے نعرے ہیں۔ ہمارے دیش میں ابھی تک ۷۰ فی صد آدمی جاہل ہیں۔ یہی جہالت تمام جھگڑوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر اس ملک سے جہالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد تمام بے فائدہ جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ جو آدمی بھی ملک میں ترقی چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ تعلیم کے کام میں اپنے آپ کو لگا دے۔

ناگپور کو آر ایس ایس کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی تقریر میں میں نے خاص طور پر یہ بات کہی کہ مسائل کا حل ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ تدبیر ہے۔

ناگپور میں جناب عبدالسلام صاحب اور جناب حنیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ اپنے تجارتی مشاغل کے ساتھ دین کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔

عبدالسلام صاحب نے آکاش بلڈنگ کے نام سے ایک عمارت بنائی ہے۔ اس میں آٹھ اپارٹمنٹ ہیں۔ اور نیچے کے حصہ میں چار دکانیں ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر انھوں نے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنائی ہے۔ عمارت اور دکان کے افراد یہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے اندر تقریباً چالیس آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ واچ مین کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ وقت پر اذان دیدے۔ فجر کے وقت وہ ہر فلیٹ پر آکر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ اس طرح اس بلڈنگ میں نماز باجماعت کا نظام قائم ہے۔ یہ ایک اچھا نمونہ ہے جو قابل تقلید ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک سرگرم ممبر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے رام مندر کے نام پر جو آندولن چلایا اور ۶ دسمبر کو اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کو سامنے رکھ کر آپ سوچیں تو آپ مانیں گے کہ اس معاملہ میں آپ کے لئے چوائس مندر اور مسجد کے درمیان نہیں تھا، بلکہ مسجد اور انارکی کے درمیان تھا۔ کیوں کہ مسجد کو ڈھا کر جو چیز آپ نے پائی ہے وہ حقیقۃً مندر نہیں ہے بلکہ انارکی ہے جس نے پورے دیش کے مستقبل کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو دیش سے محبت ہے تو آپ لوگوں کو وہی کرنا چاہئے جو ۱۹۲۲ء میں مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ انھوں نے اہنسا کی بنیاد پر نان کوآپریشن کی تحریک چلائی۔ مگر جب چورا چوری کے مقام پر کانگریسی کارکنوں نے تشدد کا واقعہ کیا تو انھوں نے فوراً ہی اپنی تحریک روک دی اور اس

کو ہمالیائی غلط اندازہ (Himalayan miscalculation) قرار دیا۔ آپ لوگوں کے لئے صرف افسوس کا اظہار کافی نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنی تحریک کو مکمل طور پر روک دینے کا اعلان کریں۔ اس سے کم درجہ کی کوئی بھی چیز آپ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

ناگپور میں شانتی یاترا ختم ہوگئی۔ اب ہمیں ناگپور سے دہلی واپس جانا تھا۔ مگر پائلٹوں کی ہڑتال کی وجہ سے تمام ملک میں پروازیں معطل ہو رہی ہیں۔ صرف ٹرنک روٹ پر مشکل سے پروازوں کا سلسلہ باقی رکھا جا سکا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں نے طے کیا کہ ناگپور سے بمبئی جائیں۔ اور بمبئی سے دہلی کے لئے ہوائی جہاز پکڑیں۔

ناگپور سے دہلی پہنچنے کے لئے ہمیں صرف ۱۰۹۵ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ مگر ناگپور سے بمبئی اور پھر بمبئی سے دہلی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہماری منزل ۲۲۷۱ کیلو میٹر لمبی ہوگئی۔ "قریب" جب قابل عمل نہ ہو تو "دور" ہی زیادہ قریب بن جاتا ہے۔

۲۲ دسمبر کو ہم لوگ انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۱۴۷ کے ذریعہ ناگپور سے بمبئی پہنچے۔ یہاں قیام کرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۱۸۳ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ دہلی پہنچنے کے بعد بظاہر شانتی یاترا ختم ہوگئی۔ مگر میں نے سوچا کہ اصل کام تو اب شروع کرنا ہے۔ یعنی شانتی یاترا کے تجربہ کو مزید آگے بڑھانا ہے۔ چنانچہ مسٹر شانتی لال موتھا نے کہا کہ ہم اس شانتی اندولن کو پورے دیش میں چلائیں گے۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر) کے درمیانی صفحہ پر دو مضمون چھپے ہوئے تھے۔ ایک امولیا گنگولی کا تھا۔ اس مضمون میں ملک کے لوگوں کی غیر سنجیدہ سوچ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا یہ تبصرہ نقل کیا گیا تھا کہ ہوش وحواس کی بات کون سنتا ہے:

Who's going to listen to the voice of sanity.

انھوں نے ملک کی تاریک صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر یہی حالت باقی رہی تو اجودھیا کے واقعہ کے بعد انڈیا اعتباری بحران (credibility crisis) میں مبتلا ہو جائے گا۔ انڈیا دوسرا لبنان یا دوسرا یوگوسلاویہ بن جائے گا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے

کہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقابل کے ذریعہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آپ یوں دیکھئے کہ ۶ دسمبر کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ مگر مسلمانوں نے مقابلۃً بہت ہی کم ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر ایک بابری مسجد کے انتقام میں پاکستان میں ۶۰ مندر ڈھائے گئے۔ گویا ایک کے بدلے میں ساٹھ۔ اس تناسب سے انڈیا کے ہندوؤں کو ۳۶۰۰ مسجدیں گرانا چاہئے تھا۔ پاکستانیوں نے بلڈوزر کے ذریعہ مندروں کو گرایا تو انڈیا میں ڈائنامائٹ کے ذریعہ مسجدوں کو ڈھانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

اس تقابل میں امید کا پہلو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا کے لوگوں کا جذباتی ابال ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح تناسب سے متجاوز نہیں ہو جاتا۔ یہ برداشت کی علامت ہے، اور برداشت بلاشبہ سب سے بڑی چیز ہے۔

۲۳ دسمبر کا دن بمبئی میں گزارا۔ کئی لوگوں سے ملاقات اور گفت گو ہوئی۔ کچھ اخبارات پڑھے۔ ایک قابل ذکر ملاقات مسٹر راجندر سدرشن جین (۳۷ سال) سے تھی۔ ۹ سال کی عمر میں ہولی کے پٹاخے نے ان کی ایک آنکھ کو نقصان پہنچایا۔ اس کا آپریشن کرایا تو سرجن کی غلطی سے دونوں آنکھ جاتی رہی۔ اب وہ مکمل طور پر نابینا ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بے تکلفی کے ساتھ اسی طرح ٹیلی فون نمبر ملا رہے ہیں جیسے کوئی آنکھوں والا ٹیلی فون نمبر ڈائل کرتا ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ ان کا ایک بڑا بزنس ہے۔ پورا بزنس وہ خود کنٹرول کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں تجارتی سفر کرتے ہیں اور بڑے بڑے تجارتی معاملات طے کرتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے اندر وہ چیز ہے جس کو چھٹی حس کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ چھٹی سنس کوئی مسٹریس چیز نہیں۔ جب آپ کے اندر سے کوئی سنس چلا جاتا ہے تو نیچر اس کی تلافی کرتی ہے اور آپ کے اندر اپنے آپ ایک اور سنس پیدا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے دیکھے بغیر ہر چیز کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور وہ اکثر درست ہوتا ہے۔

"تلافی" کا یہ اصول قدرت کے پورے نظام میں ہے۔ جب بھی آپ کوئی چیز کھوئیں تو پیشگی طور پر یقین کر لیجئے کہ کھونے کے ساتھ وہیں ایسے اسباب پیدا ہو چکے ہوں گے جو آپ کی محرومی کی تلافی کر سکیں۔ ہر محرومی اپنے ساتھ یافت کا سامان لئے ہوئے ہے۔

سوامی چیدانند رشی کیش کے سب سے بڑے آشرم کے چیرمین ہیں۔ ان کا مشن یورپ، امریکہ

آسٹریلیا، ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ سال بھر عالمی سفر پر رہتے ہیں۔

واپسی کے بعد رشی کیش سے سوامی جی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندو دھرم اور جین دھرم پر کتابیں تیار کرارہے ہیں۔ ان کے نام Hinduism and daily life اور Jainism and daily life ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ہمیں اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھ کر دیں جو Islam and daily life کے موضوع پر ہو۔ یہ کتاب تقریباً تین سو صفحہ تک ہوسکتی ہے۔ ہم ان کتابوں کو دنیا کی دس زبانوں میں چھاپ کر سارے ملکوں میں پھیلائیں گے۔

شانتی یاترا میں جب میں نکلا تو شروع میں میں نے اسلام کا نام لئے بغیر اخلاقیات کی زبان میں تقریر کی۔ مگر اسی دوران نجی مجلسوں میں اکثر میں قرآن وحدیث کی باتیں لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ سوامی چیدانند نے ایک دو تقریر سننے کے بعد کہا: مولانا صاحب، آپ ہم لوگوں کو قرآن وحدیث کی جو باتیں بتلاتے ہیں وہی آپ جلسہ میں بھی کہئے۔ وہ ہم کو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کی تقریروں میں قرآن وسنت کے حوالے سے میں اپنی بات کہنے لگا۔

شانتی یاترا سے پہلے نہ میں سوامی چیدانند کو جانتا تھا اور نہ وہ مجھ کو۔ دونوں ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ مگر دو ہفتہ کے ساتھ کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب وہ الرسالہ کے قاری بن گئے ہیں۔ اور وہ مجھ سے اسلام کے موضوع پر تین سو صفحہ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں تاکہ اس کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلائیں۔ دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ اور قربت غلط فہمی کو ختم کرکے دو اجنبیوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ کی رات کو بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ انڈین ایئر لائنز کا جہاز کئی گھنٹہ لیٹ ہوکر بمبئی سے روانہ ہوا۔ ایک ہم سفر نے کہا کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز سے سفر کریں گے اور سرکاری انڈین ایئر لائنز کو مسافر ملنا مشکل ہو جائے گا۔ الّا یہ کہ دوبارہ قانون کا سہارا لے کر لوگوں کو صرف سرکاری جہازوں میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

آج میں اپنے امن مشن کا پہلا دور ختم کرکے دہلی واپس جارہا تھا۔ میں نے سوچا کیا اس مشن میں مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے امریکہ کے فادر ڈیوائن (۱۹۶۵-۱۸۷۷) کی یاد آئی۔ انھوں نے امریکہ میں اسی قسم کا ایک مشن شروع کیا تھا جس کو امن مشن

(Peace Mission) کہا جاتا ہے۔ اس مشن میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی کا راز کیا تھا، مبصرین کا خیال ہے کہ اس کا راز اہل شاگردوں کی جاں نثاری (devotion of competent disciples) تھا۔ ان کو ایسے لائق شاگرد مل گئے تھے جو اس مشن میں اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

ایسے ہی افراد کسی مشن کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے ایسے ساتھی مہیا فرمائے۔ اگرچہ ہماری قوم میں آج سب سے زیادہ جو چیز نایاب ہے وہ بلاشبہ یہی ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد ایک صاحب نے پوچھا کہ شانتی یاترا جیسے کام کی کیا کوئی شرعی بنیاد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ اسی قسم کا ایک کام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حلف الفضول کی صورت میں ملتا ہے۔ آپ کی بعثت سے قبل مکہ کے کچھ معزز افراد نے مل کر ایک انجمن بنائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سماجی بگاڑ کو رد کیا جائے۔ مظلوم کی فریاد رسی کی جائے۔ یہ اگرچہ بعثت نبوی سے قبل کا واقعہ ہے۔ مگر بعثت کے بعد آپ نے یہ فرما کر اس کی تصدیق کر دی کہ اگر اسلام میں بھی مجھے اس کی طرف بلایا جائے تو میں اس کو قبول کر لوں گا (لو دعیت الیہ فی الاسلام لأجبت)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی انصاف اور مشترک اجتماعی مصالح کے تحفظ کی خاطر کثیر جماعتی تعاون کا طریقہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ ایسے مشترک پروگرام میں شرکت کرنا ایک ایسا دینی تقاضا ہے جس کی اہمیت خود سنت نبوی کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

ودیشا کا سفر

۳ جنوری ۱۹۹۳ کا واقعہ ہے۔ میں دہلی میں اپنے دفتر میں تھا کہ دو اجنبی آدمی اندر داخل ہوئے۔ اس دن سے پہلے میں ان سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ بھی اس سے پہلے میرے بارہ میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر ودیشا کے رہنے والے ہیں۔ سوامی ویویکا نند کے جنم دن ۱۲ جنوری کو ودیشا میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں وہ دہلی آئے تھے۔ انھوں نے اپنا نام ——— ویمل کمار اور پترو اشیشی (Pitru Ashishi) بتایا۔

ان سے میرے تعارف کا ذریعہ دہلی کے ہندی اخبار جن ستا کا ایک شمارہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ آج کے جن ستا میں ہم نے آپ کا ایک انٹرویو پڑھا۔ اس سے پہلے ہم آپ کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر اس انٹرویو کو پڑھ کر ہمیں یقین ہوگیا کہ اپنے جلسہ کے لئے ہمیں جس اسپیکر کی تلاش تھی وہ بس آپ ہی ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری دعوت کو قبول کریں اور ۱۲ جنوری کو ودیشا آکر ہمیں مارگ درشن کرائیں۔ آپ ہی اس میں مین اسپیکر ہوں گے۔

یہ میرے لئے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس وقت مدھیہ پردیش سے فرقہ وارانہ فساد کی خبریں آرہی تھیں۔ مذکورہ حضرات سے براہ راست کوئی واقفیت نہ تھی۔ ودیشا کا بھی میں نے صرف نام سنا تھا۔ تاہم مذکورہ صاحبان کے مخلصانہ اصرار پر میں نے ان کی دعوت منظور کرلی۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو بذریعہ مالوہ اکسپرس دہلی سے ودیشا کے لئے روانگی ہوئی۔ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو حسب معمول انسانوں کی بھیڑ ادھر سے اُدھر دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج کا انسان اپنی معاشی دوڑ میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کو کسی اور بات کے بارہ میں غور کرنے کی فرصت نہیں۔ اس پر ٹھہراؤ کا لمحہ صرف اس وقت آتا ہے جب کہ وہ موت سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر جب موت کی گھڑی آجائے تو کہنے کا وقت بھی ختم ہوجاتا ہے اور سننے کا وقت بھی۔

ٹرین میں داخل ہوکر میں اپنی برتھ پر سوگیا۔ قدیم زمانہ میں آدمی کو جاگ کر سفر کرنا پڑتا تھا آج آدمی سوتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا سفر بھی تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوتا رہتا ہے۔ جانور اپنے پاؤں سے چلتے ہیں۔ چڑیاں اپنے بازوؤں سے اڑتی ہیں۔ مگر انسان کے ساتھ کرمنا بنی آدم کا معاملہ کیا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں انسان جانوروں کی پیٹھ پر سواری کرتا تھا۔ اب وہ مشینی پہیہ یا مشینی بازو کے اوپر سفر کرتا ہے۔

۱۲ جنوری کی صبح کو نیند کھلی تو ودیشا کا ریلوے اسٹیشن قریب آچکا تھا۔ پلیٹ فارم پر اترتے ہی کانفرنس کے منتظمین مل گئے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر شہر آیا۔ یہاں میرا قیام مسٹر چڈھا کے مکان پر تھا۔

ودیشا ایک نہایت قدیم تاریخی شہر ہے۔ وہ دہلی سے ساڑھے چھ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ودیشا کی قدامت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم سنسکرت کتابوں، مہابھارت اور رامائن میں اس کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ موریہ اور گپتا راج کے زمانہ میں وہ ایک زبردست مذہبی، اقتصادی اور سیاسی مرکز تھا۔ ۱۲۳۵ میں وہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ ریاست مدھیہ پردیش کا ایک حصہ ہے۔

ودیشا میں کثرت سے بدھزم کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کچھ بدھسٹ اسٹوپا یہاں ایسے ہیں جن کی تاریخ دوسری صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ودیشا کے آس پاس کے علاقوں میں بھی دور تک قدیم آثار کھنڈر کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

ودیشا کے یہ آثار گویا اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ کسی کا حال خواہ کتنا ہی شاندار ہو، اس کا مستقبل بہرحال کھنڈر ہوکر رہتا ہے۔ اس میں استثناء صرف ان لوگوں کا ہے جو فانی چیزوں سے بلند سطح پر اپنے لئے زندگی کا راز دریافت کرلیں۔

رہائش گاہ پر کئی تعلیم یافتہ ہندو جمع ہوگئے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ لوگ زیادہ تر اسلام کے بارہ میں سوالات کرتے رہے۔

ایک صاحب نے شاہ بانو بیگم کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں اگر ایسا حکم ہے تو وہ بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر اسے گھر

سے نکال دے اور پھر اس کو گزر بسر کے لئے کچھ دینے سے بھی انکار کر دے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کو اس کے پورے ماحول میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بالکل درست ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حکم اس سماج کے لئے ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہو اور اسلام کا نظام قائم ہو۔ ایسے سماج میں حکومتی خزانہ (بیت المال) ہر ضرورت مند بیوہ کا پوری طرح کفیل ہوتا ہے۔ مطلقہ عورت کو سابق شوہر سے گزارہ نہ دلوا کر وہ حکومت کے خزانہ سے زیادہ بہتر طور پر اس کا گزارہ دلواتا ہے۔

سابقہ شوہر سے گزارہ لینا کسی عورت کے لئے باعزت طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام جب کسی مطلقہ عورت کو اس کے سابق شوہر سے گزارہ نہیں دلواتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کے لئے بے عزت گزارہ کے بجائے باعزت گزارہ کا انتظام کر رہا ہے۔

مگر ۱۹۸۶ میں کچھ مسلمانوں نے شاہ بانو بیگم کے نام پر جو اندولن چلایا اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ اس ملک کے قائم شدہ نظام میں سرکاری خزانہ سے گزارہ دلوانے کا انتظام نہیں ہے۔ پھر جب ایک مطلقہ کو حکومت کے خزانہ سے گزارہ دلوانا ہمارے اختیار میں نہیں تو ہم اس کو دوسرے ممکن ذریعہ سے لینے پر روک کیوں لگائیں۔

بھوپال کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ہمیشہ صلح حدیبیہ کی بات کرتے ہیں۔ اسلام میں تو جنگ بدر اور جنگ احد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ عمل ہمیشہ حالات کے مطابق کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں مختلف طریقے اختیار کئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ ہر روز آپ لوگوں سے بس جنگ بدر اور جنگ احد لڑ رہے ہوں۔

میں نے کہا کہ کچھ مسلمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں جمعہ کی نماز کی اذان بلند ہوتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص کہے کہ چلو مسجد، چلو مسجد، تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ تم تو بس ہر وقت مسجد اور نماز ہی کی بات کرتے ہو۔ آخر اسلام میں جنگ اور قتال کا حکم بھی تو ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو یقیناً آپ اس کو یہ جواب دیں گے کہ اس وقت اسلام کا جو حکم ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ہم اٹھیں اور وضو کر کے مسجد پہنچیں تاکہ جمعہ کی اجتماعی عبادت ادا کر سکیں۔

اسی طرح آج ملت کے جو حالات ہیں ان میں یہ دیکھنا ہے کہ کون سا حکم ہے جو اس وقت ہم سے مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہندو مسلم معاملہ میں اس وقت اسلام کا جو حکم ہمارے لئے قابل انطباق ہے وہ جنگ نہیں ہے بلکہ وہی ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں صلح مطلوب ہے۔ آج جنگ مطلوب نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی "سنگھ پریوار اور مسلمان" کے موضوع پر ان سے گفتگو ہونے لگی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم تعلقات کو نارمل بنانے میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ مسلمان تاریخ کی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں:

The stumbling block is the reluctance to accept facts of history.

انھوں نے اس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بابر نے "ایودھیا اسٹرکچر" بھارت واسیوں کی تحقیر (humiliation) کے لئے کھڑا کیا۔

میں نے کہا کہ سنگھ پریوار کے کہنے سے کوئی چیز تاریخی حقیقت نہیں ہو جاتی۔ تاریخ کو تاریخ داں طے کیتے ہیں۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں انڈین ہسٹری کے جو پروفیسر ہیں، ان کا ایک بورڈ بنا دیجئے۔ وہ جو فیصلہ کریں اس کو آپ بھی مان لیں اور مسلمان بھی مان لیں۔ اس پر وہ راضی نہیں ہوئے۔

آدمی دلیل کا نام لیتا ہے۔ مگر دلیل جب اس کو اپنے خلاف جاتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ دلیل کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

دوپہر کا کھانا ایک آشرم میں تھا جو یہاں کے اسپتال سے ملا ہوا ہے۔ اس آشرم کا خرچ زیادہ تر ایک مقامی ہندو تاجر ادا کرتے ہیں۔ آشرم کی مختلف سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ ایک روپیہ کی علامتی قیمت پر ضرورت مندوں کو عمدہ کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آشرم کے ذمہ دار روزانہ صبح کو سڑک پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیہات کے لوگ جو علاج کی غرض سے اسپتال آتے ہیں یا دوسرے دیہاتی جو کسی ضرورت کے تحت شہر آتے ہیں، ان کو ایک روپیہ لے کر ایک ٹکٹ دیدیتے ہیں، اس کے بعد دوپہر کو مقرر وقت پر وہ آشرم آتے ہیں اور ٹکٹ واپس کرکے

کھانا کھاتے ہیں۔

میں نے ۱۲ جنوری کو دوپہر کا کھانا اسی آشرم میں کھایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کھانا اگر ہوٹل میں کھایا جائے تو اس پر پانچ روپیہ سے بھی زیادہ خرچ آئے گا۔ مگر یہ صاف ستھرا کھانا روزانہ ۲۰۰ آدمیوں کو صرف ایک روپیہ کی برائے نام قیمت پر کھلایا جاتا ہے۔ اور کھانا کھلانے کا کام ملازمین نہیں کرتے۔ بلکہ خود مذکورہ ہندو سیٹھ اور دوسرے حضرات رضاکارانہ طور پر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔

۱۲ جنوری کو سہ پہر کے وقت مقامی پترکاروں سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ میں نے صحافی حضرات سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اکثر برائیوں کی جڑ ہماری صحافت ہے۔ ہماری صحافت میں سب سے زیادہ اہمیت گرما گرم خبر (hot news) کو دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر میں خدانخواستہ ودیشا کے کسی پولیس افسر پر بم ماروں تو آپ حضرات فوراً اس کو رپورٹ کریں گے۔ مگر آج میں نے یہاں ایک آشرم دیکھا جو ۲۰ سال سے اسی طرح چل رہا ہے۔ اور اب تک اس کی خبر ہمارے اخبارات میں نہ آسکی۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی اصطلاح میں وہ کوئی "گرم خبر" نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ اچھی خبروں کو نہ چھاپنا اور بری خبروں کو چھاپنا، اسی کا نام زرد صحافت ہے۔ ہمارے تمام اخبارات کم و بیش اسی زرد صحافت کا نمونہ ہیں۔ اور جس ملک کی صحافت زرد صحافت ہو جائے، اس کا سماج بھی آخر کار زرد سماج بن کر رہ جائے گا۔

اس کے بعد اجودھیا کے واقعہ پر اور ملک کے مستقبل کے بارہ میں مختلف سوالات ہوئے جن کا میں نے اپنے انداز میں جواب دیا۔

۱۱ مارچ کو نماز عشاء کے بعد جلسہ کا انتظام تھا۔ وہاں پہنچا تو ایک وسیع شامیانہ میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی بڑی تعداد بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ہندو بھائی نے میرے کان میں کہا: "یہ سب لوگ آپ ہی کو سننے کے لئے آئے ہیں"۔

میں سخت الجھن میں تھا۔ آخر وقت بھی میرا ذہن یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ آج مجھے کیا کہنا ہے۔ اسی ذہنی پریشانی کے ساتھ میں منچ پر بیٹھا تھا کہ اعلان ہو گیا کہ "اب مولانا صاحب آپ کو مارگ درشن کرائیں گے"۔

میں اس حال میں مائک کے سامنے آیا کہ احساس عجز کے تحت میری آنکھوں میں آنسو آگئے

تھے۔ میں نے خاموش الفاظ میں دعا کی کہ خدایا: یہ تیری پیدا کی ہوئی روحیں ہیں جو سچائی کی بات سننے کے لئے یہاں اکٹھا ہوئی ہیں۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں ان سے کیا کہوں۔ خدایا، آج تو ہی میرے لئے پلے بیک اسپیکر بن جا۔ تاکہ میں وہ بات کہہ سکوں جو تیری پسند کے مطابق ہو۔

اس کے بعد میں نے تقریر شروع کی اور دیوانگی کے عالم میں تقریباً ایک گھنٹہ تک بولتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ مگر بعد کو بمبئی کے مسٹر مدھو ہتا نے بتایا کہ آپ کی تقریر کے دوران لوگ اس قدر محو تھے کہ کروٹ بھی نہیں بدل رہے تھے۔ اکثر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ حتیٰ کہ عورتوں کو بھی میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھیں۔

یہاں کے ہندوؤں میں سوامی ویویکا نند کو ماننے والے بہت سے لوگ ہیں۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ سوامی ویویکا نند امریکہ گئے۔ وہاں ۱۸۹۳ء میں انھوں نے شیکاگو کی عالمی مذاہب کانفرنس (World's Parliament of Religions) میں ہندوازم پر تقریر کی۔ شیکاگو کے اسٹیج پر سوامی ویویکانند کے اس ظہور کو سنسنی خیز ظہور (sensational appearance) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (15/623)

وہاں کے تمام مقرر مغربی قاعدہ کے مطابق، لیڈیز اینڈ جنٹلمین کے الفاظ سے اپنی تقریر شروع کر رہے تھے۔ سوامی ویویکا نند جب کھڑے ہوئے تو ہندستانی روایت کے مطابق، ان کی زبان سے نکلا کہ امریکہ کے بہنو اور بھائیو (sisters and brothers of America) یہ الفاظ لوگوں کی فطرت کے اتنے زیادہ مطابق تھے کہ ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس کانفرنس میں سوامی جی کی تقریر سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

میں نے کہا کہ سو سال پہلے باہر کے دیشوں کے لوگ انڈیا کے لئے بہن اور بھائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ خود دیش کے لوگ بھی اب بہن اور بھائی نہیں سمجھے جا رہے ہیں۔ اس ذہن کو ہمیں بدلنا ہوگا ورنہ دیش تباہ ہو جائے گا۔

ودیشا کے سفر کا شاید سب سے اہم واقعہ مسٹر مدھو ہتا سے ملاقات ہے۔ اس سے پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ ودیشا میں پہلی بار ان سے میری ملاقات ہوئی۔ موجودہ ملکی حالات پر باتیں ہوئیں۔ جلسہ میں انھوں نے میری تقریر سنی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ

مجھے ایک "مسلم مولانا" کی تلاش تھی۔ کیوں کہ اجودھیا کے بعد ملک میں جو سنگین مسئلہ پیدا ہوا ہے، اس کو ایک مسلمان عالم ہی حل کر سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ میں نے آپ کی ذات میں اس مسلمان عالم کو پا لیا ہے۔

مسٹر مدھو مہتا بمبئی کے ممتاز افراد میں سے ہیں۔ ان کے تعلقات اعلیٰ سطح کے ہندوؤں سے ہیں۔ وہ ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ بمبئی آئیے۔ وہاں آپ اپنا "اصلاحی پروگرام" پیش کیجئے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو ہر طرح کی سپورٹ دلواؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد انھیں کے زیر اہتمام بمبئی کے لئے میرا کئی سفر ہوا۔ ہر سفر خدا کے فضل سے غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۳ کو میں بذریعہ ٹرین دہلی واپس آیا۔ ٹرین اس نئے دور کی ایک علامت ہے جب کہ انسانی تمدن کو حرکت دینے کے لئے مشینی پہیہ حاصل ہو گیا۔ کمیونی کیشن کے اس انقلاب میں ٹرین اب بہت پیچھے کی چیز ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی اس زمین پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اگرچہ بظاہر ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوں، مگر اپنی سوچ کے اعتبار سے وہ ٹرین سے بھی پیچھے کے دور میں جی رہے ہیں۔ جسم کے اعتبار سے وہ بیسویں صدی کے مسافر ہیں مگر اپنے شعور کے اعتبار سے صرف پچھلی صدی کے مسافر۔

سفر ورنداابن

کچھ تعلیم یافتہ ہندو صاحبان نے ورنداابن میں ایک چار روزہ سمواد پر یاس کا انتظام کیا تھا اس کی دعوت پر ورنداابن اور متھرا کا سفر ہوا۔ اس سفر کی مختصر رو داد حسب ذیل ہے۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو ہم لوگ بذریعہ کار دہلی سے ورنداابن کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے قافلہ میں چار آدمی تھے ــــــ ڈاکٹر راجکمار بھاٹیا، ڈاکٹر مہیش شرما، ڈاکٹر سریندر شرما، اور راقم الحروف۔ یہ گاڑی ڈاکٹر بھاٹیا (پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کی تھی اور وہ خود ہی اس کو چلا رہے تھے۔

راستہ میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ قافلہ کے دو آدمی جے پر کاش نرائن (۱۹۰۲-۱۹۷۹) کے ساتھیوں میں سے تھے، چنانچہ زیادہ تر گفتگو کا موضوع جے پر کاش نرائن کی ذات اور ان کا مشن رہا۔

میں نے کہا کہ جے پر کاش کو تھنکر کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو تھنکر کہنا بہت مشکل ہے۔ میں کبھی ان سے ملا نہیں۔ مگر ان کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں بار بار اپنا نظریہ بدلتے رہے اور آخر وقت میں فکری بے اطمینانی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔ ایسے آدمی کو سیکر (seeker) کہنا چاہئے نہ کہ تھنکر۔

میں نے کہا کہ ۱۹۷۷ کے الکشن میں جے پر کاش نرائن نے ٹوٹل ریولیوشن (پورن کرانتی) کا نعرہ دیا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں یہ تاثر دیا کہ کانگرس پارٹی کو الکشن میں ہرانا ہی دیش میں پورن کرانتی لے آنا ہے۔ مگر واقعات نے ثابت کیا کہ یہ محض ان کی سادگی یا خوش فہمی تھی۔ الکشن میں کانگرس مکمل طور پر ہار گئی، اس کے باوجود مکمل انقلاب نہ آسکا۔ الکشن کی ہار جیت سے کسی ملک میں مکمل انقلاب نہیں آیا کرتا۔ اگر جے پر کاش نرائن تھنکر ہوتے تو وہ پیشگی طور پر اس کو جان لیتے، مگر وہ اس کو نہ جان سکے۔

ایک صاحب نے جواب میں کہا کہ جے پر کاش نرائن بنیادی طور پر ایک شریف اور دیانت دار آدمی تھے۔ وہ فوری تاثر کے تحت ایک رائے قائم کرتے اور پھر کچھ دن بعد نئی رائے بنا لیتے تھے۔ یہ سب کچھ انسانی ہمدردی کے تحت ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو

جے پرکاش نرائن ایک شریف انسان تھے نہ کہ مفکر انسان۔

ورندابن پہنچ کر ہم گیتا آشرم گئے۔ یہیں پر قیام اور اجلاس دونوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ آشرم میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ اجلاس جاری ہے۔ چنانچہ ہم لوگ سیدھے آشرم کے ہال میں پہنچے اور اجلاس میں شریک ہو گئے۔ اس ہال تک پہنچنے کے لئے جامع مسجد دہلی کی طرح اونچی سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

اس آشرم میں ایک ہاسٹل ہے جس میں سنسکرت کے طلبہ کے لئے قیام کا انتظام ہے۔ یہ طلبہ شہر کے سنسکرت کالج میں پڑھتے ہیں اور ان کے لئے تعلیم و طعام کا انتظام آشرم کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ یہ برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ تقریباً ۲۰ کی تعداد میں تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ نوجوان طلبہ ہر روز صبح سویرے ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوتے ہیں اور گیتا کا پاٹھ کرتے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ہمارے یہاں تجوید کے مدارس میں ہوتا ہے۔ ایک پنڈت سامنے بیٹھ کر گیتا کے سنسکرت اشلوک اصول قرأت کے مطابق پڑھتا اور بقیہ تمام طلبہ اس کو دہراتے تھے۔ اس عمل کے خاتمہ پر سب مل کر ایک ہندی نظم پڑھتے تھے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

پاٹھ گیتا کا سدا کرنا بڑا ست دھرم ہے　　پاٹھ گیتا کا سدا کرنا ہی مانو دھرم ہے
گیان گیتا کا سدا ہردے میں دھرنا چاہئے　　منش کو ہر روز گیتا پاٹھ کرنا چاہئے

میں نے پنڈت جی سے پوچھا کہ پورے دیش میں گیتا کے کتنے لاکھ حافظ ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ لاکھ تو نہیں، شاید کچھ ہزار ہوں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آپ کو تو پوری گیتا یاد ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، کچھ کچھ۔ وہاں ۲۰ طالب علم تھے۔ سب کے سب معمولی گھروں کے دکھائی دئے۔ تاہم آشرم کی عمارت کافی شاندار اور وسیع تھی۔

یہاں آگرہ کا ہندی اخبار دینک جاگرن (۱۵ جنوری ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے پہلے صفحہ کی کچھ سرخیاں یہ تھیں:

بمبئی میں دنگائیوں نے ۸ لوگوں کو زندہ پھونکا
احمد آباد میں چھرے بازی کی چٹ پٹ واردآتیں۔
مسجد ڈھانا بھاجپا کی سوچی سمجھی سازش (ارجن سنگھ)

مسلم دھارمک نیتاؤں کا اندولن اور تیز

اجودھیا کی طرح ہی ہم دلی کی جامع مسجد پر قبضہ کریں گے

۱۵ اگست کو ہمیں سیاسی آزادی ملی ۶ دسمبر کو ہمیں مذہبی آزادی ملی۔

بعض سرخیوں کو اشتعال انگیز سمجھ کر کوئی مسلمان غصہ ہو سکتا ہے۔ مگر میں نے ان سرخیوں کو پڑھ کر سوچا کہ اردو آج بھی ہندی لیپی کے روپ میں زندہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم بول چال کی زبان آج بھی اس ملک میں اردو ہے۔ یہ بہت زیادہ قابل شکریات ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور برادران وطن کے درمیان آج بھی لسانی بعد (Language gap) نہیں پیدا ہوا۔

۱۵ جنوری کو میں دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھا۔ باہر برآمدہ میں گیتا آشرم کے دو طالب علم کھڑے ہوئے لوگوں کا ہاتھ دھلا رہے تھے۔ ایک طالب علم تولیہ لئے ہوئے کھڑا تھا اور دوسرا طالب علم مگ کے ذریعہ پانی ڈال رہا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو سیمنار میں شرکت کرنے والے ایک صاحب جو سوٹ بوٹ میں تھے، وہ ان طالب علموں سے بات کر رہے تھے۔ میں آگے بڑھ کر ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران گفتگو کی آواز کان میں آئی۔

مذکورہ صاحب نے طالب علموں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کیا پڑھتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ہم سنسکرت پڑھتے ہیں۔ موصوف نے لاپرواہی کے انداز میں کہا: سنسکرت پڑھنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ سائنس پڑھو، کچھ اور پڑھو۔ جیون برباد مت کرو۔

یہ ریمارک دینے والے صاحب ایک مسلم نوجوان تھے۔ اس کے بعد اسی دن شام کو ان طالب علموں کے استاد نے اپنے کمرہ میں ہم چند لوگوں کو چائے پر بلایا۔ یہ نہایت صاف ستھرا دو کمروں کا ایک سیٹ تھا جس میں ٹیلیفون اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ آج کے ایک "پنڈت" کے لئے کیا مواقع کھل چکے ہیں۔ وہ پرانے زمانہ کے روایتی پنڈت پر آج کے زمانہ کے جدید پنڈت کو قیاس کر رہے ہیں۔

۱۵ جنوری کی صبح کو اچانک شور و غل سنائی دیا۔ میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو آشرم کے نوجوان طلبہ اپنے ہاتھوں میں ڈنڈا لئے دوڑ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آشرم میں کچھ بندر گھس آئے ہیں، ان کو بھگایا جا رہا ہے، کیوں کہ وہ جب آتے ہیں تو کچھ نہ کچھ نقصان کرتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ بندر ان لوگوں کے نزدیک ایک مقدس جانور ہے۔ مگر جب یہ مقدس جانور ان کے انٹرسٹ کے لئے خطرہ بن جائے تو وہ اس کو مارنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جب خود اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مقدس حیوان کے ساتھ ان کا یہ سلوک ہے تو عام انسانوں کے ساتھ ان کا سلوک کیوں کر مختلف ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کا یہی معاملہ ہے۔ وہ کسی کو صرف اس وقت تک قابل احترام سمجھتا ہے جب تک وہ اس کے لئے بے ضرر حیثیت رکھتا ہو۔ جیسے ہی وہ ضرر رساں دکھائی دے، آدمی اس کا مخالف بن جائے گا۔ اب اس کے پاس ایسے آدمی کے لئے ڈنڈا ہوگا نہ کہ پھول۔

سیمنار کے شرکاء کے لئے قیام کا انتظام گیتا آشرم میں کیا گیا تھا۔ ایک کمرہ میں دو آدمی کو ٹھہرایا گیا تھا۔ میرے ساتھ آر ایس ایس کے ایک خاص رکن تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور آر ایس ایس کے انٹلکچول میں شمار کئے جاتے تھے۔ کمرہ میں ایک ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر ہم دونوں ایک ساتھ سوتے تھے۔

وہ صبح کو فجر سے پہلے اٹھ جاتے تھے۔ میں بھی اسی وقت اٹھتا تھا۔ ایک روز جب وہ سو کر اٹھے تو بستر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ آپ لوگ مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ مسلمان کیا کریں کہ آپ لوگوں کی شکایت ان سے ختم ہو جائے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں یک طرفہ طور پر ہندوؤں سے ایڈجسٹ کرکے رہیں۔

انھوں نے فوراً کہا: "نہیں مولانا صاحب، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ مسلمان برابر کے ناگرک بن کر رہیں۔ مسلمان بھائیوں سے ہم صرف ایک بات چاہتے ہیں۔ یہ کہ وہ اس دیش کو اپنا دیش سمجھیں۔" یہ ایک ایسے شخص کے الفاظ تھے، جو آر ایس ایس میں عہدیدار کی حیثیت رکھتا ہے۔

"ورندا بن" کو آپ پرانی کتابوں میں پڑھیں تو وہ ایک افسانوی مقام معلوم ہوگا مگر ۱۴ جنوری ۱۹۹۳ کو ۱۰ بجے جب میں ورندا بن کے اندر داخل ہوا تو وہ ایک عام قصبہ کی مانند تھا۔ آج وہاں ایسی چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو قدیم کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

یہاں "سنواد پریاس" گیتا آشرم میں رکھا گیا تھا۔ گیتا آشرم کافی بڑا ہے۔ پہلے وہ قدیم

طرز کا ایک مندر رہو گا مگر اب یہاں خالص جدید طرز کی ایک شاندار عمارت بنائی گئی ہے۔ وہاں گیتا کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اور اسی کے ساتھ کئی ہال ہیں۔ ایک ہال میں ہمارے کانفرنس کی کارروائی ہوئی۔

اس مضمون میں وہاں کی تمام کارروائیوں کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ باتوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

موجودہ ملکی حالات پر یہ سمینار چار دن تک جاری رہا۔ ہر ایک نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک روز میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندو راشٹر عام حالات میں ہندستان میں قائم نہیں ہوسکتا۔ آر ایس ایس یا بھارتیہ جنتا پارٹی کے لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ محض اپنی طاقت سے اس ملک میں ہندو راشٹر قائم کر دیں۔

ہندستان میں ہندو راشٹر کا قیام تمام تر مسلمانوں کے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر مسلمان خاموشی کا رویہ اختیار کر لیں۔ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی یا آر ایس ایس کی مخالفت نہ کریں تو ہندو راشٹر کے قیام کی تحریک کی ناکامی یقینی ہے۔ ہندو راشٹر صرف اس وقت قائم ہوسکے گا جب کہ اس کے علمبرداروں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہو جائے کہ مسلمان اپنے نادان لیڈروں کی غلط رہنمائی میں پڑ کر اس کے خلاف دھوم مچانا شروع کر دیں۔

ورندابن کے اس سیمنار میں مجھے اس حقیقت کا علم ہوا کہ ہندوؤں میں بھی ایک اعتبار سے وہی صورت حال ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں آج جو لوگ مختلف سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں کام کر رہے ہیں، ان کی اکثریت "انقلابی اسلام" سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس کا سبب بہت زیادہ نظریاتی نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اسکول یا کالج کی تعلیم کے زمانہ میں ان لوگوں نے ان اسلامی مفکرین کی پرجوش کتابیں پڑھیں جن میں اسلام کو انقلابی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ پختگی سے پہلے کی اس عمر میں انھیں اسلام کی یہ تشریح اچھی لگی۔ اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ عملاً ان میں سے ہر ایک کا مذہب مادی انٹرسٹ ہے۔ مگر ٹیبل ٹاک کے لئے وہ اپنے سابقہ تاثر کے تحت بدستور اسلام کی انقلابی تشریح کو اختیار کئے ہوئے ہے۔

یہی معاملہ ہندوؤں کا ہے۔ آر ایس ایس اور اس طرح کی دوسری تحریکوں نے "ہندو انڈیا" کا جو رومانی تصور دیا وہ بہت سے ہندو نوجوانوں کو پسند آ گیا۔ بعد کو اگرچہ وہ عام لوگوں کی طرح

دنیا کے کمانے میں مشغول ہو گئے۔ تاہم ایک دل پسند تاثر کے طور پر ہندو احیا، کا آئیڈیا بھی ان کے ذہن میں موجود رہا جو لکھنے اور بولنے کی سطح پر حسب موقع ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ بس اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر ارن شوری ہیں۔

اس سیمنار کے شرکاء میں اگرچہ اکثریت آر ایس ایس کے ذہن کے لوگوں کی تھی۔ تاہم یہاں فکری غلبہ کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ ہر ایک کو آزادی تھی کہ وہ کھلے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرے، مقررین کی کچھ باتیں یہاں مختصر طور پر نقل کی جاتی ہیں۔

سوامی اگنی ویش نے کہا کہ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ لوگوں میں (fixed notions) بنے ہوئے ہیں۔ لوگ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے رہتے ہیں کہ مسلمان ہے تو ایسا ہوگا اور ہندو ہے تو ایسا ہوگا۔ ہمیں سوچنے کا یہ طریقہ بدلنا ہوگا۔ ورنہ نیشن بلڈنگ کا کام نہیں ہو سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش کے حالات اگرچہ بہت خراب ہیں۔ مگر حالات کا کچھ پازیٹو پہلو بھی ہے۔ مثلاً بابری مسجد کو ڈھایا گیا تو میں دیکھتا ہوں کہ اس کی چنتا جتنی مسلمان کو ہے اس سے زیادہ چنتا ہندوؤں کو ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج یہ حالت ہے کہ دیش کا ایجنڈا پولٹیکل لوگ طے کرتے ہیں۔ یہ ایک دربھاگیہ کی بات ہے۔ دیش کو کچھ لوگوں کے پولٹیکل انٹرسٹ پر سبھینٹ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش کو الٹے راستہ پر لے جایا جا رہا ہے۔ نان اشو کو اشو بنایا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف ہمیں اٹھنا ہوگا ورنہ دیش تباہ ہو جائے گا۔

ایک ہندو نوجوان نے کہا کہ مسلمان آج بھی پاکستان کی طرف اپنا دھیان لگائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے جب کرکٹ میں پاکستان کے کھلاڑی جیتتے ہیں تو وہ یہاں خوشی مناتے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے راج موہن گاندھی نے کہا کہ ان چیزوں کو آپ اتنی زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ یہ تو خود آپ کی ذہنی ناپختگی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں ہائی کمشنر تھا۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ میچ میں اگر ہندستانی کھلاڑی اچھا گیند مارتا تو وہاں کے ہندستانی تالیاں بجاتے اور اگر پاکستانی کھلاڑی اچھا کھیل دکھاتا تو پاکستانی لوگ تالیاں بجاتے۔ اور انگریز جو وہاں ہوتے وہ کسی پر غصہ نہ ہوتے بلکہ دونوں پر مسکرا دیتے۔ یہی آپ کو بھی کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر مہیش شرما نے کہا کہ آج کی سمسیا یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ایک دوسرے کا احترام نہیں۔ دوسروں میں بھی وہی ہے جو مجھ میں ہے، یہ دیکھنے کی طاقت لوگوں میں نہیں۔ تمام سمجھدار لوگوں کا کہنا ہے کہ دشمن اگر کوئی ہے تو وہ تمہارے اندر ہی ہے۔ پر اب ہم نے دشمن بدل لئے ہیں۔ اب ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دشمن ہمارے اندر نہیں ہے، باہر ہے۔ بھاجپا کا دشمن کانگرس، کانگرس کا دشمن بھاجپا۔ یہ سوچ بدلنا ہوگا۔ اپنے بارہ میں کڑوی بات سننے کی اشتھی ہونی چاہئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت بھارت میں بھٹکی ہوئی حالت ہے۔ ہم ۸۵ کروڑ لوگ آج بھٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم کہ کدھر جائیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ دھرم کو آدھار بنا کر ہندوؤں نے پہلے کام نہیں کیا۔ آج وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی کر رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے چیتاونی دیتے ہوئے کہا ہے کہ رام کا مندر بنانے میں بھارت کا مندر نہ ٹوٹ جائے۔

ایک ہندو ڈیلی گیٹ نے ۱۴ جنوری کی میٹنگ میں کہا کہ کیلاش پربت اور مان سرور جھیل ہندوؤں نیز بدھوں میں بہت اہم مقدس مقام (Most important holy site) مانا جاتا ہے۔ ہندو تو اس کو بھگوان شیو کا سورگ مانتے ہیں۔ ہماری اتنی مقدس جگہ پر ۱۹۶۲ میں چین نے حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آر ایس ایس یا بھاجپا یا ہندو پریشد کے لوگ اس کے خلاف کوئی اندولن نہیں چلاتے۔ اور ایودھیا کے اوپر اتنی دھوم مچاتے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں۔

ایک صاحب نے کہا کہ رام منوہر لوہیا کہا کرتے تھے کہ دیش کو گرماؤ۔ چنانچہ ہم نے دیش کو گرمایا۔ مگر نتیجہ دیکھنے کے بعد اب سمجھ میں آتا ہے کہ لوہیا کا نعرہ ٹھیک نہیں تھا۔ زیادہ ٹھیک نعرہ یہ ہے کہ —— دیش کو ٹھنڈا کرو۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمیں کسی بھی حال میں گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے۔ ایک وقت تھا کہ کمیونزم کو ساری دنیا میں (unassailable ideology) سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج اس کے برعکس سمجھا جا رہا ہے۔

ایک صاحب گاندھیائی علوم کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ مہاتما گاندھی نے ایک بار اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ ہندو مسلم ایکتا دیش کی ترقی کے لئے اتنا زیادہ ضروری

ہے کہ اس کے بغیر ہم دیش کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ سرو دھرم سمبھاو ہے۔ یعنی ہر مذہب کا احترام (respect to all religions) مگر آج جو لوگ ہندو کاز کے لئے اٹھے ہیں وہ اسی بنیادی بات کو بھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس قسم کی باتوں کو سن کر میرا احساس یہ ہے کہ ہندو ضمیر تڑپ اٹھا ہے۔ اس لئے کہ سیکڑوں سال سے ہندوؤں کو بتایا جا رہا تھا کہ سچائی ہر جگہ ہے۔ جس طرح مندر مقدس ہے اسی طرح مسجد اور گرجا بھی مقدس ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ تاریخ پر افسانہ (myth) کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اخلاق اور قانون کو توڑا جا رہا ہے، انسانیت کو بلڈوز کیا جا رہا ہے۔ اس انجام کو دیکھ کر سنگھ پریوار کے خیر خواہ بھی اس کی طرف سے متوحش ہو رہے ہیں۔

ایک دلت دانشور ناگپور سے آئے تھے۔ انھوں نے کافی جارحانہ انداز میں تقریر کی۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تاریخ کی غلطیوں کو درست کریں گے۔ تو تاریخ کی غلطیاں تو اجودھیا کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے برہمنوں نے بودھ مندروں کو توڑا اور ان کی جگہ پر ہندو مندر بنا دیا۔ پھر آپ ان تاریخی غلطیوں کی اصلاح کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ہریجنوں پر ماضی میں بہت زیادہ ظلم کئے گئے۔ ہم ان کے بارہ میں بولتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ پھر آپ بھی اسی طرح اجودھیا اور کاشی اور متھرا کی بات کو کیوں نہیں بھول جاتے۔ خود تو آپ یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے کہتے ہیں کہ بھلا دو۔

ایک صاحب نے کہا کہ تلک اور گاندھی کا جھگڑا برہمن اور ابرہمن کا جھگڑا تھا۔ گویا کہ وہ جاتی واد کا جھگڑا تھا۔ وہ کوئی نظریاتی جھگڑا نہ تھا۔ یہی آج بھی ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ میں اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں آر ایس ایس سے قریب ہو گیا تھا۔ لیکن تب اور اب میں بہت انتر ہے۔ کل کی آر ایس ایس اور آج کی آر ایس ایس میں بڑا فرق آ گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی کا نام سبھی لوگ لیتے ہیں۔ مگر ہم لوگ گاندھی کو صرف آدھا مانتے ہیں۔ آج خطرہ میں ڈیموکریسی نہیں ہے۔ آج خطرہ میں دیش نہیں ہے۔ آج خطرہ میں ہندو نہیں ہے۔ آج خطرہ میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ دراصل وہ لڑائی ہے جس کو مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ تک پہنچایا

تھا۔ مگر اس کے آگے ہم اس کو جاری نہ رکھ سکے۔

رام بہادر رائے نے کہا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ نے اگلے دس سال تک کا ایجنڈا طے کر دیا ہے۔ ۶ دسمبر کی گھٹنا نے طے کر دیا ہے کہ اگلے دس سال تک دیش کی پالی ٹکس ہندتو کے ارد گرد گھومے گی۔ ان کی تقریر ختم ہوئی تو دوسرے ہندو مقرر نے کہا: یہ دیش کے لئے بہت درگھٹنا کی بات ہوگی کہ دیش کا دس سال کا ایجنڈا صرف کوئی ایک دن طے کرے۔ میرا دل ایسی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ڈاکٹر راجکمار بھاٹیا اسکول کی زندگی سے آر ایس ایس سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے والد کٹر آر ایس ایس تھے۔ چنانچہ بیٹے بھی آر ایس ایس سے وابستہ ہوگئے۔

میں نے ڈاکٹر بھاٹیا سے پوچھا کہ ہندو مسلم تعلق کو نارمل بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں (interaction) بڑھایا جائے۔ میں نے کہا کہ اور کوئی عملی چیز جو مسلم سے آپ چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا اشو پر آپ لوگ راضی ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کافی نہ ہو۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو سنگھٹن کے لئے اینٹی مسلم فیلنگ ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اگر اجودھیا اشو ختم ہو جائے تو آپ لوگ کوئی اور اشو ڈھونڈ کر کھڑا کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ اس کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جیل کے زمانہ میں مسلمان اور آر ایس ایس دونوں دوست بن گئے تھے۔

بی کے رائے، الٰہ آباد یونیورسٹی میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کمبھ میلے میں گیا۔ وہاں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی آتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا۔ کسی آدمی کے پاس ایک پیسہ نہ ہو تب بھی اس کو کھانا مل جاتا ہے۔ یہ دھرم کی طاقت ہے۔

ایک صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ پی اے سی میں افسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندو دھرم کے مطابق سچائی کئی ہو سکتی ہے اس لئے ہندوازم کا نباہ تو ہر ایک سے ہو سکتا ہے۔ مگر اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے مطابق، سچائی صرف ایک ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا نباہ دوسروں سے کس طرح ہوگا۔

میں نے کہا کہ "سچائی کئی ہے" محض کہنے کی بات ہے۔ وہ عمل میں آنے والی نہیں۔ اگر وہ کوئی حقیقی

بات ہوتی تو ماضی میں برہمن لوگ بدھوں کے مندر نہ توڑتے۔ یا آج ہندتو کے علمبردار ۶ دسمبر کو بابری مسجد نہ توڑتے۔ میں نے کہا کہ اختلاف زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ روزانہ کی زندگی میں گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہم طرح طرح کے اختلافات سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہاں ہم کیا کرتے ہیں۔ وہاں ہم برداشت کے اصول پر عمل کر کے زندگی گزارتے ہیں۔ یہی طریقہ مذہب میں بھی اختیار کرنا ہے۔ یعنی مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ٹالرنس (tolerance)

"۱۹۴۷ کے بعد نیشن بلڈنگ کا کام نہ ہوسکا" ایک صاحب نے کہا۔ اپنی بھومیکا (ذمہ داری) کو پورا کرنے کا دھیان آج بھی لوگوں میں نہیں۔ ۶ دسمبر کے بعد نیشن بلڈنگ میرے نزدیک ایجنڈا میں نمبر ایک پر ہے۔

۱۹۸۴ میں ہم لوگ بات کرتے تھے کہ کسی گھر میں ایک ویکتی مرا ہو تو اس کے گھر میں کتنا زیادہ آتنک واد پیدا ہوگا۔ اب یہی بات اور زیادہ بڑھ کر ہمارے سامنے ہے۔ آج جن گھروں میں لوگ مرتے ہیں ان کے یہاں اور کتنا زیادہ آتنک وادی پیدا ہوں گے۔

اوشیش سوامی (ورندابن) نے کہا کہ اس شکتی کے نام تو انیک ہیں۔ لیکن شکتی ایک ہی ہے جسے جگن نینتا، خدا، گاڈ، رب، واہی گرو، نام انیک ہیں۔ کنتو سمبودن ایک ہی شکتی کو کیا جاتا ہے۔ جھگڑا پوجا کا نہیں ہے اور پوجا پدھتی کا بھی نہیں ہے۔ جھگڑا کیول اپنی دکانداری کا ہے۔ کیوں کہ کچھ لوگوں کی دکانداری انھیں مدوں کے ذریعہ سے چلتی ہے اس لئے آپسی تناؤ بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔ یدی روحانی نظر سے دیکھیں تو سروم کھلودم برہم یعنی برہم ہی سب میں سمایا ہوا ہے۔ جب سبھی میں برھم سمایا ہوا ہے تو جاتی گت جھگڑے، اونچ نیچ کے جھگڑے، بھاشائی جھگڑے رہ ہی کہاں جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنے نظریہ کو دنیاوی نظر کے ساتھ روحانی نظر والا بھی بنانا ہوگا۔

ایک بڑے ہال میں فرش بچھا ہوا ہے۔ سیمنار میں حصہ لینے والے تقریباً ساٹھ آدمی دائرہ کی صورت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف لوگ موجودہ ملکی حالت پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک لڑکا ایک تھال لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ تھال میں کٹی ہوئی مولی مع پتہ رکھی ہوئی ہے جس پر نمک چھڑکا ہوا ہے۔ وہ لڑکا تھال لئے ہوئے سب کے سامنے سے گزرتا ہے۔ ہر ایک بقدر خواہش مولی لے لیتا ہے اور اس کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آخر میں چائے لائی جاتی ہے اور ہر ایک کے

سامنے چائے کی ایک پیالی رکھ دی جاتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ورندابن کا یہ سیمنار کتنا سادہ تھا اور اس کی کارروائی کتنے بے تکلفی کے انداز میں کی گئی۔ یہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔ کیوں کہ سادگی میری فطرت ہے۔ میں ہر معاملہ میں سادگی کو پسند کرتا ہوں۔

ایک صاحب نے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ بڑا کیا ہے۔ دیش بڑا ہے، یا دھرم بڑا ہے۔ دیش پہلے ہے یا دھرم پہلے ہے۔ دھرم کو کچھ لوگوں نے بڑا بنایا۔ اس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا کہ خود دیش خطرہ میں پڑ گیا۔ اس لئے اب اس کو ختم کرو۔ دیش کو بڑا بناؤ۔

ایک صاحب نے کہا کہ جس طرح انگریزوں کے اسٹیچو یہاں غلامی کی یادگار تھے۔ ان کو ہم نے ہٹایا۔ اسی طرح بابری مسجد جیسے ڈھانچے بھی مسلم غلامی کی یادگار ہیں۔ ان کو بھی توڑ کر ختم کرنا ہوگا۔ جب تک غلامی کی یہ یادگاریں کھڑی ہوئی ہیں، دیش میں شانتی آنے والی نہیں۔

ایک صاحب نے بابری مسجد ڈھانے کو عین درست بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر ہمارے لوگ معذرت کا انداز کیوں اختیار کرتے ہیں۔ اگر پندرہ اگست پر ہم کو کوئی شرم نہیں ہے تو ۶ دسمبر پر بھی ہم کو شرمانا نہیں چاہئے۔

اس سیمنار میں ایک خاص تجربہ یہ ہوا کہ اگر مسلمان چپ رہیں تو خود ہندو لوگ ہم سے بہتر اور موثر انداز میں اس کا جواب دیں گے۔ اس کا تجربہ ورندابن میں کئی بار ہوا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی مقرر نے مسلم دشمن تقریر کی۔ میں چپ رہا۔ اس کے بعد کوئی ہندو اٹھا اور اس نے نہایت طاقت ور انداز میں اس کا جواب دیا، ایسا کہ اگر میں جواب دیتا تو شاید میں اتنا طاقت ور جواب نہیں دے سکتا تھا۔

اودے پور کے کشور سنت (Telephone 28271) نے بڑی دردمندانہ تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ آج یہ لوگ ساری بات گاندھی کے نام پر کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہی گاندھی واد ہے۔ اس اندولن سے جو شکتی ابھری ہے وہ تو ہنسک شکتی ہے۔ پھر وہ گاندھی واد کیسے ہے۔ جب کہ گاندھی واد اہنسا کا نام ہے۔ میں نے گاندھی کے زمانہ کو دیکھا ہے۔ مگر آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر مجھے اپنا جیون بالکل نرر تھک لگتا ہے۔ نفرت کی آگ آج ویاپک ہے۔ گاندھی کا دیش اب نہیں ہے۔ بالکل اندھکار ہے۔

ورنداون کی اس میٹنگ میں زیادہ بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بھارتیہ جنتا پارٹی سے کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتے تھے۔ مجھے تقریر کا موقع دیا گیا تو میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے موجودہ سنگل پوائنٹ پروگرام (single-point programme) کے تحت کبھی مرکزی حکومت تک نہیں پہنچ سکتی۔ کچھ لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک قسم کی منتظر حکومت (government-in-waiting) کا درجہ دئے ہوئے ہیں، مگر موجودہ حالت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی ہندتو یا ہندو راشٹر قائم کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد پر سیاسی نظام بنانا یہ روحِ عصر (spirit of the age) کے خلاف ہے۔ اور جو نظریہ عصری مزاج کے خلاف ہو اس کو قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی قریبی مثال مسلم ملکوں کا تجربہ ہے۔ مصر، پاکستان، الجزائر، سوڈان اور دوسرے ملکوں میں کچھ مسلم جماعتوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ بلند کیا۔ انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں بھی دیں۔ مگر ان کو صد فی صد ناکامی ہوئی۔ اور اس کی وجہ اصلاً یہی تھی کہ مذہب کی بنیاد پر سیاسی نظریہ بنانا ایک ایسا نظریہ ہے جس کو وقت کی غالب سوچ کی تائید حاصل نہیں۔

میں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اگر مرکزی سرکار بناتی ہے تو اس سے مجھے نہ اختلاف ہے اور نہ اس کو میں کوئی خطرہ سمجھتا ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ "مندر۔ مسجد" کے اشو کی بنیاد پر وہ کبھی مرکز میں نہیں پہنچ سکتی۔ مرکز میں طاقت حاصل کرنے کے لئے بھارتیہ جنتا پارٹی کو کوئی ایسا اشو لینا ہوگا جو پورے ملک کی دل چسپی کا اشو ہو، جو دیش کو بنانے کا اشو ہو نہ کہ محدود طور پر مندر بنانے کا اشو۔

یہ عجیب بات ہے کہ عملی تجربہ کے بعد جو حالات سامنے آئے، اس کے بعد خود بھارتیہ جنتا پارٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ پارٹی کے بنگلور سشن (جون ۱۹۹۳) میں انھوں نے صاف طور پر اپنی پالیسی میں تبدیلی کا اعلان کر دیا۔ پارٹی کے موجودہ صدر مسٹر لال کرشن آڈوانی نے کہا کہ اب ہمارا فوکس رام مندر بنانے پر نہیں ہوگا بلکہ بھارت کا مہامندر بنانے پر ہوگا۔ ہمیں ملک سے بھرشٹاچار کو ختم کرنا ہے اور یہاں سماجی نشاۃ ثانیہ (social renaissance) کا دور لے آنا ہے۔

ایک صاحب نے غلطی کی تصیح کے نظریہ پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح مسجد ڈھانے کے عمل کو اگر ایک بار آپ جائز (legitimate) مان لیں تو پھر سلسلہ مسجد تک نہیں رہے گا۔ وہ آگے تک جائے گا۔ بس اب ختم کرو، یہ کہنے کی ہمت ہمارے اندر ہونی چاہئے۔ ورنہ آئندہ بات یہاں تک پہنچے گی کہ ایک آدمی آپ کے گھر پہنچے گا اور کہے گا کہ یہ زمین تمہارے دادا نے میرے دادا سے زبردستی لے لی تھی، اب میں دوبارہ اس پر قبضہ کروں گا۔ اس کے بعد ہمارے سماج کا کیا حال ہوگا۔ اس کو سوچئے۔ اس طرح کے عمل سے ہنسا کو (legitimacy) ملتی ہے۔

ایک ہندو اسکالر نے اپنی تقریر کے دوران یہ واقعہ بتایا کہ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ سکنڈ راونڈ ٹیبل کانفرنس (۱۹۳۱) کے موقع پر گاندھی جی کی ملاقات علامہ اقبال سے لندن میں ہوئی۔ اقبال نے اپنا تعارف کراتے ہوئے گاندھی جی سے کہا: میں کشمیری پنڈت ہوں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ہندو اور مسلمان دونوں عام طور پر اسی طرح اپنے پن کے انداز میں بات کرتے تھے۔ مگر اب "دوقومی نظریہ" کی مصنوعی تحریک کے نتیجہ میں دونوں طرف کا مزاج بدل گیا ہے۔ اب اس طرح کی بول بولنے میں قومی عصبیت حائل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مہیش شرما نوجوانی کی عمر سے آر ایس ایس سے وابستہ ہیں۔ ایک روز گفتگو کے دوران میں نے کہا اس وقت قومی ایکتا لانے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ٹالرنس ہے۔

انھوں نے کہا کہ گروگولوالکر ٹالرنس کے شبد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم دوسروں کو صرف ٹالریٹ نہیں کرتے، ہم تو دوسروں کا سواگت کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ — میں سچا تو تم بھی سچے۔

کئی لوگوں نے یہ بات کہی کہ دھرم سے متعلق جھگڑوں میں ہم کو زیادہ توجہ نہیں دینا چاہئے۔ زیادہ توجہ کے قابل دوسرے اشو ہیں، مثلاً تعلیم، اقتصادیات، افراد کے اندر نیشنل کیرکٹر پیدا کرنا۔ وغیرہ۔ آج سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ نئی نسل کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دیش کی ترقی میں اپنا صحیح رول ادا کرسکے۔

جن ستا کے پترکار مسٹر رام بہادر رائے سب سے کم بولتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب

کبھی وہ بولتے ہیں تو لوگ بہت توجہ کے ساتھ ان کی بات سنتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ بعض لوگ زیادہ بولنے کو اہم سمجھتے ہیں۔ مگر کم بولنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ مگر کم بولنے کے لئے تحمل کی طاقت درکار ہے، اور تحمل کی طاقت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ دیش میں ہنسا (تشدد) بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم لوگ ہنسا کا درودھ اہنسا سے کریں گے، یہ طے کرکے یہاں سے ہمیں اٹھنا ہے۔

ہم لوگوں کو ہر طرح کے بھید بھاؤ سے اوپر اٹھنا ہے۔ انسان سب سے بڑھ کر ہے، یہ مان کر یہاں سے جانا ہے۔ انسان پہلے ہے اور دھرم اور پالیٹکس سب اس کے بعد ہے۔

مسٹر راج نرائن سنگھ (P.A.C.) اعظم گڑھ میں پولیس افسر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانوں کو دیش کے پچھلے پروج کو اپنا پروج ماننا ہوگا۔ اس کے بنا کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک صحیح اور باقی سب غلط ہیں تو ایسی حالت میں ایڈجسٹمنٹ اور بھائی چارہ کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی نظر میں ہندو سب کے سب کافر ہیں تو دونوں میں برابری کا تعلق کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کو ایسے تمام عقیدوں کو (disown) کرنا ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمبندھ میں یہ ایک بہت پورن مدّا ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ پاکستان اگر کرکٹ جیتے تو وہ یہاں لڈو بانٹتے ہیں، پھر ان کی دیش بھگتی پر کیسے نہ شبہ کیا جائے۔

ایک روز کانفرنس کے اجلاس میں ایک انتہاپسند ہندو نے بڑی گرماگرم تقریر کی۔ مسلم نقطہ نظر سے وہ کافی اشتعال انگیز تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ تقریر سنتا رہا۔ اس کے بعد وقفہ ہوا تو میں کانفرنس ہال کے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا باہر بالکل دوسرا منظر ہے۔ ہال کے باہر مقرر کی "اشتعال انگیزی" کا کوئی اثر نہ تھا۔

یہاں اب بھی درخت اسی طرح ہریالی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ آسمان کی وسعتیں بدستور اپنی جگہ قائم تھیں۔ سورج اپنی روایتی شان کے ساتھ اب بھی اپنی روشنی پھیلائے ہوئے تھا۔ چڑیوں کی آوازیں اس طرح سنائی دے رہی تھیں جیسے کہ انھیں ان باتوں کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ دوسری طرف مقامی بازار میں دیکھا تو یہاں بھی لوگ اسی طرح لین دین میں مشغول تھے۔

وہ اس طرح اپنے اپنے کاموں میں سرگرم تھے جیسے کہ وہ ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ وہ چیز جس سے لوگ بھوکتے ہیں وہ تو صرف کانفرنس کے کمرہ کی گونج ہے۔ وہ بس ایک وقتی آواز ہے جو کبھی کبھی اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ اس کے سوا بقیہ ساری انسانیت اور بقیہ تمام کائنات کے لئے وہ گویا ایک نہ ہونے والی بات (non-event) ہے۔ اس قسم کے الفاظ سے غیر متاثر رہ کر وہ اپنے فطری راستہ پر چل رہی ہے۔ جو واقعہ وسیع تر دنیا کے اعتبار سے اتنا کم اہم ہو اس پر مشتعل ہونے کی کیا ضرورت۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم لوک تنتر کی بات کرتے ہیں۔ مگر ہم اس کو زور زبردستی سے لانا چاہتے ہیں۔ یہ تو متضاد بات ہے۔ جب جب ہم کروانے اور منوانے کی بات کرتے ہیں تو ہم ہنسا کی بات کرنے لگتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کو اس دیش میں لوک تنتر لانا ہے یا ہنسا وادلانا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ جے پرکاش کے اندولن میں ہم لوگ بہت بڑی تعداد میں جٹے تھے، ہم کو آشا تھی کہ اس سے کچھ اچھا نکلے گا۔ مگر جے پرکاش یہ کہہ کر مرے کہ میری تو کوئی سنتا نہیں۔ اسی طرح گاندھی بھی آزادی کے بعد یہ کہہ کر مرے کہ اب میری نہیں چلتی۔

ایک صاحب نے کہا کہ اگر انگریز کا راج برا تھا تو بابر کا راج کیوں برا نہیں تھا۔ انگریزوں کی حکومت اگر غلامی تھی تو بابر کی حکومت کیوں غلامی نہیں تھی۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر ان الفاظ کے ساتھ شروع کی: میں تو سننے کے لئے آیا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے بولنا شروع کیا تو سب سے زیادہ لمبی تقریر انھیں نے کی۔ مزید یہ کہ سب سے زیادہ زور زور سے بھی وہی بولے۔

گاندھی جی کے پوتے راج موہن گاندھی نے کافی مایوسانہ انداز میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کے سب لوگ بھارتیہ ہیں، یہ میں مانتا ہوں۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی سوچ یہ نہیں۔ آج ہی میں نے اخبار میں پڑھا کہ بمبئی کے کچھ نوجوانوں نے کچھ لوگوں کو پکڑا اور ان سے زبردستی "جے شری رام" کہلایا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آزادی دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ اگر اس دیش کا مسلمان اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتا تو کیا زبردستی اس

سے کہلوانا چاہتے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔

۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو ہوا اس سے سارے دیش میں الگاؤوا د بڑھے گا۔ اس میں شک نہیں۔ پھر دیش کہاں جائے گا۔ اگر اجودھیا پہ بات نہیں رکتی تو اس کے بعد کیا ہو جائے گا، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اب کیا کرنا چاہئے، اس کے لئے میرے پاس کوئی سجھاؤ نہیں ہے۔ لیکن اگر بات ایودھیا پر رک جائے تو نئی شروعات ہوسکتی ہے۔ وہ جو مانگ ہے کاشی اور متھرا کی، اسے تو چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر تو مجھ کو اندھکار ہی اندھکار دکھائی دیتا ہے۔

ورندابن ہندوؤں کا مقدس شہر ہے۔ یہاں تقریباً پانچ ہزار مندر ہیں، کئی سو کی تعداد میں آشرم ہیں۔ یہاں ہمارا قیام گیتا آشرم میں تھا۔ اس نام سے تقریباً دو درجن آشرم مختلف مقامات پر ہیں۔ ان سب کا ہیڈ کوارٹر ہردوار میں ہے۔

مقامی سنسکرت ودیالیہ کے ۲۰ طلبہ آشرم کے ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ یہ سب برہمن کے لڑکے ہیں۔ یہاں تعلیم و تربیت پانے کے بعد وہ اپنے وطن چلے جائیں گے اور وہاں پنڈت کا کام سنبھالیں گے۔ ان کی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ آشرم کی تعمیر بالکل جدید انداز میں ہوئی ہے۔ پورا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ طلبہ کو نہایت صاف ستھرا کھانا دیا جاتا ہے۔

اس کا رسوئی گھر مجھے بہت پسند آیا۔ یہاں روزانہ تقریباً تین سو آدمی کا کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑے کمرہ میں واقع تھا۔ میں نے اندر کی طرف دیکھا تو درمیان میں ایک بڑا سا چوکور توا رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر بیک وقت پندرہ روٹیاں پکائی جاسکتی ہیں۔ توے کے نیچے گیس کا چولھا جل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ آشرم کے پاس چالیس گیس سلنڈر کا لائسنس ہے۔

آشرم کے طلبہ صبح ۴ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ ہر لڑکا سب سے پہلے اشنان کرتا ہے۔ کپڑا بدلتا ہے۔ اس کے بعد تیار ہو کر ایک بڑے کمرہ میں سب کے سب جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں سوامی اوشیشتا نند ان کو گیتا کا پاٹھ کراتے ہیں۔ آخر میں سب مل کر ایک ہندی نظم پڑھتے ہیں۔

آر ایس ایس کے ایک دانشور نے کہا کہ دیش بنانا ہے، یہی اصل مدعا ہے۔ "دیش بنانا ہے" یہ کام میرے حساب سے دس بارہ سال سے نہیں ہو رہا ہے۔ کون بنا رہا ہے، کون بنائے

گا۔ مجھے کوئی نہیں ملا جو کہے کہ " میں بناؤں گا۔"

" راج نیتی نے دیش بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اس کام کو بگاڑا اور اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ مجرم ہیں۔ ان کے ساتھ جو بھی کیا جائے کم ہے۔" ہر ویکتی میں یہ بھاؤنا آنا چاہئے کہ " میں دیش بناؤں گا۔" انھوں نے کہا کہ رچناتمک چھیتر میں آر ایس ایس نے ۶۰ سال تک کام کیا ہے۔ اب ہم کو دیش بنانے کے لئے راج نیتک چھیتر کو لینا ہو گا۔

اس قسم کی باتوں کو سن کر مجھے غصہ نہیں آتا۔ بلکہ میں سوچتا ہوں کہ موجودہ اتھل پتھل شاید اس لئے ہو رہی ہے کہ ہندوازم جو ابھی تک صرف نظری طور پر قابل رد تھا، وہ عملی اعتبار سے بھی قابل رد ہو جائے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو میں ورندابن سے متھرا گیا۔ اس سفر کا مقصد کرشن جنم استھان کے معاملہ کو براہ راست طور پر دیکھنا اور سمجھنا تھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مہیش شرما، ڈاکٹر راج کمار بھاٹیا، مسٹر رام بہادر رائے بھی تھے۔

وہاں میں نے دیکھا کہ کرشن جنم استھان کے نام سے ایک بہت بڑا کامپلکس بنا ہوا ہے اور مسجد اس سے بالکل الگ ہے۔ کرشن کا جنم استھان پوری طرح مندر کے احاطہ میں ہے۔ اور وہاں روزانہ درشن اور پوجا کا عمل جاری ہے۔ ہم لوگ جب اس خاص کمرہ کو دیکھ کر باہر آئے جس کو کرشن کا جنم استھان کہا جاتا ہے تو مسٹر رام بہادر رائے نے کہا: متھرا اور کاشی کو اجودھیا کی کٹگری میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ کرشن کا جنم استھان تو مسجد میں شامل ہی نہیں۔

دوسرے صاحب نے کہا: یہاں جنم استھان پر قبضہ کا جھگڑا نہیں ہے۔ یہاں یہ جھگڑا ہے کہ جنم استھان کا دوار کدھر سے ہو۔ یہ لوگ مسجد کی طرف اس کا دوار کھولنا چاہتے ہیں۔

کرشن جنم استھان کی سیڑھی کے پاس ایک بڑا سا بورڈ رکھا ہوا ہے۔ اس پر ہندی میں کئی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس پر درج ہے کہ شری کرشن کا اوتار اس جگہ پر ۳۱۶۸ ق م میں ہوا تھا۔ اس مندر کو پہلی بار محمود غزنوی نے ۱۰۱۷ء میں توڑا۔ ۱۱۵۰ء میں راجہ وجے پال نے دوبارہ سے اس کو بنوایا۔ سکندر لودی نے سولھویں صدی میں اس کو پھر توڑا۔ اس کے بعد ۱۶۱۳ء میں ویر سنگھ دیو نے اس مندر کو پھر بنوایا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۶۹ء میں اس کو توڑا، اور مندر

کی زمین کا بڑا حصہ لے کر یہاں مسجد بنوائی۔ اب پھر یہاں زیادہ بڑے پیمانے پر مندر کا کمپلکس بنوایا جا رہا ہے۔

کرشن جنم استھان کے اوپر سے مسجد دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہاں پہنچنے کا کوئی اچھا راستہ نہیں۔ آدمی ایک کچے اور تنگ راستہ سے گزر کر ایک گہرے نالہ کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس نالہ پر کوئی پل نہیں ہے۔ اس کے اندر اتر کر اس کو پار کرنا پڑتا ہے۔ ان مراحل سے گزر کر ہم لوگ مسجد کے پاس پہنچے۔

یہ ایک خوبصورت شاہی دور کی مسجد ہے، اس کے سامنے ایک اونچا گیٹ ہے جو بعد کو ۱۳۴۶ھ میں علی خاں، رئیس مسعود آباد نے بنوایا تھا۔ اس کے اوپر ایک فارسی قطعہ ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

بکرد انجمن انتظامیہ آں کار   صدائے آفریں برخاست از صغار و کبار

اس مسجد کے پاس کچھ مسلمان آباد ہیں۔ ان کے تقریباً ۲۰۰ گھر ہیں۔ یہ لوگ گائے اور بھینس کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں ہر طرف گندگی اور بے ترتیبی کے مناظر تھے۔ پورا محلہ کوڑے خانہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کچھ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ظہور محمد صاحب تھے۔ مسجد کے امام صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

معلوم ہوا کہ مسجد میں پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ جمعہ کے روز پوری مسجد بھر جاتی ہے۔

ظہور محمد (۷۵ سال) مسجد کے پاس رہتے ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح بھینس کا کام کرتے ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ ۱۹۵۴ تک یہاں سب مسلمانوں کی آبادی تھی۔ پیچھے کی جگہ خالی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ مقدمہ قائم ہوا۔ کوتوال وغیرہ نے صلح کرائی۔ مسلمان اس پر راضی ہوئے کہ خالی جگہ مندر کے لئے دیدی جائے۔

کوتوال نے کہا کہ ہندو لوگ یہاں مندر بنائیں تو آپ لوگوں کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ اگر وہ اپنی ذاتی کوٹھی بنائیں تو ہم کو اعتراض ہوگا۔ اگر وہ مندر بنائیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں۔ ظہور محمد صاحب نے کہا ——— میں قوم سے جاٹ، مذہب سے مسلمان اور پیشہ سے گھوسی ہوں۔

ڈاکٹر سریندر شرما۔ ورندابن (۶۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے متھرا کے بارہ میں حسب ذیل کہانی سنائی: یہاں پہلے سے کیشو دیو جی کا مندر تھا۔ اس کو کیشو دیو کٹرا کہا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس مندر کو توڑا اور اسی کی نیو پر مسجد بنائی۔ مرہٹہ کا راج ہوا تو انھوں نے اس کو نزول بھومی ڈکلیر کر دیا۔ مگر بنوایا نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ادھیکار آگیا تب بھی نزول بھومی رہی۔ کمپنی کے زمانہ میں نیلامی ہوئی۔ تقریباً چودہ سو روپیہ میں راجہ ٹینی مل نے سارے چھیتر کو خرید لیا۔ پھر اس کے بعد اسی چھیتر میں ریلوے لائن نکلی۔ ریلوے لائن نے معاوضہ راجہ کو دیا۔ مسلمانوں نے برٹش گورنمنٹ کے ٹائم میں دعویٰ پیش کیا کہ اس کو نہیں دیا جائے۔ لور کورٹ میں مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ میں بھی خارج ہوگیا۔ ۱۹۲۸ میں مسلمانوں کی طرف سے پھر مقدمہ دائر کیا گیا۔ ۱۹۳۲ میں فیصلہ ہوا۔ اس فیصلہ میں اس کی پوری ہسٹری شامل کی گئی۔ اب منوہر لال شرما ایڈووکیٹ نے رٹ دائر کی ہے الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ اس میں معاہدہ کو کالعدم کرنے کو کہا گیا ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو دہلی واپس آیا۔ جب گیتا آشرم سے نکل کر ہماری گاڑی ورندابن کے بازار سے گزر رہی تو میں نے دیکھا کہ بازار کے لوگ بدستور اپنی تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ یہاں ہندو اور مسلم سوال کو بھول کر لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کمانا اور کھانا ہے۔ تمہارے بھاشنوں سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں۔

شہر سے باہر نکلے تو دنیا اور زیادہ وسیع تھی۔ یہاں فطرت کا ماحول ایک آفاقی پیغام دے رہا تھا۔ آسمان کی وسعتیں بدستور قائم تھیں۔ درخت بدستور اپنی ہریالی دکھا رہے تھے۔ سورج اور چاند کا نظام بدستور اپنی جگہ قائم تھا۔ ہواؤں کے جھونکے بدستور اپنا سہانا پیغام دے رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ لوگ اشتعال انگیز باتوں پر بھڑکتے ہیں، مگر جو آواز اتنی بے قیمت ہو کہ بولنے کے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔ یا اخبار میں چھپ کر شام تک ردی کی ٹوکری میں پہنچنے والی ہو، اس پر بھڑکنے یا مشتعل ہونے کی کیا ضرورت۔

بمبئی کا سفر

۱۲ جنوری ۱۹۹۳ کو میں ایک پروگرام کے تحت ودیشا (مدھیہ پردیش) میں تھا۔ وہاں اتفاقی طور پر مسٹر مدھو مہتا سے ملاقات ہوئی۔ موصوف مشہور ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں جس کا ہیڈ کوارٹر بمبئی (Tel. 3624471) میں ہے۔ موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان سے موجودہ ملکی حالات پر گفتگو ہوئی تو وہ میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ بمبئی واپس جانے کے بعد ان کے کئی ٹیلیفون آئے۔ وہ بمبئی میں میرا کچھ پروگرام رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اصرار پر بمبئی کا سفر ہوا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی صبح کو بمبئی کے لئے روانگی ہوئی، اور ۵ فروری کی شام کو دہلی واپس آگیا۔

دہلی ایرپورٹ پہنچا تو وہ بھیانک ہوائی حادثہ یاد آیا جو تین ہفتہ پہلے ۹ جنوری کو یہاں پیش آیا تھا۔ روسی ساخت کا ایک جہاز (Tu-154) جو کہ انڈین ایرلائنز کے استعمال میں تھا، حیدرآباد سے اڑکر دہلی پہنچا۔ اس وقت ہوائی اڈہ پر کچھ کہر تھی۔ جہاز نیچے اترا تو پائلٹ جہاز کو رن وے کی سنٹر لائن پر نہ اتار سکا۔ جہاز کا دائیں طرف کا پہیہ پختہ رن وے سے اتر کر کچی زمین پر چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں جہاز ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ تاہم اس کے ۱۶۳ مسافر معجزاتی طور پر بچ گئے۔

زندگی کی بھی ایک پختہ سڑک ہے۔ اور اس کے دائیں اور بائیں کچے راستے ہیں۔ سڑک کے سفر کا اصول ہے کہ احتیاط کے ساتھ چلو (drive cautiously) یہی اصول زندگی کے عام سفر کا بھی ہے۔ حقائق کی رعایت کرکے زندگی کا سفر طے کرنا گویا پختہ سڑک پر چلنا ہے۔ اور جذباتی ابال یا خوش گمانی کے تحت بلا احتیاط اپنی گاڑی چلانا گویا کچی زمین پر اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے۔ ایک صورت میں زندگی کی گاڑی محفوظ سفر کرکے اپنی منزل تک پہنچے گی اور دوسری صورت میں صرف یہ ہوگا کہ وہ بربادی کے گڑھے میں گر کر تباہ ہو جائے۔

دہلی سے بمبئی کے لئے انڈین ایرلائنز کے جہاز کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ آج کے اخبارات دیکھے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ملی جس کو میں یہاں درج کرسکوں۔ آجکل کے اخباروں

کا یہ حال ہے کہ ان میں زیادہ تر ایسی خبریں اور ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں کوئی سبق نہ ہو۔ یہ گویا کہ نمک کے پہاڑ ہیں جن میں سے کر کے کچھ ذرات مل جاتے ہیں جن کو ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے۔ انگریزی شاعر کے الفاظ میں "پانی پانی ہر طرف، مگر پینے کے لئے ایک قطرہ نہیں":

Water, water everywhere. Nor a drop to drink.

جہاز میں ایک ہندو سائنٹسٹ سے ملاقات ہوئی۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ وہیں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اپنے دیش جائیں اور وہاں سائنسی علوم کو ترقی دیں۔ مگر یہاں آنے کے بعد انھیں بہت تلخ تجربہ ہوا۔ انھوں نے پایا کہ یہاں کے تمام سائنس داں کیریرسٹ سائنس داں (careerist scientists) ہیں۔ وہ اپنے سوا کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے حوصلہ شکن تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ اب میں دوبارہ امریکہ چلا جاؤں گا۔ کیوں کہ انڈیا میں میرا کوئی مستقبل نہیں:

I will go back to the States, as there would hardly be any future for me in India.

جس ملک میں خود اس ملک کے اپنے دماغ مایوس ہو جائیں، وہ ملک گویا کہ خود اپنے معماروں سے محروم ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔

ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ عدالت میں جب جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے تو ایک طرف ہم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ہمارا مخالف وکیل۔ اس وقت ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم ایسی بات کہیں جس سے ہمارا مخالف مشتعل ہو جائے۔ اگر کسی طرح ہم نے اس کو مشتعل کر دیا تو اس کے بعد ہماری کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشتعل آدمی کا ذہن ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملہ کے تمام پہلوؤں پر دھیان دے سکے۔ اس کا ذہن اصل معاملہ سے ہٹ کر حریف کی شخصیت کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر متعلق باتیں کرنے لگتا ہے۔ متعلق باتیں اس کی پکڑ سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو جائے

وہ کبھی مقابلہ کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اسی کا نام صبر ہے۔ ایک ہے عاجلانہ فکر، دوسری ہے صابرانہ فکر۔ عاجلانہ فکر وہ ہے جب کہ آدمی ردعمل میں مبتلا ہو کر سوچے۔ صابرانہ فکر یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے غیر متاثر رہے۔ وہ آزادانہ سوچ کر اپنے عمل کا رخ متعین کرے۔

آج ۳۱ جنوری کو بمبئی ایئرپورٹ پر ایک حادثہ پیش آیا۔ برٹش ایئرویز کا ایک جہاز (Boeing 747) بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہوا۔ مگر ایک گھنٹہ کے اندر دوبارہ وہ بمبئی واپس آگیا۔ اس کے اوپر عملہ کے ۱۸ لوگوں کو ملا کر کل ۳۴۲ عورت اور مرد سوار تھے۔ واپسی کی وجہ یہ ہوئی کہ فضا میں بلند ہونے کے بعد جہاز کے پائلٹ نے پایا کہ اس کا ایک انجن جنریٹر (engine generator) فیل ہو گیا ہے۔ اب جہاز کو آگے لے جانا اس کو منزل کی طرف لے جانا نہیں تھا بلکہ اس کو تباہی کی طرف لے جانا تھا، اس لئے پائلٹ نے پیچھے کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا۔

آگے بڑھنا بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس دنیا میں کبھی پیش قدمی کو روک کر پیچھے کی طرف واپس جانا آدمی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی کمیوں کو درست کر کے دوبارہ پیش قدمی کے قابل ہو سکے۔ جب کہ اس وقت آگے بڑھنے کا مطلب عملی طور پر یہ بن جاتا ہے کہ اپنے وجود ہی کا خاتمہ کر لیا جائے۔

بمبئی ایئرپورٹ پر یہاں کے کئی احباب موجود تھے۔ ان کے ساتھ شہر کے لئے روانگی ہوئی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کو فجر کی نماز میں نے نظام الدین کی کالی مسجد میں پڑھی تھی۔ اور اسی دن ظہر کی نماز کے وقت میں بمبئی پہنچ چکا تھا۔ جب کہ دہلی اور بمبئی کے درمیان تقریباً ۱۵۵۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک واقعہ وہ گزرا جس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے ——— پاک ہے وہ اللہ جو ایک رات اپنے بندے کو مکہ کی مسجد حرام سے دور کی مسجد (فلسطین) تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ (الاسراء)

"اسراء" کے اس معاملہ پر سوچتے ہوئے خیال آیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ کا شاید ایک پہلو یہ بھی ہو کہ تاریخ میں آپ ایک ایسے

انقلاب کا آغاز کرنے والے ہیں جب کہ انسان کے لئے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ "ایک رات" میں دور کی کسی منزل کا سفر کرے اور پھر اسی رات کو دوبارہ اپنے مقام پر واپس آجائے۔

بمبئی میں میرا قیام ریجنسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۰۵ میں تھا۔ یہ بمبئی کے ایک پرسکون علاقہ (نیپین سی روڈ) پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے وہ میری پسند کے مطابق تھا۔

بمبئی ہندستان کا سب سے بڑا شہر ہے، بمبئی کے ساتھ بے شمار یادیں اور تاریخیں وابستہ ہیں۔ جون ۱۸۸۸ میں موہن داس کرم چند گاندھی یہیں کے ساحل سے مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ انھوں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر پانی کے جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا تھا۔ بنیا کمیونٹی کو معلوم ہوا تو اس نے موہن داس کو ذات باہر (outcaste) قرار دیا۔ لوئی فشر کے الفاظ میں، ان کا مذہب سمندری سفر طے کر کے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کیوں کہ وہاں ہندو دھرم پر عمل نہیں کیا جا سکتا تھا:

Their religion forbade voyages abroad because Hinduism could not be practiced there. (p.23)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے سو سال پہلے تک انڈیا کا سماج کتنا بند سماج تھا۔ اس بند سماج کو ۵۰ فیصد مسلم تہذیب نے کھولا، اور بقیہ ۵۰ فیصد مغربی تہذیب نے۔

بمبئی فساد کے زمانہ میں پاکستانی اخبارات میں صفحہ اول پر نہایت اشتعال انگیز خبریں چھپ رہی تھیں۔ روزنامہ وفاق جو پاکستان کا اسلامی اخبار سمجھا جاتا ہے، اس کے شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ کے صفحہ اول کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا:

بمبئی فسادات کا جہنم بن گیا۔ شہر پر جنونی ہندوؤں اور غنڈوں کا راج

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت اس قسم کے اخبارات ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات زرد صحافت کی بدترین مثال ہیں۔ ان اخبارات نے کوئی بھی تعمیری کردار ادا نہیں کیا۔ انھوں نے پچھلے سو سال میں صرف ایک کام کیا ہے۔ مسلمانوں کے مزاج کو بگاڑنا۔ انھیں آخری حد تک دوسری قوموں سے متنفر کر دینا۔ اسی منفی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اس دنیا

میں ترقی کا راز برداشت ہے نہ کہ اشتعال۔

۳۱ جنوری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کے مکان پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس دوران انھوں نے کئی دلچسپ باتیں سنائیں۔ سردار پٹیل کے سکریٹری نے ایک بار انھیں بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب پاکستان سے ریفیوجی بڑی تعداد میں دہلی آئے تو وہ چاندنی چوک کے علاقہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور وہاں سامان رکھ کر بیچنے لگے۔ اس کے بعد چاندنی چوک کے دکانداروں کا ایک وفد سردار پٹیل سے ملا جو اس وقت ہوم منسٹر تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ان شرنارتھیوں نے جب سے آکر فٹ پاتھ پر کاروبار شروع کیا ہے، ہمارا بزنس ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے ان شرنارتھیوں کو یہاں سے ہٹائیے۔

سردار پٹیل ان تاجروں کی بات چپ چاپ سنتے رہے۔ جب انھوں نے اپنی بات ختم کی تو سردار پٹیل نے پرسکون لہجہ میں کہا: اس کا حل بہت آسان ہے۔ آپ لوگ دکان چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آجائیے اور فٹ پاتھ والوں کو دکان میں بٹھا دیجئے۔ اس کے بعد تمام دکاندار خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے ——— سردار پٹیل کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ایڈمنسٹریشن چلانے کے لئے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے بتایا کہ ۱۹۴۶ میں جب پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا۔ پولیس اور فوج اس کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہو گئی تھی۔ اس وقت گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن برلا ہاؤس، دہلی گئے اور مہاتما گاندھی سے ملے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ ملک میں آگ لگی ہوئی ہے، اور میری فورس اس کو روکنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی اس کو روک سکتے ہیں۔ آپ میری واحد نفری فوج ہیں:

You are my one-man army.

بمبئی میں ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر الوین فرنینڈیز (Allwyn Fernandes) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی کے لوگ مسٹر مدھو مہتا کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول کاموں کے چیمپئن ہیں:

Madhu Mehta is the champion of unpopular causes.

مسٹر مدھو ہتا کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ایک با اصول آدمی ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اصول کی خاطر کرتے ہیں نہ کہ مفاد کی خاطر۔ لوگ عام طور پر ان اشوز کو لے کر اٹھتے ہیں جو عوام پسند ہوں، جن کے ذریعہ فوراً مقبولیت حاصل ہوتی ہو۔ مگر مدھو ہتا صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا صحیح ہے۔ اس دنیا میں مفاد کو نظر انداز کرنے والا آدمی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مدھو ہتا ایسے ہی ایک نادر آدمی ہیں، اسی لئے ان کے بارہ میں کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ غیر مقبول مقاصد کے چیمپئن ہیں۔

اخباروں میں یہ بات آچکی ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا، اس کے پڑوسی علاقہ بھیونڈی میں فساد نہیں ہوا۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ علمی مطالعہ حقیقۃً تقابلی مطالعہ کا دوسرا نام ہے۔ اس معاملہ میں علمی مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ بمبئی میں فساد ہوا تو بھیونڈی میں فساد کیوں نہیں ہوا۔ نارتھ انڈیا میں فساد ہوتا ہے تو ساؤتھ انڈیا میں فساد کیوں نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان اس دشمن ملک میں امن و سکون کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں۔

اگر اس طرح تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جہاں فساد ہوتا ہے اس کا سبب کیا ہے، اور جہاں مسلمانوں کو امن و سکون کے ساتھ رہنے کا موقع مل رہا ہے وہاں ایسا کس طرح ہوتا ہے۔

میں نے اس پہلو سے بہت غور کیا ہے۔ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان حقیقت پسندانہ انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد نہیں ہوتا ہے اور جہاں جذباتی انداز میں رہتے ہیں وہاں فساد ہو جاتا ہے۔ فسادی عناصر تو ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا مثبت ردعمل ایک جگہ بم کو ڈیفیوز کر دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا منفی ردعمل دوسری جگہ بم کو انفجار تک پہنچا دیتا ہے۔

بہار کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ انتظامی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ قصہ بتایا۔ بہار کی ایک سڑک پر کچھ ڈاکوؤں نے ایک مسافر بس کو روکا۔ وہ گن لئے ہوئے بس میں داخل ہوئے اور تمام مسافروں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جتنی رقم ہو وہ سب ہمارے حوالے کر دے۔ مسافروں کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رقم

ڈاکوؤں کے حوالے کردی۔

آخر میں ڈاکوؤں کے سردار نے حاصل شدہ رقم کو گنا تو وہ کل سات ہزار تھی۔ اس نے کہا کہ اس میں تو ہم کو گھاٹا ہو جائے گا۔ کیوں کہ ہمیں دس ہزار روپیہ تو پولیس کو دینا ہے۔ چنانچہ اس نے تمام کی تمام رقم مسافروں کو دوبارہ واپس کردی۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ کی شام کو ۵ بجے گورنر ہاؤس میں مہاراشٹر کے گورنر پی سی الکزینڈر (P.C. Alexander) سے ملاقات ہوئی۔ اس میں میرے علاوہ اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، جسٹس دھرم ادھیکاری، انا ہزارے اور دوسرے کئی لوگ شریک تھے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ انھوں نے میرے کچھ انگریزی مضامین پڑھے ہیں اور شانتی یاترا کا ٹیپ دیکھا ہے۔ اس سے وہ کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں جو سنگین مسئلہ ہے اس کو پولیٹکل لوگ حل نہیں کرسکتے۔ اس کو صرف مذہبی اور روحانی شخصیتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔

اس ملاقات کی رپورٹ راج بھون پریس ریلیز کے تحت بمبئی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (یکم فروری ۱۹۹۳) میں چھپی۔ اس میں یہ صراحت بھی تھی کہ یہ ملاقات خود گورنر کی درخواست پر ہوئی:

> Various religious leaders and prominent citizens met the governor at Raj Bhavan at his request. (p.3)

یکم فروری کی شام کو مسٹر مدھو مہتا کی قیام گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ بمبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے خطاب کیا۔ خطاب کے دوران میں نے کہا کہ لوگ اجودھیا کو پرابلم بنائے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اجودھیا کو سبق اور نصیحت کا واقعہ بنا دیا جائے۔

یہاں سوال و جواب بھی ہوئے۔ ایک نوجوان راہل شرما (Rahul Sharma) نے کہا کہ مسلمان اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتے ہیں۔ اس کے بارہ میں آپ کا خیال کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہاں شاید کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے آپ کو پاکستان کے ساتھ آئیڈنٹیفائی کرتا ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان کرکٹ میچ میں کچھ مسلمان لڑکے بعض طفلانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ میں اس قسم کی حرکتوں کو لغو سمجھتا ہوں۔ مگر وہ صرف

اس قابل ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کی بنیاد پر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں رائے بنانا صحیح نہیں۔

ٹائمس آف انڈیا کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر ایلون فرنانڈیز (Allwyn Fernandes) نے مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ریجنسی ہوٹل کے کمرہ ۳۰۵ میں ریکارڈ کیا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲ فروری ۱۹۹۳ میں یہ انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔

سوالات زیادہ تر مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں تھے۔ میں نے ایک بات یہ کہی کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک بات واضح طور پر جان لینا چاہئے کہ جب مختلف لوگ مل کر ایک سماج میں رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک کو دوسرے سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہر سماج میں ہوتا ہے خواہ وہ انڈیا کا معاملہ ہو یا اور کسی ملک کا معاملہ۔

ایسی حالت میں کیا کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اوائڈ کریں۔

جنرل ایس کے سنہا (۶۶ سال) پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ ان سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ۲ فروری کی ملاقات میں میں نے کہا کہ آپ لمبی مدت تک فوج میں رہے ہیں۔ اپنی فوجی زندگی کا کوئی واقعہ بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے زمانہ میں جو فوج تھی وہ آج سے بہت مختلف تھی۔ اس میں زبردست کیرکٹر پایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۴ میں لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ کلکتہ میں انگریزوں کی ایک بٹالین تھی۔ اس میں ایک ہزار انگریز سپاہی تھے۔ ان میں سے کچھ انگریز کلکتہ کی ایک کینٹین میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ ہندستانی ملازم نے کھانا لانے میں کچھ دیر کی۔ ایک انگریز سپاہی جو شراب پئے ہوئے تھا غصہ میں آگیا۔ اس نے ہندستانی ملازم کو گھونسا مار دیا۔ اتفاق سے وہ مر گیا۔ یہ واقعہ اخبار میں چھپ کر کافی مشہور ہوا۔

اس کے بعد یہ کیس فوج کی کورٹ آف انکوائری میں آیا۔ انگریز فوجیوں نے سطے کیا کہ وہ گواہی نہیں دیں گے اور یہ کہہ دیں گے کہ ہم کو نہیں معلوم کہ کس نے گھونسا مارا۔ آخر کار قاتل کا ثبوت نہ مل سکا۔ فوجی ذمہ داروں نے وائسرائے کو لکھ کر بھیج دیا کہ قاتل کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔

اس لئے اس کیس کو کلوز کر دیا جائے اور مقتول کے وارثوں کو پانچ ہزار روپیہ بطور تلافی دے دیا جائے۔

لارڈ کرزن نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مقتول کو پانچ ہزار روپیہ ہم دے دیتے ہیں۔ مگر کیس کو ہم کلوز نہیں کریں گے۔ بلکہ پوری انگریز بٹالین کو اس کی سزا دیں گے۔ چنانچہ وائسرائے نے ایک ہزار فوجیوں کی اس انگریز بٹالین کو برما کے ایک غیر ترقی یافتہ علاقہ میں بھیج دیا جو کہ ملیریا کا علاقہ تھا۔ وہاں پوری بٹالین دو سال تک بطور سزا رہی۔ بہت سے لوگ ملیریا کی وجہ سے بیمار ہو گئے اور ستره انگریز فوجی وہیں مر گئے۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائک بہت باشعور اور درد مند آدمی ہیں۔ وہ اپنے دو صاحبزادوں، ڈاکٹر محمد نائک اور ڈاکٹر ذاکر نائک کے ساتھ نہایت مفید انداز میں "دعوۃ ورک" کر رہے ہیں۔ یکم فروری کی شام کو مدھو مہتا صاحب کی رہائش گاہ پر جو میٹنگ ہوئی، اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں اجتماع کے بعد ان لوگوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دوسری انگریزی کتابیں لوگوں کے درمیان تقسیم کیں۔ لوگوں نے بہت شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

ڈاکٹر نائک صاحب نے کہا کہ مسلم نوجوان اکثر شکایت کرتے ہیں کہ ان کے لئے مواقع نہیں۔ جو مواقع بظاہر مہیا نہیں ہیں ان کی تو وہ شکایت کرتے ہیں۔ مگر جو مواقع مہیا ہیں ان کو وہ استعمال نہیں کرتے۔

انھوں نے کہا کہ ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ڈسپلن والی زندگی اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک ضروری کام یہ ہے کہ ہر آدمی ڈائری رکھے اور روزانہ اپنی سرگرمیوں کا اس میں اندراج کرے۔ اسی طرح ملک میں بہت سے رضاکارانہ ادارے (volunteer bodies) ہیں جو مفت میں مختلف قسم کی چیزیں سکھاتے ہیں۔ مثلاً جرنلزم، اسمال اسکیل انڈسٹری، جمنازیم اسکاوٹنگ، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی رضاکار تنظیموں سے وابستہ ہو کر مسلم نوجوانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

۲ فروری کی دوپہر کو مہاراشٹر اسٹیٹ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک تاریخی بلڈنگ میں قائم ہے۔ یہاں انسپکٹر جنرل آف پولیس مسٹر جی این اوبالے (G.N. Ubale)

اور ڈپٹی کمشنر آرایس راٹھور (R.S. Rathod) اور دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

عام طور پر لوگ پولیس کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ پولیس کے لوگ بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کو چھیڑیں تو وہ غصہ میں آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ مقدس بزرگ بھی۔ جب آدمی کسی کے اوپر غصہ ہوتا ہے تو وہ اس کے خلاف ہر کارروائی کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ جس آدمی کے پاس کنکر ہے وہ کنکر پھینک کر مارے گا۔ اور اگر بندوق ہے تو وہ بندوق چلائے گا۔ گویا کہ یہ معاملہ وہ ہے جس کی بابت فارسی شاعر نے کہا کہ:

ایں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند۔

مسٹر آر ایس راٹھور بمبئی پولیس میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ان کی فرمائش پر ۳ فروری کی شام کو ان کے یہاں کھانا کھایا۔ کھانا، فرنیچر، مکان، ہر چیز میں سادگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ عام پولیس افسروں سے بہت مختلف ہیں۔

کھانے کے دوران انھوں نے کئی قصے بتائے۔ ایک یہ تھا کہ ۱۹۷۷ میں جب جنتا گورنمنٹ نے اندرا گاندھی کو گرفتار کیا، اس وقت وہ پربھنی میں پولیس افسر تھے۔ اس وقت شہر میں دو جلوس نکلے۔ ایک کانگرس پارٹی کا جو حکومت کے خلاف بطور احتجاج تھا۔ دوسرا جنتا پارٹی کا جو حکومت کی حمایت میں تھا۔ دونوں ایک ہی سڑک پر مخالف سمتوں سے آرہے تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ ایک پوائنٹ پر پہنچ کر دونوں میں ٹکراؤ ضرور ہی ہے۔

دونوں طرف ہزاروں آدمی تھے اور دونوں ہی جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ مسٹر راٹھور وردی میں ملبوس ہو کر موقع پر پہنچے۔ انھوں نے جلوس کا مائک اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس یہاں کافی فورس موجود ہے۔ اگر آپ لوگ تشدد کرتے ہیں تو میں بھی تشدد کروں گا اور فوراً فائرنگ کا آرڈر دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ جلوس میں بہت سے معصوم (innocent) لوگ ہیں۔ اگر فائرنگ ہوئی تو سب سے پہلے یہی معصوم لوگ مریں گے۔ اس لئے میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں سے چلے جائیں۔

اس اعلان کے بعد آدھے سے زیادہ لوگ جلوس سے نکل کر چلے گئے۔ اس کے بعد جلوس

والے اتنا پریشان ہوئے کہ انھوں نے راستہ بدل دیا اور کسی ٹکراؤ یا ایکشن کی نوبت نہیں آئی۔

۲ فروری کو مسٹر مدھو مہتا کی رہائش گاہ پر جنرل سنہا اور راماکرشنن (S. Ramakrishan) سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر راماکرشنن نے میری کل کی تقریر کے بارہ میں کہا کہ اس کو سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی رشی بول رہا ہے۔ آپ کے شبد ہونٹوں سے نہیں بلکہ دل سے نکل رہے تھے۔

مسٹر راماکرشنن ایک بہت بڑا مشن چلا رہے ہیں۔ اس کا نام ڈی ڈیوائن لائف سوسائٹی ہے۔ انھوں نے اپنی سوسائٹی کی چھپی ہوئی کئی کتابیں دیں جو اخلاق اور روحانیت کی تعلیمات پر مبنی تھیں۔ انھوں نے راج گوپال اچاری کے کئی واقعات بتائے۔

راج گوپال اچاری کے متعلق میرا خیال ہے کہ مہاتما گاندھی کے بعد وہ پورے ملک میں سب سے زیادہ قابل اور لائق آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد اگر وہ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم ہوتے تو شاید ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

مسٹر پرتاپ بھوگی لال بمبئی کے ایک صنعت کار ہیں (فون نمبر 3623688) ان کی رہائش گاہ پر ۲ فروری کی شام کو مغرب بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً چالیس لوگ شریک ہوئے۔ وہ زیادہ تر ممتاز تجارتی افراد تھے۔ اس موقع پر میں نے سہ نکاتی فارمولے کی وضاحت کی نیز یہ بتایا کہ موجودہ ملکی مسائل کا حل کیا ہے۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔

۲ فروری کو مسٹر اشیش شاہ (Ashish Shah) نے نہایت تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مڈڈے (Mid-day) کے لئے تھا۔ وہ مڈڈے کے شمارہ ۱۳ مئی ۱۹۹۳ میں شائع ہو چکا ہے۔

مسٹر ہرندر دوے ایک گجراتی اخبار جنم بھومی (جاری شدہ ۱۹۳۴) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ اشعار کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ ملکی لیڈرشپ پر سلام مچھلی شہری کا ایک شعر سنایا:

سمندر تیز طوفانی ہوا ٹوٹی ہوئی کشتی یہی اسباب کیا کم تھے کہ اس پر ناخدا تم ہو

مسٹر ہرندر دوے روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں پرارتھنا بھی کرتا ہوں تو بھگوان سے یہ کہتا ہوں کہ جو بھی اچھی بات میرے لئے ہو اس کو آپ میرے لئے کر دو۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ سوامی ویویکانند کے بہت معتقد تھے۔ انھوں نے سوامی ویویکانند کے عالمی مذہب (universal religion) کے نظریہ کی حمایت کی۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی۔ اس میں تھا کہ سوامی ویویکانند نے ۱۸۹۳ میں امریکہ کے ایک لکچر میں کہا تھا کہ نام نہاد ٹالرنس ایک بددینی کی بات ہے۔ میں ٹالریٹ کرنے کے بجائے قبول کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ ٹالرنس کا مطلب یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم غلط ہو اور میں تم کو صرف زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ کیا یہ سوچنا بددینی نہیں ہے کہ میں اور تم دونوں ایک دوسرے کو بس زندہ رہنے کا حق دے رہے ہوں۔ میں سارے ہی مذہبوں کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ ایک خوبصورت تخیل تو ہے مگر وہ کوئی خوبصورت نظریہ نہیں۔ نظریہ وہ ہے جو قابل عمل ہو۔ یہ بات موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔ یہاں عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ ٹالرنس ہی ہے۔ اس کے ناقابل عمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والے ایسے مذہب کی تو قدر کرتے ہیں جو انھیں کی طرح یہ کہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ مگر جو مذہب یہ کہے کہ سچا مذہب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے، اس کی قدر دانی کرنے کے لئے یہ لوگ کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ اپنے نظریہ کے مطابق انھیں ایسے مذہب کی بھی پوری قدر کرنا چاہئے۔

تعدد حقیقت کے اس ہندو نظریہ کو مغربی ملکوں میں بہت مقبولیت ملی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے توحید حقیقت کے نظریہ کو وہاں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کو مغرب کے لوگوں کا تعصب قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسلام دشمنی کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ رائے درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل مغرب کے لئے ہندوازم کا نظریہ زیادہ مفید مطلب (convenient) ہے، جب کہ اسلام کا نظریہ انھیں اپنے لئے موافق نظر نہیں آتا۔

اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ مذہب ان کے سیاسی اور تمدنی معاملات میں داخل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کہا کہ مذہب ایک پرائیویٹ انسانی معاملہ ہے۔ ہندوازم کے نظریہ میں بھی ان کو یہی فائدہ دکھائی دے رہا ہے۔ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے مذہب

کو ایک پرائیویٹ معاملہ بتایا تھا وہی مقصد انھیں ہندوازم کے اس نظریہ میں بھی الفاظ بدل کر حاصل ہو رہا ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ عربی، اردو، فارسی، انگریزی میں مسلمانوں کے جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں، ان سب کو ایک ہی مشترک نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ پروٹسٹ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہر صحافت نامہ احتجاج نامہ ہے۔ ان میں اغیار کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتا کر ان پر سب وشتم کیا جاتا ہے۔

یہ یقینی طور پر قرآن کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے اوپر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانا عملی طور پر قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔ مگر قرآن کا یہ عملی انکار ساری مسلم دنیا میں علی الاعلان کیا جارہا ہے۔ اور یہ عملی انکار وہ لوگ کر رہے ہیں جو قرآن اور اسلام کے نام ہی پر اپنی ساری مہم چلا رہے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ دستور نے ہم کو برابری کا حق دیا ہے اور کوئی بھی شخص ہم کو اپنا دستوری حق لینے سے روک نہیں سکتا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا:

None can curtail minorities rights bestowed by the constitution.

میں نے کہا کہ یہ واقعہ تو خود آپ لوگوں کے بیان کے مطابق، پچھلے چالیس سال سے جاری ہے کہ مسلم اقلیت کو اس کا دستوری حق نہیں مل رہا ہے۔ پھر کیوں نہیں آپ نے اس کو روک دیا۔ میں نے کہا کہ کسی گروہ کو اس کا حق دستوری الفاظ کی بنیاد پر نہیں ملتا بلکہ اس کے اپنے استحقاق کی بنا پر ملتا ہے۔ آپ اگر دستور میں لکھا ہوا حق لینا چاہتے ہیں تو اس قسم کی پرجوش تقریر نہ کیجئے۔ بلکہ مسلمانوں کو تعلیم اور دوسرے شعبوں میں آگے بڑھا کر اس قابل بنا دیجئے کہ وہ اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہو جائیں۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا جو لکھنے اور بولنے والا طبقہ ہے، اس

کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم معاملات میں اپنے لئے اپوزیشن سے رہنمائی لیتا ہے۔ اپوزیشن کا سیاسی فائدہ یہ ہے کہ وہ حکمراں پارٹی کو بدنام کرے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فساد یا اور کسی موقع پر اپوزیشن کے افراد فوراً یہ کرتے ہیں کہ اس کو لے کر انتظامیہ کی مذمت شروع کرتے ہیں۔ اس پالیسی کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام انتظامیہ (یعنی حکمراں پارٹی) سے بدظن ہو جائیں اور اگلے الکشن میں ان کو ووٹ نہ دیں۔

مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے بھی عین یہی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ ہر مسئلہ میں ان کو بس کہنے کی ایک ہی بات معلوم ہے، اور وہ یہ کہ "انتظامیہ" کو ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف مذمتی بیانات شائع کریں۔

یہ پالیسی ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ ہم کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ انڈیا میں جو ہندو مسلم معاملہ ہے اس کا بہت کم تعلق نام نہاد انتظامیہ سے ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق مسلم عوام اور ہندو عوام سے ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات پیدا کریں اور لوگوں کو یہ نصیحت کریں کہ وہ اختلافی معاملات میں صبر و ضبط اور حکمت و تدبیر سے کام لیں نہ کہ جوش اور مشتعل مزاجی سے۔ اس کے سوا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

ایک مجلس میں کسی نے کہا کہ ملک میں سب سے بڑا مسئلہ روزگار کا مسئلہ ہے۔ مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ یہ بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے دیش میں لوگوں کے اندر کام کرنے کا جذبہ نہیں۔ وہ چاہتے کہ بس انھیں ایک ملازمت مل جائے اور پھر کام نہ کرکے بھی تنخواہ لیتے رہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں امریکہ گیا اور وہاں مختلف لوگوں سے ملا۔ میں نے پایا کہ ایک امریکی نوجوان جس کے پاس کوئی جاب نہ ہو وہ اپنے بارہ میں بتاتے ہوئے یہ کہے گا کہ میں کام کی تلاش میں ہوں:

I am for work.

اور انڈیا میں معاملہ اس کے الٹا ہے۔ انڈیا کا ایک نوجوان بے روزگار ہے تو وہ اپنی حالت کو بتاتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں ایک جاب کی تلاش میں ہوں:

I am looking for a job.

امریکہ کا نوجوان "کام" کی تلاش میں ہوتا ہے، اور انڈیا کا نوجوان "ملازمت" کی تلاش میں۔ دونوں دیشوں کے مزاج میں جو فرق ہے وہ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

بمبئی میں مسلسل ملاقاتوں اور میٹنگوں کی وجہ سے اخبار پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا تاہم کم از کم ایک اخبار میں ضرور پڑھ لیتا تھا۔ جب کہ دہلی میں روزانہ میں چار اخبار دیکھتا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا (۳ فروری ۱۹۹۳) میں علی گڑھ کی ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے چند لڑکوں نے بعض نام نہاد لیڈروں کی کال پر ۲۶ جنوری کو کالا جھنڈا لگایا۔ مگر وہاں کے مسلمانوں نے اس کی سخت مذمت کی۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ ۲۶ جنوری کو میں علی گڑھ شہر میں گیا۔ لیکن وہاں کسی ایک گھر کے اوپر بھی کالا جھنڈا نظر نہیں آیا:

This correspondent could not spot a single black flag on any house. (p.17)

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اب علی گڑھ کے مسلم نوجوان یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے شدت پسند لوگ (hardliners) مسلمانوں کو رہنمائی دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو حقیقت پسند اور روشن خیال قیادت (realistic and enlightened leadership) کی ضرورت ہے۔ یہ صرف علی گڑھ کی بات نہیں۔ یہ آج ملک کے تمام مسلمانوں کی آواز ہے۔ اب وہ حالات پوری طرح تیار ہو چکے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان نئی صالح قیادت ابھرے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے۔

۳ فروری کی دوپہر کو میں بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ جے جے ہاسپٹل کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی عمارت دکھائی دی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ پولیس چوکی ہے۔ حالیہ فساد کے دنوں میں اس کو مسلمانوں کے ہجوم نے توڑنے کی کوشش کی تھی۔

ہندستان کے مسلم لیڈروں نے عام طور پر اپوزیشن کی بولی کو اختیار کر لیا ہے۔ اپوزیشن کے لیڈر مخصوص مصالح کے تحت ہمیشہ پولیس یا انتظامیہ کے خلاف بیان دیا کرتے ہیں۔ اس کی نقل میں نام نہاد مسلم لیڈر بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہر فساد کے بعد وہ آنکھ بند کر کے ایک ہی بیان جاری

کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ انتظامیہ (پولیس) نے فساد کرایا۔

اس طرح کے بیانات کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مسلمان عام طور پر پولیس کے بارہ میں منفی سوچ کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے جب وہ پولیس کی پارٹی کو دیکھتے ہیں تو فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں انتہائی غیر ضروری طور پر مسلم ــــ پولیس تصادم پیش آتا ہے۔ پولیس کی مفروضہ مسلم دشمنی حقیقۃً مسلم لیڈروں کے غلط بیانات کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کو خلاف واقعہ طور پر ہمارے اخبارات پولیس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

۴ فروری کی شام کو ۵ بجے خلافت ہاؤس میں تقریر تھی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صدارت کر رہے تھے۔ ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ باہر بھی کافی آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: اس نازک وقت میں بمبئی میں کیوں آیا۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ جو کہانی آپ نے بار بار خون کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کی مگر وہ لکھی نہ جاسکی۔ اب ایک بار ہم اس کہانی کو آنسوؤں کے قطروں سے لکھنے کی کوشش کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ ہماری دل فگاری کو قبول کر لے، جو کہانی خون کے قطروں سے لکھی نہ جاسکی وہ آنسوؤں کے قطروں سے لکھ کر تیار ہو جائے۔

میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان اٹھا۔ اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا: ہم نہیں سنیں گے۔ تم واپس جاؤ۔ وغیرہ۔ میں خاموش ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہال کے حاضرین میں سے بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے ہیں اور اس نوجوان سے کہہ رہے ہیں کہ تم کو نہیں سننا ہے تو تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کیوں کہ ہمیں تو سننا ہے۔ کچھ دیر تک آوازوں کا شور رہا۔ آخر کار وہ لڑکا باہر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی اور سارا مجمع نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ حاضرین کی فرمائش پر میں نے اس موقع پر تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔

۴ فروری کو بمبئی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ حالات اب تو یہاں کافی اعتدال پر آگئے ہیں مگر پچھلے ہفتہ تک عجیب حال تھا۔

انھوں نے بتایا کہ لوکل ٹرینوں میں لوگ خاموشی سے داخل ہو جاتے اور مکمل طور پر چپ رہتے۔ کوئی شخص بھی بولتا نہیں تھا۔ ڈبوں کے اندر ٹرین کے چلنے کی آواز کے سوا کوئی اور آواز مطلق سنائی

نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے بمبئی سے تھانے تک ٹرین میں سفر کیا۔ یہ تقریباً ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ مگر پورے سفر میں کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی۔ لوگوں کو ڈر ہوتا تھا کہ اگر وہ بولیں تو فوراً ان کی آئیڈنٹٹی معلوم ہو جائے گی۔ اگر کبھی بولنا ضروری ہو جائے تو لوگ سوچنے لگتے تھے کہ ہندی میں بولیں یا مراٹھی میں۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر ٹرینوں میں لوگ وقت گزارنے کے لیے تاش کھیلتے ہیں یا بھجن گاتے ہیں۔ مگر فساد کے دنوں میں سب کچھ مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔

۴ فروری کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت میں ۳۰ ویں منزل پر جانا ہوا۔ یہاں ایڈیٹرس گلڈ کی کی میٹنگ تھی جس میں مجھ کو خطاب کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ "اڈیٹرس گلڈ" کے زیر اہتمام دہلی کے ممتاز جرنلسٹوں کی ایک ٹیم بمبئی آئی تھی تاکہ یہاں کے فساد کے بارہ میں فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کرے۔ یہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ چالیس سے زیادہ کی تعداد میں تمام بڑے بڑے ہندی اور انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر اس میں شریک ہوئے۔ ہال کی ساری سیٹیں بھر گئیں۔ آخر کار مزید کرسیاں منگانی پڑیں۔ زیادہ تر ہندو اور کچھ کرسچین تھے۔ کنڈکٹر نے آغاز کرتے ہوئے کہا:

Unusually it is a very large meeting.

مقررین نے بمبئی کے فساد پر زیادہ تر انتظامیہ کو سخت سست کہا۔ ایک صاحب نے پرجوش طور پر بولتے ہوئے کہا:

Who is policing the police.

دوسرے نے کہا کہ اصل قصور پولیس کا نہیں ہے بلکہ سیاسی لیڈروں کا ہے۔ پولیس کسی مجرم کو پکڑتی ہے اور اس کو سزا دینا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی کسی لیڈر کا ٹیلی فون پولیس افسر کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ میرا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو۔ لیڈر جب تک پولیس کے کام میں دخل دینا نہیں چھوڑیں گے، امن نہیں ہو سکتا۔

اکثر لوگ غصہ کے انداز میں بول رہے تھے کہ آخر اس قسم کے بھیانک فساد ملک میں کیوں ہوتے ہیں۔ ہر آدمی لمبی لمبی تقریر کرتا تھا۔ مگر اس کی تقریر زیادہ تر غیر متعلق باتوں سے بھری رہتی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ پر جب بھی گفت گو ہوتی ہے تو اس کا عنوان ہوتا ہے: انڈیا میں فساد کا مسئلہ۔ حالاں کہ یہ عنوان ہی غلط ہے۔ کیوں کہ فساد جو ہو رہا ہے وہ پورے انڈیا میں نہیں ہو رہا ہے، وہ زیادہ تر نارتھ انڈیا میں ہو رہا ہے۔ گویا کہ اس وقت ہم جس مسئلہ کے حل کے بارہ میں بحث کر رہے ہیں، وہ آج بھی انڈیا کے نصف حصہ میں حل شدہ ہے۔ ایسی حالت میں کوئی نئی بحث چھیڑنے کے بجائے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ملک کے محفوظ حصہ (ساؤتھ انڈیا) کا مطالعہ کرکے جانیں کہ وہاں فساد کیوں نہیں ہوتا۔

میں نے اس کی تحقیق کی ہے۔ میری دریافت یہ ہے کہ ساؤتھ انڈیا کے لوگوں میں برداشت کرنے کا مزاج ہے، اسی لئے وہاں فساد نہیں ہوتا۔ اس بنا پر میری رائے میں فساد کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں برداشت کا مزاج پیدا کیا جائے۔ برداشت کا مزاج آتے ہی فساد اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ کام سب سے زیادہ اخبارات کر سکتے ہیں۔

۵ فروری ۱۹۹۳ کی شام کو انڈین ایئر لائنز کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ بمبئی ایئر پورٹ پر اور جہاز میں کئی لوگ ایسٹ ویسٹ ایئر لائنز کی بات کرتے ہوئے سنائی دئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں تو ایسٹ ویسٹ سے سفر کرنا چاہتا تھا، مگر اس میں جگہ نہیں ملی۔

چالیس سال پہلے ایک ایکٹ (Air Corporation Act 1953) پاس ہوا تھا۔ اس کے سکشن ۱۸ کے مطابق، انڈیا میں سرکاری ہوائی کمپنی کے سوا کسی اور شخص یا ادارہ کے لئے ہوائی جہاز چلانا غیر قانونی تھا۔ مگر موجودہ حکومت نے پرائیویٹ کمپنیوں کو ہوائی سروس کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ تقریباً چالیس کی تعداد میں پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ بہتر ایسٹ ویسٹ ایئر لائنز سمجھی جاتی ہے جو مسلمانوں نے قائم کی ہے اور اس کے چیئرمین نصیر الدین عبد الوحید ہیں۔ ایسٹ ویسٹ خود سرکاری انڈین ایئر لائنز کے لئے چیلنج بنتی جا رہی ہے۔

جس ملک میں یہ امکانات ہوں کہ ایک مسلم ادارہ قائم ہو کر اتنی ترقی کرے کہ وہ خود گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے چیلنج بن جائے، اس ملک میں جو لوگ کہتے کہ یہاں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں، وہ ملک کے بارہ میں خبر نہیں دیتے بلکہ خود اپنی بے بصیرتی کا اعلان کر رہے ہیں۔

مدراس کا سفر

پیس مشن کے تحت ایک سفر ہوا۔ اس کا راستہ اس طرح تھا ـــــ دہلی، مدراس، کانچی پورم، منگلور، سرنگیری، بمبئی، پونہ، دہلی۔ اس سفر میں میرے ساتھ حسب ذیل مزید افراد شامل تھے: اچاریہ سوشیل کمار، سوامی چیدانند، مدھو مہتا، شانتی لال موتھا، نائجل ایڈمنڈ ٹولی۔ اس سفر کی مختصر روداد تاریخ وار درج کی جاتی ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۹۳

صبح فجر سے پہلے نظام الدین سے روانہ ہو کر دہلی ایئر پورٹ پہنچا۔ ایئر پورٹ پر ساڑھے پانچ بجے نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یہ الفاظ زبان پر آ گئے: یا اللہ، آپ کا ایک کمزور ترین بندہ ایک مشکل ترین کام کے لئے نکلا ہے۔ اس کی مدد فرمائیے۔ ملک میں امن قائم فرمائیے اور اہل وطن کے لئے اپنی رحمت و برکت کے دروازے کھول دیجئے۔

دہلی سے مدراس کے لئے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۳۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دہلی سے اس قافلہ میں اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند اور نائجل ٹولی (آسٹریلیا) شریک تھے۔ مدراس پہنچ کر مسٹر مدھو مہتا (ہندستانی اندولن) اور مسٹر شانتی لال موتھا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں بمبئی سے براہ راست مدراس پہنچے تھے۔

دہلی اور مدراس کے درمیان سفر میں اچاریہ جی اور سوامی جی سے اس پر بات ہوئی کہ ملک میں امن وامان کس طرح قائم ہو۔ دونوں نے اس سے اتفاق کیا کہ بے غرض اور غیر متعصب قسم کی مذہبی شخصیتوں کو سامنے آنا چاہئے۔ ایسے ہی لوگ اس وقت کوئی موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا کر بہتر انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ ایگو ہے۔ "میں" کا ذہن ٹکراؤ پیدا کرتا ہے، اور اگر میں کا ذہن ختم کر دیا جائے تو اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا:

The term "I" in the vertical form stands for ego, but in the horizontal form it becomes a bridge between two points.

موجودہ حکومت کی اوپن اسکائی پالیسی (open-sky policy) کے نتیجہ میں اس وقت تقریباً چالیس پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں ملک میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ایسٹ ویسٹ (East West Air Ways) ہے۔ اس کو بمبئی کے مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر ٹی اے وحید ہیں۔ یہ ایک بڑی کمپنی ہے جو ۱۶ اسکٹر بس اپنے دس جہاز چلا رہی ہے۔

انڈیا کے مسلمانوں میں سے جو لوگ مسائل تلاش کر کے ان میں الجھے رہتے ہیں، ان کے پاس شکایت اور احتجاج کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو تلاش کرتے ہیں ان کو یہاں ایسے مواقع مل جاتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر لیں۔

درمیان میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے حیدر آباد میں اترا۔ اس کے بعد وہ مزید پرواز کر کے مدراس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ مدراس میں ہم لوگوں کا قیام ایک ہندو تاجر کے مکان پر تھا۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا گیا۔ کھانے کی میز کے گرد کئی مقامی اور غیر مقامی ہندو صاحبان موجود تھے۔ وہ لوگ مسلسل بات کرتے رہے۔ میں خاموشی کے ساتھ صرف ان کی باتیں سنتا رہا۔

اس گفتگو کے بعد میری وہ رائے مزید پختہ ہو گئی جو اس سے پہلے اپنے مطالعہ کے دوران میں نے قائم کی تھی۔ وہ یہ کہ مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۴۷ سے پہلے جو سیاست مسلمانوں کے درمیان چلائی، ٹھیک اسی انداز کی سیاست اب ہندو انتہاپسند ہندوؤں کے درمیان چلا رہے ہیں۔

یہ خطرہ کی سیاست ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے کچھ فرضی یا واقعی باتوں کو لیکر مسلمانوں کو بتایا کہ ہندو تمہارے لئے زبردست خطرہ ہے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ تمہارے ملی وجود کو مٹا دے گا۔ وہ تم کو ترقی نہیں کرنے دے گا۔ اس کے ساتھ زرد صحافت کو استعمال کر کے انھوں نے بیشتر مسلمانوں کو بہکایا۔ انھوں نے نان اشو کو اشو بنایا اور پھر اس کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا دیا۔ اس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ تھا۔

اب ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈر ٹھیک اسی مریضانہ سیاست کو ہندوؤں میں دہرا رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو خطرہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ بے بنیاد باتوں کو لے کر انھیں اشو بنایا۔ ان کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ انھوں نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ مسلمان اس ملک کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ حتی کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے ذریعہ کچھ برسوں کے بعد وہ بھارت کو اسلامستان

بنا دیں گے۔

اس جذباتی سیاست نے پہلے ملک کا بٹوارہ کیا تھا۔ اب وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا بٹوارہ کر رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں میں اتنی زیادہ دوری آچکی ہے کہ ایک سماج میں دونوں کا معتدل طور پر رہنا ہی ناممکن دکھائی دینے لگا ہے۔ مزید دردناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے نااہل لیڈر اپنی ناعاقبت اندیشانہ کارروائیوں کے ذریعہ اس دوری میں صرف اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔

مدراس سے سنکراچاریہ کے یہاں جانا تھا۔ چنانچہ یہاں سے بذریعہ کار کانچی پورم کے لئے روانگی ہوئی۔ وہاں ہم لوگ ڈھائی بجے دن میں پہنچے۔ کانچی کے سنکراچاریہ (جگت گروسنکراچاریہ) سے تقریباً دو گھنٹہ کی ملاقات رہی۔ یہ آشرم کافی بڑا ہے۔ مگر وہ اتنا ہی سادہ ہے۔ نظم اور صفائی کا زیادہ اہتمام نظر نہیں آتا۔

کانچی کے سنکراچاریہ معمر ہیں اور انتہائی سادہ مزاج آدمی ہیں۔ گفتگو میں ہنسی کا انداز غالب رہتا ہے۔ ابتدائی مشاھدہ میں مجھے خیال ہوا کہ وہ بالکل سیدھے سادے ایک سنت ہیں۔ مگر بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور ہر معاملہ میں نہایت جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے احوال سے بھی وہ کافی باخبر نظر آئے۔

سنکراچاریہ نے جو باتیں کہیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ مندر اور مسجد کا جھگڑا اس طرح طے کیا جانا چاہئے کہ دیش کی شانتی بھنگ نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ دیش میں اگر شانتی نہ ہو تو اس کے بعد دوسرا کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔

اسی دن ہم لوگ کانچی پورم سے لوٹ کر مدراس آگئے۔ یہاں شام کو نماز مغرب کے بعد ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ مدراس کے انگریزی اور تامل اخباروں کے رپورٹر موجود تھے۔ یو این آئی کی طرف سے بھی ایک نمائندہ اس میں شریک تھا۔ گفتگو زیادہ تر اجودھیا کے مسئلہ پر ہوئی۔ میں نے تین نکاتی فارمولا کی وضاحت کی۔ اس پریس کانفرنس میں میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چید انند بھی موجود تھے۔

۱۶ فروری ۱۹۹۳

مدراس میں کئی تعلیم یافتہ افراد سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہندو تاجر مسٹر سی ایل مہتا نے کہا کہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ ہوا، اس کا مکمل ویڈیو فلم تیار کیا گیا تھا۔ اس کو اب جگہ جگہ دکھایا جا رہا ہے۔ اگر پہلے سے اس کا منصوبہ نہ بنایا گیا ہوتا تو اس عمل کا پورا فلم کیسے تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس فلم کے اثرات بے حد خطرناک ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے اس فلم کو دیکھ کر کہا: آخر کار ہم نے فتح پالی۔ ایک اور ہندو نوجوان اس کو دیکھنے کے بعد بول اٹھا: غلامی کا نشان مٹ گیا۔ ایک اور ہندو نوجوان نے کہا: مسلمان دباؤ کی بھاشا سمجھتے ہیں، یہ بات اب پکی ہو گئی۔

مدراس سے ہم لوگوں کو منگلور جانا تھا۔ اور پھر وہاں سے سرنگیری جا کر دوسرے سنکراچاریہ سے ملنا تھا، قیام گاہ سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے تو گاڑی میں میرے ساتھ آسٹریلیا (سڈنی) کے ۴۴ سالہ مسٹر نائجل ایڈمنڈ ٹولی (Nigel Edmund Tolley) بھی موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ انڈیا اور آسٹریلیا میں آپ نے کیا فرق دیکھا۔ انھوں نے بہت سے مادی فرق بتائے مثلاً زیادہ آمدنی، زیادہ صاف سڑکیں، زیادہ اچھے گھر، ہر چیز اعلیٰ صنعتی معیار کی۔

میں نے کہا کہ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آسٹریلیا کے لوگ ہندستان سے زیادہ خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ خوشی کا تعلق دل سے ہے، اس کا تعلق مادی چیزوں سے نہیں:

Happiness comes from the heart, not from money.

مسٹر ٹولی نے ایک لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ مگر چند سال کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اب دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ دونوں غیر مطمئن ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے ابھی تک دوسرا نکاح نہیں کیا۔ مغربی ملکوں میں طلاق کی کثرت کی وجہ انھوں نے یہ بتایا کہ آزادی کا تصور اتنا غالب ہے کہ عورتیں مرد کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔

مدراس سے منگلور کے لئے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۵۵۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین اکسپریس (۱۶ فروری) دیکھا۔ اس میں صفحہ ۶ پر ایک کتاب کا تذکرہ تھا:

Dr Barbara Theiring, Jesus the Man

ڈاکٹر باربرا نے ۲۰ سال تک بحر مردار کی دستاویزات (Dead Sea scrolls)

کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مذکورہ کتاب تیار کی ہے۔ اس میں حضرت مسیح کی زندگی کے جو حالات ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں جو موجودہ انجیل میں ہیں یا مسیحی چرچ میں بتائے جاتے ہیں۔ اس کے مطابق حضرت مسیح نے دوبار نکاح کیا۔ ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک بچی کا نکاح پال سے ہوا۔ حضرت مسیح سولی کے بعد بھی زندہ رہے۔ اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ان کی وفات ہوئی۔ وغیرہ۔ مبصر نے ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> The Christ whom Christians worship and the Jesus of the New Testament do not appear to be the same person. The former is the romantic product of theology and the latter, an intolerant prophet who denied his own mother at a wedding party, cursed a tree for not bearing fruit, promised to divide family members against each other.

۱۰ بجے دن میں ہمارا جہاز منگلور کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ ہمارے قافلہ میں پانچ آدمی تھے۔ یہاں سے ہم لوگ کار کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک سرسبز وادیوں کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ تاہم مسلسل سفر کی وجہ سے میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سر کے اندر چکر کی سی کیفیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ قدرتی مناظر کو دیکھنے کی خوشی حاصل کروں۔ مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذہنی حالت اس میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

میرے دل نے کہا کہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انسان کو امپرفکٹ دنیا دے مگر وہ اس کو پرفکٹ دنیا سے محروم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا یہ محسوس کرنا کہ یہ دنیا اس کے لئے امپرفکٹ ہے، یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پرفکٹ دنیا بھی ضرور اس کے لئے تیار کی گئی ہے۔

منگلور سے بذریعہ روڈ ہم نے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ ڈیڑھ بجے دن میں سرنگیری (Sirengeri) میں داخل ہوگئے۔ یہیں پربستی کے کنارے ایک بڑے رقبہ میں سنکر اچاریہ کا آشرم ہے جو ۱۲ سو سال سے قائم ہے۔

سرنگیری میں ایک معلوماتی کتاب ۱۲۵ صفحہ کی ملی۔ یہ ۱۹۹۱ میں انگریزی میں چھاپی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جگد گرو آدی سنکر اچاریہ (۸۲۰ - ۷۸۸ء) نے صرف ۳۲ سال کی عمر پائی۔ مگر انھوں نے انڈیا کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے دیش بھر کا سفر کر کے چار کونوں پر

چار مٹھ بنائے۔ دوارکا (ویسٹ) بدری کسرا (نارتھ) جگناتھ (ایسٹ) سرنگیری (ساؤتھ)

تعارفی کتاب کا ایک ذیلی عنوان ٹیپو سلطان کے بارہ میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ٹیپو سلطان کے کئی خطوط مٹھ کے دفتر میں محفوظ ہیں۔ ایک خط کے بارہ میں یہ الفاظ درج ہیں:

In a letter, he reiterated his conviction that his strength and hope were reared upon the three fold basis of God's grace, the holy Jagadguru's blessings, and the prowess of the arms of the realm. (p.68)

سرنگیری کے سنکر اچاریہ سے ملنے کے لئے یہاں کا سفر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آدی سنکر اچاریہ نے بھارت میں چار مرکز قائم کرنے کے بعد یہیں قیام کیا تھا۔ ان کے آخری ایام اسی جگہ گزرے۔ سرنگیری مٹھ بالکل جدید طرز پر بنا ہوا ہے۔ ۴۶ ایکڑ کے رقبہ میں واقع اس مٹھ میں نظم اور صفائی اعلیٰ معیار کی نظر آئی۔

یہ مٹھ قدرتی مناظر کے درمیان واقع ہے۔ جگہ نہایت پرفضا ہے۔ پورے ماحول میں ایک خوشگوار سکون چھایا ہوا ہے۔ چڑیوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز آنفاًفاً ہی کبھی سنائی دیتی ہے۔ ندی، باغ، پل، پارک، پہاڑیاں، یہ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے یہاں کھایا۔ میرے علاوہ سوامی چیدانند، مدھو مہتا، شانتی لال موتھا اور مسٹر ٹولی شریک تھے جو ہندوازم سے متاثر ہیں۔ ایک بڑے کمرہ میں سادہ میز کے چاروں طرف سادہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر کیلے کے ہرے پتے بچھائے گئے۔ پھر اس پتہ کے اوپر روٹی، چاول، سالن وغیرہ باری باری لاکر رکھا گیا۔

ہر چیز صاف ستھری اور صحت بخش تھی۔ سرنگیری مٹھ کے ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر گوری شنکر (V.R. Gowri Shankar) بھی کھانے میں شریک تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر مٹھ کے اندر اپنے کمرہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد آرام کیا۔ شام کو چار بجے سنکر اچاریہ سے ہم لوگوں نے ملاقات کی۔

سنکر اچاریہ سے بہت اچھے ماحول میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمارے پیس مشن کی مکمل حمایت کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ دھرم کا مطلب مذہب نہیں ہے۔ بلکہ کرتو

(ڈیوٹی) ہے۔ یہ سیاسی لوگ ہیں جنھوں نے دھرم کو مذہب کا معنی دے دیا ہے۔ دھرم تو انسان کا کرتو ہے۔ جیسے پتنی کا دھرم، راجہ کا دھرم، وغیرہ۔ ہندو کا لفظ ہماری کتابوں میں کہیں نہیں۔ یہ لیڈر ہیں جنھوں نے 'ہندو' کو وہ نام دیا ہے جو آج سمجھا جاتا ہے۔

مسٹر مدھو بہتا نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں ہر چیز بزنس ہو گئی ہے۔ حتی کہ روحانیت کو بھی تجارت کی چیز بنا دیا گیا ہے:

Even spiritualism has been commercialised in this country.

۱۷ فروری ۱۹۹۳

آج صبح کو سرنگیری سے واپس ہونا تھا۔ یہاں میں نے اپنے کمرہ میں فجر کی نماز پڑھی۔ سینہ میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ جذبات الفاظ کی صورت میں ڈھل نہیں رہے ہیں۔ جذبات جب بہت زیادہ گہرے ہوں تو کیفیات کا غلبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ الفاظ کے لئے ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، اس دعا کو تو میری طرف سے لکھ لے جس کے لئے میرے پاس الفاظ بھی نہیں۔

ہمارے ساتھی شانتی لال موتھا (پونہ) نے کل شام کو یہاں کے مطبخ میں کہہ دیا تھا کہ صبح کو ہم لوگ اِڈلی کا ناشتہ کریں گے۔ چنانچہ صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر ہم لوگ کھانے کی میز پر آئے تو کیلے کے پتہ پر اِڈلی، ناریل کی چٹنی اور کافی رکھی ہوئی تھی۔ یہ جنوبی ہند کا عمومی ناشتہ ہے۔ اس سے فراغت کے بعد ہمارا قافلہ سرنگیری سے منگلور کے لئے روانہ ہوا۔

پورا راستہ سبزہ سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان طے ہوا۔ قدرت کے پھیلے ہوئے مناظر اتھاہ سکون کا پیغام دے رہے تھے۔ کبھی کبھی سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جب سامنے کی گاڑی اور ہماری گاڑی قریب آتی تو ٹرافک اصول کے مطابق، ایک گاڑی دائیں کی طرف اور دوسری گاڑی بائیں کی طرف کترا کر نکل جاتی۔ میں نے سوچا کہ دونوں گاڑی اگر سیدھا چلنے پر اصرار کرے تو دونوں ہی تباہ ہو جائیں۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کو اوائڈ کرتی ہیں تو دونوں کو زندگی کی شاہراہ مل جاتی ہے۔

راستہ میں سوامی چیدانند اپنی دلچسپ باتیں سناتے رہے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ پیار کی

کرنسی ایسی ہے جو دنیا میں ہر جگہ چلتی ہے۔ پھر اس خیال کو موزوں کرتے ہوئے کہا: پیار کا دیا جلاؤ، دشمنی کا اندھیرا بھگاؤ۔

۱۰ بجے دن میں ہم لوگ منگلور ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں لاونج میں کچھ وقت گزارا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ ایک ہندو بھائی نے کہا کہ ہم مندر۔ مسجد پالیٹکس کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ بمبئی میں میرا کارخانہ ہے۔ میں ایکسپورٹ کا سامان تیار کرتا ہوں۔ میرے علاقہ میں فساد نہیں ہوا، مگر فساد کی خبریں پھیلیں تو میرے ورک فورس کا ۹۵ فیصد حصہ بھاگ گیا۔ اب میری انڈسٹری ٹھپ پڑی ہوئی ہے۔ بھلا اس طرح دیش ترقی کر سکتا ہے۔

دوسرے ہندو بھائی نے کہا کہ اشوک سنگھل جیسے لوگوں کا کہنا ہے کہ:

دیش کو بچانا ہے غلامی کا کلنک مٹانا ہے۔

مگر یہ نعرہ بالکل الٹا ہے۔ ان لوگوں کو کہنا چاہئے کہ غلامی کا کلنک مٹانے کے نام پر دیش کو تباہ کرنا ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جھوٹی سیاست سے دیش کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ اور پھر خود ہی وہ دیش کو بچانے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی کو فارسی زبان میں کہا گیا ہے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ یہ سیاست کی بدترین قسم ہے۔ اس میں کچھ فرضی چیزوں کو اشو بنایا جاتا ہے۔ اور پھر جذباتی تقریروں کے ذریعہ اس کو بڑھا کر آخری حد پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا قومی نشہ ہے، اس کا قومی ترقی سے کوئی تعلق نہیں۔

انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۶۰ کے ذریعہ منگلور سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں آج کے دو اخبار پڑھے۔ انڈین ایکسپریس اور حیدرآباد کا نیوز ٹائم۔ نیوز ٹائم (۷ فروری) میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس کو ورلڈ نیوز لنک نے ریکارڈ کیا تھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلم دنیا میں جو فنڈا منٹلسٹ تحریکیں چل رہی ہیں ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ڈاکٹر نصیف نے جواب دیا کہ ہر مذہب میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے جوش کے تحت رات دن کے اندر نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم

بڑھائی جائے۔ اخلاقی اقدار پیدا کی جائیں۔ اسی طرح ایک اور سوال یہ تھا کہ سلمان رشدی کے خلاف موت کا فتویٰ جو ایران کے مذہبی لیڈر نے دیا تھا، اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نصیف کا حسب ذیل جواب اخبار میں نقل کیا گیا ہے:

Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody.

یہ بات اگر ہندستان یا پاکستان کا کوئی شخص کہے تو نام نہاد علماء اس کے قتل کا یا کم از کم اس کو کوڑا مارنے کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ مگر یہی پرجوش حامیان اسلام اس وقت خاموش رہتے ہیں جب کہ وہ سعودی عرب کے کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے کہی گئی ہو۔ کیسا عجیب ہوگا وہ اسلام جو بھارت جیسے ملک میں کچھ اور رہو اور پٹرو ڈالر والے ملک میں پہنچتے ہی کچھ اور ہو جائے۔

بمبئی میں ہمارے ساتھی ایرپورٹ پر موجود تھے۔ تاہم پروگرام کے مطابق، آج پونہ جانا تھا۔ بمبئی میں دو گھنٹے گزار کر بذریعہ کار پونہ کے لئے روانگی ہوئی۔

مسٹر شانتی لال موتھا نے مجھ کو پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانتی لال موتھا نے پوچھا کہ آپ کو کیا چاہئے۔ کیا چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سڑک کے کنارے کوئی مسجد ہو تو اتر کر نماز پڑھ لوں۔ انھوں نے کہا کہ مسجد تو ابھی ہمارے پیچھے تھی۔ فوراً گاڑی روک کر پیچھے کی طرف لے گئے۔ اور مسجد کے پاس اس کو کھڑا کر دیا۔ میں نے اتر کر وہاں نماز پڑھی اور پھر ہم لوگ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔

مغرب کے وقت ہم لوگ پونہ پہنچ گئے۔ یہاں پہلے مسٹر شانتی لال موتھا کے آفس میں ٹھہرا۔ کچھ دیر بعد جناب عبد الصمد صاحب اور جناب محمد یونس صاحب آگئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نیوا ایرا کالونی میں آگیا۔ یہاں میرا قیام محمد یونس صاحب کے مکان پر تھا۔ پونہ کے کئی لوگ خبر سن کر یہاں آگئے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے تک ان لوگوں سے بات ہوتی رہی۔

میں نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلم تعلقات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ

کی ضرورت ہے۔ اکثر مسلمان ایسا کرتے ہیں کہ وہ برادران وطن کو حلقوں اور جماعتوں میں تقسیم کرکے دیکھتے ہیں۔ یہ آر ایس ایس کا آدمی ہے۔ یہ کانگرس کا آدمی ہے۔ یہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا آدمی ہے۔ یہ اس جماعت کا آدمی ہے۔ یہ اُس جماعت کا آدمی ہے۔ اس قسم کی سوچ سراسر بے بنیاد ہے۔ صحیح اسلامی بات یہ ہے کہ تمام لوگوں کو انسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ جماعتی تعلق ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک انسان ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ انسان کے اعتبار سے معاملہ کرنا چاہئے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۳

آج فجر کی نماز نیوایرا (پونہ) کی مسجد میں پڑھی۔ امام صاحب نے آخری رکعت میں قرآن کا جو حصہ پڑھا، اس کی آخری آیت یہ تھی: واصبر وما صبرك الا بالله ولا تحزن عليهم ولا تك في ضيق مما يمكرون. ان الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون (النحل ۲۸-۱۲۷)

نماز کے بعد کچھ لوگ میری قیام گاہ پر اکٹھا ہو گئے۔ میں نے مذکورہ آیات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن کے اس بیان پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو موجودہ حالات کے اعتبار سے بہت بڑا سبق ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ یہاں ہمارا اصل مسئلہ ہمارے خلاف سازش کی موجودگی نہیں ہوگی۔ بلکہ اصل مسئلہ خود ہمارے اندر صبر اور تقویٰ اور حسن عمل کی غیر موجودگی ہوگی۔ گویا یہاں سارا معاملہ خود ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہمیں باہر کی سازشوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خود اپنے اندر تقویٰ اور صبر اور حسن عمل کی صفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر داخلی سطح پر ہمارے اندر یہ اوصاف موجود ہوں تو اس کے بعد تمام بیرونی مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

پونہ کے تعلیم یافتہ افراد میری رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے مختلف قسم کے دینی اور ملی امور پر باتیں ہوتی رہیں۔ عبد القادر عبد الغنی صاحب (۵۳ سال) نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج کا مسلمان جھگڑا بالکل نہیں چاہتا۔ آج اگر مسلمان لیڈر کسی جھگڑے والی بات کے لئے بلائیں تو مسلمانوں کی طرف سے انھیں کوئی رسپانس ملنے والا نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ۶ دسمبر کے حادثہ کا ایک روشن پہلو ہے۔ ۶ دسمبر کو جب بابری مسجد کی عمارت ڈھائی گئی تو اسی کے ساتھ موجودہ نام نہاد مسلم قیادت بھی ہمیشہ کے لئے ڈھ گئی۔

شام کو نماز عشاء کے بعد ڈاکٹر عبد الرزاق شیخ کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے اجودھیا کے مسئلہ پر تقریر کی اور تین نکاتی فارمولا کی تشریح کی۔ آخر میں سوال وجواب پر مجلس برخاست ہوئی۔ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا کا پونہ کے لئے ایک ضمیمہ نکلتا ہے۔ اس کا نام پونے پلس (Pune Plus) ہے۔ ڈاکٹر شیخ کا ایک مراسلہ اس کے کل کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے تین نکاتی فارمولا کی مکمل حمایت کی ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۳

صبح ساڑھے نو بجے پونہ کے اردو ٹاورس کے ہال میں وسیع پیمانہ پر ایک کانفرنس ہوئی۔ حاضرین میں پونہ کے ہر طبقہ کے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ میرے علاوہ، اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب ہوا۔ پریس کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چنانچہ اگلے دن انگریزی، مراٹھی، ہندی، کے تمام اخباروں میں مفصل رپورٹیں شائع ہوئیں۔

شام کو ۵ بجے سندھیوں کے بڑے گرو دادا واسوانی سے ان کے آشرم پر ملاقات ہوئی۔ وہ تواضع اور شرافت اور انکسار کی سراپا تصویر تھے۔ انھوں نے مسجد کو گرا کر وہاں مندر بنانے پر بہت دکھ کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا:

They are killing the spirit of India.

انھوں نے کہا کہ اگر اجودھیا میں رام مندر بنتا ہے تو اس کے ساتھ وہیں ایک مسجد بھی بننا چاہئے۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں خود وہاں جا کر اذان دوں گا اور وہاں نماز پڑھوں گا۔

مغرب کی نماز پونہ میں پڑھ کر بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ اچاریہ سوشیل کمار اور سوامی چیدانند بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک چھوٹے بازار میں کچھ کام کے لئے رکے۔ دکاندار نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہم نے آپ لوگوں کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔ ٹی وی کسی شخصیت کی توسیع ہے۔ وہ اس عقیدہ کو قابل فہم بناتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ رات کو ساڑھے دس بجے ہم لوگ بمبئی پہنچے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳

فجر کی نماز بمبئی میں جوہو اسکیم میں پڑھی۔ صبح کا کچھ وقت یہاں گزرا۔ اس کے بعد ہمیں میکر ٹاورس پہنچنا تھا۔ ہمارا ساتھ منتظمین کاروں میں روانہ ہوا۔ میں مسٹر افضل الانہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے نئے تھے۔ وہ الکٹرانک سنٹر چلاتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے نئی ماروتی کار خریدی ہے۔ اس پر وہ مجھ کو لے کر روانہ ہوئے۔

لمبے راستہ میں ایک گھنٹہ تک زیادہ تر وہی بولتے رہے۔ ان کی گفتگو تمام کی تمام اس پر تھی کہ آج مسلم نوجوانوں میں زبردست فرسٹریشن ہے۔ یہ فرسٹریشن لڑائی جھگڑے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے موجودہ حالات کی ذمہ داری سب سے زیادہ ملکی تعصب پر ڈالی۔

ان کے ذاتی حالات معلوم کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ بمبئی آئے تو انھوں نے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کی "پگار" پر کام کرنا شروع کیا۔ عام رواج کے خلاف، انھوں نے کبھی سیٹھ سے تنخواہ اور الاؤنس بڑھانے کی بات نہیں کی۔ وہ بس اپنے کام میں محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کو کافی تجربہ ہو گیا۔ اب وہ الکٹرانکس میں اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں اور بمبئی میں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی عملی زندگی الگ ہے، اور آپ کی سوچ الگ۔ آپ نے اپنی زندگی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بلاشبہ کامیابی کا طریقہ تھا۔ مگر یہ طریقہ آپ کی سوچ میں شامل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زبان سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ انڈیا میں مسلم نوجوانوں کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ حالاں کہ عین اسی وقت آپ اسی انڈیا میں مکمل کامیابی حاصل کئے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ہی جیسا معاملہ آجکل اکثر مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ہیں۔ جنھوں نے اپنی ذات کی سطح پر محنت کرکے کامیاب زندگی حاصل کی ہے۔ مگر جب وہ بولتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کا تجربہ بیان نہیں کرتے۔ بلکہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر شکایت اور مایوسی کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ اگر صرف یہ کریں کہ وہ خود اپنا تجربہ لوگوں سامنے بیان کریں تو

ملت کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے۔

۱۰۰۰ ق م میں بمبئی صرف مچھیروں کی ایک معمولی بستی تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اشوک کی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس کے بعد وہ مختلف راجاؤں کے ماتحت رہا۔ ۱۲۹۴ میں وہ خلجی خاندان کے قبضہ میں آیا۔ ۱۵۰۷ میں یہاں سمندر کے راستہ سے پرتگالی داخل ہوئے۔ ۱۶۶۱ میں جزیرہ بمبئی انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ایک عرصہ تک وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام رہا۔ ۱۸۵۷ میں پہلی سوتی مل یہاں قائم ہوئی۔

بمبئی میں میں "جوہو اسکیم" کے علاقہ میں ٹھہرا تھا۔ یہاں ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ اور کچھ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان رہتے ہیں۔ مختصر قیام کے دوران یہاں اس طبقہ کے لائف اسٹائل کو دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس اختلاط کے دوران یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہندو۔ مسلم اشوز کو اگر محدود دائرہ میں رکھا جائے، ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک نہ پہنچنے دیا جائے تو ہندوؤں کا اوپر کا طبقہ ان معاملات میں غیر جانب دار رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے اوپر کے طبقہ کا وزن اس قسم کی تحریکوں کو نہ ملے تو اس کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ ان کو قومی پرسٹیج کی حد تک جانے سے روکا جائے۔

مثلاً اجودھیا کے مسئلہ کو اگر اجودھیا تک محدود رکھا جاتا، شاہ بانو بیگم کے معاملہ میں ملکی اندولن نہ چلایا جاتا تو فرقہ پرست یا تشدد پسند عناصر کو اوپر کے طبقہ کے ہندوؤں کا تعاون ہرگز نہ ملتا۔

بمبئی میں مسٹر ایس آر سنگھوی (Tel. 750866, 750625) سے ملاقات ہوئی۔ وہ کلکتہ میں رہتے ہیں اور اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ کلکتہ کا پروگرام بنائیے۔ ہم اس میں پورا تعاون دیں گے۔

انھوں نے بتایا کہ ان کی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ یہاں کالج میں مسلم لڑکے بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ہندو مسلم ذہن کے ساتھ نہیں سوچتا تھا۔ مگر ۵۔ ۴ سال میں بہت زیادہ فرق آگیا۔ ایک دوسرے کے درمیان بہت دوری

آگئی۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ ایک طرف بابری مسجد تحریک اٹھی، اور دوسری طرف رام مندر تحریک شروع ہوئی۔ ان تحریکوں نے سارے ماحول میں زہر گھول دیا۔

گویا کہ موجودہ فرقہ وارانہ منافرت نہ مسلم دورِ حکومت کی دین ہے اور نہ ملک کے بٹوارہ کا نتیجہ۔ وہ قریب کی بعض تحریکوں کا نتیجہ ہے جو نہایت غیر دانش مندانہ انداز میں چلائی گئیں۔ کچھ فرقہ پرست ہندو اگر ماضی کی بعض باتوں کو آج دہرا رہے ہیں تو اس کی حیثیت حقیقۃً "نکتۂ بعد الوقوع" کی ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد مسٹر خوراکی والا (شریف ببلی) نے لنچ پر شہر کے کچھ خاص لوگوں کو بلایا تھا۔ یہاں موجودہ حالات پر لوگوں سے گفت گو ہوئی۔ مسٹر خوراکی والا نے گفت گو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ملک جدھر جا رہا ہے اس پر سب کو دکھ ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ ذاتی مفاد اور پارٹی پالٹکس سے اوپر اٹھ کر دیش کے مفاد کو سپریم بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ قومی مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں۔

آج دن میں شہر کی کئی ممتاز شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ہر ایک نے "تین نکاتی فارمولا" سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کو ملک میں امن کے قیام کا ذریعہ بتایا۔

شام کو ۵ بجے جم خانہ کلب کے ہال میں عمومی اجتماع ہوا۔ تمام سیٹیں پوری طرح بھری ہوئی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، ہندو اور مسلم دونوں بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ مقررین میں میرے علاوہ اچاریہ سوشیل کمار، سوامی چید انند، نانی پالکھی والا، کارڈینال سائمن پمینٹا، لو مالوپ زنگ اور ایف ٹی خوراکی والا تھے۔

مسٹر سعید نقوی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں فیض آباد کا رہنے والا ہوں جو اجودھیا کے پڑوس میں ہے۔ مگر ۱۹۸۶ کے ایجی ٹیشن سے پہلے تک میرے والدین کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بابری مسجد کہاں ہے۔ یہ صرف تحریکوں کی دھوم تھی جس نے لوگوں کو اس سے باخبر کیا۔

پالکھی والا نے اپنی تقریر میں کہا انڈیا میں اس وقت آپس کے جو جھگڑے ہیں وہ شرمناک حد تک بے معنی ہیں۔ ہم کو اگر ترقی کرنا ہے تو ہمیں ان آپسی جھگڑوں کو ختم کرنا ہوگا۔ انھوں نے

اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی : یا تو بھائیوں کی طرح زندگی گزاریئے یا جانوروں کی طرح مرجائیے :

Live as brother or die as animals.

میں نے اپنی تقریر میں تین نکاتی فارمولے کی تشریح کی۔ آخر میں اچاریہ سوشیل کمار مانک پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں میں سے جن لوگوں کو فارمولے سے اتفاق ہے وہ ہاتھ اٹھائیں۔ اچانک کچھ مسلمان اٹھ کر شور کرنے لگے۔ ان کے شور میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف یہ سنائی دیا کہ : ہم مولانا کے فارمولے کو نہیں مانتے۔

اس کے بعد سوامی چیدانند اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں میری حمایت کی۔ اس سے لوگ ٹھنڈے ہوئے۔ اس کے بعد نانی پالکھی والا آئے۔ انھوں نے شاندار انگریزی تقریر میں میری زبردست حمایت کی۔ ان کی تقریر نہایت علمی اور نہایت موثر تھی۔ اس کے بعد مجمع بالکل خاموش ہوگیا۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳ کو بمبئی کے مذکورہ جلسہ میں جس مسلمان بزرگ نے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کیا، وہ مولانا ضیاء الدین بخاری تھے۔ موصوف ابتداً ایک "معمولی اور گمنام ٹیچر تھے۔ اس کے بعد وہ بمبئی کی مسلم سیاست کے میدان میں آئے۔ اپنی جوشیلی تقریروں کے ذریعہ انھوں نے مقامی مسلم حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی۔ وہ "بیباک مسلم لیڈر کے روپ میں ابھرے۔ اور ایک صحافی کے الفاظ میں، بمبئی کے مسلمانوں کی مزاحمتی سیاست کی علامت بن گئے۔ (ہندستان، بمبئی، ۲۱-۲۲ اپریل ۱۹۹۳)

۲۰ فروری کے جلسہ میں انھوں نے اتنا شور کیا کہ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ دو ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۹۳ کو یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ بمبئی کے علاقہ بائی کلہ کی فائن پیلس بلڈنگ میں واقع ان کے دفتر میں چار مسلح لوگ داخل ہوئے اور ریوالور سے مسلسل فائر کر کے ان کو ہلاک کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

بمبئی کے سفر پر روانگی سے پہلے بمبئی سے کئی ٹیلیفون آئے تھے کہ آپ بمبئی نہ آئیں۔ یہاں کچھ افراد آپ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ آپ کے خلاف کچھ بھی حرکت کر سکتے ہیں۔ تاہم میں اللہ کے بھروسے پر بمبئی گیا۔ جس وقت ہال میں کچھ مسلمان ہنگامہ کر رہے تھے اور میں اسٹیج پر

خاموش بیٹھا ہوا تھا، ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی طرف سے گولی آسکتی ہے اور یہیں میرا خاتمہ کرسکتی ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے دل میں اس وقت ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی اسٹیج کا پردہ اس کے ذمہ داروں نے کھینچ دیا۔ اس کے بعد دو پولیس افسر میرے دائیں اور بائیں آگئے۔ وہ باہر گاڑی میں سوار ہونے تک مسلسل میرے ساتھ رہے۔

۲۰ فروری کی شام کو میں مسٹر افضل الانہ کی گاڑی میں ایرپورٹ جانے کے لئے بیٹھا۔ عین اسی وقت دو ہندو نوجوان گاڑی میں داخل ہوئے اور میرے دائیں اور بائیں بیٹھ گئے۔ یہ دونوں میرے لئے نئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی حفاظت کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان نے کہا: مولانا جی، یدی کوئی آپ پر گولی چلاتا ہے تو وہ گولی پہلے ہمارے سینہ کو چھیدے گی۔ اس کے بعد ہی وہ آپ تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ لوگ ایرپورٹ کے دروازہ تک میرے ساتھ رہے۔

شام کو فلائٹ نمبر ۱۸۳ کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ کسی قدر لیٹ ہو کر جہاز نے ۹ بجے بمبئی سے پرواز شروع کی۔ راستہ میں چند اخبار ہندی اور انگریزی کے دیکھے۔ ہندی اخبار سندھیہ ٹائمس (۲۰ فروری ۱۹۹۳) میں ایک تفریحی کالم ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہے: اٹ پٹے سوال، چٹ پٹے جواب۔ اس کے دو سوال وجواب اس طرح تھے:

سوال: جب دنیا کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت راستہ کون دکھاتا ہے۔

جواب: ہمت۔

سوال: یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مگر ایک مہاشے کو شکایت ہے کہ لگاتار پانچ ورشوں کی کڑوی محنت کے بعد بھی پھل کڑوا ہی ملا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔

جواب: پانچ سال میں محنت سے کریلے ہی بوئے ہوں گے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳ کی رات کو میں دہلی واپس پہنچا۔ تاخیر کا سبب یہ تھا کہ جہاز غیر معمولی طور پر کئی گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔ مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ مجھے اس کی اطلاع بمبئی میں پیشگی طور پر مل گئی تھی اور میں نے اس وقت کو بمبئی میں استعمال کر لیا تھا۔

سیواگرام کا سفر

وسط مارچ ۱۹۹۳ میں سیواگرام میں ایک سمینار تھا۔ یہ سیمنار گاندھی، ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن کے ماننے والوں نے سرودیہ سماج کے زیر اہتمام کیا تھا۔ منتظمین کی دعوت پر میں نے بھی اس میں شرکت کی۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۳ کی دوپہر کو گھر سے دہلی ایئر پورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ میرے ساتھ ہندی اخبار جن ستا کے بیورو چیف مسٹر رام بہادر رائے بھی تھے۔ ایئر پورٹ پر پہنچے تو انتظار گاہ میں بہت سے مسافر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ جگہ جگہ رنگین ٹیلی ویژن رکھے ہوئے تھے جن پر تفریحی فلمیں دکھائی جارہی تھیں۔ یہ اس لئے تھا تاکہ مسافر اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔

میں نے کہا کہ جدید تمدن قدم قدم پر غیر فطری دلچسپیاں بکھیرے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی فطرت کی لائن پر سوچ نہیں پاتا۔ قرآن میں سفر (سیاحت) کو ذریعۂ عبرت بتایا گیا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر طرف مصنوعی رونقیں اتنی زیادہ پھیلادی گئی ہیں کہ انسان سفر کے دوران بھی انھیں میں کھویا ہوا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاز کے اندر بھی کان پر آلۂ سماعت لگاکر موسیقی کی دھنیں سنتا رہتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کبھی وہ لمحہ نہیں آتا جب کہ وہ فطرت سے قریب ہو۔ وہ آلاء الٰہی سے آشنا نہیں ہو پاتا۔ وہ آلاء انسانی کے درمیان جیتا ہے، اور انھیں کے درمیان مرجاتا ہے۔

میں ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اناؤنسر کی آواز کان میں آئی ——— " یہ سوچا انتم بار دی جارہی ہے "۔ ایئر پورٹ کا اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ گوا جانے والے یاتری فوراً گیٹ نمبر ۲ پر پہنچیں۔ کیوں کہ فلائٹ اب روانگی کے لئے بالکل تیار ہے۔

اچانک خیال آیا کہ آخری پیغمبر کا ظہور بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ وہ انسانیت کے لئے آخری انتباہ تھا۔ شاید اسی لئے آپ نے فرمایا کہ میں اور قیامت اتنے ہی قریب ہیں جیسے کہ میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں (بُعِثْتُ أنَا والسّاعَةَ كَهَاتَين) مشکاۃ المصابیح ۱/۴۴۲

مگر بھری ہوئی دنیا میں ایسے لوگ کہیں نظر نہیں آتے جو اس انتم سوچنا کو سنیں اور اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

ظہر کی نماز ایئر پورٹ پر پڑھی۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اسلام میں تو یہ ہے کہ پوری زمین مسجد ہے۔ جہاں چاہے اپنی عبادت کر لو۔ ایسی حالت میں مسلمانوں نے بابری مسجد کے لئے اتنا زیادہ شور کیوں کیا۔ دونوں باتوں میں مجھے یکسانیت دکھائی نہیں پڑتی۔

میں نے کہا کہ کچھ خود ساختہ لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر جو آل انڈیا ایجی ٹیشن چلایا، اس ایجی ٹیشن سے تو میں اتفاق نہیں کرتا، مگر جہاں تک خود بابری مسجد کا مسئلہ ہے، اس پر اس کے فطری دائرہ میں پر امن تحریک چلانا بلاشبہ درست تھا، کیوں کہ ایک ثابت شدہ مسجد کو بزور مندر میں کنورٹ کرنا انصاف اور قانون کے سراسر خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ آپ جس مکان میں رہتے ہیں وہ کوئی مقدس جگہ نہیں، آپ اس کے سوا کسی دوسرے مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص آپ کے مکان پر زبردستی قبضہ کر لے تو آپ ضرور اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔ اس لئے نہیں کہ آپ کسی دوسری جگہ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ اس لئے کہ آپ کے ایک ثابت شدہ مکان پر زبردستی قبضہ کرنا قانون اور انصاف کے خلاف ہے۔ بابری مسجد کی تحریک دراصل غیر قانونی قبضہ کے خلاف تھی، وہ اس معنی میں نہ تھی کہ اس ڈھانچہ کے باہر عبادت نہیں کی جا سکتی۔

ایئر پورٹ پر نماز پڑھنے کے بعد جب دوبارہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھا تو ایئر پورٹ کا ایک ملازم آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا۔ پھر چرن اسپرش کر کے بولا کہ مجھے ایک ہفتہ سے بخار ہے۔ مجھ کو پھونک مار دو۔ میں نے کچھ دعائیہ کلمات پڑھ کر اسے پھونک دیا۔ اور کہا کہ خدا نے چاہا تو تم اچھے ہو جاؤ گے۔

اس طرح کی پھونک کے بعد اگر کوئی مریض اچھا ہو جائے تو عام لوگ اس کو بزرگ کی کرامت سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بدلے ہوئے اسلوب میں خود ایک دعا ہے۔ اس کے بعد اگر مریض اچھا ہو جائے تو وہ دعا سے اچھا ہوا نہ کہ بزرگ کی کرامت سے۔

انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۷۴۷ کے ذریعہ ۱۵ مارچ کو دہلی سے ناگپور کے لئے روانگی ہوئی۔ دن کے ۲ بجے کا وقت تھا۔ جہاز فضا میں بلند ہو کر تیزی سے اڑ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو جہاز کے نیچے بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ جہاز ان کے اوپر سے آگے کی طرف

جاتا ہوانظر آرہا تھا، اور بادل کے ٹکڑے پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ صرف نظر کا معاملہ تھا۔ ہوائی جہاز کی رفتار تیز تھی اور بادل کی رفتار اس کے مقابلہ میں سست، اس لئے دیکھنے میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز آگے کی طرف جا رہا ہے اور بادل پیچھے کی طرف۔ اس دنیا میں اسی طرح انسان کا ہر مشاہدہ اضافی ہے۔ آدمی اگر اس راز کو نہ جانے تو وہ کسی بھی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔

راستہ میں انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سوا گت (مارچ ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کا ایک مضمون ہوائی جہاز اور چڑیوں کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــ پنکھ دار خطرے:

Winged Hazards

اس میں بتایا گیا تھا کہ چڑیوں کے جھنڈ جو اکثر آسمانوں میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ ہوائی جہاز کے لئے بہت بڑا امکانی خطرہ (potential danger) ہیں۔ اگر وہ فضا میں کسی ہوائی جہاز سے ٹکرا جائیں تو وہ ہوائی جہاز کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ جہاز کی رفتار جتنا زیادہ تیز ہوگی اتنا ہی زیادہ چڑیوں کا ٹکراؤ اس کو نقصان پہنچائے گا۔

ایک گدھ اگر ایک ایسے جہاز سے ٹکرائے جو فضا میں ۴۸۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا ہو تو اس کا امپیکٹ ۱۴ ٹن کے برابر ہوگا۔ لیکن اگر جہاز کی رفتار ایک ہزار کیلو میٹر فی گھنٹہ ہو تو اس وقت ٹکراؤ کا امپیکٹ ۷۰ ٹن ہو جائے گا جو کسی ہوائی حادثہ (air crash) کے لئے کافی ہے۔ فوجی جہازوں کو خاص طور پر چڑیوں کا خطرہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ بہت تیز رفتار کے ساتھ اڑتے ہیں۔ ۱۹۹۰ میں انڈین ایئر لائنز کے جہازوں کے ساتھ چڑیوں کے ٹکراؤ کے ۱۸ کیس ہوئے اور اس کے نتیجہ میں متاثر جہازوں کی مرمت پر ۴۲ لاکھ روپئے خرچ کرنا پڑا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ جب ٹکراؤ واقع ہوتا ہے تو اس وقت جہاز کی رفتار کی اہمیت چڑیوں کے وزن سے زیادہ ہوتی ہے:

> When collision occurs, the speed of the aircraft is more important than the weight of the bird. (p.65)

یہی اصول انسانی زندگی کا بھی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اگر فریق ثانی کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ ہو جائے تو آپ کو اس کا جو نقصان پہنچے گا وہ آپ کی اپنی رفتار کے تناسب سے ہوگا نہ کہ فریق ثانی کے حجم یا تعداد کے تناسب سے۔

ناگپور ایئرپورٹ پر جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ پہنچا۔ لینڈنگ بھی رف تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جہاز کو دھم سے زمین پر گرا دیا گیا ہو۔

ایئرپورٹ پر سیواگرام کانفرنس کے منتظمین موجود تھے جو مجھ کو براہ راست سیواگرام لے جانا چاہتے تھے۔ مگر ایئرپورٹ پر ناگپور کے احباب جناب محمد حنیف صاحب، جسٹس قاضی صاحب، عبدالسلام اکبانی صاحب آگئے تھے۔ ان کی تجویز تھی کہ آج میں ان کے ساتھ ناگپور میں قیام کروں اور کل صبح یہاں سے سیواگرام جاؤں۔ ناگپور سے سیواگرام کا سفر بذریعہ روڈ ایک گھنٹہ کا ہے۔

ایئرپورٹ سے روانہ ہو کر ہم لوگ ہوٹل سنٹر پوائنٹ (centre point) پہنچے۔ یہاں میرے کمرہ نمبر ۵۰۲ میں ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ شام کو دیر تک نشست رہی۔ محمد حنیف صاحب، جسٹس قاضی صاحب، عبدالسلام اکبانی صاحب کے ساتھ قرآن و حدیث کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور میں کچھ دیر لکھنے پڑھنے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔

ہوٹل کے مالک ایک سردار جی ہیں۔ اور اس کے منیجر ایک مسلمان ہیں۔ یہ روزہ کا دن تھا۔ صبح کو ½۴ بجے ہوٹل کے آدمی نے گھنٹی بجائی اور روزہ کی سحری لا کر کمرہ میں رکھ دی۔ شیخ سعدی شیرازی نے کہا تھا:

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست ہرجا کہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

مگر اب ہر جگہ ہوٹلوں کے قیام کے بعد اس سہولت کا تعلق صرف "منعم" سے نہیں رہا۔ بلکہ وہ ہر ایک کی دسترس تک گیا ہے۔

ایک مسئلہ پر گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندو کو کافر کہنا سراسر غیر اسلامی ہے۔ کافر کے معنی عربی زبان میں منکر کے ہوتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں منکر وہ ہے جس کا انکار ناصحانہ دعوت اور صابرانہ تبلیغ کے ذریعہ آخری طور پر ثابت شدہ بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی رسول نے کبھی "اے کافرو" کہہ کر اپنے زمانہ کے لوگوں کو خطاب نہیں کیا۔ ان کے خطاب کے الفاظ ہمیشہ یہ ہوتے تھے ——— اے میری قوم کے لوگو، اے انسانوں، اے اللہ کے بندو، وغیرہ۔ موجودہ حالت میں ہندوؤں کو کافر کہنا یا ان کے خلاف ہلاکت کی دعا کرنا مجرمانہ حد تک غلط

ہے۔ یہ اپنی ذمہ داری ادا کئے بغیر دوسرے کو مجرم ٹھہرانا ہے۔

اسی طرح میں نے کہا کہ انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب بلاشبہ الگ الگ ہے۔ مگر دونوں ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس معاملہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے بالکل درست فرمایا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، قوم مذہب سے نہیں بنتی۔

ایک اور گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ سہ نکاتی فارمولا اصلاً اجودھیا کے مسئلہ کے حل کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ تاہم اس کوشش کے دوران وہ ایک خیر کا ذریعہ بن گیا۔ اور وہ ہے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچنا۔ اس فارمولے کی اشاعت کے بعد پہلی بار یہ موقع ملا کہ میں ہندوؤں کے دانشور طبقہ میں اور ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں پہنچ سکوں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد میں جتنا زیادہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اوپر کے طبقہ کے ہندوؤں میں پہنچ سکا ہوں اتنا موقع مجھے اپنی پوری عمر میں نہیں ملا تھا اور نہ میری معلومات کے مطابق، کسی اور مسلم رہنما یا عالم کو۔

یہ سفر اصلاً سرو سیوا سنگھ کے سیمینار میں شرکت کے لئے ہوا جو سیوا گرام میں ہو رہا تھا۔ حسب پروگرام ۱۶ مارچ کی صبح ناگپور سے سیوا گرام کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ میرے ساتھ جن ستا کے ایڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی اور مسٹر رام بہادر رائے تھے۔ میں ہوٹل کے کمرہ سے نکلا تو حسب معمول میرے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا، جبکہ سیوا گرام میں مجھے تین دن گزارنا تھا۔ مسٹر پربھاش جوشی نے اس کو دیکھ کر کہا: کیا یہ آپ کے تین دن کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

سیوا گرام میں ہم لوگ گیارہ بجے پہنچے۔ وہاں سیمنار کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اس سیمنار میں زیادہ تر گاندھی وادسے تعلق رکھنے والے لوگ شریک تھے۔ اس کا موضوع بحث یہ تھا: موجودہ حالات میں دیش کے سدھار کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے۔ سیمنار کا ماحول مکمل طور پر گاندھیائی تھا۔ ایک سادہ سے بڑے کمرہ میں لوگ معمولی فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی منچ نہیں تھا۔ کسی کے لئے کوئی اہتمام نہیں تھا۔ دیوار سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ اسٹیج تھا جس پر بیٹھ کر مقرر بولتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر جیسی چیزیں بھی نہیں تھیں۔ کوئی جوشیلی تقریر نہیں ہوئی۔ ہر آدمی سادہ، متواضع اور دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ چند نوجوان تھے اور زیادہ تر بوڑھے یا ادھیڑ عمر کے لوگ۔

اجتماع گاہ میں ایک نیا منظر یہ تھا کہ جس طرح تبلیغ والوں کے جلسہ میں بہت سے لوگ عین دوران

اجتماعی تسبیح پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں، یہاں بھی کچھ لوگ مخصوص قسم کا دستی کرگھا لئے ہوئے سوت کاتنے میں مشغول تھے۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۶ میں اپنا سابرمتی کا آشرم چھوڑ دیا۔ وسط ہند میں وہ دوسرا آشرم بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت واردھا ضلع میں مسٹر بجاج نے ایک بہت بڑی زمین انھیں عطیہ میں دے دی۔ یہیں پر گاندھی جی نے اپنا آشرم بنایا اور اس کا نام سیوا گرام رکھا۔ یہاں انھوں نے ایک ماڈل کمیونٹی بنائی جو ابھی تک وہاں پائی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ گاندھی جی نے سیوا گرام کے باشندوں کو یہ نشانہ دیا کہ وہ یہاں ایک خود کفیل کمیونٹی بنائیں۔ وہ خود اپنا کھانا، کپڑا، مکان اور اسباب بنائیں جو سماجی زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانیت، آرٹ، لٹریچر، ڈراما وغیرہ میں انھیں اپنا کام آپ بنانا چاہیے (IX/82)

۱۹۳۴ میں مہاتما گاندھی نے کانگرس پارٹی کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ کانگرسی لوگوں نے نان وائلنس کو محض پولیٹکل مصلحت کے لئے اختیار کیا ہے نہ کہ واقعی عقیدہ کے طور پر جیسا کہ وہ خود اس کو سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی نے وقتی طور پر اپنی پولیٹکل سرگرمی ختم کر دی۔ انھوں نے اپنی توجہ تعمیری پروگرام میں لگا دی، تاکہ قوم کو اس کی ابتدائی سطح سے تیار کرسکیں، اس کے لئے انھوں نے نئی تعلیمی سنگھ کی تحریک شروع کی جو اب تک چل رہی ہے (7/877)

سیوا گرام میں افراد تیار کرنے کے لئے گاندھی جی کا جو نقشہ تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ بنیادی طور پر ان کے سامنے مارکسی ماڈل تھا۔ مارکس کا نظریہ تھا کہ سوشل حالات انسانی اخلاقیات کی تشکیل کرتے ہیں۔ سیوا گرام کا نقشہ بھی اسی کے مطابق تیار کیا گیا۔ البتہ یہ فرق تھا کہ مارکس نے اپنے نظام کو سیاسی انقلاب کے ساتھ جوڑا۔ اور گاندھی جی نے اس کو غیر سیاسی دائرہ میں حاصل کرنا چاہا۔

مگر تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں یکساں طور پر ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی اخلاقیات کی تشکیل کرنے والی طاقت آدمی کی اپنی ذہنی سوچ ہے نہ کہ اس کے سماجی اور اقتصادی حالات۔ آدمی جیسا سوچتا ہے ویسا بنتا ہے نہ کہ جیسا رہتا ہے ویسا بن جاتا ہے۔

سیوا گرام میں دیکھنے کی چیزیں بہت ہیں۔ خاص طور پر مٹی اور لکڑی سے بنا ہوا وہ چھوٹا سا مکان جس کو گاندھی جی کا ہٹ (جھونپڑا) کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر مہاتما گاندھی کے بیٹھنے کی جگہ،

ملاقات کی جگہ، سونے کی جگہ، کھانے کا برتن، وغیرہ ہیں۔ ہر چیز نہایت سادہ اور نہایت معمولی ہے۔ اس کو اس کی اصل صورت میں پوری طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔

میکسیکو کا فلسفی آئیوان الیچ (Ivan Illich) جنوری ۱۹۷۸ میں سیوا گرام آیا تھا۔ یہاں ان کو ایک کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا۔ وہ جتنے دن سیوا گرام میں رہے، انھوں نے اپنا زیادہ وقت گاندھی جی کے جھونپڑے (Bapu's hut) میں گزارے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جھونپڑا مجھ کو روحانیت اور سادگی کی علامت نظر آتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر مجھ کو ایک سکون حاصل ہوتا ہے جو مجھ کو کہیں اور نہیں ملتا۔ انھوں نے اپنے لکچر میں کہا کہ ہم کو ایک طریقہ دریافت کرنا ہوگا جس کے ذریعہ ہم اس فکر کی بنیاد پر آج کی دنیا کی قدروں میں تبدیلی لا سکیں:

We have to find a method by which this thinking finds expression in changing the values of today's world.

مہاتما گاندھی کی سب سے زیادہ خاص صفت میرے نزدیک یہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے تھے جیسے کہ وہ ان کا ہمدرد ہو۔ ایک گاندھیائی پروفیسر نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی کے ستیہ گرہ کے فلسفہ میں دشمن بھی مستقل دشمن نہیں تھا بلکہ وہ ایک امکانی دوست تھا:

The fact is that in Gandhi's philosophy of Satyagraha, the enemy was not regarded as an eternal enemy, but a potential friend.

سیمنار میں تقریباً پچاس آدمی تھے۔ وہ سب گاندھی، ونوبا بھاوے اور جے پرکاش کے نظریات سے متاثر تھے۔ اپنے اپنے انداز میں لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۶ مارچ کو دوپہر بعد کی میٹنگ میں میں نے پون گھنٹہ تک ایک تقریر کی۔

میں نے کہا کہ گاندھی جی نے اہنسا کے ذریعہ آزادی حاصل کی۔ مگر آزادی کے بعد ملک ہنسا کے رخ پر چل پڑا۔ اس کا نقصان اتنا زیادہ ہے جو گنتی میں نہیں آتا۔ مثلاً بمبئی اس دیش میں صنعتی ترقی کی علامت تھا، آج بمبئی کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ پنجاب زراعتی ترقی کی علامت تھا، آج پنجاب تباہ ہو رہا ہے۔ کشمیر اس ملک میں فطرت کے حسن کا نمونہ تھا، آج کشمیر تباہی کا منظر

پیش کر رہا ہے۔

ان حالات میں مہاتما گاندھی کے خیالات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ آج اہنسا کے اصول کو از سر نو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا جائے۔

ایک پرانے گاندھیائی نے کہا کہ گاندھی جی یہ کہتے تھے کہ ہم کو گرام سوراج لانا ہے۔ تم لوگ آدرش گرام بنانے کی چرچا کرو۔ یہی جے پی کے سمپورن کرانتی کا مطلب بھی تھا۔ اب ہم کو اسی کے لئے اٹھنا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پہلا سوال یہ ہے کہ ہمارا ایجنڈا کیا ہو۔ میں کہوں گا کہ یہ ایجنڈا سوشل چینج ہے۔ سوشل چینج کے لئے ہمیں ایک نان پولٹیکل فورس کو جنریٹ کرنا ہے۔ آپ کو ڈیش میں نان پولٹیکل فورس کھڑا کرنا ہوگا۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ آج کا ہندو کرائسس آف آئیڈنٹٹی کے مسئلے سے دوچار ہے۔ ہندو کون ہے، خود یہ سوال غور طلب بن گیا ہے۔ اس کے لئے ہمیں کڑی محنت کرنا ہوگا۔

ایک صاحب نے "سب کی بھلائی" کو آدرش قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں پوری انسانیت کو سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا:

جب تک سب کا بھلا نہ ہوگا نہیں کریں گے ہم آرام

ایک صاحب نے کہا کہ آجکل سیاسی لیڈروں کا نظریہ یہ ہو گیا ہے کہ ــــــ دنگا کرا دو، پولرائزیشن ہو جائے گا، ووٹ مل جائے گا۔ ایسی گندی سیاست کے ماحول میں ہم کو بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہے۔

یہاں کھانے کا نظام بھی پوری طرح گاندھیائی تھا۔ ایک کھلا ہوا ہال ہے۔ اس کے اوپر خوبصورت چھپر پڑا ہوا ہے۔ چاروں طرف درخت کی ہریالی ہے۔ چڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ اس کے اندر معمولی قسم کا ٹاٹ بچھا دیا گیا۔ سب لوگ آ کر اس پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہر ایک کے سامنے سادہ قسم کی تھالی رکھی گئی جس کے اندر دو کٹوریاں تھیں۔

کھلانے والے آتے ہیں اور ہر ایک کی تھالی میں روٹی، چاول، سالن، ڈالنا شروع کرتے ہیں۔ ہر ایک صرف بقدر ضرورت لیتا ہے۔ کیوں کہ یہاں کھانا چھوڑنے کا رواج نہیں۔ میٹھے کے لئے حلوا یا مٹھائی

نہیں ۔ بلکہ سادہ قسم کا گڑ دیا جارہا ہے۔

کھانا رکھے جانے کے بعد بھی کوئی شخص کھانا شروع نہیں کرتا ۔ بلکہ انتظار کرنا ہے کہ تمام لوگوں کے سامنے کھانا رکھ دیا جائے ۔ جب سب کی تھالی میں کھانا رکھا جاچکا ہوتا ہے تو ایک آدمی کھڑے ہو کر ہندی میں دعائیہ گیت گاتا ہے جس کو دوسرے لوگ دہراتے ہیں ۔ اس کے بعد سب لوگ بیک وقت کھانا شروع کرتے ہیں ۔

برتن دھونا ہر آدمی کی اپنی ذمہ داری ہے ۔ ہر شخص کھانے سے فارغ ہو کر اٹھتا ہے تو اس کا برتن اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ وہ نل پر جاکر اسے دھوتا ہے اور پھر مخصوص جگہ اس کو لے جاکر رکھ دیتا ہے ۔

شام کو بہت سے لوگ میرے کمرہ میں اکٹھا ہو گئے ۔ مسلمانوں کے معاملات پر باتیں ہوتی رہیں ۔ ایک ہندو نوجوان مسٹر کمار پرشانت بھی ان میں شامل تھے ۔ وہ باصلاحیت اور تعلیم یافتہ ہیں ۔ مگر بعض امور میں ان کو میں نے حد درجہ شدید پایا ۔ مثلاً انھوں نے شاہ بانو بیگم کے معاملہ کا ذکر کیا ۔ ان کے نزدیک شاہ بانو اس بات کی علامت تھی کہ مسلم عورتیں موجودہ سماج میں ظلم کا شکار ہو رہی ہیں ۔ اور ملّا لوگ ریفارم کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں ۔

میں نے کہا کہ نکاح و طلاق کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک اندرونی مسئلہ ہے ۔ اس میں آپ کیوں دخل دینا چاہتے ہیں ۔ بہتر ہے کہ ہم اور آپ ان چیزوں پر بات کریں جو سارے دیش کی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ انھوں نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا : اب نئے بھارت میں یہ الگا ؤ نہیں چلے گا ۔ مسلم سماج یا تو خود طے کر کے اپنے آپ کو دیش کے مطابق بنالے ، ورنہ اس کے اوپر بلڈوزر چلا کر اس کو یکساں بنا دیا جائے گا ۔

اگلے دن ۱۷ مارچ کو شرکا نے جو باتیں کہیں ، ان میں سے کچھ کا خلاصہ یہاں نقل کیا جارہا ہے ۔ ونے بھائی بنارس سے آئے تھے ۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سردار پٹیل آر ایس ایس کو دیش کے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے ۔ انھوں نے کہا تھا کہ آر ایس ایس والے دیش کا نہ جانے کیا کر ڈالیں گے ۔ آپ کے گھر میں کوئی ایسا نوجوان ہے تو اس کو سمجھائیے ۔ اگر وہ نہ مانے تو اس کو گھر سے نکال دیجئے ۔ ونے بھائی نے رام لیلا گراؤنڈ کی میٹنگ میں سردار پٹیل کی زبان سے یہ بات سنی ۔

ونے بھائی نے بتایا کہ نوجوانی کی عمر میں میں خود آر ایس ایس میں شامل ہو گیا تھا۔ میں "راشٹریہ سیوک سنگھ" کے نام سے پر بھاوت ہوا۔ مجھے "راشٹریہ" کے لفظ سے دھوکا ہوا کہ یہ لوگ راشٹر کا کام کر رہے ہیں۔ مگر اندر داخل ہو کر معلوم ہوا کہ اصل میں تو وہ ہندو سنگھ ہے اور نام راشٹر سنگھ رکھ لیا ہے۔ یہ جھوٹا نام ہے۔ اور اسی جھوٹ سے انھوں نے بہت سے لوگوں کو دھوکا دیا ہے۔ ان لوگوں کو اپنا نام ہندو سنگھ رکھنا چاہئے تاکہ لوگوں کو سمجھنے میں دھوکا نہ ہو۔ یہ ونے بھائی بنارس میں رہتے ہیں۔

ایک ہندو ویر رگ نے اجودھیا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں مندر اور مسجد دونوں کو بننا چاہئے۔ ایک مناسب فاصلہ (reasonable distance) پر ہم دونوں ہی کو بنائیں گے۔

ایک ہندو نوجوان نے کہا کہ یہاں راج نیتک اکائی بکھرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ساری دنیا میں راج نیتک اکائیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ہم اس سے الگ رہ سکیں گے، اس میں مجھے شک ہے۔

مسٹر رام بہادر رائے نے کہا کہ ہندو مسلم سمبندھ کا سوال آج دیش کا سب سے بڑا سوال ہے۔ یہ اجودھیا سے پیدا ہوا ہے اور اجودھیا ہی سے اس کا حل نکلنا شروع ہوگا۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ بھاجپا کو دلی کی کرسی پر بیٹھنے سے روکنا یہ ہماری پہلی ترجیح ہے یا ہندو مسلم سمبندھ بنانا، یہ ہماری پہلی ترجیح ہے۔

مسٹر پربھاش جوشی نے کہا کہ بھارت میں کبھی ہندو راجیہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ ہندو ازم میں راجیہ کا اسٹرکچر موجود ہی نہیں۔ اسلام میں اسلامی راجیہ بن سکتا ہے۔ کیوں کہ اسلام میں راجیہ کا اسٹرکچر پایا جاتا ہے۔ ہندو ازم میں ایسا نہیں ہے۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ جے پرکاش نرائن ایک بار بالا صاحب دیورس سے ملے۔ پھر وہ دلی سے پٹنہ آئے۔ وہاں ایک میٹنگ میں انھوں نے لوگوں کے سوال پر بتایا کہ میں نے بالا صاحب دیورس سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک ہندو کون ہے۔ بالا صاحب دیورس نے جواب دیا: ہندو وہ ہے جو ہندو پن کا ابھمان چھوڑ دے۔

ایک صاحب نے بڑے درد کے ساتھ کہا کہ آج فرقہ وارانہ نفرت کا جوز ہر پھیلا ہوا ہے، اس کو اگر ہم ختم نہیں کر سکتے تو کم سے کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اس زہر کا کچھ حصہ ہم پی لیں، تاکہ اس کی کچھ بوندیں

تو ہم کم کر سکیں۔ یہ کم سے کم ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔

مسٹر رام بہادر رائے نے موجودہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرا فیملی ڈاکٹر پہلے کبھی ہندو اور مسلم کی بات نہیں کرتا تھا۔ مگر ۶ دسمبر کے بعد اب اتنا بدلاؤ آگیا ہے کہ اس نے مجھ سے کہا کہ پاکستان میں جس طرح ہندو رہتا ہے، بنگلہ دیش میں جس طرح ہندو رہتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو اس دیش میں رہنا ہوگا۔ تب فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہوگا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام عرب میں آیا تو لوٹا ہوا عرب جڑ گیا۔ اور اسلام جب بھارت میں آیا تو جڑا ہوا بھارت ٹوٹ گیا۔ اس سے بڑی بدنامی اسلام کی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایک ہندو بھائی نے کہا کہ مسلمان ۱۹۴۷ کے بعد سے ہمیشہ سرکار کے گرد گھومتے رہے۔ اب اس کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب مسلمانوں کو ہندو سماج سے جڑنا ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے اس دیش میں اب کوئی اور راستہ نہیں۔

مسٹر پربھاکش جوشی نے کہا کہ مسلمان اب تک یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا ووٹ بیلنسنگ ہے۔ ہمارے ووٹ سے حکومت کا فیصلہ ہوگا۔ اب یہ دور ختم ہو چکا۔ اب اس ملک میں صرف ہندو ووٹ سے سرکار بنے گی۔ انھوں نے کہا کہ البتہ ہندوؤں میں دو گروپ بن جائیں گے۔ کٹر ہندو، اور اودار ہندو۔

مہا دیو ڈیسائی کے فرزند مسٹر نارائن ڈیسائی نے کہا کہ آجکل کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ پٹنہ کے ایک میدان میں جلسہ کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا "آپ لوگ ہزاروں کی سنکھیا میں آئیں"۔ دوسرے شخص نے مائک چھین لیا اور بلند آواز سے بولا: آپ لوگ کروروں کی سنکھیا میں آئیں۔ یہ سن کر ایک آدمی بولا کہ اس چھوٹے سے میدان میں کروروں آدمی سمائیں گے کہاں۔

سیوا گرام میں نارائن ڈیسائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہا دیو ڈیسائی کے لڑکے ہیں۔ مہا دیو ڈیسائی ایک اعلیٰ درجہ کے انگلش جرنلسٹ تھے۔ وہ غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ ۱۹۱۷ میں مہاتما گاندھی کے سکریٹری بنے۔ وہ اپنی موت ۱۹۴۲ تک اس عہدہ پر رہے۔ سیوا گرام میں ان کو ۷۵ روپیہ ماہوار ملتے تھے جس میں وہ اپنی پوری فیملی کا خرچ چلاتے تھے۔ مسٹر

بی آر نندا کے الفاظ میں انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ اپنی عمر کے آخری ۲۵ سال رضاکارانہ غربت (voluntary poverty) میں گزارے۔

سیواگرام میں وہ روزانہ اپنی ڈائری لکھا کرتے تھے جس میں مہاتما گاندھی کی باتیں اور ان کی روزانہ کی سرگرمیاں درج ہوتی تھیں۔ یہ ڈائری کئی جلدوں میں چھپی ہے جو مہاتما گاندھی کے حالات کو جاننے کے لئے نہایت اہم ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ اس ڈائری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک انگریز مسٹر ویریر ایلون (Varrier Elwin) نے کہا تھا کہ مہادیو ڈیسائی نے گاندھی کو عالمی شہرت کا آدمی بنادیا:

He made Gandhi the best known man in the world.

مہاتما گاندھی اور ان کے کانگرسی ساتھیوں نے کبھی مہادیو ڈیسائی کی وفاداری پر شک نہیں کیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے عجائب میں سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ اس ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے مہادیو ڈیسائی کو ایک برٹش انفارمر بتایا۔ اورخود مہاتما گاندھی کے بارہ میں انکشاف کیا کہ وہ ایک ففتھ کالمنسٹ (fifth columnist) تھے (سنڈے ہندستان ٹائمس ۲۳ مئی، ۱۹۹۳، صفحہ ۵)

ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں ادھک سے نہیں لوں گا۔ میں ٹیلی گرافک لینگوبج میں بولوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ہمیں ایک common concern تلاش کرنا ہوگا جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ہو۔ میرے نزدیک وہ یہ ہے کہ دیش ایک کیسے رہے۔ اس کی ترقی کیسے ہو۔

ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ آل انڈیا پیمانہ کا ایک سمیلن کیا جائے۔ اس کا موضوع یہ ہو کر غیر تشدد انہ طریق زندگی کی طرف:

Towards a non-violent way of life.

۱۷ مارچ کی آخری نشست عمل پروگرام طے کرنے کے بارہ میں تھی۔ لوگوں نے اپنی اپنی رائیں دیں۔ میں نے کہا کہ جب عمل پروگرام طے کرنا ہوتا ہے تو یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ اس کے لئے جو موافق مزاج درکار ہے وہ موجود ہے۔ مگر واقعہ میں چوں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر پروگرام عملاً فیل ہوجاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جن لیڈروں نے آزادی کا پروگرام قوم کے سامنے رکھا، انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ ہندستانیوں میں وہ مزاج موجود ہے جو آزاد ہندستان کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔ اسی طرح جن مسلم لیڈروں نے علیحدہ پاکستان بنانے کا نعرہ لگایا انھوں نے بھی یہ فرض کر لیا تھا کہ علیحدہ پاکستان بننے کے بعد اس کی تعمیر کے لئے جو مزاج مطلوب ہے وہ مسلمانوں کے اندر موجود ہے۔ مگر دونوں ہی مفروضے غلط تھے۔ چنانچہ نہ آزاد ہندستان میں مطلوبہ ہندستان بن سکا اور نہ آزاد پاکستان میں مطلوبہ پاکستان۔

دیش کی ترقی کے لئے بلاشبہ ایک پروگرام درکار ہے۔ مگر پروگرام سے پہلے وہ افراد درکار ہیں جو اس پروگرام کو دل کی آمادگی کے ساتھ اختیار کریں۔ میں نے کہا کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اختلافات ہر سماج میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود مل جل کر رہنا سیکھیں۔ ہمارے دیش کے مسئلہ کا حل وہی ہے جو کسی نے کہا کہ اختلافی باتوں کو پرامن طور پر طے کر لینا:

Peaceful resolution of conflicts.

اس مقصد کے لئے ہمیں intensive awareness programme جاری کرنا ہوگا۔

۱۷ مارچ کی شام کو مغرب کی نماز سیواگرام میں پڑھی۔ اس کے بعد یہاں سے ہم لوگ ناگپور کے لئے روانہ ہوئے۔ میرے ساتھ مسٹر پربھاکش جوشی اور مسٹر رام بہادر رائے تھے۔ ناگپور پہنچ کر ان دونوں صاحبان نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ میں جناب محمد حنیف صاحب کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ رات انھیں کے مکان پر گزاری۔ صبح کو انھوں نے سحری کے وقت جگایا۔ آج کے روزہ کی مختصر سحری میں نے انھیں کے گھر پر کھائی۔

۱۸ مارچ کو صبح ۱۰ بجے ناگپور کے پترکار بھون میں پریس کانفرنس کو خطاب کیا۔ اس کا عنوان تھا: Meet the Press

تقریباً تمام مقامی اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ سوالات کا موضوع زیادہ تر اجودھیا کا مسئلہ، تین نکاتی فارمولا، مسلمانوں کا موجودہ رخ، الرسالہ مشن، تھا۔ اگلے دن ناگپور کے اکثر ہندی، انگریزی اور اردو اخباروں میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی۔

مسٹر محمد سراج وہاب ایک انگلش جرنلسٹ ہیں۔ ان کے اندر تعمیری فکر ہے۔ ایرپورٹ تک ان کا ساتھ رہا۔ میں نے ان سے کہا کہ آج ضرورت ہے کہ باصلاحیت مسلم نوجوان بڑی تعداد میں انگریزی اور ہندی اور دوسری ملکی زبانوں میں اچھے جرنلسٹ بن کر داخل ہوجائیں۔

مسلمانوں کے نادان لیڈر فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے پولیس اور فوج میں مسلم نمائندگی بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس قسم کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے۔ زیادہ مفید بات یہ ہے کہ باصلاحیت نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ ملکی صحافت میں داخل کیا جائے۔ کیوں کہ یہی اخبارات ہیں جو فرقہ وارانہ آگ لگاتے ہیں، اور وہی اس آگ کو بجھا سکتے ہیں۔ صحافت کی اہمیت پر یہ شعر بہت بامعنی ہے:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار سنبھالو — گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

ناگپور میں آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ آر ایس ایس کی تنظیم ناگپور میں ۱۹۲۵ میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی ڈاکٹر ہیڈگوار ہیں۔ آر ایس ایس کے نظریات ہمیشہ سے نزاعی رہے ہیں۔ تاہم اس کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا اعتراف اس کے مخالفین بھی کرتے ہیں، اور وہ ڈسپلن ہے۔ آر ایس ایس اپنے آغاز سے لے کر اب تک اس میں ممتاز رہی ہے۔

فیلڈ مارشل کیری اپا (۱۹۹۳-۱۹۰۰) نے ایک بار وجے دسمی کے فنکشن میں اس تنظیم کے سیوم سیوکوں کو دیکھا۔ ان کے ڈسپلن سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وقت کی پابندی کے معاملہ میں اب تک فوج کی مثال دی جاتی رہی ہے، مگر اب تو اس کے لئے آر ایس ایس کی مثال دی جانی چاہئے:

> When it comes to punctuality in maintaining time-schedule the barometer is often referred to as 'Army precision', but now on it should be 'RSS precision'.

اکثر مسلم دانشور آر ایس ایس کی تحریک کو فاشزم کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح طور پر آر ایس ایس کا معاملہ جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون جیسی مسلم تحریکوں کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔

اس قسم کی کوئی تحریک ابتداءً اصولیت (fundamentalism) کی سطح پر اٹھتی ہے۔

اس کے بعد وہ تطرف (extremism) کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اور آخر کار وہ ارہاب (terrorism) کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی واضح مثال مصر، الجزائر اور کشمیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جو مسلم دانشور فلاح انسانیت کے نام پر آر ایس ایس کی مذمت کرتے ہیں، ان کو اسی طاقت کے ساتھ جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون جیسی مسلم تحریکوں کی بھی مذمت کرنا چاہئے۔ کیوں کہ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

سعودی عرب کی رابطۃ العالم الاسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے مصر کے دورہ کے درمیان پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس قسم کی انتہا پسند مسلم تحریکوں کے نقطۂ نظر کو منفی نقطۂ نظر (negative attitude) قرار دیا۔ اور اسلام کی تخویفی تعبیرات (frightening interpretation) کی مذمت کی جو مسلم جوانوں کو لڑائی جھگڑے کی سیاست کی طرف لے جاتی ہے (العالم الاسلامی، مکہ، ۲۶ اپریل۔ ۲ مئی ۱۹۹۳)

ڈاکٹر نصیف کا یہ بیان اخبار العالم الاسلامی کے انگریزی حصہ میں چھپا ہے اور مذکورہ نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے۔

۱۸ مارچ کی شام کو انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۸۷۴ کے ذریعہ ناگپور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ افطار کا وقت جہاز کے اندر ہوا۔ غالباً زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز یا کسی اور سواری کے اندر روزہ افطار کیا۔ اب تک کا میرا معمول تھا کہ میں روزہ میں سفر نہیں کرتا تھا۔ اس لئے سفر کے دوران سحری اور افطار کی نوبت بھی نہیں آتی تھی، جہاں تک یاد آتا ہے، یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں نے روزہ کے مہینہ میں سفر کیا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو دوسرے کروروں لوگوں کی طرح میرے لئے بھی یہ ایک ہلا دینے والا واقعہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ملک کے مختلف حصوں کا سفر کرکے سب سے پہلے حالات کو سمجھنا ہے۔ ایک طرف میں نے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت بڑھا دیا۔ دوسری طرف ہر موقع کو استعمال کرتے ہوئے بار بار سفر کئے۔ انھیں میں سے ایک سفر سیوا گرام کا تھا جو رمضان کے مہینہ میں پیش آیا۔ اس سفر سے میں نے جو باتیں جانیں ان میں سے کچھ کا مختصر ذکر اوپر آیا ہے۔

انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین (مارچ ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے ٹائٹل کی پشت پر ایک انٹرنیشنل ہوائی کمپنی کا اشتہار تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک اچھا تربیت یافتہ پائلٹ سب سے زیادہ اہم حفاظتی تدبیر ہے۔ چنانچہ ہماری کمپنی اس کا پورا اہتمام کرتی ہے۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ اعلیٰ تربیت یافتہ پائلٹ تیار کرنے کے لئے انھوں نے اپنے ملک کے دو شہروں میں دو بڑے بڑے اسکول قائم کئے ہیں۔ ان میں ہر سال چھ ہزار امیدوار لئے جاتے ہیں۔ ان کی نہایت سخت نفسیاتی اور ذہنی جانچ ہوتی ہے۔ اس جانچ میں بمشکل ۴۰۳ آدمی پاس ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی ان کو ۱۹ سال کا تجربہ کرایا جاتا ہے۔ تب وہ اس قابل بنتے ہیں کہ وہ بڑے جہاز بوئنگ ۷۴۷ کے کیپٹن بن سکیں۔

میں نے سوچا کہ ایک بوئنگ میں چند سو مسافر ہوتے ہیں اور اس کے قائد کے انتخاب میں لوگوں کو اتنی سخت تربیت کرائی جاتی ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ کروروں افراد پر مشتمل ایک قوم کا قائد بننے کے لئے کسی تربیت یا تیاری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ کوئی بھی شخص ایک روز اپنے گھر سے نکل کر سڑک پر آتا ہے اور پرجوش تقریر کرکے قوم کا قائد بن جاتا ہے۔

مارچ ۱۹۹۳ کی ۸ تاریخ تھی۔ پونے سات بجے شام کو جہاز دہلی کے ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ حسب معمول جہاز کے عملہ کی طرف سے اعلان شروع ہوا۔ اناؤنسر نے اعلانات کے دوران کہا: یاتریوں کو چوٹ سے بچانے کے لئے اوپر لگے لاکر نہ کھولیں۔

جہاز کے یاتری اس کو سن کر ہنس پڑے۔ کیوں کہ یہ چھوٹا جہاز تھا اور اس میں "اوپر لگا ہوا لاکر" تھا ہی نہیں۔ ایئر ہاسٹس رٹے ہوئے الفاظ بول رہی تھی۔ تاہم ہندی کے بعد جب اس نے انگریزی میں اعلان کیا تو اس میں اس غلطی کی تصحیح کر دی گئی تھی۔

بنگلور کا سفر

ہندستانی اندولن (بمبئی) کے چیرمین مسٹر مدھو مہتا کے بنائے ہوئے ایک پروگرام کے تحت مارچ ۱۹۹۳ کے آخری ہفتہ میں بنگلور کا سفر ہوا۔ بنگلور کے لئے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۵۰ میں ہوا تھا۔ اس کا مختصر تذکرہ الرسالہ جنوری ۱۹۸۷ میں دیکھا جا سکتا ہے (صفحہ ۲۶ - ۲۷) یہ سفر خاص طور پر بنگلور کے لئے نہیں تھا۔ مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے میں بنگلور پہنچا تھا۔

فروری ۱۹۷۰ میں دوسری بار میں نے بنگلور کا سفر کیا۔ اس کی روداد الجمعیۃ ویکلی ۶ - ۲۰ - ۲۷ مارچ ۱۹۷۰) میں تین قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت بنگلور کی ایک مسجد کو دیکھ کر میں نے اس کے امام سے کہا تھا کہ مسجدوں کو ہم نے صرف عبادت خانہ کی حیثیت سے باقی رکھا ہے۔ حالانکہ ہر مسجد کو ایک اسلامی مرکز ہونا چاہئے۔ بلاشبہ مسجد کا پہلا مصرف اقامت صلاۃ ہے لیکن اس کے ساتھ اگر مسجد کے اندر دار المطالعہ، لکچر ہال، ریسرچ اکیڈمی، تبلیغ و اشاعت اسلامی کے ضروری شعبے ہوں تو مسجد ایک مکمل تحریک کی حیثیت حاصل کر لے۔

۱۹۷۰ میں شاید اس طرح کی مسجد کہیں موجود نہیں تھی۔ مگر آج ساری دنیا میں اس طرح کی کثیر مسجدیں بن چکی ہیں جہاں اس قسم کے تمام شعبے نہایت شاندار عمارتوں میں قائم ہیں۔ صرف امریکہ میں ایک ہزار ایسے اسلامک سنٹر ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی تاریخ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ برعکس طور پر مسلمانوں کو یہ خبر دے رہا ہے کہ دشمنان اسلام نے اسلام اور مسلمانوں کو ہر طرف تباہ کر رکھا ہے۔

بنگلور کے لئے میرا تیسرا سفر ستمبر ۱۹۸۳ میں ہوا۔ اس کی روداد الرسالہ مارچ ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس وقت میں نے بنگلور کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں قابل ترجیح بنانے کے لئے کچھ لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام افضل مذہب ہے۔ مگر یہ عصری زبان نہیں۔ کیوں کہ "افضلیت" عقیدہ کی چیز ہے نہ کہ تبلیغ کی چیز۔ اگر آپ افضلیت کی زبان میں کلام کریں تو جدید ذہن کو وہ ایک پر اسرار مسئلہ دکھائی دے گا۔

کیوں کہ جدید ذہن معلوم حقیقیوں کو مانتا ہے ذکر پراسرار تصورات کو۔ اس کے بجائے اسلام کی ترجیحی صفت بتانے کے لئے ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ اسلام واحد تاریخی مذہب ہے۔ یہ زبان آج کا انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ کیوں کہ تاریخ اس کے نزدیک ایک معلوم معیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی ہر چیز تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے۔ دوسرا کوئی مذہب تاریخ کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

بنگلور کے لئے میرا چوتھا سفر جون ۱۹۸۶ میں ہوا۔ اس کی روداد الرسالہ جنوری ۱۹۸۷ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر میں ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا تھا جو مجھ کو صریح طور پر خدا کی نصرت معلوم ہوتا ہے۔

یہ سفر مذاہب کی عالمی کونسل (Council for the World Religions) کی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہوا تھا۔ اس کا اہتمام ایک امریکی ادارہ نے کیا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شخص سے اس کا مقالہ پیشگی طور پر منگوالیا گیا تھا۔ کارروائی کی صورت یہ تھی کہ ہر مقالہ کی فوٹو کاپی کانفرنس سے پہلے تمام شرکار کو فراہم کر دی گئی تھی۔ ہر ایک کے لئے ایک رسپانڈنٹ مقرر تھا۔ کسی مقالہ کے بارہ سب سے پہلے اسی رسپانڈنٹ کو اپنا تبصرہ پیش کرنا تھا۔ اس کے بعد صاحب مقالہ کو اس کا جواب دینا تھا۔

مجھ کو ڈاکٹر راجندر رما کا رسپانڈنٹ بنایا گیا تھا۔ اور میرے رسپانڈنٹ ڈاکٹر آنند اسپنسر تھے۔ یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ مجھے فکر تھی کہ ڈاکٹر آنند اسپنسر میرے مقالہ کے بارہ میں معلوم نہیں کیا تبصرہ کریں گے اور مجھ کو فوری طور پر اس کا کیا جواب دینا ہوگا۔

دہلی سے میری روانگی جس جہاز سے ہوئی اس میں کئی شرکار کے ساتھ ڈاکٹر اسپنسر بھی موجود تھے۔ دوران پرواز وہ از خود میرے پاس آئے اور میرے مقالہ پر انھوں نے جو تنقیدی تبصرہ لکھا تھا اس کی ایک فوٹو کاپی انھوں نے پیشگی طور پر مجھے دی۔ یہ ایک غیر متوقع بات تھی۔ کیوں کہ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی اور نہ اس کے دو درجن شرکار میں سے کسی اور نے اپنا تبصرہ اس طرح پیشگی طور پر فراہم کیا تھا۔ ڈاکٹر اسپنسر نے استثنائی طور پر ایسا کیا۔

اس طرح مجھے پیشگی طور پر اپنے مقالہ کے بارہ میں اپنے رسپانڈنٹ کا تبصرہ معلوم ہو گیا۔ مجھے کافی

موقع مل گیا کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اجلاس سے پہلے اس کا جواب انگریزی میں تیار کرسکوں۔

بنگلور کے لئے میرا پانچواں سفر موجودہ سفر ہے جو مارچ ۱۹۹۳ میں پیش آیا۔ بمبئی کے مسٹر مدھو مہتا (چیرمین ہندستانی اندولن ،تین نکاتی فارمولا" کے سلسلہ میں غیر معمولی تعاون دے رہے ہیں۔ انھوں نے بنگلور میں کچھ ممتاز افراد سے میری ملاقات کے لئے ایک خصوصی پروگرام بنایا۔

۲۶ مارچ ۱۹۹۳ کی صبح کو فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہوا۔ فجر کی نماز دہلی ایئرپورٹ پر پانچ بجے پڑھی۔ ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک روشن اشتہار پر نظر پڑی۔ یہ گاڑی کے ٹائر کا اشتہار تھا۔ ٹائر کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The tyre that never tires.

اس جملہ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ وہ ٹائر جو کبھی تھکتا نہیں۔ مگر اس ترجمہ میں وہ ادبی چاشنی منتقل نہیں ہوتی جو اصل انگریزی الفاظ میں ہے۔

تاہم یہ کوئی انگریزی زبان کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ یہ ہر زبان کی بات ہے۔ ہر زبان کے الفاظ یا اسلوب میں بعض ایسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو صرف اسی زبان کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس کو ترجمہ میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

دہلی سے بنگلور کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۰۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں نیشنل ہیرالڈ (۲۶ مارچ) پڑھا۔ یہ اخبار ۵۲ سال پہلے جواہر لال نہرو نے جاری کیا تھا۔ جواہر لال نہرو انڈیا کے اول درجہ کے لیڈر تھے۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد سے اپنی آخر عمر (۱۹۶۴) تک وہ ملک کے وزیر اعظم رہے۔ مگر ان کے مکمل سپورٹ کے باوجود نیشنل ہیرالڈ کبھی اول درجہ کا اخبار نہ بن سکا۔ دوسری طرف اس کے اردو اڈیشن قومی آواز نے اردو صحافت میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ قومی آواز اردو میں تھا اور اردو زبان میں اسے کوئی مقابلہ پیش نہیں آیا۔ قومی آواز کا صحافتی معیار بذات خود معمولی ہے۔ مگر اردو میں اعلیٰ معیار کی صحافت موجود ہی نہیں۔ اس لئے اردو میں قومی آواز کو اپنی جگہ بنانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس کے برعکس نیشنل ہیرالڈ انگریزی میں تھا۔ اور انگریزی میں کئی اعلیٰ معیار کے اخبار موجود تھے۔ ان کے مقابلہ

میں نیشنل ہیرالڈ اپنے معمولی معیار کی بنا پر کوئی قابل ذکر جگہ حاصل نہ کرسکا۔

نیشنل ہیرالڈ جاری کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے اس کو ایک پیغام دیا تھا۔ وہ پیغام یہ تھا کہ آزادی مصیبت میں ہے، اس کو اپنی پوری طاقت سے بچاؤ:

Freedom is in peril. Defend it with all your might.

آزادی حاصل کئے ہوئے اب تقریباً آدھی صدی بیت گئی ہے۔ مگر آج بھی نیشنل ہیرالڈ کے صفحہ پر یہ الفاظ چھپے ہوئے ہیں۔ گویا کہ آج بھی آزادی مصیبتوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ تحریک آزادی کے لیڈروں کو تو بڑائی مل گئی۔ مگر خود آزادی کو وہ بڑائی نہ مل سکی جس کے نام پر غیر معمولی قربانیاں دی گئی تھیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ) میں مسٹر مکندن (Mr. Mukundan) کا انٹرویو تھا۔ وہ ملیالم کے ادیب اور ناول نگار ہیں۔ ان کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا ہے۔ انھوں نے تخلیقیت (creativity) کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کا تمام اعلیٰ ادب ان افراد نے پیدا کیا ہے جو مصیبتوں کا شکار تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسرور آدمی کبھی کوئی اچھی کتاب لکھ سکتا ہے۔ دکھ اور مصیبت کا تجربہ ہی تخلیقی فکر پیدا کرتا ہے:

The experience of pain and agony is the inspiration for creativity. All creative artists experience this. (p. 4)

دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز نیچے آیا۔ ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا کہ اب سے کچھ منٹ بعد ہمارا جہاز بنگلور ایئرپورٹ پر اترے گا۔ براہ کرم اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں:

In a few minutes from now, we shall be landing at Bangalore airport. Please fasten your seat belt.

جہاز کے پبلک ایڈرس سسٹم پر یہ الفاظ سن کر ایسا لگا جیسے کوئی پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اے لوگو، خدا کے سامنے تمہاری حاضری کا وقت قریب آگیا۔ اٹھو اور فوراً اس کی تیاری میں لگ جاؤ۔

مسٹر مدھو مہتا پہلے ہی بمبئی سے بنگلور آگئے تھے۔ وہ اور ڈاکٹر احمد سلطان وغیرہ ایئرپورٹ پر

موجود تھے۔ مسٹر مدھو مہتہ نے بتایا کہ میں ڈاکٹر احمد سلطان سے بالکل واقف نہ تھا۔ ایئر پورٹ پر پہلی بار انھیں دیکھا۔ ان کا سنجیدہ حلیہ دیکھ کر میں ان کی طرف بڑھا۔ میری زبان سے نکلا: "کیا آپ مولانا صاحب کو ریسیو کرنے کے لئے آئے ہیں"۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اس طرح ہم دونوں ملے۔ ملنے کے بعد ایسا محسوس ہوا گویا کہ ہم دیکھے بغیر ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔

ایر پورٹ سے روانہ ہوئے تو گاڑی ڈاکٹر سہیل صاحب چلا رہے تھے۔ وہ نہایت سنجیدہ نوجوان ہیں۔ ان کے والد ڈاکٹر احمد سلطان نے بتایا کہ کل صبح کے وقت وہ مکان میں اوپر کی منزل سے نیچے اتر رہے تھے۔ اور حالت یہ تھی کہ جوتا اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں۔ ڈاکٹر سہیل نے کہا کہ ہمارا ڈرائیور نیچے سو رہا ہے۔ رات کو وہ دیر سے سویا تھا میں نے جوتے اس لئے ہاتھ میں لے لئے کہ کہیں جوتے کی آواز سے اس کی نیند خراب ہوجائے۔

ایر پورٹ سے ہم لوگ سنچری کلب پہنچے۔ پہلے دن میرا قیام یہیں کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ اس کلب کو وسویسواریا (Sir M. Visvesvaraya) نے قائم کیا تھا۔ وہ ۱۸۶۱ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۲ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ کلب ایک پرفضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں ایک بڑی لائبریری بھی ہے۔ اس کے تحت تعلیم وترقی کی مختلف سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔ بنگلور پہنچنے کے بعد ۲۶ مارچ کو میرے ساتھی مجھے اسی کلب میں لے گئے۔ ۲۷ مارچ کی صبح کو ڈاکٹر احمد سلطان صاحب دوبارہ یہاں آئے۔ ان کے ساتھ میں ان کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔

بنگلور کے سنچری کلب میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک پروفیسر ٹی رامیسن (فون نمبر 576595) تھے:

Prof. T. Ramesan
10, John Armstrong Road
Richards Town, Bangalore-560005

انھوں نے بتایا کہ مسٹر کمارا پا گاندھیائی فلسفہ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ میں نے ان کے کئی لکچر سنے ہیں۔ ایک لکچر میں انھوں نے مہاتما گاندھی کا نظریہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ انڈیا کو ایک بڑا ملک نہیں بننا ہے بلکہ اس کو ایک اچھا ملک بننا ہے:

India should not be a great country, but it must be a good country.

پروفیسر آرنلڈ (Prof. T.W. Arnold) نے اپنی مشہور و معروف کتاب دعوت اسلام (The Preaching of Islam) ۱۸۹۶ میں مکمل کی جب کہ وہ علی گڑھ میں تھے۔ اس کتاب کا ایک باب انڈیا میں اسلام کی اشاعت پر ہے۔ اس میں وہ انیسویں صدی کے آخر کے حالات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں انڈیا کے اکثر شہروں میں تبلیغ اسلام کی سرگرمیاں زور و شور کے ساتھ جاری تھیں۔

بنگلور کے بارہ میں انھوں نے بتایا تھا کہ یہاں تبلیغی سرگرمیاں بہت زیادہ عام تھیں ایک مسلمان جو ۱۸۹۰ میں یہاں کی ایک مسجد کا امام تھا، اس کی تنہا کوششوں سے بنگلور کے ۲۴ لوگ اسلام میں داخل ہوگئے۔ پروفیسر آرنلڈ نے بتایا کہ اس کا وعظ اتنا مقبول تھا کہ بعض اوقات خود ہندو اس امام کو بلاتے تھے تاکہ وہ ان کو اسلامی وعظ سنائے:

In Bangalore this practice is very general, and one of these preachers, who was the imam of the mosque about the year 1890, was so popular that he was even sometimes invited to preach by Hindus. (p. 285)

ان وعظوں سے بعض اوقات یورپی افراد بھی اسلام قبول کر لیتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی طرف سے سارے ملک میں تبلیغی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مگر وہ بہت زیادہ مفید نہ تھیں۔ کیوں کہ ان مسلمانوں کا تبلیغی جوش زیادہ تر آریہ سماج یا مسیحی مشنریوں کی تردید میں صرف ہوتا تھا۔ اس طرح ان کی سرگرمیاں خالص تبلیغی نہ ہو کر دفاعی بن گئیں (صفحہ ۲۸۶)

بنگلور میں سب سے پہلے الرسالہ کے ایک مخالف نے الرسالہ کا آغاز کیا۔ ایک صاحب رمضان کے زمانہ میں اپنے مدرسہ کے سفیر کی حیثیت سے بنگلور آئے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں الرسالہ کی شدید مخالفت کی۔ ایک صاحب، جو اس وقت سعودی عرب میں ہیں، انھوں نے سفیر صاحب کی زبان سے سب سے پہلے الرسالہ کا نام سنا۔ اس کے بعد انھوں نے کہیں سے الرسالہ کا ایک شمارہ حاصل کرکے پڑھا۔ ذاتی مطالعہ کے بعد الرسالہ انھیں اتنا پسند آگیا کہ انھوں نے الرسالہ کی ایجنسی حاصل کرکے اس کو بنگلور میں پھیلانا شروع کر دیا۔

عبد اللہ بری صاحب ایک مخلص اور نہایت مستعد نوجوان ہیں۔ وہ بڑے پیمانہ پر الرسالہ کی ایجنسی چلا رہے ہیں۔ ان کی مسلسل کوشش سے الرسالہ اس وقت بنگلور کے تعلیم یافتہ طبقہ میں

کافی پھیل گیا ہے۔ انھوں نے ایک تعلیم یافتہ ہندو کے بارہ میں بتایا کہ انھوں نے الرسالہ انگریزی پڑھ کر کہا: مسلمانوں کے جتنے بھی انگریزی اخبار یا میگزین ہیں۔ ان کو میں نے پڑھا ہے۔ ان سب میں زیادہ تر شکایت والی باتیں ہوتی ہیں۔ انگریزی الرسالہ واحد رسالہ ہے جس میں شکایتی بات نہیں ہوتی، بلکہ صرف اسلام کی بات ہوتی ہے۔ یہ رسالہ فطرت کا ترجمان ہے۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے نہیں لکھا ہے بلکہ یہ فطرت ہے جو ہم کو آواز دے رہی ہے۔

۲۶ مارچ کی شام کو انڈین اکسپرس کے ریزیڈنٹ اڈیٹر بالارام (H.S. Balaram) اپنے اسٹینوگرافر کے ساتھ سنچری کلب میں آئے۔ انھوں نے اجودھیا کے مسائل اور میرے تین نکاتی فارمولا پر تفصیلی انٹرویو لیا۔

اگلے دن اخبار پاسبان کے نمائندہ مسٹر عبدالخالق تشریف لائے اور انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ہندو اخبار نویس اور مسلمان اخبار نویس کے سوالات میں اکثر میں نے ایک فرق پایا ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اخبار نویس کے سوالات زیادہ تر مسلم فرقہ کی شکایتوں کے گرد گھومتے ہیں اور ہندو اخبار نویس کے سوالات دیش کے قومی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں مسلم اخبار نویس کو اپنا ذہن بدلنا چاہئے اور وسیع تر قومی حالات کی روشنی میں اپنی صحافت کو فروغ دینا چاہئے۔

۲۶ مارچ کی شام کو ۳ بجے اُڈپی کے شری وشویش سوامی جی سے ان کے آشرم پر ملاقات ہوئی۔ اس سفر کا خاص مقصد ان سے ملنا تھا۔ بنگلور میں ہمارا قافلہ ان کے مقامی آشرم میں پہنچا۔ ہم لوگ ایک خاص کمرہ میں لے جائے گئے۔ یہاں لکڑی کی بنی ہوئی ایک سادہ قسم کی مسہری تھی، اس کے اوپر ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کھال کے اوپر سوامی جی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے لئے سادہ قسم کی کرسیاں بچھائی گئیں۔ کچھ ہندو چمڑے کی چپل بھی نہیں پہنتے، اور کچھ ہندو چمڑے کے اوپر بیٹھتے ہیں۔

اُڈپی کے سوامی جی ایک دبلے پتلے آدمی ہیں۔ لباس اور انداز میں انتہائی سادہ اور متواضع ہیں۔ بولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ریا و نمائش کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ ملکی حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ حتی کہ مسلم قائدین کی کمزوریوں کا بھی انھیں بخوبی پتہ تھا۔ انھوں نے میرے

تین نکاتی فارمولا پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور اس سے پورا اتفاق کیا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ کے بعد میں اپنے ملکی اسفار میں ہندوؤں کے بہت سے دھرم گروؤں سے ملا ہوں۔ ایک نئی بات مجھے یہ معلوم ہوئی کہ ان کے یہاں بہت بڑی بڑی مذہبی گدیاں ہیں۔ مگر ان کے یہاں "صاحبزادگی" کا جھگڑا نہیں۔ ان کے دھرم گرو اپنی روایات کے مطابق، برہمچریہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں بیٹا نہیں ہوتا، اور جب بیٹا نہیں ہوتا تو صاحبزادہ کی گدی نشینی کا جھگڑا بھی ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتا۔

۲۶ مارچ کی دوپہر کو جناب عزیز سیٹھ صاحب کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۸۶ سے الرسالہ پڑھتے رہے ہیں اور اس کے نقطہ نظر سے اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ کرناٹک منسٹری میں تھے۔ حال ہی میں انھوں نے استعفا دے دیا ہے۔ ابھی وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ہی مقیم ہیں، جلد ہی وہ اپنے وطن میسور چلے جائیں گے۔

یہ رہائش گاہ ایک بہت بڑے کمپاؤنڈ کے اندر تھی جس میں بہت سے وزیروں کی رہائش گاہیں واقع تھیں۔ اس کمپاؤنڈ کے چاروں طرف اونچی دیوار بنی ہوئی تھیں۔ منسٹروں کے مکانات کے لئے یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ دہلی میں ہر منسٹر کے مکان پر بہت سے اسلحہ بردار سپاہی کھڑے رہتے ہیں۔ اگر سب کے مکانات ایک ہی کمپاؤنڈ میں ہوں تو سکوریٹی کا خرچ بہت گھٹ جائے گا، کیوں کہ اس کے بعد کمپاؤنڈ کی حفاظت کی جائے گی نہ کہ ہر ہر مکان کی۔

عزیز سیٹھ صاحب کے ملاقات کے کمرہ میں ایک شیر (ٹائگر) اسٹف کیا ہوا رکھا تھا۔ مجھے بھی شیر سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ شیر کی تصویر کو اکثر میں دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ شیر کو دیکھ کر میری زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں: شیر کو خدا نے اس کے آخری ماڈل پر بنایا ہے۔ کوئی آرٹسٹ اس پر قادر نہیں کہ وہ شیر جیسے جانور کے لئے کوئی دوسرا ماڈل تیار کر سکے۔

تاہم مسلم دانشوروں نے شیر کی بابت جو تصور قائم کیا ہے وہ سراسر خلاف واقعہ ہے۔ یہ لوگ شیر کو طاقت اور ٹکراؤ کی علامت سمجھتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ شیر انتہائی طاقتور ہونے کے باوجود ٹکراؤ سے آخری حد تک اعراض کرتا ہے۔ شیر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ —— طاقت ور ہو تب بھی کسی سے نہ ٹکراؤ۔

۲۷ مارچ کی صبح کو سیچری کلب چھوڑ دیا اور ڈاکٹر احمد سلطان صاحب کی رہائش گاہ پر چلا آیا۔ ملاقات سے پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ وہ کلنک کرتے ہوں گے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ تاریخی اشیاء کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کا وسیع مکان حیرتناک قسم کی تاریخی اشیاء سے بھرا ہوا ہے۔ اس موضوع پر ان کی معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو تاریخی نوادر کی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے، اور ان کے مکان کو تاریخی اشیاء کا میوزیم۔

ڈاکٹر احمد سلطان صاحب الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اس کے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے کسی نے الرسالہ کی صبر کی پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ صبر کب تک۔ انھوں نے جواب دیا کہ موت تک:

Until to the death.

میں نے کہا کہ صبر تو ایک عبادت ہے۔ مومن جب صبر کرتا ہے تو وہ اپنے رب کے لئے صبر کرتا ہے (وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ) جس طرح نماز کی عبادت آخر عمر تک کرنا ہے اس طرح صبر کی عبادت بھی آخر عمر تک کرنا ہے۔

ڈاکٹر احمد سلطان کا تعلق سلطان ٹیپو کے خاندان سے ہے۔ انھوں نے سلطان کا یہ شعر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سنایا:

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے   بہ پیش ہمت ما ہر کہ آمد بود دہمانے

دو تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو لبرل بتایا۔ لیکن گفتگو کے دوران وہ ثابت کرنے لگے کہ ملک کا بٹوارہ مسلمانوں نے نہیں کرایا بلکہ ہندوؤں نے کرایا۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے آپ کو لبرل بتاتے ہیں، حالاں کہ آپ مسلمانوں کی وکالت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ بٹوارہ کے ذمہ دار ہندو ہیں میں نے کہا کہ کسی تاریخی معاملہ میں اس طرح رائے قائم نہیں کی جاتی۔ تاریخ کا کوئی بھی واقعہ ہو، خواہ وہ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر سے متعلق کیوں نہ ہو، اس میں ہمیشہ اور ہر حال میں کچھ ضمنی عوامل (subsidiary factors) ہوں گے اور ایک بنیادی عامل (basic factor) مبصر کو یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ضمنی عوامل کو نظر انداز کرے اور بنیادی عامل کو لے لے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو

آپ تاریخ کے کسی واقعہ کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتے۔ حتی کہ تاریخ کے بارہ میں کوئی واضح بیان دینا بھی آپ کے لئے ممکن نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی مانگ پر ملک کا بٹوارہ ہوا۔ اس لئے انصاف کی بات یہی ہے کہ مسلمان بٹوارہ کی ذمہ داری کو قبول کریں۔ ایسے معاملہ میں مانگ کرنے والا ذمہ دار ہے نہ کہ مانگ پر راضی ہونے والا۔

میرا تجربہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو زبان سے اپنے آپ کو لبرل کہتا ہے۔ مگر اندر سے وہ کیمونل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نہ دیش کے کسی کام کے ہیں اور نہ مسلمانوں کے کسی کام کے۔

ڈاکٹر احمد سلطان ۸ جنوری ۱۹۹۳ کو بنگلور کی ایک سڑک پر چل رہے تھے۔ اس وقت وہ موٹر سائیکل پر تھے اور ان کے صاحبزادے اس کو چلا رہے تھے۔ سامنے سے ایک ہندو اپنی کار میں آرہے تھے۔ اتفاق سے ان کی کار موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی۔ ڈاکٹر احمد سلطان سڑک پر گر گئے۔ ان کے پاؤں میں سخت چوٹ آئی۔ کار والے ہندو نے چاہا کہ وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب کو اسپتال لے جائے۔

مگر ڈاکٹر احمد سلطان نے نہ صرف یہ کہ مذکورہ ہندو کو برا نہیں کہا۔ بلکہ اس سے کہا کہ تم اپنی کار میں بیٹھ کر یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ کیوں کہ یہاں میرے جاننے والے بہت ہیں۔ وہ لوگ جمع ہورہے ہیں اور وہ تم کو ضرور مار پیٹ کریں گے۔ وہ تم کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے تم فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس طرح اصرار کرکے انھوں نے کار والے کو وہاں سے رخصت کردیا۔ اس کے بعد اپنے لڑکے کے ساتھ اسپتال جاکر اپنی مرہم پٹی کرائی۔

اگلے دن وہ کار والا ہندو ڈاکٹر احمد سلطان کے مکان پر آیا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے کہا کہ آپ نے میرے ساتھ بہت بڑی مہربانی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ تمہاری گاڑی میرے اسکوٹر سے ٹکرا گئی۔ اس میں تمہاری نیت شامل نہیں تھی۔

لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو کئی مسلمانوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یہ شخص تو مسلم دشمن ہے۔ یہ تو وہ شخص تھا جو ایک بار بنگلور میں ہندو مسلم فساد کرواچکا ہے۔ اس سے انتقام لینا ضروری تھا۔ اس

نے جان بوجھ کر اپنی گاڑی آپ کے اسکوٹر سے ٹکرادی۔ اس کے بعد اس کو پکڑ وانے کے لئے آپ کو ایک گولڈن چانس ملا ہے۔ آپ اس کو ہرگز نہ کھوئیں۔ فوراً پولیس میں رپورٹ کریں۔ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان مسلمانوں کو جواب دیا: جاؤ، اب پھر کبھی وہ فساد نہیں کرائے گا۔ اس کا پہلا اثر یہ دیکھو کہ جو شخص پہلے نستے کہنے کے لئے تیار نہیں تھا، وہ آج یہاں پاؤں چھو کر گیا ہے — یہ ہے اخلاق کا کرشمہ۔ لوگ جوابی کارروائی کو دفاع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جوابی کارروائی نہ کرنا اس سے زیادہ بڑا دفاع ہے۔

بنگلور میں الرسالہ کے پڑھنے والے بہت ہیں۔ مگر موجودہ سفر بلا اعلان ہوا۔ مقامی لوگوں کو میری آمد کی خبر نہ ہو سکی۔ چنانچہ بہت کم افراد سے ملاقات ہو سکی۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی ازسرنو تعبیر (reinterpretation) کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے ایک صحیح کام کے لئے غلط لفظ استعمال کیا، یہ صحیح ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور نئے حالات سامنے آگئے ہیں۔ مگر آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ نئے انطباق (reapplication) کی ہے نہ کہ نئی تعبیر کی۔

ڈاکٹر احمد سلطان کی رہائش گاہ پر جناب مقصود علی صاحب (پیدائش ۱۹۲۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بنگلور کے مشہور اردو اخبار سالار (جاری شدہ ۱۹۶۴) کے مالک اور چیف اڈیٹر ہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اس کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتے ہیں۔ مقصود علی صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ان سے میں اتنا متاثر ہوا کہ رخصت کے وقت میں نے کہا کہ آپ میری ڈسکوری (دریافت) ہیں۔

آج (۲۷ اپریل) کا سالار دیکھا۔ اس کے صفحہ ۴ پر میرا ایک لمبا مضمون "اجودھیا کا مسئلہ" شائع کیا گیا تھا۔ اسی طرح سالار میں اکثر الرسالہ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۲۷ مارچ کو بنگلور کے غفار ہال میں ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں زیادہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم صاحبان شریک ہوئے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر مجھے قرآن سے موجودہ مسلمانوں کے

مسائل کا حل بتانا ہو تو میں یہ آیت پیش کروں گا ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (الطلاق ۳) اس سے معلوم ہوتا ہے توکل ہمارے تمام مشکل معاملات کا یقینی حل ہے۔ اگر ہم قرآن کو مانتے ہیں تو ہمیں یقین کے ساتھ اس کو مان لینا چاہئے۔

پھر میں نے کہا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال کر گھر کے اندر بیٹھ رہو۔ یہ ایک طریق عمل کو چھوڑ کر دوسرا طریق عمل اختیار کرنے کا حکم ہے نہ کہ خود عمل کو چھوڑنے کا حکم۔ یہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر بھروسہ کرنا ہے، اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ میں کامیابی کا یقین کرنا ہے۔

مثلاً قرآن میں ہے کہ اگر تم اپنے مخالفین کے مقابلہ میں صبر و تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان مخالفین کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) اسی طرح فرمایا کہ تمہارا مخالف گروہ اگر صلح پر آمادہ ہو تو تم اس سے صلح کر لو اور اللہ پر توکل کرو۔ اگر ان کی طرف سے دھوکہ کا اندیشہ ہو تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے (الانفال ۶۲-۶۱) اب توکل علی اللہ یہ ہے کہ سازشوں کے مقابلہ میں بھی صبر کی تدبیر پر یقین کیا جائے۔ مخالفین کی طرف سے دھوکا کے اندیشہ کے باوجود صلح کے طریقہ کو درست طریقہ سمجھا جائے۔

پروفیسر بشیر حسین (Tel: 608963) اور ان کے ساتھیوں کی خواہش تھی کہ میں بنگلور میں مزید ایک دن ٹھہروں اور اتوار کو ۱۱ بجے ان کی میٹنگ میں خطاب کروں۔ مگر مزید ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لئے میں ان کی دعوت کو قبول نہ کر سکا۔

۲۸ مارچ کی صبح کو بنگلور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ رہائش گاہ سے ایئرپورٹ تک ڈاکٹر احمد سلطان صاحب اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے رہے۔ وہ نہایت فہیم اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۹۱ میں شموگا گئے۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہاں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا ہے۔ وہ لوگ اپنا جلوس مسجد کے راستہ سے لائیں گے۔ اشتعال انگیزی کریں گے۔ اور پھر خونیں فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کو روکنے کی تدبیر بتائیے۔ وہ لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔ اپنے ذہن کے تحت انھیں روک ٹوک کے سوا کوئی اور بات معلوم نہ تھی۔ مگر سابقہ تجربہ کے تحت وہ یہ بھی جانتے تھے کہ روک ٹوک کا نتیجہ تباہی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ لوگ جلوس روکنے کو تدبیر سمجھتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جلوس کو

نہ روکنا اس سے بھی زیادہ بڑی تدبیر ہے۔ آپ اس کا تجربہ تو کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ فی الحال آپ لوگ بالکل خاموش رہیں۔ کوئی جوابی کارروائی نہ کریں۔ جب وہ تاریخ آجائے جس روز جلوس نکلنے والا ہے تو آپ لوگ یہ کریں کہ بازار سے ۲۰۔ ۲۵ کی تعداد میں پھولوں کا ہار خرید لائیں۔ اس کو ایک ٹرے میں رکھ لیں۔ ہندوؤں کا جلوس جب چلتا ہوا مسجد کے سامنے پہنچے تو آپ اطمینان کے ساتھ اس ٹرے کو لے کر سڑک پر آجائیں۔ اور جو ہندو لیڈر جلوس کے آگے چل رہے ہیں ان سب کا سواگت کرتے ہوئے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیں۔

شموگا کے مسلمانوں نے کہا کہ یہ تو آپ الٹی تدبیر بتا رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ اور زیادہ دلیر ہوجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ اپنی تدبیر کا تجربہ کرکے اس کی برائی کا انجام دیکھ چکے ہیں۔ اب آپ میرے کہنے سے اس دوسری تدبیر کا تجربہ بھی کرلیں۔ شموگا کے مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ وہ لوگ جب پھولوں کا ہار لے کر باہر آئے اور ہندو لیڈروں کو ہار پہنانا شروع کیا تو اچانک ان کا سارا جوش ختم ہوگیا۔ نعرہ اور باجے کی جگہ لوگ خوش ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ مزید یہ کہ اگلے سال جب جلوس کی تاریخ آئی تو ان لوگوں نے خود ہی اپنے جلوس کی روٹ بدل دی۔

۲۸ مارچ کو انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۰۸ کے ذریعہ بنگلور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں کچھ اخبارات کا مطالعہ کیا۔

انگریزی اخبار ہندو (۲۸ مارچ) میں ایک مضمون آواز سے تیز رفتار جہاز (Supersonic Concorde) کے بارہ میں تھا۔ اس قسم کا جہاز پہلی بار ۱۹۷۶ میں اڑایا گیا تھا۔ اب اس میں کافی ترقی ہوچکی ہے اور مستقبل قریب میں مزید ترقی ہوگی۔ موجودہ جہاز میں ایک سو آدمی بیٹھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے خاتمہ پر، جب کہ ایک جہاز میں تین سو آدمی بیٹھ سکیں گے، اس کی قیمت دس بلین پونڈ ہوجائے گی۔

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ آدمی آج اپنا سفر شروع کرے اور وہ گزشتہ کل کے دن اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ مگر آواز سے تیز رفتار جہاز نے اس کو ممکن بنا دیا ہے۔

آپ لندن سے صبح ساڑھے دس بجے واشنگٹن کے لئے روانہ ہوں تو جب آپ لندن پہنچیں گے اس وقت ابھی آپ کی گھڑی ساڑھے نو بجے کا وقت بتا رہی ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عام جہاز لندن سے واشنگٹن سات گھنٹہ میں پہنچاتا ہے، جب کہ آواز سے تیز رفتار جہاز ساڑھے تین گھنٹہ میں آپ کو لندن سے واشنگٹن پہنچا دیتا ہے۔ یہ جہاز ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا اپنی منزل کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس طرح کی مختلف حیرت انگیز معلومات مضامین میں درج تھیں۔ یہ جہاز انگلینڈ کے کارخانہ میں بنایا گیا ہے۔

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھے ایک سوال کا جواب معلوم ہوگیا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے پولیٹیکل ایمپائر کو کھو دیا۔ اس کے بعد وہ ساری دنیا میں حقیر ہو کر رہ گئے۔ دوسری طرف اسی دور میں انگریزوں نے بھی اپنے پولیٹیکل ایمپائر کو کھویا ہے۔ مگر ان کی عزت بدستور باقی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز کو پولیٹیکل ایمپائر کھونے کے بعد انڈسٹریل ایمپائر مل گیا جس پر وہ کھڑا ہو سکے۔ مگر مسلمانوں کے پاس صرف پولیٹیکل ایمپائر تھا اس سے محروم ہوتے ہی وہ گر کر زمین کی سطح پر آگئے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے اپنا انڈسٹریل ایمپائر بنانا ممکن نہیں۔ البتہ ایک اور چیز ممکن ہے۔ وہ آئیڈیولاجیکل ایمپائر ہے۔ مسلمان اپنا ایک طاقت ور آئیڈیولاجیکل ایمپائر بنا سکتے ہیں مگر اس کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے موجودہ مسلمان آخری حد تک خالی ہو چکے ہیں۔

سفر کے دوران جہاز کے اندر مختلف اخبارات دیکھے۔ انڈین ایکسپرس (۲۸ مارچ) میں مسٹر کلدیپ نیر کا ایک تبصرہ تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۶۶ میں جب سابق ہندستانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا تاشقند میں اچانک انتقال ہوا، اس وقت مسٹر کامراج کانگرس کے صدر تھے۔ اگر وہ پرائم منسٹر شپ کی گدی چاہتے تو اس وقت وہ آسانی سے اس پر قبضہ کر سکتے تھے۔ اس وقت کامراج کو پارٹی کے اوپر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ وزیر اعظم کا عہدہ قبول کرلیں۔ مگر کامراج نے خود اس کو نہیں کر دیا۔ دیانتدارانہ طور پر انھوں نے محسوس کیا کہ چونکہ وہ نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ ہندی، وہ انڈیا جیسے ملک کو ٹھیک طور پر نہ چلا سکیں گے جہاں

سرکاری دفاتر میں یہی دونوں زبانیں استعمال کی جاتی ہیں :

The party's old guard was in full control.

قیادت کا موقع ملنے کے بعد صرف اس لئے قیادت پر قبضہ سے رک جانا کہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے، یہ ایک ایسی نادر خصوصیت ہے کہ موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے بزرگوں میں بھی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

انگریزی اخبار ہندو (۲۸ مارچ) میں ایک فلسفیانہ مضمون کرشن چیتنیہ کا تھا۔ اس کا عنوان تھا :

Values for a sustainable society.

اس مضمون میں دنیا کے بارہ میں جدید خیالات (modern world-views) کو بتاتے ہوئے جارج گیلارڈ (George Gaylord) کا قول نقل کیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ انسان یقینی طور پر ارتقاء کا آخری مقصود نہیں تھا جس کا بظاہر خود کوئی مقصود نہیں۔ انسان کا منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا، کیوں کہ فطرت کا عمل خود منصوبہ بند نہ تھا :

Man was certainly not the goal of evolution, which evidently had no goal. He was not planned in an operation wholly planless.

جدید مفکرین انسان اور کائنات کی توجیہہ میں سخت ناکام ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے معاملے کو مانے بغیر اس کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں حد درجہ منصوبہ بندی ہے اور مقصدیت بھی۔ مگر آخرت کو نہ ماننے کی وجہ سے سب کچھ انھیں عبث نظر آتا ہے۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۳ کو صبح ۱۰ بجے جہاز دہلی ایئر پورٹ پر اترگیا۔ لوگ ایک کے بعد ایک جہاز کے باہر آنے لگے۔ میں نے سوچا کہ جہاز جب فضا میں اڑ رہا تھا، اس وقت اگر یہ لوگ جہاز کا دروازہ کھول کر باہر آجاتے تو کیا وہ باہر آنا بھی ویسا ہی ہوتا جیسا کہ اب لوگ باہر چل رہے ہیں۔

باہر نکلنے کا لفظ اگرچہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر فضا میں اڑتے ہوئے جہاز سے باہر نکلنا اور زمین پر ٹھہرے ہوئے جہاز سے باہر آنا، دونوں میں زندگی اور موت کا فرق ہے۔ بہت سے لوگ جو اس فرق کو نہیں جانتے وہ اڑتے ہوئے جہاز سے کود پڑتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ جہاز کے عملہ نے ان کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔

پٹنہ کا سفر

۱۱ اپریل ۱۹۹۳ کی صبح کو مجھے دہلی سے پٹنہ جانا تھا۔ فجر کی نماز نظام الدین کی کالی مسجد میں پڑھی۔ مسجد میں داخل ہوا تو اس کو دیکھ کر اجودھیا کی بابری مسجد کا معاملہ یاد آگیا۔ اسال پہلے کالی مسجد خستہ حالت میں تھی۔ اس کا فرش ٹوٹے پھوٹے سنگ خارا کا بنا ہوا تھا۔ آج اس عظیم مسجد کی مرمت ہو چکی ہے۔ پوری مسجد میں سفید سنگ مرمر کا ہموار فرش بن گیا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں اجودھیا کی بابری مسجد ڈھا کر ختم کر دی گئی۔

دونوں مسجدوں کے انجام میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب ایک لفظ میں تدبیر ہے۔ بد تدبیری نے بابری مسجد کے معاملہ کو بگاڑا۔ اور خوش تدبیری نے کالی مسجد کے معاملہ کو درست کر دیا۔

امام صاحب نے فجر کی نماز پڑھاتے ہوئے دوسری رکعت میں وہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو۔ اور قول سدید (درست بات) کہو۔ وہ تمہارے اعمال کو سدھارے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۰-۷۱)

۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد کالی مسجد بھی ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی تھی اور بابری مسجد بھی ہندوؤں کے قبضہ میں۔ کالی مسجد کے امام نے جب واگزاری کی کوشش شروع کی تو انھوں نے اس کو صرف ایک مسجد کا مسئلہ بنایا۔ اس کے برعکس بابری مسجد کی واگزاری کو کچھ خود ساختہ لیڈروں نے یہ کہہ کر اٹھایا کہ وہ ۲۰ کروڑ مسلمانان ہند کے عزت و وقار کا مسئلہ ہے۔ پہلی بات قول سدید تھی اور دوسری بات قول غیر سدید۔ اس لئے پہلی مسجد کے معاملہ میں مکمل کامیابی ہوئی۔ اور دوسری مسجد کے معاملہ میں مکمل ناکامی۔

پٹنہ کے لئے میرا پہلا سفر جولائی ۱۹۸۶ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ دسمبر ۱۹۸۶ میں چھپ چکی ہے۔ وہاں اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔

پٹنہ کے لئے میرا دوسرا سفر جولائی ۱۹۹۱ میں ہوا۔ یہ سفر الرسالہ سمپوزیم میں شرکت کے

لئے تھا۔ اس کی روداد الرسالہ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۱ میں مفصل طور پر شائع ہو چکی ہے۔

موجودہ سفر پٹنہ کا تیسرا سفر تھا۔ یہ سفر لوک سوراج اندولن کی دعوت پر ہوا۔ اس کے کنوینر جنرل ایس کے سنہا (ریٹائرڈ) اور سکریٹری مسٹر راشٹر آکھوری ہیں۔ اس تیسرے سفر کی روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۱ اپریل کو صبح سوا چھ بجے گھر سے نکلا۔ راستہ میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر سے مسٹر مدھوبھا کا ساتھ ہو گیا۔ وہ ہندستانی اندولن کے چیرمین ہیں اور مسٹر راج گوپال اچاری اور مسٹر جے پرکاش نرائن کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ بمبئی کی ایک ممتاز فیملی سے ان کا تعلق ہے۔

راستہ میں انھوں نے بتایا کہ پچھلے سال انھوں نے گجرات کے دو ہزار دیہات کا سروے کرایا۔ اس کا مقصد پنچایت راج کے بارہ میں لوگوں کی رائے معلوم کرنا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ تقریباً اتفاق رائے کے ساتھ گاؤں کے لوگوں نے کہا کہ یہ پنچائت راج نہیں ہے، یہ غنڈا راج ہے۔ ہم کو اس راج سے مکتی دلاؤ۔

گجرات میں یہ پنچائتی نظام ۱۹۶۳ میں قائم کیا گیا تھا۔ وہ ریاست کے تقریباً ۱۹ ہزار گاؤں کو کور کر رہا تھا۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ کچھ معاملات میں دیہاتوں کے اندر ہی فیصلہ کیا جاسکے:

To administer justice in certain matter in rural areas. (8/479)

حقیقت یہ ہے کہ انصاف کا تعلق کسی نظام سے نہیں ہے، بلکہ افراد سے ہے۔ افراد اگر منصف ہوں تو فیصلہ منصفانہ ہوگا، افراد اگر غیر منصف ہوں تو فیصلہ بھی غیر منصفانہ ہو جائے گا۔ خواہ ایک سسٹم ہو یا کوئی دوسرا سسٹم۔

ایرپورٹ کے ضروری مراحل سے گزر کر ہم لوگ انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۸۹۰ کے اندر داخل ہوئے۔ اس کی روانگی کا وقت ۸ بجے صبح تھا۔ ہوائی جہاز کے دروازے بند ہو گئے۔ اعلان ہو گیا کہ اب ہم پٹنہ کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ دہلی سے پٹنہ تک کی دوری ایک گھنٹہ ۴۰ منٹ میں پوری ہو جائے گی۔ تمام مسافروں نے حفاظتی پٹیاں باندھ لیں۔

گھڑی کی سوئی آگے بڑھنا شروع ہوئی۔ خیال ہوا کہ جہاز شاید کچھ لیٹ ہے۔ آخر کار ساڑھے

آٹھ بج گئے۔ اب کیپٹن نے افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ بعض ٹکنکل خرابی کی وجہ سے جہاز وقت پر روانہ نہیں ہوسکتا۔ جہاز کے بند دروازے دوبارہ کھول دئے گئے۔ پرامید چہرے اب بے یقینی کا منظر پیش کرنے لگے۔ لوگ امید و بیم کے دوگونہ احساس کے ساتھ انتظار کرنے لگے کہ کب جہاز کے عملہ کی طرف سے نیا اعلان کیا جاتا ہے۔

میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو اندھیرا اب اجالے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ زمین کی حرکت اپنی مقرر رفتار کے ساتھ برابر جاری ہے۔ کسی "تکنکل خرابی" نے اس کی حرکت کو نہیں روکا۔ کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جو اس پر قادر تھا کہ کائنات کے تمام تقاضوں کو پیشگی طور پر سمجھ سکے۔ اور ایک ایسا کارخانۂ کائنات بنائے جس میں اربوں اور کھربوں سال تک بھی کسی مرمت یا نظر ثانی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

تاخیر کے ساتھ جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ آج کے اخبار (ہندستان ٹائمس ۱۱ اپریل) میں پہلے صفحہ پر ایک خبر اس سرخی کے ساتھ تھی کہ ——— ہائی جیکروں پر قابو پالیا گیا (Hijackers overpowered) انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۳۶ لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہوئی۔ اس میں عملہ سمیت ۵۹ لوگ سوار تھے۔ ۲۵ منٹ بعد چار نوجوان کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے دو نے پیچھے کی طرف پوزیشن سنبھال لی اور دو نوجوان نے پبلک ایڈرس سسٹم پر قبضہ کرکے یہ اعلان کیا کہ ہم نے اس جہاز کو ہائی جیک کرلیا ہے۔ اترپردیش سرکار ہماری مانگوں کو پورا کرے ورنہ ہمارے پاس اکسپیلوسو ہے۔ انھوں نے دھمکی دی کہ اگر ہمارے حکم پر عمل نہیں کیا گیا تو ہم پورے جہاز کو بم سے اڑا دیں گے۔

یہ چاروں نوجوان لکھنؤ کے آرٹس کالج کے طالب علم تھے۔ جہاز کے اندر کھلبلی مچ گئی۔ وائرلیس کے ذریعہ لکھنؤ اور دہلی اور دوسرے کئی مقامات پر پیغام بھیج دیا گیا۔ مگر جہاز کے کچھ مسافر، خاص طور پر ریٹائرڈ بریگیڈیر کپل موہن نے ہمت سے کام لے کر چاروں نوجوانوں کو پکڑ لیا۔ تلاشی کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے پاس بم یا کسی بھی قسم کی کوئی خطرناک چیز نہیں تھی۔ وہ محض "اخباری ہیرو" بننے کے لئے ہائی جیکنگ کا ڈراما دکھا رہے تھے۔ جہاز حفاظت کے ساتھ دوبارہ لکھنؤ کے ہوائی اڈہ (اموسی) پر اتار لیا گیا۔ مسافر کسی قدر تاخیر کے ساتھ دہلی پہنچا دئے گئے۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ اکثر تخریب کاروں کا معاملہ یہی ہوتا ہے۔ تخریب کار اپنے آپ کو جتنا ظاہر کرتا ہے، وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے۔ آدمی اگر ہمت سے کام لے تو اکثر تخریب کاروں کو صرف تدبیر کے ذریعہ اسی طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے جس طرح مذکورہ ہائی جیکروں کو قابو میں کر لیا گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم پٹنہ ایرپورٹ پر اتر گئے۔ یہاں مختلف حضرات موجود تھے۔ میں مسٹر ایم ٹی خان کے ساتھ روانہ ہو کر عدالت گنج پہنچا۔ یہاں میرا قیام انھیں کی رہائش گاہ پر تھا۔

پٹنہ ریاست بہار کی راجدھانی ہے۔ وہ طویل زمانہ تک سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ مگر شہر کے جس حصہ میں بھی جائیے، آپ کو گندگی اور کوڑے کا منظر دکھائی دے گا۔ ہمارے لیڈروں نے سیاسی تحریکیں تو بے شمار چلائیں۔ مگر صفائی تحریک انھوں نے ایک بھی نہیں چلائی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے جو پٹنہ اور دوسرے شہروں میں ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔

۱۱ اپریل کو یہاں کے گرینڈ اپارٹمنٹس میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کا موضوع —— اجودھیا کا مسئلہ اور اس کا حل تھا۔

میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اس معاملہ میں میرا نقطہ نظر کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک بار میں اجودھیا گیا تھا۔ وہاں میں نے بابری مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی تھی۔ تمنا تھی کہ دوبارہ وہاں جاؤں اور دوبارہ اس کے اندر نماز ادا کروں۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ نے اس کا امکان ختم کر دیا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میں نے جو سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے، اس کے حوالہ سے کچھ لوگ میرے اوپر جھوٹے الزامات لگا رہے ہیں۔ اس کا جواب میری طرف سے وہی ہے جو ایک عرب عالم نے اسی طرح کے اتہام کے جواب میں کہا تھا:

سیعلم قومی انی لا اغشاهم ومهما استطال الليل فالصبح واصل

میں نے کہا کہ ۱۹۸۶ سے لے کر ۱۹۹۲ تک میں یہ کہتا رہا کہ اس مسئلہ کو ایجی ٹیشن کا اشو نہ بناؤ بلکہ اسے ثالثی کے اصول پر طے کر لو۔ مگر مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے اس کو نہیں مانا۔ یہاں تک کہ ان کے غلط طریق کار کے نتیجہ میں بابری مسجد ڈھادی گئی۔ اگر وہ ثالثی فارمولا کو مان لیتے تو یقینی

ہے کہ بابری مسجد ہرگز نہ ڈھائی جاتی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ شریعت کا مسئلہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے نئے حالات کے پیش نظر سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اب یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ بابری مسجد دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پر بنائی جائے۔ فارمولے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس طوفان کو بس ایک پر روک دیا جائے۔ اس کو ایک کے بعد مزید آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۳ کی شام کو ۶ بجے بھارتیہ ودیہ کلا مندر کے ہال میں پبلک میٹنگ تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ ایک سمپوزیم تھا جس کا عنوان کمیونل ہارمنی تھا۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا اس میں سے ایک یہ تھا کہ کمیونل ہارمنی بلاشبہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مگر اس کے لئے عام طور پر جو تجویزیں پیش کی جارہی ہیں وہ اصل مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔

میں نے کہا کہ کمیونل ہارمنی کا ذریعہ کمیونل یونی فیکیشن نہیں۔ بلکہ کمیونل ایڈجسٹمنٹ ہے۔ تنوع نیچر کا ایک قانون ہے جو پوری کائنات میں قائم ہے۔ وہی انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ ہمیں انسانوں کے اندر کلچر اور مزاج کے تنوع کو قبول کرنا ہے۔ اس کو ختم کرنے کی ہر کوشش یقینی طور پر ناکام ثابت ہوگی۔

مہاتما گاندھی نے پیس کو اتنا بڑھایا کہ وہ انڈیا کی علامت بن گیا۔ مگر آج ہم دوسروں کو یہ کہنے کا موقع دے رہے ہیں کہ پیس انڈیا کے لئے ایکسپورٹ آئٹم ہے، وہ لوکل کنزمپشن کے لئے نہیں۔

۱۲ اپریل کی صبح کو ہندستان ٹائمس اور ٹائمس آف انڈیا کے مقامی نمائندوں نے انٹرویو لیا۔ یہ دونوں مسلم نوجوان تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ مسلم نوجوان بڑی تعداد میں انگلش جرنلزم میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ تمام تر خود نوجوانوں کے ذاتی شوق سے ہو رہا ہے۔ نام نہاد مسلم قیادت پچھلے ۴۰ سال سے لوگوں کو اس وہم میں ڈالے ہوئی تھی کہ اصل کام خود اپنا انگریزی اخبار نکالنا ہے۔ حالاں کہ زیادہ صحیح رہنمائی یہ تھی کہ نوجوانوں کو ابھارا جائے کہ وہ ملک کے

انگریزی اخباروں میں زیادہ سے زیادہ داخل ہوں۔ تاہم اب نوجوانوں نے خود اپنے شوق کے تحت یہ کام شروع کر دیا ہے۔

۱۲ اپریل کی شام کو ۳ بجے پاٹلی پترا ہوٹل میں پریس کانفرنس ہوئی۔ تقریباً تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ میرے سوا مسٹر مدھو مہتا اور جنرل سنہا بھی موجود تھے۔ میں نے ابتداءً مختصر خطاب کیا۔ اس کے بعد سوال وجواب کی صورت میں پریس کانفرنس جاری رہی۔ اگلے دن پٹنہ کے تمام انگریزی اخباروں میں اس پریس کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی۔

پٹنہ میں ۱۲ اپریل کو سید اعجاز حسین آروی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آرہ میں ایک کربلا (امام باڑہ) ہے۔ یہ مولا باغ میں ہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ میں ایسا ہوا کہ کچھ ہندوؤں نے اس عمارت کے اوپر بھادیری جھنڈا (بھگوا جھنڈا) لگا دیا۔ یہ ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔ چنانچہ مقامی مسلمانوں میں اس پر تناؤ پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ جھنڈے کو اتار کر پھینک دیں۔

اس وقت کچھ سمجھ دار مسلمان آگے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں خود کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے کے بجائے پولیس کو رپورٹ کرنا چاہئے۔ انھوں نے کوئی جلوس نہیں نکالا۔ بلکہ چند مسلمانوں کا ایک وفد بنایا۔ اس وفد نے وہاں کے ایس پی اور انتظامی ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ پولیس افسر نے کہا کہ آپ لوگ جائیے اور جھنڈا اتار دیجئے، ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ مگر وفد نے کہا کہ ہم اس کو نہیں اتاریں گے۔ یہ کام آپ کو کرنا چاہئے۔

مسلمانوں نے جب کوئی ایکشن نہیں لیا تو اگلے دن پولیس والے اس مقام پر آئے اور عمارت کے اوپر چڑھ کر بھادیری جھنڈا اتار دیا اور اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد پولیس کی طرف سے وہاں چند دن تک پہرہ رہا۔ مگر بات ختم ہوگئی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

اس طرح کے معاملات میں یہی درست طریقہ ہے، ایسے مواقع پر نہ جلوس نکالنا چاہئے نہ خود ایکشن لینا چاہئے۔ نہ اور کسی قسم کی دھوم مچانا چاہئے۔ صرف وہی کرنا چاہئے جو آرہ کے مسلمانوں نے اس معاملہ میں کیا۔ اس کے بعد انشاء اللہ کبھی بھی فرقہ وارانہ فساد کی نوبت نہیں آئے گی۔

مسٹر ایم ٹی خان نے پٹنہ میں الرسالہ مشن کی سرگرمیوں کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں۔

یہ لوگ پابندی سے یہاں ماہانہ اجتماع کررہے ہیں۔ یہ اجتماع پروفیسر شہاب دسنوی کی رہائش گاہ پر ہوتا ہے۔ الرسالہ مشن سے وابستہ افراد اس موقع پر جمع ہو کر مشن کی بابت مشورہ اور گفت گو کرتے ہیں۔

مسٹر ایم ٹی خان اور ان کے ساتھیوں نے پٹنہ میں تین نکاتی فارمولا پر ایک سمینار بھی کیا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ پٹنہ کے صاحب فہم حضرات بڑی تعداد میں اس میں شریک ہوئے جن میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ اس سیمنار میں کھلے مباحثہ کے بعد سہ نکاتی فارمولا کی مکمل تائید کی گئی۔ اور مقامی اخباروں میں اس کی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔ سیمنار کے موقع پر ایک خوبصورت دو ورقہ انگریزی زبان میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں الرسالہ مشن کے تعمیری پروگرام کا تعارف کیا گیا تھا۔ لوگوں نے اس دو ورقہ کو کافی پسند کیا۔

الرسالہ مشن کے خلاف ۳۵۲ صفحہ کی ایک کتاب چھپی ہے۔ ۱۹۹۰ میں یہ کتاب چھپ کر سامنے آئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ الرسالہ میں اس کا جواب دینا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ کتاب اپنی تردید آپ ہے۔ جو لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے، ان کا یقین الرسالہ مشن کی صداقت پر اور پختہ ہو جائے گا۔

میرے اس قیاس کی ایک تصدیقی مثال پٹنہ کے زمانۂ قیام میں معلوم ہوئی۔ یہاں ڈھاکہ (بہار) کے جناب عطاء اللہ صاحب آئے تھے۔ انھوں نے اپنے یہاں کے ایک صاحب کا تاثر عین یہی بتایا جنھوں نے کہ اس نام نہاد تنقیدی کتاب کو پڑھا تھا۔ عطاء اللہ ڈھاکوی نے بہار کی دیہاتی زبان میں اس کو اس طرح بتایا:

"ایک صاحب جو ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو یہ تنقیدی کتاب ہاتھ لگی۔ انھوں نے اسے پڑھ کر مجھ سے کہا کہ اے عطاء اللہ، کتبوا تو اے لئے پڑھن کہ اے میں مولانا کا پوسٹ مارٹم کئے ہوئی۔ لیکن اس کو پڑھ کر ایسا لگا کہ اے میں تو خالی مولانا کی تعریف ہے۔ اب ہم ہو مولانا کے قلم کا قائل ہو گیو"

۱۲ اپریل کو پٹنہ سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ جہاز کا مقرر وقت شام کو ۶ بجے تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایرپورٹ پہنچا تو معلوم ہوا کہ جہاز ابھی کلکتہ میں کھڑا ہوا ہے، وہ وہاں

سے روانہ نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ وہ کئی گھنٹے لیٹ ہو سکتا ہے۔ اس خبر کے بعد میں دوبارہ قیام گاہ کی طرف واپس آگیا۔

عدالت گنج میں مسٹر ایم ٹی خان کی رہائش گاہ پر کئی تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہو گئے۔ چنانچہ مجلس کی صورت میں گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار ایئر پورٹ سے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع ملنے پر دوبارہ ایئر پورٹ آیا۔ جہاز پٹنہ سے پانچ گھنٹہ لیٹ ہو کر روانہ ہو سکا۔ یہ ایئر انڈیا کی فلائٹ ۸۱۰ تھی جو کلکتہ اور دہلی کے درمیان چلتی ہے۔

پٹنہ ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دیوار پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا ـــــ یہاں سگریٹ نہ پینے کا شکریہ:

Thanks for not smoking here.

یہ سگریٹ نوشی سے منع کرنے کا اچھوتا طریقہ ہے۔ عام طور پر ایسے مقامات پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ "یہاں سگریٹ پینا منع ہے۔" یا "سگریٹ نہ پیجئے۔" اس قسم کے جملہ سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ ایسا نہ کریں۔ لیکن مذکورہ جملہ اس کے بجائے یہ فرض کر رہا ہے کہ آپ نے خود اپنے احساس کے تحت پبلک مقام پر سگریٹ نہیں پیا۔ اور اب شکریہ ادا کرنے والا آپ کی اس خوش اخلاقی پر آپ کا اعتراف کر رہا ہے۔

جہاز کے اندر مختلف اخبارات دیکھنے کے لئے موجود تھے۔ ہندستان ٹائمس (۱۲ اپریل) میں مسٹر ایس ایس گل (S.S.Gill) کا ایک مضمون تھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا: بمبئی کے بعد (Beyond Bombay) اس مضمون میں ملک کے موجودہ سنگین حالات کا تذکرہ تھا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوا تھا:

In modern times, India has never before faced such a threat to its integrity and its very existence as a nation state. And we have never been so ill-equipped to face this challenge. The maladies are known, the remedies are known, but the physician is missing.

جدید دور میں انڈیا کو ایک قومی ریاست کی حیثیت سے اس کے استحکام بلکہ اس کے وجود کے لئے کبھی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا جیسا کہ اس وقت اسے درپیش ہے۔ اور ہم اس چیلنج کا مقابلہ

کرنے کے لئے کبھی اتنے بے سہارا نہ تھے۔ بیماری معلوم ہے۔ دوا بھی معلوم ہے، مگر ڈاکٹر موجود نہیں۔ (صفحہ ۱۴)

لیکن میرا خیال ہے کہ جو چیز غیر موجود ہے، وہ ایک اور چیز ہے۔ یہاں بیماری اور دوا معلوم ہے۔ ڈاکٹر بھی موجود ہے۔ مگر کمی یہ ہے کہ لوگوں میں دوا کے استعمال کا جذبہ نہیں۔

مہاتما گاندھی کا ڈاکٹر ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر ہندو مسلم بھائی چارہ کے لئے جو کچھ انھوں نے کہا اس کو ان کی زندگی ہی میں قبول نہیں کیا گیا۔ جواہر لال نہرو کو سب لوگ ڈاکٹر کا درجہ دیتے ہیں مگر ان کا سیکولرزم خود ان کی پارٹی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس طرح پچھلے سو سال کے اندر بہت سے دھرماتما پیدا ہوئے اور آج بھی موجود ہیں۔ مگر ان کے پرچار کے باوجود کوئی دھرم کی اصل تعلیمات پر نہیں چلتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا اصل کام لوگوں کے مزاج کی تربیت ہے تاکہ وہ ڈاکٹر کے مشورہ کو مان سکیں۔ اسی مزاج کے بننے یا نہ بننے پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔

میں دہلی پہنچا تو رات کے ایک بج چکے تھے۔ اگر جہاز پٹنہ سے وقت پر روانہ ہوتا تو میں ۱۲ اپریل کی شام کو ۸ بجے دہلی پہنچ جاتا۔ مگر جہاز کے لیٹ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اور میں دہلی اس وقت پہنچا جب کہ اپریل کی ۱۳ تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ کیلنڈر کی تاریخ اسی طرح بدلتی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب کہ زندگی اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔

بمبئی کا سفر

بمبئی سے مسٹر مدھو مہتا اور مسٹر اروند دیش پانڈے کی دستخط سے ایک دعوت نامہ ملا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ لوک سوراج اندولن بمبئی میں ایک آل انڈیا شہری کنونشن (citizen's convention) منعقد کر رہا ہے۔ یہ کنونشن بمبئی (انڈین مرچنٹس چیمبر) میں ۳ اپریل ۱۹۹۳ کو ہوگا۔ اس کے داعیوں میں ممتاز شہریوں کے نام تھے۔ مثلاً مسٹر بی کے نہرو، مسٹر این اے پالکھی والا، مسٹر مینو مسانی، مسٹر جسٹس سی ایس دھرمادھیکاری، مسٹر رام کرشن بجاج، مسٹر پرتاپ بھوگی وال، مسٹر الوک جاجوڈیا، وغیرہ۔ اس کنونشن کا موضوع تھا:

The survival of India as a nation.

اس دعوت نامہ کے مطابق بمبئی کا سفر ہوا۔

۲ اپریل ۱۹۹۳ کی شام کو گھر سے روانہ ہوا۔ نظام الدین سے ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے دائیں بائیں کے مناظر مسلسل دکھائی دے رہے تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ کوئی نیا آئیڈیا میرے ذہن میں نہیں آرہا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے میں ایک نئے ملک کی راجدھانی میں اترا تھا جب میں ایئر پورٹ سے شہر کی طرف روانہ ہوا تو ہر اگلا منظر ایک نیا خیال میرے ذہن میں پیدا کرنے لگا۔

میں نے سوچا کہ دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایسا کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کا یہ راستہ بار بار دیکھنے کے بعد میرے لئے ایک مانوس راستہ بن گیا ہے۔ جب کہ مذکورہ شہر کی سڑکیں اور اس کے مناظر میرے لئے بالکل نئے تھے۔ نیا آئیڈیا زیادہ تر نئی چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں سیاحت کا ذکر خصوصی اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کیوں کہ سیاحت کے دوران آدمی نئی نئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کو نئی عبرتیں اور نئی دریافتیں حاصل ہوتی ہیں۔

ایئر پورٹ پہنچ کر پہلا مرحلہ بورڈنگ کارڈ لینے کا ہوتا ہے۔ پہلے یہ نظام تھا کہ مختلف ڈیسک پر مختلف مقامات کی تختیاں لگی ہوتی تھیں۔ آدمی کو ایئر پورٹ میں داخل ہونے کے بعد تلاش کرنا پڑتا تھا

کہ اس کو جس مقام پر جانا ہے اس کی تختی کہاں لگی ہوئی ہے۔ مگر اب یہ سہولت ہے کہ آپ کسی بھی ڈیسک سے کسی بھی مقام کے لئے بورڈنگ کارڈ لے سکتے ہیں۔

یہ کمپیوٹر کا کرشمہ ہے۔ کمپیوٹر نے موجودہ زمانہ میں ہر چیز میں غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہ ترقیاں شاید جنت کا ابتدائی تعارف ہیں۔ اگر آدمی کے اندر احساس آخرت زندہ ہو تو وہ ان ترقیوں میں جنت کی زیادہ ترقی یافتہ دنیا کی جھلک دیکھنے لگے۔

۲ اپریل کی شام کو ۶ بجے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۰۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اناؤنسر نے اعلان کیا: "ہم بمبئی جا رہے ہیں۔ بمبئی تک کی دوری ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں پوری کی جائے گی"۔ یہ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہنے والا کہہ رہا ہو کہ ہم آخرت کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ دنیا سے آخرت تک کی دوری ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں پوری کی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ میری عمر تو اس سے زیادہ ہو چکی۔ میرے لئے اب ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ میرا سفر مکمل ہو جائے اور اگلے سکنڈ میری زندگی کی سواری آخرت کے عالم میں اتر جائے۔

راستہ میں چند اخبارات دیکھے۔ ایوننگ نیوز (۲ اپریل) کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ بابری مسجد تحریک سے وابستہ تمام مسلم لیڈر متفقہ طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد کے انہدام کے واقعہ میں وزیر اعظم نرسمہا راؤ خود شریک ہیں۔ ان کی ملی بھگت سے بھارتیہ جنتا پارٹی کے کارکنوں نے مسجد کو ڈھایا۔ اسی کے ساتھ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ مسلم لیڈر وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے مل کر یہ مانگ کرنے والے ہیں کہ مسجد کو دوبارہ اس کی اصل جگہ (original site) پر بنایا جائے۔ (صفحہ ۳)

بابری مسجد کے نام پر اٹھنے والے ان مسلم لیڈروں سے اگر یہ کہا جائے کہ آپ لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی سے مانگ کیجئے کہ وہ مسجد کو دوبارہ وہیں بنائے تو وہ کہیں گے بھارتیہ جنتا پارٹی ہی نے تو مسجد کو ڈھایا ہے۔ پھر اس سے ہم کس طرح ایسی مانگ کر سکتے ہیں۔ مگر موجودہ حالات میں نرسمہا راؤ سے اس قسم کی مانگ کرنا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا بھارتیہ جنتا پارٹی سے مانگ کرنا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان نام نہاد لیڈروں کے لئے اب یہ کہنے کا موقع نہیں رہا کہ "مسجد وہیں بناؤ"

بلکہ ان کو اب یہ کرنا چاہئے کہ خود اجودھیا جاکر مسجد کو وہیں بنائیں۔ ان کی موجودہ روش گویا قول پر عمل کا کریڈٹ لینا ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

بمبئی ایئرپورٹ پر دہلی کے سابق پولیس کمشنر مسٹر ویدمروا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اسی جہاز سے کنونشن میں شرکت کے لئے آئے تھے، مگر ملاقات ایئرپورٹ پر ہو سکی۔

ایئرپورٹ سے ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ میری عادت ہے کہ میں ہر ایک سے اس کے اپنے دائرہ کی بات کرتا ہوں اور زیادہ تر سوالات کی صورت میں اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ مسٹر ویدمروا سے میں نے پولیس کے محکمہ کی بابت سوالات کئے۔

ایک مسلم لیڈر صاحب نے ایک بار مجھے بتایا کہ ایک سفر کے دوران ان کی ملاقات ایک پولیس افسر سے ہوئی۔ انھوں نے پولیس افسر سے پوچھا: جناب یہ بتائیے کہ کمیونل رائٹ میں پولیس صرف مسلمانوں کو کیوں مارتی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سوال نہیں ہے، بلکہ چھیڑ خانی ہے۔ میں کسی آدمی سے وہ سوالات کرتا ہوں جس سے میں اس کی فیلڈ کی کچھ نئی معلومات لے سکوں۔ میرا مقصد اپنی معلومات بڑھانا ہوتا ہے نہ کہ اس کو ملعون کرنا۔

پچھلے سفر میں میری ملاقات بمبئی کے ڈپٹی کمشنر آر ٹی راٹھور سے ہوئی۔ ان سے بھی میں نے ان کے دائرۂ عمل کی باتیں کیں۔ انھوں نے بتایا کہ پولیس کی تعریف ایک شخص نے ان الفاظ میں کی ہے ——— پولیس کے لوگ سماجی ڈاکٹر ہیں۔ ان کا کام سماجی برائیوں کو ختم کرنا ہے:

Police are social doctors to eradicate social evils.

اس بار بمبئی میں میرا قیام جسٹس ایم ایم قاضی کی رہائش گاہ (مالابار ہلز) پر تھا، وہ نہایت باذوق اور دینی مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے مکان پر جانے کے لئے جب میں ان کی گاڑی پر بیٹھنے لگا تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک پرزہ ہے۔ یہ ان کے گھر سے آیا تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا: آپ آتے وقت گوشت یا مرغ لیتے آئیں تو ٹھیک رہے گا۔

پوچھنے پر جسٹس قاضی نے بتایا کہ انھوں نے ٹیلی فون کے ذریعہ اپنے گھر پر بتادیا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ چنانچہ ان کی اہلیہ نے مذکورہ رقعہ بھجوایا ہے۔ اس کے بعد فوراً میں گاڑی سے اتر گیا۔

میں نے کہا کہ میں صرف اس شرط پر آپ کے یہاں چلوں گا کہ جو کچھ آپ کے یہاں موجود ہے بس اسی کو آپ مجھے کھلائیں۔ کسی بھی نئے آئٹم کا اضافہ نہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد میں دوبارہ ان کی گاڑی پر بیٹھا۔

جسٹس قاضی کا مطالعہ اور تجربہ دونوں کافی وسیع ہے۔ وہ دلچسپ انداز میں قیمتی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کسی کا ایک قول سنایا کہ ہر آدمی صاحب علم بننا چاہتا ہے۔ مگر کوئی آدمی اس کی قیمت ادا نہیں کرتا :

Everybody wants to be learned but nobody wants to pay the price.

۳ اپریل کو انڈین مرچنٹس چیمبر کے وال چند ہیرا چند ہال میں کنونشن تھا۔ صبح نو بجے اس کی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے کچھ تعارفی تقریریں ہوئیں۔ ان میں بتایا گیا کہ اس وقت ملک کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ اس کے حل کے لئے اگر کچھ نہ کیا گیا تو ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس کے بعد تین رزولیوشن پیش کئے گئے اور غور و بحث کے بعد کسی قدر ترمیم کے ساتھ منظور کئے گئے۔

پہلا رزولیوشن مسٹر بی کے نہرو نے پیش کیا۔ اس میں موجودہ ہندستانی دستور میں کچھ تبدیلیاں تجویز کی گئی تھیں۔ ان کے بعد جنرل ایس کے سنہا نے اس کی حمایت میں تقریر کی۔ اس کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

دوسرا رزولیوشن مسٹر کے ایف رستم جی نے پیش کیا۔ یہ ملک کی موجودہ انتظامی حالت کے بارہ میں تھا اور اس میں کچھ انتخابی تبدیلیاں تجویز کی گئی تھیں۔ یہ رزولیوشن بھی اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

تیسرا رزولیوشن مسٹر نانی پالکھی والا نے پیش کیا۔ اس میں اجودھیا کے بارہ میں میرے فارمولا کی تائید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اس کو ہندو اور مسلمان دونوں فریق مان لیں۔ اور اس کی بنیاد پر ملک میں امن و امان کا دور لائیں۔ مجھے اس کی حمایت میں تقریر کرنا تھا۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں ماضی اور حال اور مستقبل، تینوں اعتبار سے اس کی اہمیت واضح کی۔ یہ رزولیوشن بھی اتفاق رائے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

جنرل سنہانے اپنی تقریر میں کہاکہ اجودھیا کا مسئلہ ایک معمولی مسئلہ تھا۔ وہ اتنا زیادہ اس لئے بڑھ گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اس معاملہ میں غیرحقیقی طریقہ اختیار کیا۔ ہندوؤں نے اس کو بے عزتی کا نشان (symbol of humiliation) سمجھ لیا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اس کو اپنے لئے عزت ووقار کی علامت (symbol of honour) بنا لیا۔ اس دوطرفہ ضد کی وجہ سے یہ مسئلہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اجودھیا کا ایک مقامی مسئلہ پورے ملک کی بقاء وترقی کا سوال نہ بن جاتا۔

سعید نقوی صاحب نے کہاکہ یہ دراصل سیاست تھی جس نے یہ تمام مسئلے پیدا کئے۔ ورنہ اس ملک میں رام اور رحیم کا کوئی جھگڑا ہی نہ تھا۔ انھوں نے اقبال کا یہ شعر سنایا جس میں رام کو ہند کا امام کہا گیا ہے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز　　اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

مسٹر سعید نقوی نے اپنی تقریر میں بتایاکہ ۱۹۷۷ میں اٹل بہاری باجپئی وزیر خارجہ کی حیثیت سے پاکستان گئے۔ ان کے ساتھ جرنلسٹوں کی جو ٹیم تھی اس میں مسٹر نقوی بھی شامل تھے۔ کراچی میں مسٹر نقوی کے چچا رہتے ہیں۔ وہ اپنے چچا سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ ان کے ساتھ کچھ ہندو جرنلسٹ بھی تھے۔ جب وہ لوگ چچا کے گھر میں تھے تو چچا کے ایک نوجوان لڑکے نے ان کو دیکھ کر کہا: بھتیا، یہ ہندو ہیں کیا۔ وہ تو دیکھنے میں بالکل تمہاری طرح لگتے ہیں۔

اس نے ایسا کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے والا مسلم بچہ گھر سے لے کر باہر تک ہندو کے بارہ میں بری باتیں سنتا ہے۔ وہاں کا پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا ہندو کا تعارف اس انداز سے کراتا ہے جیسے کہ ہندو کوئی بہت خراب قسم کی مخلوق ہو۔ وہ ہندو کے بارہ میں صرف ایک ہی چیز جانتا ہے۔ وہ یہ کہ ہندو ایک مسلم دشمن قوم ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص انسان ہے۔ ہر ایک کے اندر وہی فطرت ہے جو کسی دوسرے انسان کے اندر ہے۔ دنیا کی قوموں کو دشمن اور دوست کے خانے میں تقسیم کرنا غیر معقول بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔

یہی بات برعکس صورت میں انڈیا میں اکثر ہندو گھرانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہاں مسلمان کا چرچا اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے جیسے کہ مسلمان کوئی ہندو دشمن مخلوق ہو۔ حالاں کہ اس کا حقیقت

سے کوئی تعلق نہیں۔

مسٹر سی سبرامنیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ دنیا میں کوئی سماج ایسا نہیں ہے جو واحد مذہبی سماج (uni-religious society) ہو۔ دنیا کا ہر سماج کثیر مذہبی سماج (multi-religious society) ہے۔ ایک ایسی دنیا میں ہم انڈیا کو ایک مذہبی جزیرہ نہیں بنا سکتے۔ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی ہم کو ہر مذہب کے لئے آزادانہ مواقع دینے ہوں گے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرے، مگر اسے یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کے مذہب کی مذمت کرے:

Everybody is entitled to preach his religion, but no abuse.

چیئرمین نے اپنی آخری تقریر میں کہا کہ آج انڈیا میں حالات بہت زیادہ خراب ہیں لیکن ابھی بھی امید کی ایک کرن باقی ہے:

Things are very very dark in India today, but there is also a ray of hope.

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۴ اپریل) میں صفحہ ۳ پر بمبئی کے کچھ مسلمانوں نے ایک اپیل شائع کرائی تھی۔ اس میں اپنے مسلمان بھائیوں سے کہا گیا تھا کہ وہ یہ طریقہ چھوڑ دیں کہ جمعہ کی نماز کی صفیں سڑکوں پر بنائیں۔ چوں کہ مسافروں اور غیر مسلم حضرات کو اس پر اعتراض ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ طریقہ چھوڑ دینا چاہئے۔

میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کچھ لوگوں سے کہا کہ حدیث میں ایمان کا ایک تقاضا یہ بتایا گیا ہے کہ راستہ سے تکلیف والی چیز کو ہٹانا (اماطۃ الاذی عن الطریق) ایسی حالت میں کیسا عجیب ہوگا کہ مسلمان راستہ میں تکلیف ڈالنا (اقامۃ الاذی علی الطریق) کا عمل کرنے لگیں۔

میں نے کہا کہ کوئی بھی عذر مسلمانوں کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ شارع عام پر نماز پڑھنے لگیں۔ عذر کو ہمیشہ اپنے داخلی دائرہ میں حل کرنا چاہئے نہ کہ اسے خارجی مسئلہ بنا دیا جائے۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے بات چیت کے دوران کہا کہ انڈیا میں صرف دو قسم کے لوگ بستے ہیں۔ ایک وہ جو کہ ہندو ہیں، دوسرے وہ جو کہ ہندو تھے:

There are two kind of people in India—one who are Hindus, and the other who were Hindus.

اس بات کو اگر کلچرل معنی میں لے کر کہا جائے کہ سارے لوگ ہندو ہیں تو وہ درست نہ ہوگا۔ البتہ اگر اس کو اخوت کے معنی میں لے کر کہا جائے کہ سارے لوگ بھائی بھائی ہیں تو وہ عین درست ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ایک شخص نے لکھا ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ دانش مند آدمی اپنے گردوپیش کے حالات کے ساتھ موافقت کرتا ہے۔ اور غیر دانش مند آدمی حالات کو خود اپنے موافق بنانے کی کوشش کرتا ہے:

The reasonable man adjusts himself to the circumstance around him; the unreasonable man tries to adjust the circumstances to himself.

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کے بعد اب ہندوؤں کے لئے کاشی اور متھرا کا چیپٹر کھولنے کا کوئی جسٹی فیکیشن نہیں ہے۔ کیوں کہ اجودھیا میں تو ان کے کہنے کے مطابق، رام مندر نہیں تھا جس کو انھیں بنانا تھا۔ جب کہ کاشی اور متھرا کا کیس یہ نہیں ہے۔ کاشی میں گیان واپی مسجد سے الگ شیو کا استھان بنا ہوا ہے اور وہ ہندوؤں کے قبضہ میں ہے۔ اسی طرح متھرا میں آج بھی کرشن جنم استھان مسجد سے الگ ہے اور وہ پوری طرح ہندوؤں کے قبضہ میں ہے۔ ایسی حالت میں کاشی اور متھرا کا چیپٹر کھولنے کا انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ایک اور ہندو نے کہا کہ مسلمان کانسٹی ٹیوشن کا نام بہت لیتے ہیں۔ مگر وہ کانسٹی ٹیوشن کو صرف اپنے رائٹ کے لئے کوٹ کرتے ہیں، اپنی ڈیوٹی کے لئے وہ کانسٹی ٹیوشن کو کوٹ نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ کانسٹی ٹیوشن کے مطابق، مسلمانوں کو اس ملک میں مائناریٹی کا حق حاصل ہے۔ پھر وہ اس طرح کیوں نہیں رہتے جس طرح ساری دنیا میں مائناریٹیز رہتی ہیں۔ انھیں

بھارت میں اسی طرح رہنا ہوگا جس طرح پاکستان میں ہندو مائناریٹی اور بنگلہ دیش میں ہندو مائناریٹی رہتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کی قیمت انھیں خود ہی ادا کرنی پڑے گی۔

۴ اپریل کی صبح کو مسٹر مدھو مہتا وغیرہ کے ساتھ بمبئی کے ایک آشرم پر گیا۔ یہاں مشہور سماجی ریفارمر پانڈورنگ شاستری سے ملاقات ہوئی۔ یہ بہت بڑا آشرم تھا۔ اس کے باوجود ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ پانڈورنگ شاستری ریفارمر بھی ہیں اور دھرم گرو بھی۔ اس لئے روزانہ ہزاروں لوگ ان کے درشن کے لئے آتے ہیں۔

ہم لوگ جب آشرم کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئے تو پہلا تجربہ جو پیش آیا وہ یہ تھا کہ گیٹ پر دو آدمی لال رنگ کے تھیلے لئے ہوئے کھڑے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ایک تھیلا دیا گیا۔ ہمیں یہ کرنا تھا کہ اس کے اندر اپنا جوتا رکھ کر دوبارہ انھیں لوٹا دیں۔ اس کے بعد انھوں نے ہر ایک کو ایک ٹوکن دیا جس پر الگ الگ نمبر لکھا ہوا تھا۔ ہمارے جوتے اس طرح تھیلوں میں بند کر کے لکڑی کی الماری کے خانہ میں رکھ دئے گئے۔ جب ہم واپس آئے تو نمبر دکھا کر دوبارہ ہم کو ہمارا جوتا واپس کر دیا گیا۔ یہ ساری خدمت بلا معاوضہ تھی۔

ہم لوگ پانڈورنگ شاستری کے مخصوص کمرہ میں داخل ہوئے۔ مسٹر مدھو مہتا نے جب میرا تعارف کرایا تو انھوں نے کہا: "ان کا فوٹو تو اخباروں میں دیکھا ہے۔" ان کا ایک خاص مشن ہے جو اس وقت آٹھ ہزار گاؤں میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ گاؤں میں اتحاد ہو۔ غریبوں کی مدد کی جائے۔ گاؤں کے ہر بچہ کو ایک گلاس دودھ روزانہ ملے۔ گاؤں کا کوئی آدمی بھوکا نہ سوئے۔ مہاراشٹر اور دوسری ریاستوں میں یہ مشن خاموشی کے ساتھ چل رہا ہے۔

مسٹر مدھو مہتا نے کہا: یہ لوگ جہاں جاتے ہیں، اپنی روٹی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ پیڑ کے نیچے سوتے ہیں۔ کسی سے کچھ نہیں لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ ہیں جو انڈیا کو چلا رہے ہیں۔

۴ اپریل کی شام کو ساتھیوں نے ایک ڈبنگ تھیٹر دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ فاروق فیصل صاحب اور افضل لادی والا صاحب کے ساتھ روانہ ہو کر بی آر ڈبنگ تھیٹر میں پہنچے۔ فلم بندی کے وقت کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایکٹر کی آواز کے ساتھ کوئی خارجی آواز مل جاتی ہے۔ بعد کو اسے

صاف کیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اصل ایکٹر کو ساؤنڈ پروف تھیٹر میں بلایا جاتا ہے۔ اس کو فلم کا وہ حصہ دکھایا جاتا ہے۔ وہ مخصوص مائک کے سامنے وہ الفاظ دوبارہ بولتا ہے۔ اب مشینی عمل کے تحت اس کی پچھلی آواز ٹیپ سے حذف ہوجاتی ہے اور نئی آواز اس پر مرتسم ہوجاتی ہے۔

میں جب تھیٹر میں پہنچا تو یہ عمل جاری تھا۔ اس کو دیکھ کر بڑے عجیب قسم کے تاثرات ہوئے۔ مثلاً ایک ایکٹر آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ وہ سگرٹ پی رہا ہے اور اپنے دوست کے ساتھ تفریح کر رہا ہے۔ اتنے میں اس کے سامنے فلم کا ایک منظر لایا جاتا ہے جس میں اس نے نہایت غصہ کے ساتھ ایک شخص کو ڈانٹا ہے۔ اب اچانک ایکٹر اپنا منھ مائک کے سامنے لاتا ہے اور غیظ وغضب سے بھرے ہوئے انداز میں ان الفاظ کو دوبارہ بولتا ہے۔ جب وہ ان الفاظ کو ادا کرلیتا ہے تو پھر وہ معمول کے ساتھ اپنی کرسی پر دراز ہوجاتا ہے اور دوبارہ اپنی تفریح میں مشغول ہوجاتا ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ہمارے لیڈر بھی ٹھیک اسی طرح کے ایکٹر ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ بالکل معمول کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جب وہ عوام کے سامنے آتے ہیں تو مصنوعی طور پر کچھ اور بولی اپنے منھ سے نکالتے ہیں جس کا ان کی عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بمبئی کے اس ڈبنگ تھیٹر میں ایک ریکارڈسٹ ہیں۔ ان کا نام مسٹر پی این تیواری (Telephone : 8891624) ہے۔ ان سے میں نے ذکر کیا کہ دہلی میں ہم نے کئی تقریریں ریکارڈ کرائی ہیں۔ مگر وہاں زیادہ اچھی ریکارڈنگ نہیں ہوئی۔ آپ کے اس تھیٹر میں ریکارڈنگ کا جو انتظام ہے وہ بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ مگر آپ لوگ تو صرف بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ایک دو کیسٹ کی ریکارڈنگ کی گنجائش آپ کے یہاں نہیں ہوسکتی۔

مسٹر تیواری نے فوراً کہا کہ ایسا کچھ نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی ہم آپ کی تقریر ریکارڈ کریں گے۔ اگرچہ میرا ٹائم ختم ہو رہا ہے، اور مجھے اپنے گھر جانا ہے جو یہاں سے بہت دور ہے۔ مگر میں آپ کی تقریر کی ریکارڈنگ کے لئے ٹھہر جاؤں گا۔ اس کے بعد مسٹر تیواری نے سارا نظام درست کرایا اور مجھ کو بٹھا کر میری آدھ گھنٹہ کی تقریر ریکارڈ کی۔

آخر میں انھوں نے کہا : آپ کی آواز اس عمر میں بھی جوان ہے۔ آج ریکارڈنگ کے اتہاس میں ایک خوب صورت پنا جڑ گیا۔ آپ سے میری ریکوئسٹ ہے کہ اپنے انیک شاگردوں میں ایک نام میرا بھی لکھ لیجئے۔ مسٹر تیواری کا ریکارڈ کیا ہوا یہ کیسٹ اسلامی مرکز دہلی کے آفس میں موجود ہے۔

۴ اپریل کی رات کو ہارون بھائی ہوزری والے نے کچھ مسلمانوں کو اپنے یہاں شام کے کھانے پر بلایا۔ یہاں کھانے کے بعد ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے تین نکاتی فارمولا کے بارے میں اعتراضات کا جواب دیا۔

میں نے کہا کہ کچھ لوگ میرے اوپر الزام تراشی میں مشغول ہیں۔ ان سے میں ایک عرب عالم کی زبان میں کہوں گا جس نے پہلی عالمی جنگ کے زمانہ میں اسی قسم کے الزام کے جواب میں کہا تھا:

سیعلم قومی انني لا أغشهم ومهما استطال الليل فالصبح واصل

کچھ مسلمانوں نے بابری مسجد تحریک اور تین نکاتی فارمولے کا تقابل کیا اور فارمولا پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ دو کرائیٹیرین (معیار) کیوں استعمال کرتے ہیں۔ بابری مسجد کمیٹی کو آپ بھیڑ کے معیار سے ناپتے ہیں اور تین نکاتی فارمولا کو رزلٹ کے معیار سے ناپ رہے ہیں۔ دونوں کو آپ ایک معیار سے ناپیں۔ اس کے بعد ہی آپ کوئی منصفانہ رائے قائم کر سکتے ہیں۔

ایک جرنلسٹ نے فیملی پلاننگ کی تائید کی۔ میں نے کہا کہ فیملی پلاننگ میرے نزدیک نیچر میں مداخلت ہے۔ اور نیچر میں مداخلت کبھی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدائش اور موت دونوں کا تعلق فطرت کے نظام سے ہے۔ برتھ اور ڈیتھ کو فطرت کی طرف سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ انسان کے پاس نہ وہ علم ہے اور نہ وہ طاقت جس سے وہ اس نظام کو کنٹرول کر سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فیملی پلاننگ شریعت سے ٹکراتی ہے البتہ میں کہتا ہوں کہ فیملی پلاننگ فطرت سے ٹکراتی ہے۔ اور جو چیز فطرت سے ٹکرائے وہ کبھی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے یونیفارم سول کوڈ کی پرجوش حمایت کی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ یونیفارم سول کوڈ کیا ہے، اور اس کا عملی نقشہ کیا ہوگا۔ وہ کچھ نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ کانسٹی ٹیوشن بننے کے بعد سے بہت سے لوگ اس کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ مگر اب تک

کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ یونیفارم سول کوڈ کیا ہے۔ آپ حضرات پہلے اس کا عملی نقشہ سامنے لائیے اس کے بعد اس پر لوگوں کی رائے لیجئے۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کے بم دھماکوں کے بعد اندیشہ تھا کہ اس کے ردعمل میں فوراً ہی فسادات ہوں گے۔ اسی اندیشوں کی فضا میں بمبئی میں رمضان کے مہینہ میں شیوسینا والوں نے اپنے لگے ہوئے بورڈوں پر اس قسم کے نعرے لکھ دئے :

روزے تم رکھو، عید ہم منائیں گے

مگر عجیب بات ہے کہ اس سال عید (۲۵ مارچ ۱۹۹۳) کے موقع پر بمبئی یا کسی بھی دوسرے مقام پر کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ البتہ پاکستان سے اس قسم کی خبریں آئی ہیں۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۸ مارچ ۱۹۹۳) کے صفحہ اول پر یہ سرخی ہے: بھاولپور میں عید کے اجتماع پر حملہ۔

۵ اپریل ۱۹۹۳ کی صبح کو بمبئی سے واپسی ہوئی۔ رہائش گاہ سے ایئرپورٹ تک جسٹس قاضی کا ساتھ تھا۔ وہ پورے معنوں میں باغ و بہار آدمی ہیں۔ بات بات میں ایک موزوں شعر ان کی زبان پر آجاتا ہے۔ ان کی ہمراہی میں آدمی کبھی اکتاہٹ کے احساس میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔

بمبئی سے دہلی کے لئے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۱۸۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف اخبارات دیکھے جو ہوائی جہاز کے نظام کے تحت مسافروں کے مطالعہ کے لئے مہیا کئے گئے تھے۔

بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا (۴ اپریل ۱۹۹۳) میں چھپا ہوا ایک مضمون پڑھا۔ یہ مضمون مسٹر جین سین G.H. Jansen کے قلم سے تھا۔ اس کا عنوان تھا کہ عالمی اسلامی تلوار محض ایک افسانہ ہے :

global Islamic sword a myth.

اندور کاسفر

۲۳ مئی ۱۹۹۳ کو ایک ٹیلی فون آیا۔ ہندی اخبار جن ستا کے ایڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کستور باگرام (اندور) کے تحت ۲۹۔ ۳۰ مئی کو ایک سمیلن ہو رہا ہے۔ جس کا موضوع چینتا ابھیان ہو گا۔ اس میں انڈیا بھر سے لوگ آئیں گے۔ نیز بابا آمٹے اور دوسرے کئی خاص لوگ شریک ہوں گے۔ سمیلن کے علاوہ اس میں ایک سال کے لئے پیس پروگرام بنایا جائے گا۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ آپ بھی اس میں ضرور شرکت کریں۔

اب میرا معاملہ یہ تھا کہ ۱۹ مئی ۱۹۹۳ کو میرا ہرنیا کا آپریشن ہوا تھا۔ دو دن ہولی فیملی اسپتال رہ کر ابھی میں گھر واپس آیا تھا۔ اگلے دن میں اپنے سرجن ڈاکٹر مہیشوری سے ملا۔ اور ان سے پوچھا کہ کیا میں اندور کا سفر کر سکتا ہوں۔ انھوں نے صاف منع کر دیا کہ ابھی آپ کے لئے سفر مناسب نہیں ہے۔

درمیان میں ان لوگوں کی طرف سے بار بار تقاضے کے ٹیلیفون آتے رہے۔ میں کچھ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ۲۸ مئی آگئی جو کہ روانگی کی تاریخ تھی۔ مسٹر پربھاش جوشی نے ٹیلیفون پر بتایا کہ آج سہ پہر کو روانگی ہے۔ ہم سب لوگوں کو آپ کی صحت کی بے حد فکر ہے مگر ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ اس سمیلن میں ضرور چلیں۔ ان لوگوں کی بہت خواہش ہے کہ آپ وہاں ان کے درمیان ضرور موجود ہوں۔

۲۸ مئی کو ۳ بجے مسٹر پربھاش جوشی اور مسٹر رام بہادر رائے گاڑی لے کر آگئے۔ میں انکار نہ کر سکا اور اللہ کے نام پر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں گھر سے باہر نکلا تو معمول کے مطابق میرے ہاتھ میں میرا چھوٹا بیگ بھی نہیں تھا جسم کے اوپر جو کپڑے تھے وہی میرا کل اثاثہ تھا۔ مسٹر جوشی نے کہا: کیا یہ آپ کے تین دن کے لئے کافی ہو جائے گا۔ آپ تو خان عبدالغفار سے بھی زیادہ بڑے فقیر ہیں۔ ان کے ساتھ پوٹلی ہوتی تھی، آپ کے ساتھ وہ بھی نہیں۔

گھر سے نکل کر ہم لوگ ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ دماغ پر سخت بوجھ تھا کہ آپریشن میں کوئی بات بگڑی تو بہت زیادہ پریشانی ہو جائے گی۔ مگر جلد ہی بعد دماغ سے بوجھ اتر گیا۔

مسٹر جوشی کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ ان کو مختلف قسم کی باتیں کثرت سے یاد ہیں۔ انھوں نے دلچسپ واقعات سنانے شروع کئے اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ میں جسمانی کلفت کے ماحول سے نکل کر ذہنی سفر کی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔

مسٹر پرکاش جوشی نے ایک قصہ سنایا جس کا تعلق اچاریہ نریندر دیو اور سمپورنانند سے تھا۔ میں نے سمپورنانند کو نہیں دیکھا۔ البتہ اچاریہ نریندر دیو کو ایک بار لکھنؤ میں سنا ہے۔ شستہ اردو میں انھوں نے ایسی تقریر کی تھی جیسے کہ مقرر کے منھ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ ایسا مقرر میں نے اپنی زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔

سمپورنانند جی اچاریہ نریندر دیو کے شاگرد تھے۔ ۱۹۵۵ میں سمپورنانند یوپی کے چیف منسٹر تھے۔ اس وقت سمپورنانند کا تعلق کانگرس سے تھا اور اچاریہ نریندر دیو کا پرجا سوشلسٹ پارٹی سے جو کانگرس کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ لکھنؤ میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کا پولیٹیکل رزولیوشن اگلے دن پیش ہونے والا تھا۔ اور اس کا ڈرافٹ اچاریہ نریندر دیو کو تیار کرنا تھا۔

عین اس وقت اچاریہ نریندر دیو بیمار پڑ گئے۔ سمپورنانند رات کے وقت اپنے گرو کو دیکھنے کے لئے آئے۔ اچاریہ نریندر دیو نے ان سے کہا کہ دیکھو، کل مجھے اپنی پارٹی کے اجلاس میں پولیٹیکل رزولیوشن پیش کرنا ہے مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں اس کو لکھ نہیں سکا۔ تم اس رزولیوشن کا ڈرافٹ تیار کر دو۔ سمپورنانند نے تعجب کے ساتھ کہا کہ میں اور آپ کا پولیٹیکل رزولیوشن۔ کیوں کہ یہ رزولیوشن اسی کانگرسی حکومت کے خلاف لکھنا تھا جس کے سمپورنانند چیف منسٹر تھے۔ اچاریہ نریندر دیو نے کہا کہ ہاں، تم ہی اسے لکھو۔ سمپورنانند نے کہا کہ جب آپ کہہ رہے ہیں تو بہر حال مجھے اس کو لکھنا ہو گا۔

سمپورنانند اپنی سرکاری رہائش گاہ میں واپس آئے اور رات بھر جاگ کر پرجا سوشلسٹ پارٹی کا پولیٹیکل رزولیوشن تیار کیا۔ اگلی صبح کو انھوں نے یہ ڈرافٹ اچاریہ نریندر دیو کے پاس بھیج دیا۔

اگلی رات کو سمپورنانند دوبارہ اپنے استاد کی عیادت کے لئے گئے۔ بات چیت کے

دوران انھوں نے اچاریہ نریندر دیو سے پوچھا کہ اس رزولیوشن کا کیا ہوا۔ اچاریہ جی نے کہا کہ وہ پارٹی کے اجلاس میں پیش ہوکر پاس بھی ہوگیا۔ سمپورنانند نے کہا کہ آپ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اچاریہ نریندر دیو نے کہا کہ جس چیز کو تم نے لکھا ہو اس کو مجھے دیکھنے کی کیا ضرورت۔ میں نے تو اسے پڑھے بغیر ہی فوراً آگے بڑھا دیا تھا۔ یہ رزولیوشن اگرچہ خود سمپورنانند سرکار کے خلاف تھا مگر اس کا ڈرافٹ اتنے اچھے انداز میں تیار کیا گیا تھا کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لوگوں کو شبہ تک نہیں ہوا کہ اس کو اچاریہ نریندر دیو کے سوا کسی اور نے لکھا ہوگا۔

مسٹر پربھاش جوشی نے ایک اور واقعہ ۱۹۷۶ کا بتایا۔ یہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ رام ناتھ گوئنکا کا اخبار انڈین اکسپریس ہمیشہ ایمرجنسی کے خلاف لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ کانگرس گورنمنٹ اس کی سخت مخالف ہوگئی۔ ان کا اکاؤنٹ منجمد کر دیا گیا۔ سنجے گاندھی نے تمام بینکوں کو ٹیلیفون کر دیا کہ کوئی بھی گوئنکا کو پیسہ نہ دے۔ چنانچہ ایسا وقت آگیا کہ ۵ - ۱۰ ہزار روپیہ کی رقم بھی گوئنکا کے لئے مشکل ہوگئی۔ اسی زمانہ میں انڈین اکسپریس کے ایڈیٹر مسٹر ملگاؤنکر کا چک بینک سے یہ لکھ کر واپس آگیا کہ کھاتہ میں رقم موجود نہیں۔

گھنشیام داس برلا اس وقت ملک کے نمبر ایک صنعت کار تھے۔ برلا کا تعلق کانگرس سے تھا اور گوئنکا کا تعلق اپوزیشن سے۔ مگر جب برلا کو معلوم ہوا تو وہ فوراً ان کی مدد کے لئے تیار ہوگئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگر وہ خود گوئنکا سے ملنے کے لئے جائیں تو یہ خبر مشہور ہوگی اور اگر گوئنکا کو اپنے یہاں بلائیں تب بھی لوگ اس کو جان لیں گے۔ اور پھر ان کے لئے گوئنکا کی مدد کرنا مشکل ہوجائے گا۔ چنانچہ برلا نے اپنا ایک آدمی رات کے وقت گوئنکا کے پاس بھیجا۔ برلا نے اس سے کہا کہ گوئنکا کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ اپنے اصول سے نہ ہٹیں، وہ اس پر پوری طرح جمے رہیں۔ جہاں تک پیسہ کا سوال ہے تو میں اس کا انتظام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ گوئنکا نے آدمی سے کہا کہ تم واپس جاؤ اور جاکر برلا جی سے کہو کہ میری ضرورت تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کتنی رقم کی حد تک میری مدد کرسکتے ہیں۔

برلا نے کہا کہ جاکر میری طرف سے گوئنکا جی کو کہہ دو کہ :

وہ دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ کیوں کہ برلا کانگرس میں تھے اور گوئنکا کانگرس مخالف گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ گوئنکا نے برلا سے کوئی رقم تو نہیں لی مگر اس کے بعد وہ برلا کے بہت معتقد ہوگئے۔ ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد گوئنکا کا دور دورہ ہوگیا۔ اس کے بعد برلا کی سالگرہ آئی تو انھوں نے خصوصی اہتمام کے ساتھ ایک ہزار سرخ گلاب کا پھول برلا کی خدمت میں پیش کیا۔

ہماری گاڑی دلی کی سڑکوں پر گھومتی ہوئی ایئر پورٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور مسٹر پربھات جوشی ایک کے بعد ایک اس قسم کے واقعات بتا رہے تھے۔ ایئر پورٹ پہنچ کر میں گاڑی سے باہر نکلا تو مسٹر آنند سنگھ ہماری رہنمائی کے لئے موجود تھے جن کو مسٹر جوشی نے پہلے ہی ایئر پورٹ پر بھیج دیا تھا۔ مسٹر آنند سنگھ انڈین ایکسپرس کے ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ وہاں وھیل چیئر کے ساتھ موجود تھے۔ میں گاڑی سے نکل کر وھیل چیئر میں بیٹھ گیا۔ کیونکہ آپریشن کی وجہ سے ڈاکٹر نے مجھے چلنے سے منع کر دیا تھا۔

ایئر پورٹ سے ہوائی جہاز تک کا راستہ وھیل چیئر کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی سفر میں وھیل چیئر استعمال کی۔ جب ایئر پورٹ کا ایک آدمی میری وھیل چیئر کو چلاتا ہوا جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا تو آخرت کے معاملہ کو سوچ کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، دنیا میں بھی میں عاجز تھا اور آخرت میں بھی میں عاجز ہوں گا۔ یہاں آپ نے میرے عجز کی تلافی کے لئے "وھیل چیئر" کا انتظام فرما دیا۔ آخرت میں بھی میرے عجز کی تلافی کے لئے وہاں کی "وھیل چیئر" مجھے دے دیجئے تاکہ میں وہاں کے سخت تر مرحلہ کو آسانی کے ساتھ طے کر سکوں۔

۲۸ مئی کی شام کو دہلی سے اندور کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۳۳۴ تھی۔ تمام مسافر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سیفٹی بلٹ باندھ چکے تھے۔ جہاز کے دروازے بھی بند کر دئے گئے۔ مگر آخر وقت میں اعلان ہوا کہ جہاز کچھ لیٹ ہو کر روانہ ہوگا۔ اس قسم کا اعلان انڈین ایئر لائنز میں عام ہے۔ مگر اسی ملک میں تقریباً ۴۰ کی تعداد میں پرائیویٹ ایئر کمپنیاں

کام کر رہی ہیں اور ان میں کبھی لیٹ ہونے کا اعلان نہیں ہوتا۔ پرائیوٹ کمپنیوں نے کارکردگی کے میدان میں انڈین ایئر لائنز کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر انڈین ایئر لائنز کو قانونی تحفظ نہیں دیا گیا تو عین ممکن ہے کہ اس کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے۔

پرائیوٹ ہوائی کمپنیوں میں اس وقت ایسٹ ویسٹ ایئر لائنز ٹاپ پر ہے جو کہ بمبئی کے کچھ مسلمانوں نے قائم کی ہے، میں نے ایک مسلمان سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جس ملک میں مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ وہاں کی سب سے طاقت ور ایئر لائنز بنا سکیں، وہاں مسلمانوں کو مظلوم بتا کر فریاد کرنا جہالت کے سوا اور کچھ نہیں۔

جہاز کے اندر مختلف چیزیں پڑھیں۔ دہلی کے ہندی اخبار سانددھیہ ٹائمز (۲۸ مئی) میں ایک رپورٹ چھپی تھی اس کا عنوان یہ تھا: تمباکو پینے اور کھانے سے ہر سال ۸ لاکھ لوگ مرجاتے ہیں۔

تمباکو کے نقصان کے بارہ میں اس قسم کی خبریں اور مضامین سالہا سال سے چھپ رہے ہیں مگر تمباکو کے استعمال میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا کہ تمباکو کا نقصان تو اسی دکھائی دینے والی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ایسے کھلے ہوئے نقصان کے باوجود لوگ تمباکو نوشی چھوڑنے پر تیار نہیں تو اخلاقی اور روحانی غلطیوں کا نقصان تو آنکھوں سے نہ دکھائی دینے والی آخرت سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اس کو بھلا کون چھوڑنے پر راضی ہوگا۔

راستہ میں ٹائمس آف انڈیا (۲۸ مئی) دیکھا۔ اس کے درمیانی صفحہ پر مسٹر دیویک بھارتی کا مضمون انڈیا کی موجودہ صنعتی پالیسی کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ باہر کی جو کمپنیاں ہندستان میں اپنے کارخانے لگا رہی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ یہاں کا بنایا ہوا سامان جب وہ باہر کی مارکیٹ میں لے جائیں تو اس پر ہندستان کا نام چھپا ہوا نہ ہو۔ مثلاً ماروتی ادیوگ لمیٹڈ میں جاپان کی فرم سوزوکی حصہ دار ہے جو "سوزوکی ماروتی" گاڑی تیار کرکے فروخت کر رہی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ اس کی نئی کار زین (Zen) کے ساتھ ماروتی کا لفظ شامل نہ ہوگا۔ باہر کی مارکیٹ میں وہ صرف زین کے نام سے فروخت کی جائے گی:

Its new car, Zen, will no longer, carry the Maruti tag when sold in foreign markets.

کوئی ہندستانی فرم جب کسی بیرونی فرم کے ساتھ اشتراک کرتی ہے تو وہ اہتمام کے ساتھ اس کے نام کا اعلان کرتی ہے۔ مگر بیرونی فرم اپنے ہندستانی اشتراک کو پوشیدہ رکھ کر اپنا سامان بیچنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر کی مارکیٹ میں میڈ ان انڈیا کی کوئی قیمت نہیں۔ جب کہ ہندستان میں "فارن" کا لفظ طلسماتی تاثیر رکھتا ہے۔

آزادی کے بعد یہاں کے ایک فرقہ نے کہا کہ فخر سے کہو ہم مسلمان ہیں۔ دوسرے فرقہ نے کہا کہ گردسے کہو ہم ہندو ہیں۔ لوگ اپنے گرد ہی فخر میں مبتلا رہے۔ کوئی بھی ہندستان کو پر فخر بنانے کے لئے سرگرم نہ ہو سکا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے جو مذکورہ صورت میں آج دکھائی دے رہا ہے۔

دہلی سے اندور تک یہ جہاز براہ راست نہیں جاتا۔ چنانچہ وہ دہلی سے اڑکر پہلے گوالیار میں اترا۔ وہاں سے روانہ ہو کر بھوپال میں رکا۔ بھوپال کے بعد اندور پہنچا۔ جب جہاز اندور کی فضا میں داخل ہوا تو میں نے سوچا کہ میری زندگی بھی اسی طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اب آخری مرحلہ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب زندگی کی سواری دنیا میں جگہ جگہ رکتی ہوئی آخر کار آخرت کے عالم میں اتر جائے۔

اندور میں جہاز سے اترنے کے بعد دوبارہ وھیل چیئر موجود تھی۔ جہاز کے اندر ہی سیٹ سے اتر کر وھیل چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد کار تک کا پورا فاصلہ وھیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے طے ہوا۔

اس وقت میرے پاس صرف وہی کپڑا تھا جو میرے جسم کے اوپر تھا۔ مسٹر پرکاش جوشی نے کہا کہ ہم کھادی بھنڈار سے ایک جوڑا کپڑا حاصل کریں گے۔ میرے سخت منع کرنے کے باوجود وہ لوگ اندور کے بازار میں اِس دکان سے اُس دکان گھومتے رہے۔ مگر اس وقت رات کے دس بج چکے تھے، چنانچہ کپڑا انہیں ملا۔ صرف کھادی کا ایک تولیہ ملا وہ انھوں نے لاکر مجھے دیا۔ اور مجھے بہر حال اس کو قبول کرنا پڑا۔

جب میں گاڑی پر سوار ہوکر ایئر پورٹ سے روانہ ہوا اور اندور کی سڑکوں سے گزرنے لگا تو اچانک یاد آیا کہ میں اپنا وہ نوٹ بک ہوائی جہاز میں بھول آیا ہوں جس میں میں اپنی سفری یادداشت لکھ رہا تھا۔ میری عادت ہے کہ میں سفرنامہ کی باتیں دریان سفر ہی میں لکھتا ہوں۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے مجھ کو دیکھ کر کہا کہ آپ ناولسٹ تو نہیں۔ لوگ عام طور پر ناول پڑھتے ہیں اس لئے وہ کتاب کے نام پر ناول ہی کو جانتے ہیں۔ جب وہ کسی رائٹر کو تحریری کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اپنے ذہن کے مطابق سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ناول لکھ رہا ہوگا۔ جب میں اترتے ہوئے اپنا نوٹ بک جہاز کے اندر بھول گیا تو اچانک دماغ کو سخت جھٹکا لگا کہ اب کیا ہوگا اور سفرنامہ کیسے لکھا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر قرآن کا ایک حصہ لکھا اور پھر وہ ان سے کھو گیا۔ اس حصہ کو انھیں دوبارہ لکھنا پڑا۔ اس واقعہ کا تذکرہ انھوں نے اپنے تفسیر قرآن کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے فیضی کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ کہا ہوا اگر میرے ہاتھ سے چلا گیا تو شکر ہے کہ نہ کہا ہوا ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ ۲۰۰ خزانوں میں سے میں نے صرف ایک مٹھی بھر موتی کو کھویا ہے:

گفتہ گرشد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجا ست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

میرا حافظہ اتنا اچھا نہیں ہے کہ میں اپنی کسی گم شدہ تحریر کو دوبارہ اسی طرح لکھ ڈالوں۔ میں نے سوچا کہ میرے اندر فیضی اور ابوالکلام جیسی اعلیٰ یادداشت ہوتی تو شاید وہ میرے لئے اچھی بات نہ تھی۔ کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ وہ میرے اندر متکبرانہ نفسیات پیدا کر دیتی۔ مجھ کو یہ زیادہ پسند ہے کہ میں اپنی کمتر یادداشت کے احساس کی بنا پر عجز اور فروتنی کی نفسیات میں مبتلا رہوں۔

ایئر پورٹ سے چل کر ہم لوگ اندور یونیورسٹی پہنچے۔ یہاں پہلی رات کے لئے ہم لوگوں کا قیام اندور یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ ۲۸ مئی کی شام کو یہاں کئی لوگ کھانے کی میز پر تھے۔ ان میں سے اکثر میرے لئے اجنبی تھے۔ میں خاموشی ان لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ ایک صاحب نے کہا کہ بھارت میں بہت غریبی ہے۔ اور اس کی وجہ یہاں کے سماجی

جھگڑے ہیں۔ آزادی کے بعد یہاں برابر فرقہ وارانہ جھگڑے جاری ہیں۔ اس بنا پر یہاں ترقی کا کام نہ ہوسکا۔ ایک اور صاحب بولے کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس معاملہ میں آر ایس ایس کی سوچ کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بٹوارہ کے باوجود ۱۴ کروڑ مسلمان اس دیش میں رہ گئے۔ انڈیا کی غربت کا اصل سبب یہی لوگ ہیں۔ ہم کو اس اصل کارن کو دور کرنا ہے۔ جب تک غریبی کی اصل جڑ کو ختم نہ کیا جائے اس وقت تک ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی۔

اندور مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا شہر ہے۔ راجدھانی کی حیثیت سے بھوپال کی اہمیت زیادہ ہے۔ مگر تجارت اور رقبہ کے اعتبار سے اندور زیادہ بڑا ہے۔ اندور کی آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً ڈھائی لاکھ مسلمان ہیں۔ یہاں ۱۲۰ مسجدیں ہیں اور بہت سے چھوٹے بڑے مدرسے ہیں۔

اندور ۱۷۱۵ میں ایک مقامی بازار کے طور پر قائم ہوا۔ پھر بڑھتے بڑھتے ایک مکمل شہر بن گیا۔ اندور یونیورسٹی ۱۹۶۴ میں بنی۔ اٹھارویں صدی میں یہ مراٹھا ہولکر اسٹیٹ کا مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اندور کا نام اندریشور مندر کے نام پر پڑا ہے۔

۲۸ مئی کا دن بہت گرم تھا۔ شام تک گرمی کا احساس ستاتا رہا۔ تاہم یہ مالوہ کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ کی رات گرمی کے موسم میں بھی بہت سہانی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ صبح اودھ اور شام بنارس کے ساتھ شب مالوہ کافی مشہور ہے۔

رات کو اچھی نیند آئی صبح کو سو کر اٹھا۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں فجر کی نماز تنہا پڑھی۔ عجز میرا مزاج ہے۔ آجکل آپریشن کی وجہ سے عجز کا احساس مزید غالب آگیا ہے۔ دلفگاری کے جذبہ کے تحت میں نے کہا کہ نماز کی اصل حقیقت یقینی طور پر عجز ہے۔ انسان کا احساس عجز جب عبادتی ہیئت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام نماز ہے۔

صبح کو اپنے کمرہ سے باہر آیا تو موسم کل کے مقابلہ میں بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سرسبز درخت ٹھنڈی ہوائیں بکھیر رہے تھے۔ چڑیوں کے چہچہے کائناتی نغمے بن کر فضا کی خوشگواری میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

اچانک خیال آیا کہ رنگ و بو کی اس کائنات کے خالق کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس

نے مجھے آنکھیں دیں تاکہ میں اس آفاقی حسن کو دیکھ سکوں۔ اس نے مجھے کان دئے تاکہ یہاں کے سرمدی نغمے میرے لئے قابل سماعت بن جائیں۔ اس نے مجھے شعور دیا تاکہ میں کائنات کی اتھاہ معنویت کا ادراک کرسکوں۔ انسان اگر ان صلاحیتوں کے بغیر ہوتا تو اس کی زندگی کتنی زیادہ بے لطف ہو جاتی۔

مگر موجودہ دنیا میں یہ حواس لطف اندوزی کے لئے نہیں دئے گئے بلکہ اس لئے دئے گئے ہیں تاکہ انسان اپنے خالق کو شکر کا نذرانہ پیش کرسکے۔ ہماری زندگی کی کامیابی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ ہم نے اس دنیا میں کتنا زیادہ سامان لطف حاصل کیا بلکہ اس کا پیمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا زیادہ احساس شکر کا ثبوت دے سکا۔

اندور یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں "مدھیہ پردیش شاسن" کا ہندی کا کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ہر صفحہ پر دو تاریخیں درج تھیں۔ کھلے ہوئے صفحہ پر ایک طرف "مئی ۱۹۹۳" لکھا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف "ویشاکھ۔ جیٹھ 1915" درج تھا۔ یہ کلینڈر اگر کسی مسلم ادارہ نے چھاپا ہوتا تو اس پر مئی ۱۹۹۳ کے ساتھ ذی الحجہ ۱۴۱۳ چھپا ہوا ہوتا۔

میں نے سوچا کہ اسی قسم کے اختلافات ہیں جن کو بڑھا کر دو قومی نظریہ کا پرچار کیا گیا۔ اور ملک کا بٹوارہ کرایا گیا۔ اور اب دوبارہ اسی قسم کے اختلافات ہیں جن کو لے کر ہمارے لیڈر باہمی نفرت پھیلانے میں مصروف ہیں حالاں کہ یہ فرق یا اختلاف کسی انسان کے گھڑے ہوئے نہیں۔ وہ فطرت کے نقشۂ تخلیق پر مبنی ہیں جن کو نہ انسان نے بنایا اور نہ وہ ان کو بدلنے پر قادر ہے۔

مثلاً اگر فطرت کے نظام میں یہ نہ ہوتا کہ سورج کی گردش کا اصول الگ ہے اور چاند کی گردش کا اصول الگ۔ اگر خود فطرت میں یہ فرق نہ ہوتا تو ایک سے زیادہ کلینڈر بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس اختلاف کو تنوع سمجھ کر اس کو قبول کرنا چاہئے نہ کہ اس کو دو انسانی گروہوں میں ٹکراؤ کا اشو بنایا جائے۔

۲۹ مئی کی صبح کو ہندی روزنامہ پربھات کرن (اندور) کے نمائندہ مسٹر راجندر گپتا آئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا، سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ فرقہ وارانہ حالات

سے تھا۔

۲۹ مئی کی صبح کو ایک بڑی گاڑی آئی اور گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس میں بیٹھ کر مجھے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس سے کستور باگرام جانا تھا جو یہاں سے تقریباً ۵ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اس گاڑی کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ بابا آمٹے کی ایمبولنس گاڑی ہے۔ اس میں ایک طرف گدے دار بستر لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف گیس، چولھا اور گھر کا تمام ضروری سامان موجود تھا۔ یہ گویا ایک چلتا پھرتا مکان تھا۔ اس میں اندر داخل ہو کر اس کے گدے پر لیٹ گیا۔

گاڑی سڑک پر چلتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد دوبارہ وہ ایک ہری بھری پرسکون بستی کے اندر رکی۔ یہ کستور باگرام تھا جو یہاں ۱۹۵۰ سے قائم ہے۔ یہاں عورتوں کی تعلیم اور ٹریننگ کا انتظام ہے۔ یہاں کا چھوٹے سے لے کر بڑے کام تک سب کچھ عورتیں کرتی ہیں۔ چاروں طرف کھلا ہوا سبز اور پرسکون ماحول ہے۔ اسی پر امن جزیرہ میں سیمینار کے دو روزہ اجلاس ہوئے۔ گیسٹ پر جلی حرفوں میں کپڑے کا ایک بینر لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا: چیتنا ابھیان، راشٹر سیمینار، اندور

کستور باگرام کے اس سیمینار میں پہلی بار بابا آمٹے سے ملاقات ہوئی۔ وہ سادگی اور جفاکشی کا زندہ نمونہ ہیں۔ بابا آمٹے اپنے فلسفۂ حیات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

I sought my soul, my soul I could not see;
I sought my God, my God eluded me;
I sought my brother and I found all the three.

بابا آمٹے طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں۔ ان کی موجودہ حالت یہ ہے کہ وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ ان کے لئے دو ہی صورت ہے، یا کھڑے رہیں یا لیٹے رہیں۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ جب آپ بیمار ہیں تو آپ اتنا زیادہ سفر کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: یہ صحیح ہے کہ میں بیمار ہوں۔ مگر میرا دیش تو اس سے بھی زیادہ بیمار ہے۔

ان کے بہت سے کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ وہ کوڑھیوں کا آشرم چلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کوڑھیوں کے بدن خراب ہیں مگر ان کے من اچھے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے بدن اچھے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کے من خراب ہو چکے ہیں۔

یہ سطریں میں کستور باگرام گیسٹ ہاؤس کے نیچے کے کمرہ میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ کچھ لوگ

آئے اور ناشتہ کے لئے لے گئے۔ ۲۹ مئی کی صبح کو ناشتہ میں نے کستور باگرام میں کیا۔ سادہ کھچڑی اور ایک گلاس گرم دودھ، یہ ناشتہ تھا، جو میرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ کیوں کہ کھانا جتنا زیادہ سادہ ہو اتنا ہی زیادہ مجھ کو پسند آتا ہے۔

۲۹ مئی کو صبح ۹ بجے کستور باگرام کے ہال میں کارروائی شروع ہوئی۔ منچ پر دوسرے لوگ گدے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دو آدمی کا معاملہ الگ تھا۔ بابا آمٹے اپنی معذوری کی بنا پر منچ کے کنارے ایک کھاٹ پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں پاؤں سمیٹ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا چنانچہ منچ پر میرے لئے ایک کرسی رکھی گئی۔

وسیع ہال پورا بھرا ہوا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ آئے تھے۔ مسلمان اور سکھ اور عیسائی بہت تھوڑی سی تعداد میں تھے۔ مجموعی طور پر شاید ایک درجن ہوں گے۔ بقیہ تمام حاضرین ہندو کمیونٹی کے پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام اس کا دعوت نامہ بھیجا گیا تھا، مگر وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔

ایک ہندو پروفیسر نے سیلن کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دیش ہماری چنتاؤں کا وشے ہے۔ ہمارا دیش ٹوٹنے سے بچ جائے، بگڑنے سے بچ جائے۔ اس کے لئے ہم سب یہاں اکٹھا ہوئے ہیں۔ اس طرح کے ایک افتتاحی خطاب کے ساتھ سیلن کا آغاز ہوا۔

پروفیسر سروج کمار جلسہ کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ میری باری آئی تو انھوں نے کہا کہ آپ ہم کو کچھ پریکٹیکل پروگرام دیجئے۔ اس سے ہم سب کو آگے بڑھنے کا ایک راستہ ملے گا۔ میں نے قرآن وحدیث کے حوالے سے ایک تفصیلی تقریر کی۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس دنیا کے بنانے والے نے دنیا کو ہمارے لئے ماڈل بنا دیا ہے۔ بقیہ کائنات جس سلوک کو مجبورانہ طور پر اختیار کئے ہوئے ہے اسی کو ہمیں اختیارانہ طور پر اپنانا ہے۔ دنیا کے تمام جانور قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) رکھتے ہیں۔ یہی قابل پیشین گوئی کردار جو دوسرے حیوانات میں فطرت کے حکم کے تحت ہے، اسی کو ہم خود اپنے اختیار سے اپنا لیں۔ اسی طرح گلاب کا درخت ہمیں ایک پیغام دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں "کانٹے" بھی ہیں اور 'پھول' بھی۔ اس لئے تم کانٹوں سے اپنے دامن کو بچاؤ اور احتیاط کے ساتھ پھول کو حاصل

کرلو۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

اندور چرچ کے فادر ورگیز نے کہا کہ ہم کو اس سمیلن میں یہ وچار کرنا ہے کہ ہمارے راشٹر کا سروپ کیا ہونا چاہئے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی پاکستان سے زیادہ مسلمان بھارت میں رہتے ہیں۔ وہ برابر کے ناگرک ہیں۔ ہمارا دیش بہت بڑا دیش ہے۔ اس کو بڑا بن کر رہنا ہے۔ ہم چھوٹے دیشوں کی طرح نہیں رہ سکتے۔

منوہر سنگھ مہتا (شکچھا منتری) نے آنے والوں کا سواگت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس دیش کی سوتنترتا کے لئے ہم بھینٹ دے رہے ہیں، ہمارے ہی جیون کال میں اس کی ایسی استھتی ہو جائے گی۔ دیش کے ہر ناگرگ کو برابر کا حق ملے، یہ گاندھی جی نے کہا تھا۔ اس کو ہمیں دیش میں لانا ہے۔ اگر ہم دنگوں اور جھگڑوں میں پڑے رہے تو ہمارا کیا بنے گا۔ یہی سوچنے کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔

جواہر لال راٹھور نے کہا کہ یہ ابھیاس منڈل سرودھرم سمبھاؤ کے پرچار کے لئے کیا گیا ہے۔ ماتا کستوربا کے اس استھان سے ہم ایک نئی جیوتی جگانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ہندستان کی اس دھرتی پر پیدا ہوئے وہ سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے، اس کے لئے ہم اکٹھا ہوئے ہیں۔ ہم دیش کو ٹوٹنے اور بکھرنے نہیں دیں گے۔ بھارت میں کوئی ایک نمبر کا ناگرگ اور کوئی دو نمبر کا ناگرگ نہیں ہے۔ ہم سب بھارتی ہیں۔ ہم سب ہندستانی ہیں۔

اس کے بعد حسب پروگرام کچھ خواتین اسٹیج پر آئیں۔ انھوں نے مل کر ایک گیت گایا جس میں سب بھائی چارہ کی باتیں تھیں۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

لہو کا رنگ ایک ہے تو دور کیا قریب کیا　　لگالو سب کو تم گلے حبیب کیا رقیب کیا

اندور شہر کا ایک محلہ دولت گنج ہے۔ یہاں ۶ دسمبر کے بعد کچھ فساد ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی لوگ سنبھل گئے۔ اس کے بعد وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مثالی اتحاد کا ثبوت دیا چنانچہ دولت گنج کے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا انتخاب ہوا۔ دونوں اسٹیج کے پاس آئے اور انھوں نے مل کر سبھا کی دیپک جلائی۔

بابا آمٹے نے اس طرح تقریر کی کہ وہ مائک کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان کا

ایک پاؤں زمین پر تھا اور ایک پاؤں اسٹول پر۔ انھوں نے کہا کہ میں سارے دیش میں گھوما ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ دیش میں مجارٹی میں وہ لوگ ہیں جو شریف ہیں۔ اور جو غنڈے ہیں وہ مائنارٹی میں ہیں۔ میں اگرچہ شکستہ جسم ہوں مگر میں شکستہ روح نہیں :

Though I am broken in body,
I am not broken in spirit.

میں سورت گیا جب کہ وہاں فساد ہو چکا تھا۔ میں نے وہاں کے لوگوں سے کہا کہ تم نے سورت کو بدصورت کر دیا۔ جو لوگ دوسروں کے خلاف بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ یہ یکطرفہ معاملہ نہیں ہے۔ ہر شکاری کو معلوم ہے کہ شکار کرنے والا بھی کبھی شکار ہو جاتا ہے۔ بابا آمٹے کے الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر کسی نے کہا کہ آپ اپنے بالوں میں کنگھی نہیں لگاتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں پوری قوم کے بال سنوار رہا ہوں:

I am combing the whole nation.

ڈاکٹر پرکاش آمٹے (فرزند بابا آمٹے) کا کلینک گجرات میں ہے۔ وہ جانوروں میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کھیلتے ہیں۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ اس طرح جانوروں میں رہتے ہیں۔ کیا آپ کو ان سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ جانوروں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تمام جانور اپنے سلوک کے معاملہ میں قابل پیشین گوئی (predictable) ہیں۔ اس دنیا میں صرف ایک ہی مخلوق ہے جو اپنے سلوک کے معاملہ میں ناقابل پیشین گوئی (unpredictable) ہے اور وہ انسان ہے۔ اگر تم جانوروں کے ساتھ اپنے سلوک کو درست رکھو تو وہ تمہارے اوپر حملہ نہیں کرے گا۔ جب کہ انسان کے معاملہ میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ کب کیا کر ڈالے۔

مسٹر سبارا ؤ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں اجودھیا گیا وہاں میں نے ہندوؤں سے پوچھا، یہ بتاؤ کہ رام کیا دسرتھ کے بیٹے تھے۔ سب نے کہا ہاں۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ دسرتھ راجہ تھے یا نہیں۔ سب نے کہا کہ ہاں وہ راجہ تھے۔ میں نے پھر پوچھا کہ جب وہ راجہ تھے تو وہ محل کے اندر رہتے رہے ہوں گے۔ سب نے کہا کہ ہاں۔ اب میں نے ان لوگوں سے کہا کہ

جب رام ایک راجہ کے بیٹے تھے تو وہ ضرور محل کے اندر پیدا ہوئے ہوں گے۔ اگر دسرتھ صرف ایک مندر کے پجاری ہوتے تو سمجھ میں آسکتا تھا کہ ان کا بیٹا مندر میں پیدا ہوگا۔ جب دسرتھ ایک راجہ تھے تو ان کا بیٹا محل میں پیدا ہوگا نہ کہ کسی مندر میں۔ ایسی حالت میں یہ رام جنم بھومی کا جھگڑا کیوں۔

۱۱ بجے چائے کا وقفہ ہوا۔ ایک ڈاکٹر باباآمٹے سے ملنے کے لئے آئے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ باباآمٹے دل کے مریض ہیں۔ اس وقت بھی وہ اسپتال سے اٹھ کر یہاں آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میرے پاس ایک طبی نصیحت ہے۔ آدمی اگر اس کو سوچ لے تو اس کا سارا تردد ختم ہو جائے۔ وہ یہ کہ آپ کا دل آپ کی زندگی کے آخر وقت تک رہے گا:

Your heart would last your lifetime.

اس کے بعد ماحول میں تازگی لانے کے لئے ایک گیت گایا گیا۔ ایک عورت اور ایک مرد نے اس کو مل کر گایا۔ اس گیت کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ وہ اس طرح تھا:

ہر مذہب کو چاہنے والا، دنیا بھر سے نرالا

ہندستان ہمارا

ایک صاحب جو اکثر بیرونی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں کئی قصے بتائے۔ انھوں نے کہا کہ میں امریکہ گیا تو وہاں میں ایک ہندستانی لیڈی مسز رینوکا کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز مسز رینوکا نے کہا کہ یہ امریکی عورت جو ہمارے یہاں صفائی کے لئے آتی ہے اس کا قصہ سنئے جس سے آپ کو امریکی سماج کا اندازہ ہوگا۔ اس کا نام گولڈی ہے۔ ہمارے یہاں وہ روزانہ دو گھنٹہ کے لئے آتی ہے۔ ہندستانی سکہ کے لحاظ سے ہم اس کو پانچ ہزار روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ اور بہت سے گھروں میں کام کرتی ہے۔ ہر بار جب اسے چیک دینا ہوتا ہے تو مجھے اس کا نام پوچھنا پڑتا ہے کیوں کہ وہ بار بار شوہر بدلتی ہے، اس لئے اس کا نام بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس وقت اس کا چھٹا شوہر ہے۔ مسز رینوکا نے کہا کہ میں نے اس سے اس کے پانچویں شوہر کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ بہت اچھا تھا۔ میں نے جس جس پہلو سے سوال کیا ہر پہلو سے وہ اس کو اچھا بتاتی چلی گئی۔ میں نے کہا کہ جب وہ ہر لحاظ سے ٹھیک تھا تو تم نے اس کو کیوں چھوڑ دیا۔

اس نے جواب دیا: چھ سال اس کے ساتھ رہتے رہتے میں اکتا گئی تھی، اس لئے میں نے اس کو چھوڑ کر ایک اور شوہر کر لیا۔

دوپہر کو دو گھنٹہ کا وقفہ دیا گیا. جلسہ گاہ سے نکل کر گاڑی کے ذریعہ ڈائننگ ہال پہنچا۔ وہاں سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد گاڑی ہی کے ذریعہ اپنے کمرہ میں آیا۔ میں نے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے چھوٹے فاصلوں پر پیدل چلنا میرے لئے ایک محبوب مشغلہ ہے۔ مگر آج عذر کی بنا پر اپنی طبیعت کے خلاف مجھے گاڑی پر بیٹھ کر یہاں سے وہاں جانا پڑتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں اپنے کمرہ میں ایک گھنٹہ (ساڑھے تین بجے تک) آرام کر سکوں گا۔ مگر ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ یہ مختلف ہندی اور انگریزی اخبارات کے مقامی نمائندے تھے جو انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ ان پترکاروں کے نام یہ ہیں: ایشور سنگھ چوہان (لوک سوراج) وی وی متر (فری پریس) شاہد مرزا (فری لانسر) ہیمنت شرما (چوتھا سنسار)، شرو شندی (یو این آئی) ان حضرات کے ساتھ مشترک انٹرویو ہوا۔ وہ لوگ سوال کرتے رہے اور میں ان کا جواب دیتا رہا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ حکومتوں کے بدلنے سے ملک میں ترقی کا دور نہیں آ سکتا۔ ترقی کا دور لانے کے لئے ہمیں لوگوں کی سوچ اور ان کے مزاج کو بدلنا ہوگا۔ ہم اسی مشن کے لئے پچھلے ۲۵ سال سے کام کر رہے ہیں۔

ساڑھے تین بجے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ مسٹر راؤ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج جو سام پر دائکتا دیش میں پھیل رہی ہے وہ ایک زہر ہے۔ اس پر مرہم لگانا کافی نہیں۔ اس کے لئے کچھ اور کرنا ہوگا۔ ان سب کے پیچھے یہ کارن ہے کہ اگر دیش میں روٹی اور روزگار کا انتظام کیا گیا ہوتا تو ایسی پارٹیوں کو عوام میں کبھی مقبولیت نہ ملتی۔ سام پر دائکتا تب تک ختم نہیں ہوگی جب تک لوگوں کی معاشی حالت کو درست نہ کیا جائے۔

شرن بھائی نے کہا کہ ۱۹۹۰ میں کچھ لوگ صرف بابری مسجد پر چڑھ گئے تھے اور اس پر بھگوا جھنڈا لگا دیا تھا تو دیش میں بہت سے دنگے ہوئے تھے۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد

توڑ ڈالی گئی مگر اس کے بعد بہت کم دنگا ہوا۔ اس میں مجھے ایک اچھی علامت دکھائی دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا دیش برے سے اچھے کی طرف جارہا ہے نہ کہ برے سے زیادہ برے کی طرف۔

پر بھاش جوشی نے اپنی تقریر میں کہا کہ سمواد کے لئے پل بنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ دوری ہٹے۔ آج سب سے زیادہ ضروری ڈائیلاگ شروع کرنا ہے۔ اس کا کاریہ کرم بنانا چاہئے۔ جس اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا، اسی اورنگ زیب نے جس مندر کو دیکھا کہ اس کی کوئی ضرورت ہے تو اسے کو پورا کیا۔ عرصہ تک سکھ اپنے آپ کو ہندو سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ ان دو سماجوں کے بیچ میں جتنا لین دین تھا اتنا کسی میں نہیں تھا۔ مگر آج ایسا نہیں۔ ایک ضروری کام ہمیں یہ کرنا ہے کہ مسلمان اور دوسرے اقلیتی سماج جو ہندو سماج سے الگ ہو کر بند سماج بن گئے ہیں ان کو کھولنے کا کام کیا جائے۔

ایک نوجوان جے پال نے کہا کہ ہمارا ایک ہی دھرم ہونا چاہئے اور وہ ہے انسانیت کا دھرم۔ ہمیں انسانیت کے دھرم کو پھیلانے کے لئے ایک نئی پارٹی بنانا ہے۔

مسٹر رویندر نے کہا کہ میرے بھوشیہ کا بھارت کیا ہوگا۔ میں مستقبل کے ہندستان میں ہندو یا مسلم کا شبد نہیں سننا چاہوں گا۔ ہمیں سچا انسان بن کر رہنا ہے۔ میں یہاں سامپردائکتا بھی دیکھنا نہیں چاہونگا۔

اس قسم کی تقریریں ۵ بجے شام تک چلتی رہیں۔ اس کے بعد پرارتھنا کا پروگرام ہوا کچھ خواتین نے مل کر روحانی اور انسانی انداز کے گیت گائے۔

پروفیسر مہیش سنگھ نے کہا کہ دھرم کے نام پر اپیل بہت ہو چکی۔ اب ہمیں کچھ آگے بڑھنا چاہئے۔ دھارمک اپیل سے کام نہیں بنا، اس لئے اب ایسی چیز کو تلاش کرنا ہے جس میں لوگوں کے لئے اپیل ہو۔ ہمیں شاستر آرتھ کا طریقہ چھوڑ کر سمواد کا طریقہ اپنانا چاہئے۔ پنجاب میں ہندو اور سکھ کے درمیان سانسکرت الگاؤ نہیں تھا، تب بھی دونوں کے بیچ میں جھگڑا پیدا ہوا۔ اس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

پروفیسر سورج کمار نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا تستی کرن ہوا ہے۔ ان کا اپیزمنٹ ہوا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا تستی کرن ہوا ہے تو مسلمان کیوں ہندوؤں سے

زیادہ خوش حال نہیں۔ مسلمان کیوں سروسوں میں زیادہ نہیں۔ مسلمان کے گھر ہندوؤں کے گھر سے اچھے کیوں نہیں۔ اگر تستی کرن ہوا ہے تو وہ کچھ مسلم لیڈروں کا ہوا ہے نہ کہ عوام کا۔

جسٹس چندر شیکھر دھرمادھیکاری نے کہا کہ میں گاندھی جی کے ساتھ دس سال رہا ہوں۔ ان کے آشرم میں ہریجن اور برہمن ایک طرح سے رہتے تھے۔ آج جو بگاڑ آیا ہے اس میں ہمیں اپنا رول ادا کرنا ہوگا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ اچھوں کا چپ رہنا بروں کے بولنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ پڑوس بنا سمبندھ (neighbourhood without relationship) کا زمانہ ہے۔ ہمارے سماج میں سجن لوگ بہت ہیں مگر وہ اپنے اپنے میں جیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سجن لوگ ایک دوسرے سے صرف شمشان بھومی ہی میں ملتے ہیں۔

اندور میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔ کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ اکثر لکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ذہنی بیداری کا کام نہیں ہوا ہے۔ یہ آپ کیسے کہتے ہیں جب کہ پچھلے سو سال سے ہمارے یہاں ذہنی بیداری کا کام ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ مثالیں دیں۔

میں نے کہا کہ یہ سب جذباتی اپیل کی مثالیں ہیں نہ کہ ذہنی بیداری کی مثالیں۔ اس سلسلہ میں اقبال اور ابوالکلام آزاد کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے جو کہا یا لکھا وہ سب کا سب جذباتی اپیل سے تعلق رکھتا تھا۔ مثلاً ابوالکلام آزاد نے ایک تقریر میں کہا کہ ستارے ڈوب گئے تو ڈوب جائیں۔ سورج روشن ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور اپنے راستہ میں بچھا دو۔ یا اقبال نے کہا:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس قسم کا کلام صرف جذباتی اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذہنی بیداری کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جذباتی اپیل کا کام بلاشبہ پچھلے سو سال سے بہت بڑے پیمانہ پر ہوتا رہا ہے۔ مگر جذباتی اپیل سے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک بے شعور قوم ایک باشعور قوم کی حیثیت سے اٹھ کر کھڑی ہو جائے۔ ذہنی بیداری در اصل قوم کو باشعور بنانے کا کام ہے۔ اور وہ سنجیدہ لٹریچر کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ خطابت اور شاعری اور انشا پردازی کے ذریعہ۔

ایک مسلم نوجوان سے میں نے کہا کہ دانشور کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا کرے، وہ لوگوں کو صحیح رہنمائی دے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں نے صرف مسلمانوں کو بہکانے کے لئے اپنے علم کا استعمال کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو جھوٹے شبد جنجال میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔

ایک مسلم دانشور کا انگریزی مضمون میں نے پڑھا۔ ان کے پرجوش الفاظ کو اس کی سرخی بنایا گیا تھا کہ اقلیتوں کو دئے ہوئے دستوری حقوق پر کوئی بندش نہیں لگا سکتا:

None can curtail minorities' rights bestowed by constitution.

اسی طرح میں نے ایک مسلم نوجوان کا خط آر ایس ایس کے جواب میں پڑھا۔ آر ایس ایس کے مضمون میں مسلمانوں کو ملک کے بٹوارہ کا ذمہ دار بتایا گیا تھا۔ مسلم نوجوان نے جذباتی انداز میں لکھا تھا: میں ۱۹۴۷ کے بعد پیدا ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ ملک کو کس نے تقسیم کرایا۔

میں نے کہا کہ اس طرح کی باتیں لفظی بھرم سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ مسلم دانشور اس قسم کے الفاظ پچھلے پچاس سال سے بول رہے ہیں اور ان الفاظ کی گونج میں مسلمانوں کے تمام معاملات بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی میں اصل اہمیت حقائق کی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ حقائق کو اپنے موافق بنائیں۔ لفظ ان کے کسی کام نہ آیا ہے اور نہ آئندہ آنے والا ہے۔

یہاں کچھ ایسے نوجوان بھی آئے تھے جن کا تعلق آر ایس ایس سے تھا۔ ایک صاحب سے بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آر ایس ایس کے نظریہ کے مطابق مسلمان کا مذہب الگ ہو سکتا ہے مگر کلچر کے اعتبار سے مسلمان بھی ہندو ہیں، وہ ہندو ہی کا ایک حصہ ہیں:

The RSS ideology holds the Muslims as part of Hindus.

میں نے کہا کہ محض آپ کے کہنے کی وجہ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے پرانے مذہبی شاستروں میں کہیں ہندو کا لفظ موجود نہیں۔ ملکی کانسٹی ٹیوشن یہاں کے باشندوں کو انڈین کہتا ہے، وہ ہندو نہیں کہتا۔ پھر ان دو کے بعد آپ کے پاس کون سی تیسری سند ہے جس کی بنا پر

آپ ایسا کہہ رہے ہیں، اگر صرف کہنے سے ایسا ہوتا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں کے تمام لوگ مسلمان ہیں۔ آر ایس ایس کوئی دلیش کی ٹھیکیدار نہیں ہے۔ اگر آپ کو خود سے کچھ کہنے کا حق ہے تو ہمیں بھی حق ہے کہ ہم خود سے ایک نظریہ بتائیں اور اس کو سب کے اوپر تھوپنا شروع کر دیں۔

ہندستانی اخبارات پر گفتگو کے دوران ایک صاحب سے میں نے کہا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈئنس ہے اور ریڈئنس مسلمانوں کا آرگنائزر۔ میرے نزدیک دونوں ہی زرد صحافت کا نمونہ ہیں۔ انڈیا کے اردو اخبارات اور ہندی اخبارات زیادہ تر اسی سطحی اصولِ صحافت پر چلائے جارہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یورپ اور امریکہ میں بھی زرد صحافت کی کمی نہیں۔ پھر آپ انڈیا ہی کی زرد صحافت کو اتنا زیادہ کنڈم کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یورپ اور امریکہ کی زرد صحافت محض تجارتی نوعیت رکھتی ہے۔ جب کہ یہاں یہ ہے کہ ہندوؤں کے اس قسم کے اخبارات مسلمانوں کے خلاف بری باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھاپتے ہیں اور مسلمانوں کے اس قسم کے اخبارات ہندوؤں کے خلاف بری باتوں کو ڈھونڈ کر نمایاں کرتے ہیں۔ مغرب کی زرد صحافت زیادہ سے زیادہ ایک تماشائی صحافت ہے۔ جب کہ انڈیا کی زرد صحافت فرقہ وارانہ نفرت پیدا کرنے میں مصروف ہے۔ مغرب کی زرد صحافت اگر ایک تفریح ہے تو انڈیا کی زرد صحافت ایک زہر۔

۱۹ مئی ۱۹۹۳ کو میرا ہرنیا کا آپریشن ہوا تھا۔ ۲۸ مئی کو میں نے اندور کا سفر کیا۔ یہ ڈاکٹر کے مشورہ کے خلاف تھا۔ کیوں کہ میں نے ان سے سفر کے لئے پوچھا تو انھوں نے سفر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ابھی تک کافی کمزوری اور تکلیف بھی تھی۔ اس لئے میں خلاف عادت ہر معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کرتا رہا۔

اجتماع گاہ میں کرسی پر بیٹھتا تھا، جب کہ دوسرے لوگ فرش پر بیٹھتے تھے۔ اجتماع کے مقام سے قیام گاہ اور طعام گاہ وغیرہ کے فاصلے زیادہ نہ تھے۔ مگر میں ہر بار گاڑی سے آتا جاتا رہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے کسی اخباری رپورٹر سے لیٹ کر بات کی، وغیرہ۔

مگر اس آپریشن نے مجھے اپنی بات کہنے کے لئے ایک بہت اچھا موضوع بھی دے دیا۔ ایک

مجلس میں میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہرنیا کیسا ہے اور اس کے آپریشن کا مطلب کیا ہے۔ ہرنیا (hernia) ایک لاطینی لفظ ہے جس کا مطلب اپنی حد سے باہر نکل آنا (protrusion) ہے۔ عام طور پر ہرنیا آنتوں کے باہر نکل آنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ آنتوں کے باہر ایک جھلی ہوتی ہے جو اس کو ایک حد میں روکے رکھتی ہے۔ کبھی یہ جھلی پھٹ جاتی ہے یا ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے آنت کا کوئی حصہ باہر نکل آتا ہے۔ اس وقت سرجن یہ کرتا ہے کہ آپریشن کرکے جھلی کو درست کرتا ہے اور آنت کو اس کی اصل جگہ لوٹا دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرنیا کا آپریشن نام ہے حالتِ فطری کے بگڑ جانے کے بعد عضو کو دوبارہ اس کی حالتِ فطری پر قائم کر دینے کا۔ میں نے کہا کہ یہی معاملہ سماج سدھار کا بھی ہے۔ جب بھی کسی سماج میں بگاڑ آتا ہے تو اسی لئے آتا ہے کہ اس کے افراد فطرت کی قائم کی ہوئی حالت سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب ریفارمر کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی سوچ کو بدلے تاکہ وہ دوبارہ اپنی حالت فطری کی طرف واپس ہو جائیں۔ مثلاً ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تعلق کو فطرت نے الفت، یگانگت اور احترام کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ مگر آج ہمارے سماج میں بعض اسباب سے ایسا ہوا ہے کہ نفرت، دوری اور بے قدری نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو دوبارہ ان کی اصل حالت فطری کی طرف لوٹا دیا جائے۔ آج ہر آدمی غیر معتدل جذبات کے تحت دوسرے سے معاملہ کر رہا ہے۔ اب اگر اس کو اعتدال کی طرف واپس کر دیا جائے تو وہ اپنی فطرت کے زیر اثر عمل کرنے لگے گا، اور اس کے بعد سماجی تعلقات اپنے آپ انسانی قدروں کی بنیاد پر قائم ہو جائیں گے۔

ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو تو نصیحت کرتے ہیں مگر ہندوؤں کی فرقہ پرست جماعتوں اور انتہا پسند تنظیموں کو کنڈم نہیں کرتے۔ ایسا کیوں۔

میں نے کہا کہ آپ یوں سوچئے کہ مجھ ایک شخص کے سوا مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ وہی کام کر رہے ہیں جو آپ چاہتے ہیں۔ ہر آدمی بلا استثنار پچھلی نصف صدی سے ان ہندوؤں کی مذمت کرنے میں مصروف ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود ہندوؤں کے ہزاروں لیڈر اور دانشور بھی یہ کام مسلسل طور پر کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں صرف ایک مثال دینا چاہوں گا جو اس

نوعیت کی آخری مثال ہے۔ مہاتما گاندھی جو مسلّمہ طور پر انڈیا کے نمبر ایک لیڈر تھے۔ انھوں نے بار بار نہایت کھل کر ہندو انتہا پسندوں کی مذمت کی۔ اپنی موت سے صرف ایک ہفتہ پہلے انھوں نے ایسے لوگوں کی بابت یہ شدید ترین الفاظ کہے تھے:

> It would spell the ruin of both the Hindu religion and the majority community if the latter, in the intoxication of power, entertains the belief that it can crush the minority community and establish a purely Hindu Raj.

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ سخت الفاظ میں ہندو انتہا پسندوں کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود ہندو انتہا پسندی مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ گویا کہ اب مسئلہ مذمت کا نہیں ہے بلکہ مذمت کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ اگر آپ "مذمت برائے مذمت" کے قائل نہ ہوں بلکہ "مذمت برائے نتیجہ" کے قائل ہوں تو اس معاملے میں آپ کو موجودہ طریقۂ کار کو بدلنے پر غور کرنا چاہئے نہ کہ موجودہ طریقہ کار کو مزید جاری رکھنے پر۔

بمبئی کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے "ہندو تعصب" کا ذکر کیا۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ دیکھئے، بمبئی میں جمعہ کی نماز میں کچھ مسجدوں میں نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو وہ سڑک پر صف بنا لیتے ہیں۔ اس کو ہندو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ہم کو وارننگ دے رہے ہیں کہ سڑک پر نماز پڑھنا بند کر دو، ورنہ . . .

میں نے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اختلاف اور دشمنی کے وقت بھی انصاف سے کام لو۔ اس لئے اس معاملہ میں آپ لوگوں کو انصاف والی بات کہنا چاہئے۔ پھر میں نے کہا کہ اسی ملک میں پچاس سال سے یہ ہو رہا ہے کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے مسلمان جب نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو ہندو مسافر کھڑے ہو کر جگہ خالی کر دیتے ہیں تاکہ مسلمان سہولت کے ساتھ نماز پڑھ سکیں۔ اگر آپ کو اس میں شبہ ہو تو تبلیغی جماعت کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لیجئے۔

اب سوچئے کہ وہی ہندو جو روزانہ ٹرین میں نماز پڑھنے کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے وہی سڑک پر نماز پڑھنے کو کیوں ناپسند کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹرین میں آپ کو نماز کی جگہ دینے سے اس کا سفر بھنگ نہیں ہوتا۔ جب کہ سڑک پر آپ کی نماز سے اس کا سفر بھنگ

ہوتا ہے۔ سڑک سے سفر کرنے والے ہزاروں مسافروں کو سڑک کے اِدھر اور اُدھر اس وقت تک رکے رہنا پڑتا ہے جب تک آپ نماز ختم کرکے سڑک کو خالی نہ کر دیں۔ اس لئے آپ یوں کہئے کہ جو نماز ہندو کی زندگی میں خلل نہ ڈالے اس کا وہ سواگت کرتا ہے، البتہ وہ اس نماز کا مخالف ہے جس سے اس کی زندگی میں خلل واقع ہوتا ہو۔

مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کی اندور بنچ میں حال ہی میں ایک رٹ پٹیشن داخل کیا گیا ہے اس کو داخل کرنے والے اندور کے ستیہ پال آنند ہیں اور وہ بھارت سرکار کے خلاف ہے۔ جسٹس آشارام تیواری نے بھارت سرکار کے نام وجہ بتاؤ نوٹس جاری کر دیا ہے اور اس کی سماعت کی تاریخ ۲۲ جون ۱۹۹۳ مقرر کی ہے۔ اس رٹ پٹیشن میں کہا گیا ہے کہ بھارت سرکار نے اس سال حج کے مسافروں کے لئے چالیس کروڑ روپیہ کے بقدر زرمبادلہ دینا منظور کیا ہے۔ چونکہ حج ایک خالص مذہبی کام ہے، اس لئے اس میں سرکاری تعاون نہیں دیا جا سکتا جو کہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔

اس قصہ کو بتاتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ دیکھئے ہندوؤں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ نہ کہئے کہ ہندوؤں نے شوشہ چھوڑا ہے، بلکہ یہ کہئے کہ ایک آدمی جس کا نام ستیہ پال آنند ہے، اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ اس قسم کے شوشے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ پٹیشن خارج ہو جائے گا اور حاجیوں کے قافلے بدستور مزید اضافہ کے ساتھ حج کے لئے جاتے رہیں گے۔ پھر جو کیس اتنا زیادہ کمزور ہو اس پر اپنا ذہن الجھانے کی کیا ضرورت۔

شام کو سیمیلن کے کئی ذمہ دار میرے کمرہ میں آئے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس سیمیلن میں کوئی ایسا پروگرام بنایا جائے جس کو آئندہ سال بھر تک برابر چلایا جا سکے۔ ہر ایک اپنی اپنی بات کہتا رہا۔ میں زیادہ تر ان کی باتیں سنتا رہا۔

ڈاکٹر چاولہ نے کہا کہ آج کی تقریروں میں زیادہ تر ہندو۔ مسلم تعلقات کا چرچا رہا۔ ہم کو دیش کے دوسرے گروپوں کو بھی لینا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دلت کمیونٹی کے کئی قصے بتائے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں ایک میٹنگ تھی۔ اس میں زیادہ تر دلت لوگ شریک تھے۔

بلراج مدھوک بھی اس میں موجود تھے۔ مسٹر مدھوک نے ڈاکٹر امبیڈکر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ امبیڈکر تو ایک برہمن تھے۔ اتنا بڑا ودوان موجودہ زمانہ میں کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ یہ سنتے ہی تمام دلت بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو آپ نے بابا امبیڈکر کو بہت بڑی گالی دیدی ہم کو یہ بالکل پسند نہیں کہ بابا امبیڈکر کو برہمن کہا جائے۔

۳۰ مئی کی صبح کو میں کستور باگرام کے گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باہر دیکھا تو آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے چلتے ہوئے نظر آئے۔ مجھے یاد آیا کہ عباسی سلطنت کے زمانہ میں خلیفہ ہارون الرشید بغداد میں اپنے محل کے اوپر تھا۔ اس کو بھی اسی طرح بادل کے ٹکڑے آسمان میں چلتے ہوئے دکھائی دئے۔ اس کو دیکھ کر اس نے کہا: جہاں چاہے جا کر برس تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔

مسلمان اپنے آپ کو اسی تاریخی عظمت کے ساتھ منسوب کرتے ہیں جس کا ایک جزء ہارون الرشید تھا۔ مگر ماضی اور حال میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ پہلے ہر جگہ کا خراج مسلم خزانہ میں آتا تھا۔ حتی کہ دنیا کے علوم، دنیا کی قوتیں، دنیا کی سرگرمیاں، سب اسلام کی حامی ومددگار بن گئی تھیں۔ آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔ آج مسلم دنیا کی تمام دولت دوسری قوموں کے پاس چلی جارہی ہے تمام عالمی ذرائع مسلم قوموں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

یہ سب اس کے باوجود ہے کہ مسلمانوں میں ایسی ایسی شخصیتیں ہیں جن کے القاب کئی سطروں میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسی جماعتیں ہیں جن کا کہنا ہے کہ انھوں نے عالم میں اسلام کی ہوائیں چلادی ہیں۔ ایسی تحریکیں ہیں جنھوں نے اپنے دعوے کے مطابق ساری دنیا میں نیا عہد پیدا کر دیا ہے —— موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے الفاظ کے اعتبار سے چوٹی پر ہیں اور حقیقت کے اعتبار سے کہیں بھی نہیں۔

بابا آمٹے نے اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ ان کو ٹرک کا حادثہ ہوا۔ اس کے بعد ان کا حال یہ ہوا کہ ان کی پتنی اور ان کے بیٹے اسپتال آتے تھے اور وہ ان کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ ان کو نسیان (retrograde amnesia) کا عارضہ ہو گیا ہے۔ بابا آمٹے نے کہا کہ آج ہندستانیوں کو اسی طرح قومی نسیان (national amnesia)

کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔ آج ہم اپنے قومی بڑوں کو پہچانتے نہیں۔ یہاں تک کہ گاندھی کو بھی نہیں۔

کانفرنس کے آخری دن ایک خصوصی میٹنگ میں ایک رزولیوشن کا مضمون پیش کیا گیا۔ منتخب کمیٹی کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ہندی زبان میں تھا۔ ایک جگہ "واتاورن" کا لفظ آیا۔ بابا آمٹے نے کہا کہ یہ تو آر ایس ایس کی زبان ہے۔ ماحول لکھو۔ عام بول چال یہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں ماحول کیسا ہے۔

ایک صاحب نے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اکثر پڑھے لکھے ہندو یہ یقین کئے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کا تُسٹی کرن کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کچھ لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ کس کس کو سمجھائیں گے۔ یہ تو ہندو ذہن میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ کانگرس نے مسلمانوں کو اسپیشل کمیونٹی بنا کر رکھا ہے تاکہ وہ انھیں ووٹ دیتے رہیں۔

ایک ہندو بھائی نے بتایا کہ فرقہ پرست ہندوؤں میں مسلمانوں کے تئیں رائے بہت زیادہ سخت ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کا بھارتیہ کرن کرنا ضروری ہے۔ وہ ہندو سنسکرتی کے وسیع تر دائرہ میں ایک محمدی فرقہ بن کر رہ سکتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ مسلمان ایک محمدی سامپردائے ہیں، مگر وہ ہندو وازم کا ایک حصہ ہیں جس طرح دوسرے کئی گروہ اس کا حصہ ہیں۔

مئی کی ۲۹ تاریخ ہے۔ رات کے ۱۰ بجے کا وقت ہے۔ آج کے پروگراموں سے فارغ ہو کر اور عشاء کی نماز پڑھ کر میں اپنے کمرہ میں واپس آیا ہوں۔ یہاں بظاہر مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں۔ لوگ بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ کوئی کام تو نہیں، ہم آپ کی کیا سیوا کرسکتے ہیں۔ مگر میرا دل اندر سے بجھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے احوال کو سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ اس ملک میں (اور اسی طرح ساری دنیا میں) مسلمانوں کو جو سنگین مسائل درپیش ہیں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انھوں نے داعی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔

رسول اور اصحاب رسول کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ [یھا الناس قولوا لا الٰہ الّا اللہ تفلحو] اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے "توحید" کو اپنا اشو بنایا۔ اس وقت عرب میں وہ تمام مسائل موجود تھے جو آج مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ حتی کہ کعبہ کے اندر ۳۶۰

بتوں کی صورت ہیں گویا ایک سپر بابری مسجد بھی موجود تھی۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی اشو نہیں بنایا گیا۔ اشو صرف دعوت توحید کو بنایا گیا۔

موجودہ مسلمانوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ وہ توحید کو اپنا اشو بنائیں۔ ہندستان میں انھوں نے کبھی تقسیم کو اشو بنایا۔ کبھی اردو کو، کبھی مسلم یونیورسٹی کو، کبھی ملی تشخص کو، کبھی مسلم پرسنل لاکو، کبھی بابری مسجد کو۔ رسول اور اصحاب رسول کے نمونہ کے مطابق، یہ سب کے سب نان اشو ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں پوری کی پوری ملت اسی قسم کی چیزوں کی طرف دوڑتی رہی۔ وہ توحید کو اپنا اشو نہ بنا سکی۔

۳۰ مئی کی صبح کو میں کستور با گراؤنڈ کے گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے میں تھا۔ کھڑکی کے باہر صبح کا سہانا سماں آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں خیالات کے سمندر میں کھویا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ بابا آمٹے آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ باہر نکلا تو ایک آدمی چھڑی لئے ہوئے کھڑا تھا۔ سانولا رنگ، جسم کے اوپر کے حصہ میں سفید مارکین کی سلی ہوئی بغیر آستین کی معمولی سی بنیائن، نیچے ایک سفید کپڑے کا جانگھیا، ہاتھ میں ایک چھڑی، یہ تھے بابا آمٹے جو سراپا سادگی اور جفاکشی کا نمونہ ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی انھوں نے فوراً کہا: آپ سے ملنے کی بہت اچھا تھی۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ کہہ کر انھوں نے گفتگو شروع کر دی۔ اور تقریباً دیوانگی کے عالم میں مسلسل بولتے رہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان میں ہندو قوم نے صرف دو شخصیتیں پیدا کیں۔ ایک بابا آمٹے، اور دوسرے ڈاکٹر مودی۔ بابا آمٹے کے خیالات عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لئے نراشا کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہر شکست کی صورتحال کے اندر امکانی فتح کے اسباب بھی موجود رہتے ہیں:

Every defeating situation has within it a potential victory.

عمل کے بغیر آدمی کو کبھی عزت حاصل نہیں ہوتی:

There is no credibility without performance.

۳۰ مئی کو اندور کے سبھی اخباروں میں اس سمیلن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ یہاں کے

ہندی روزنامہ (نئی دنیا ۳۰ مئی) نے اپنی رپورٹ کے ذیل میں جو کچھ لکھا اس کا ایک پیراگراف اردو خط میں اس طرح ہے :

"مولانا وحید الدین نے کہا کہ لوگوں کا سوچ بگڑ گیا ہے جسے بدلنا ہی دیش ہِت کا رَیہ کرم ہوگا۔ آپ نے کہا کہ اخباروں میں آدمیوں کی برائیوں کا پرچار بہت ہوتا ہے جس سے ایسا لگتا ہے کہ وہ برا ہی برا ہے۔ اسے اچھے کریا کلاپ کو بھی ابھارنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے جیون میں آستھا پیدا ہوگی۔ اس گاندھی وادی مسلم سنت نے کہا کہ دشمن سے بھی شدھ دیوہار کرو۔ ایسا کرنے سے ان کا انتر من بدل جائے گا۔ آج انسانی ضمیر کا چھونا ہی سب سے ضروری ہے۔"

۳۰ مئی کی صبح کو ساڑھے نو بجے کا اجلاس ایک گیت سے شروع ہوا۔ ایک مرد اور ایک عورت نے مل کر اس کو گایا۔ اس گیت کا ایک شعر یہ تھا :

مندر مسجد کی چادر نے بانٹ لیا بھگوان کو　　دھرتی بانٹی ساگر بانٹا مت بانٹو انسان کو

کنونشن کا ہر اجلاس کسی گیت سے شروع کیا جاتا تھا۔ منتظمین کے بیان کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو یہ احساس ہو کہ ہم سب ایک ہیں۔

آج کے اجلاس کا موضوع تھا : دھرم اور راجنیتی کا تعلق۔ پروفیسر مرلی دھر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری آج کی شکشا کا کوئی تعلق ہمارے سماجی حالات سے نہیں ہے۔ ہم جو اتہاس اپنے تعلیمی اداروں میں پڑھاتے ہیں وہ جوڑنے والا نہیں ہے بلکہ توڑنے والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ تمہارے پوروج اگر اکبر اور بابر ہیں تو اسی طرح شیواجی اور مہارانا پرتاپ بھی تمہارے پوروج ہیں۔ اسی طرح ہندو کو یہ جاننا ہے کہ اگر شیواجی اور مہارانا پرتاپ کو وہ اپنا پوروج مانتے ہیں تو اکبر اور بابر کو بھی اپنا پوروج ماننا چاہئے۔

پروفیسر شانت نے کہا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں گرو اور شِشی کا تعلق ٹوٹ چکا ہے۔ ہمارے آج کے نوجوان کا گرو صرف ایک ہے اور وہ میڈیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک آنکھ کھولنے والی بات ہے کہ اس سال سب سے زیادہ بکنے والی کتاب پریم چند کا اصلاحی ناول نہیں تھا بلکہ ایک بدنام ناول وردی والا غنڈا تھا۔ یہ کتاب ایک سال (۱۹۹۲) میں ۵ لاکھ بک گئی۔ میرے نزدیک پروگرام صرف ایک ہے۔ آپ بیس بھاشن دینے کے بجائے بیس نوجوان سے ملئے

اور ان کی باتوں کا سامنا کیجئے۔

ونوبا بھاوے کے ایک خاص شاگرد اچاریہ بال وجے بھی اس میں شریک تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم کو سائنس اور روحانیت پر وچار کرنا ہوگا۔ دھرم اور پالٹکس پر نہیں۔ ونوبا بھاوے جی نے تمام دھرموں کا ایسنس نکالا تھا۔ انھوں نے یہ آیت پڑھی: وتوا صوا بالحق وتوا صوا بالصبر اور کہا کہ ہم کو ایک ایسی جماعت بنانا ہے جو حق کی راہ پر چلے اور صبر سے کام لے۔

بال وجے جی نے بتایا کہ مرار جی ڈیسائی جب پرائم منسٹر ہوئے تو وہ ونوبا بھاوے سے ملنے کے لئے آئے۔ ونوبا بھاوے نے ان سے کہا کہ اب آپ پرائم منسٹر ہیں۔ اب آپ دیش میں شراب بند کر دیجئے۔ مرار جی ڈیسائی نے جواب دیا کہ ونوبا جی، میرے ساتھی ہی شراب پیتے ہیں تو میں کیسے شراب بند کر سکتا ہوں۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے سوچا کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ حکومت سے بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں اور اس سے مانگ کرتے رہتے ہیں ان کو شاید اس کی خبر نہیں کہ حکمرانوں کی بھی محدودیتیں (limitations) ہوتی ہیں جس طرح غیر حکمرانوں کی ہیں۔

بابو لال پانڈو جی نے بتایا کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ سارے مسلمانوں میں یہ سوچ ہے کہ میں پہلے مسلمان ہوں، پھر میں ہندستانی ہوں۔ یہ سوچ جب تک باقی ہے تب تک دیش میں شانتی آنے والی نہیں۔ اس سوچ کو ہمیں بدلنا ہوگا۔ ہمیں اپنے کو سچا ماننے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی سچا ماننا ہوگا۔ ورنہ لڑائی جھگڑائی جاری رہے گی اور دیش تباہ ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہندستانی اسلام کو محمدی سمپردائے کہتا ہوں۔ وہ کوئی الگ مذہب نہیں۔ وہ ہماری ہی پرمپرا کا ایک حصہ ہے۔ بابو لال پانڈو جی نے مزید کہا کہ مسلمان بھارت میں آئے تو ایک محمود غزنوی کو چھوڑ کر سب کے سب دینے کے لئے آئے۔ وہ یہاں سے لوٹ کر باہر لے جانے کے لئے نہیں آئے۔ انھوں نے یہاں کی دھرتی پر لال قلعہ بنایا، تاج محل بنایا۔

ڈاکٹر مہیش نے اپنی تقریر میں کہا کہ گلزاری لال نندا جب ہوم منسٹر ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ میں ایک سال میں دیش کے بھرشٹاچار کو ختم کر دوں گا۔ لوگ اپنی شکایتیں لے کر میری کوٹھی پر آئیں۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ ایک روز ان کی کوٹھی پر آدمیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی

تھی۔ پیچھے کا ایک آدمی اپنی لائن چھوڑ کر آگے پہنچا۔ آگے کی لائن میں جو آدمی اپنی عرضی لئے ہوئے کھڑا تھا اس سے پوچھا کہ تمہاری شکایت کیا ہے اس نے کہا کہ مالک مکان مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔ پیچھے والے نے کہا کہ تمہاری شکایت بہت چھوٹی ہے۔ مجھ کو ٹیکس افسر پریشان کر رہا ہے۔ تم یہ سو روپئے کا نوٹ لو اور پیچھے جا کر میری جگہ پر کھڑے ہو جاؤ۔ ڈاکٹر مہیش نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد کہا کہ اس طرح بھرشٹاچار ختم نہیں ہو سکتا تھا اور نہ وہ ختم ہوا۔

ایک سردار جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس دیش میں بے روزگاری اور جہالت نے ایک نیا کریمنل کلاس پیدا کر دیا ہے۔ یہ دلت نوجوان ہیں۔ آپ ایک نوجوان کو ایک بوتل شراب اور سو روپیہ کا ایک نوٹ دیجئے اور پھر جو چاہے کرا لیجئے۔ ۱۹۸۴ میں دہلی میں سکھوں کے خلاف جو دنگا ہوا اس میں اسی تدبیر کو استعمال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد کانپور میں مسلمانوں کے خلاف جو دنگا ہوا اس میں بھی یہی تدبیر کام میں لائی گئی۔

ایک صاحب نے کہا کہ اپنے تعلیمی اداروں میں جب ہم ہندستان کی تاریخ پڑھاتے ہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ بھارت میں ڈچ آئے، پرتگیز آئے، فرنچ آئے، برٹش آئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عیسائی آئے۔ حالاں کہ وہ سب کے سب عیسائی تھے۔ مگر مسلمانوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہماری زبان بدل جاتی ہے۔ اب ہم کہتے ہیں بھارت میں مسلمان آئے۔ حالاں کہ یہاں بھی ہمیں کہنا چاہئے کہ ترک آئے، مغل آئے، افغان آئے، پٹھان آئے۔ اگر مسلمانوں کی آمد کو اس طرح بیان کیا گیا ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف کوئی نفرت نہ ہوتی جس طرح وہ یورپی قوموں کے خلاف نہیں ہے۔

اندور کے سمّیلن میں ایک ہندو تعلیم یافتہ نے ڈاکٹر نائر کا قصہ بتایا۔ وہ تمباکو نوشی کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ شنکر اچاریہ سے ملے اور ان سے تمباکو نوشی کے نقصانات بتاتے ہوئے کہا کہ آپ اس کے خلاف بیان دیں تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ مقرر کی روایت کے مطابق شنکر اچاریہ نے جواب دیا کہ میں ایسا بیان کس طرح دے سکتا ہوں، کیوں کہ ہماری دھرم گرنتھوں میں تو یہ بات لکھی ہوئی نہیں ملتی۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں عوام کی تربیت پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بتایا

کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ لوک تنتر میں عوام ہی ماسٹر ہوتے ہیں۔ عوام بے شعور ہوں تو کوئی کام درست نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ اپنے ماسٹروں کو ایجوکیٹ کیجئے:

Educate your masters.

پروفیسر مہیش نے کہا کہ اب تو لوگ اتنے بے حس (insensitive) ہو گئے ہیں کہ اب تو ہمیں لوگوں کے اوپر غصہ بھی نہیں آتا، خوشی بھی نہیں ہوتی۔ ایسے سماج میں ہم کو جینا ہے۔

جسٹس چندر شیکھر نے کہا کہ اب تو لیڈر سب ڈیلر ہو گئے ہیں۔ پاپولر مارکیٹ میں ہر ایک اپنی قیمت لگانے کو دوڑ رہا ہے۔

اس سیمینار میں ملک کے مختلف حصوں کے لوگ آئے تھے۔ گویا ایک چھت کے نیچے پورا ہندستان جمع تھا۔ اس طرح یہاں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگوں کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔

جسٹس سوہنی نے کہا کہ اس طرح کے سیمینار میں یہ ہونا چاہئے کہ ہر مذہب کے جو کٹر پنتھی ہیں ان کو بلایا جائے اور سنا جائے کہ ان کے وچار کیا ہیں۔ یہ دیش جو وناش کی طرف جا رہا ہے اس کو کیسے روکا جائے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہر آدمی ڈھونڈھے کہ میرا دھرم کیا ہونا چاہئے۔ دھرم اس کا اپنا چوائس ہے۔ مگر آج کچھ ایسا واتاورن ہو گیا ہے کہ جو میرے ماں باپ کا دھرم ہے وہی میرا دھرم۔

وجے واڑہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر لاونم نے کہا کہ میں ناستک ہوں۔ ساماجک نیائے تب ہو گا جب ہم مذہبی جھگڑوں کو چھوڑ کر انسانیت کو اپنا دھرم بنائیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں پہلے بھارتی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں پہلے انسان ہوں پھر میں کچھ اور ہوں۔

گاندھی گرام یونیورسٹی کے ایک استاد نے بتایا کہ کندن لال جی نے لکھا ہے کہ لالہ لاجپت رائے کے پتا اسلام کو بہت مانتے تھے۔ وہ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، قرآن پڑھتے تھے۔ وہ مندر نہیں جاتے تھے۔ ان کے اثر سے نوجوان لاجپت رائے بھی اسلام سے پربھاوت ہو گئے۔ انھوں نے سرسید کو لکھا کہ میں ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے نوجوان لاجپت رائے کو لکھا کہ تم کو اسلام پسند ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کے لئے دھرم کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے اپنے دھرم پر قائم رہے۔ انھوں نے کہا کہ مذہب بدلوانا کوئی صحیح کام نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کوانٹیٹی کو بڑھانے کے بجائے کوالیٹی بڑھانے

پر زور دیا جائے۔

گاندھی گرام یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر اوزا نے کہا کہ ہم اپنے مسائل کے لئے اکثر سرکار کی طرف دیکھتے ہیں، مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سرکار مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ سرکار تو خود مسئلہ کا ایک حصہ ہے:

> Government is not the solution to the problem, but is a part of the problem.

کانفرنس ہال کے باہر نکلا تو باہر سامنے کی ایمبولنس کھڑی ہوئی تھی۔ ایک بڑی ٹاٹا مرسیڈیز کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر ایک گدے دار بستر کا انتظام ہے اور اسی کے ساتھ ضروریات کی دوسری چیزیں بھی۔ ایمبولنس کے اوپر ہندی زبان میں یہ لکھا ہوا نظر آیا: شانتی مانو کے لئے، مانو شانتی کے لئے۔

میں اپنی قیام گاہ پر واپس آیا تو یہاں مسٹر شاہد مرزا موجود تھے۔ وہ فری لانس انگلش جرنلسٹ ہیں۔ ۳۰ مئی کی سہ پہر کو انھوں نے تفصیلی انٹرویو لیا جس میں ہندستانی مسلمانوں کے مختلف مسائل پر بات چیت ہوئی۔

ایک سوال یہ تھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا تھری پوائنٹ فارمولا یک طرفہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ الٹی بات ہے۔ انڈیا میں بٹوارہ کے وقت ۱۹۴۷ میں سرحدی علاقے کی ہزاروں مسجدوں کے ساتھ وہی ہوا جو اجودھیا میں بابری مسجد کے ساتھ پیش آیا۔ حتی کہ خود اجودھیا میں ۶ دسمبر کو بابری مسجد کے علاوہ دو درجن مزید مسجدیں گرا دی گئیں۔ مگر ان تمام مساجد پر ہمارے علما چپ رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح بابری مسجد پر بھی مسلمان چپ ہو جائیں۔ پھر اس میں نئی بات کیا ہے۔ میرا فارمولا عین وہی ہے جس پر تمام علما پچھلے پچاس سال سے قائم ہیں۔

۳۰ مئی کی شام کو سمیلن کا آخری سیشن تھا۔ اس میں ایک ڈیکلریشن اور ایکشن پلان پیش کیا کیا گیا۔ اس میں ہنسا اور انگاؤ واد کی سخت مذمت کی گئی تھی اور اپیل کی گئی تھی کہ نان اشوز کو چھوڑ کر اشوز پر محنت کی جائے۔ ایکشن پلان میں بتایا گیا تھا کہ ہر قسم کے انیائے کے خلاف سنگھرش کیا جائے گا۔ پوری پیڑھی کو اس مقصد کے لئے لگایا جائے گا۔

ایک میٹنگ میں لوگوں کے درمیان ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے: آجکل پڑھے لکھے لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص کا دماغ خیالات کا کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔ جس آدمی کو کوئی صلاحیت حاصل ہو جائے تو پہلا موقع ملتے ہی وہ اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس دنیا میں جو آدمی اپنی صلاحیت کا غلط استعمال نہ کرے وہی دراصل ہیرو ہے۔ مگر ایسے ہیرو تاریخ میں اتنے کم ہیں کہ وہ کسی گنتی میں نہیں آتے۔

مسٹر اوزا نے ایک گفتگو کے دوران کہا کہ ہم ہندستانیوں میں یہ کمزوری ہے کہ ہم اکیلے اکیلے کام کر سکتے ہیں، مگر ہم سنگھٹن کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنگھٹن یا اتحاد کے ساتھ کام کرنے کے لئے اختلاف کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں یہ مزاج نہیں۔ ہندستانی انسان اپنی رائے دینا جانتا ہے مگر وہ اپنی رائے واپس لینا نہیں جانتا۔ جب کہ اتحاد کی یہ لازمی شرط ہے۔ اتحاد کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو زبان رکھتے ہوئے نہ بولیں۔ جو رائے رکھتے ہوئے اس کو ظاہر نہ کریں۔ جو اختلاف رکھتے ہوئے اس کو استعمال نہ کریں۔

ایک مسلم صحافی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عیسائیوں نے اپنی ایک بھی یونیورسٹی ملک میں نہیں بنائی۔ مگر آج وہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ کمیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے یہاں چار یونیورسٹی (مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، جامعہ ہمدرد) بنائی۔ مگر مسلمان اس ملک میں آج تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ کسی کمیونٹی کو تعلیم میں آگے بڑھانے کے لئے ابتدائی تعلیم کے ادارے بنانا زیادہ ضروری ہے۔ عیسائیوں نے اس راز کو جانا۔ چنانچہ انھوں نے کثیر تعداد میں اسکول کھول کر اس ملک میں اپنا ایک ایجوکیشنل ایمپائر بنالیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے یونیورسٹیاں کھولیں اور ابتدائی ادارے نہیں کھولے جو گویا فیڈر ادارے ہیں۔ ایسی حالت میں یونیورسٹی کھولنا بھی غیر مفید بن جاتا ہے۔ اگر آپ کی ابتدائی تعلیم اچھی ہو جائے تو اس کے بعد آپ کو تعلیم میں آگے بڑھنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ خواہ آپ کی اپنی قوم میں یونیورسٹی موجود ہو یا نہ ہو۔

صبح کو میں اپنے کمرہ کے باہر کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک محسوس ہوا کہ کوئی صاحب

آکر میرے دائیں طرف کھڑے ہوگئے ہیں۔ نظر اٹھائی تو بابا آمٹے تھے۔ کل بھی وہ اسی طرح یہاں آئے تھے۔ انھوں نے مجھے کرسی سے اٹھنے نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں کرسی پر بیٹھ نہیں سکتا۔ مجھ کو تو کھڑا ہی رہنا ہے۔ اس لئے آپ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ ان سے دیر تک اس طرح گفتگو ہوتی رہی کہ میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

بابا آمٹے (۷۹ سال) عجیب وغریب شخصیت کے آدمی ہیں۔ ان کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ ان کو بہت سے ایوارڈ ملے ہیں جن میں ٹمپلٹن ایوارڈ (۷۰ لاکھ روپیہ) بھی شامل ہے۔ ان کے جسم پر ۱۶ امیجر آپریشن ہو چکے ہیں۔ ان کے سینہ پر ایک ابھار تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ پیس میکر (pacemaker) ہے جو ۷۵ ہزار روپیہ میں درآمد کرکے بذریعہ آپریشن ان کے اندر داخل کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ اتنے زیادہ حادثات پیش آئے ہیں کہ اب وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ وہ یا کھڑے رہتے ہیں یا لیٹے رہتے ہیں۔ ان کی دو خاص ایمبولنس ہیں جن کے اندر بستر اور دوسری ضرورت کی چیزیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جب وہ ایک ایمبولنس میں چلتے ہیں تو ساتھ ایک خالی ایمبولنس بھی چلتی ہے تاکہ اگر ایک فیل ہو جائے تو دوسری استعمال کی جاسکے۔ وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں ایک خانہ بدوش سوار ہوں:

I am a nomad on wheel.

ایک ہندو بھائی جو زیادہ عمر کے تھے انھوں نے خصوصی ملاقات کی۔ ان کی گفتگو کا موضوع عجیب تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ الٰہ کا مطلب وجود ہوتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ـــ نہیں ہے کوئی مگر اللہ ہے۔ یعنی وجود صرف ایک کا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو وحدت وجود (monism) کی تعلیم ہے۔ جب کہ اس کلمہ میں توحید (monotheism) ہے۔ عربی کے لحاظ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ نہیں ہے کوئی الٰہ سوا اللہ کے۔ یعنی اللہ ہی واحد معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر میری تشریح ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

غلطی کی یہ قسم مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے مسلمان حتی کہ عالم اور مفکر ملیں گے جو قرآن کی ایک آیت لیں گے اور اس کا ایک خود ساختہ مطلب نکال کر اپنی اس خود ساختہ تشریح پر ایک پوری عمارت کھڑی کر دیں گے۔ اگر ان کے سامنے دلائل پیش کیجئے تو

ان کو اپنے خیال کا اتنا یقین ہوگا کہ وہ آپ کی دلیلوں پر غور بھی نہیں کریں گے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ میں خدا کی تلاش میں نہیں ہوں، میں انسان کی تلاش میں ہوں:

I am not in search of God.
I am in search of man.

جو لوگ اس قسم کی بات کرتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ انھیں اعلیٰ حقیقتوں کی کوئی خبر نہیں۔ وہ صرف سامنے کی چیزوں کو جانتے ہیں جو انھیں اپنی آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے وہ انھیں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

۲۱ مئی کو صبح سویرے کا وقت ہے۔ میری نیند کھل چکی ہے مگر ابھی میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں دہلی (نظام الدین) میں مسجد سے آنے والی اذان کی آواز یہ بتاتی تھی کہ فجر کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اندرون شہر میں اگرچہ ۱۲۰ مسجدیں ہیں مگر گستور باگرام شہر سے تقریباً ۲۵ کیلو میٹر دور ہے اس لئے یہاں اذان جیسی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن گھڑی میں پانچ بجے کا وقت ہوا تو اچانک باہر کے درختوں سے کوئل کی کوک سنائی دینے لگی۔ ایسا ہی پچھلی صبح کو بھی پیش آیا تھا میں نے سوچا کہ یہ چڑیاں قدرت کی موذن ہیں۔ وہ بے خطا طور پر صبح کی آمد کو جان لیتی ہیں۔ اور اپنی سریلی آواز میں اس کی آمد کا اعلان کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ میں اپنے بستر سے اٹھا اور وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے ملک میں کردار کے دیوالیہ پن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندستان کے سدھار کے لئے گاندھی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو وہ میدان ہے جہاں گاندھی بھی فیل ہو چکے ہیں۔ گاندھی تو صرف اس وقت تک گاندھی تھے جب تک وہ غیروں کے خلاف اندولن چلا رہے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جب انھوں نے خود اپنوں کے خلاف بولنا شروع کیا تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی۔ یہاں تک کہ ان کو گولی مار دی۔ گاندھی اس شخص کا نام ہے جس نے احتساب غیر کے نام پر لوگوں کو متحرک (mobilise) کیا۔ مگر آج احتساب خویش کے نام پر لوگوں کو متحرک (mobilise) کرنے کی ضرورت ہے۔

اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس محاذ پر گاندھی بالکل غیر موثر ہو گئے۔ اب ہمیں گاندھی سے آگے سوچنے کی ضرورت ہے۔ آج کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک گاندھی چاہئے۔ آج کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم گاندھی کی ناکامی سے سبق لیں اور وہ سبق میرے خیال سے یہ ہے کہ ملکی تعمیر کے کام کا آغاز ذہن سازی سے شروع ہوتا ہے نہ کہ عملی اقدام سے۔

ایک ہندو بھائی نے کہا کہ میں مسلم محلوں میں بہت جاتا ہوں۔ سیکڑوں مسلم پریواروں سے میری جان پہچان ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ آدی واسیوں سے بھی زیادہ بری حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ آر ایس ایس والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تسٹی کرن کانگرس نے کیا ہے۔ مگر وہ تسٹی کرن کہاں ہے۔ یہ تو الٹا معاملہ ہے۔ اگر تسٹی کرن کیا جاتا تو ان کی حالت اچھی ہوتی۔

۳۱ مئی ۱۹۹۴ کو مسٹر ارن کوٹھاری اور مسٹر نور الدین قریشی صبح آٹھ بجے میری قیام گاہ پر حسب پروگرام آئے۔ ان کے ساتھ میں شہر کے لئے روانہ ہوا۔ مسٹر کوٹھاری ابھی نوجوان ہیں وہ اپنی گاڑی چلا رہے تھے۔ میں ان کے بازو میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج ہندو نوجوان کی سوچ کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا: اَسوچ۔ انھوں نے کہا کہ آج کے ہندو نوجوان کی باغیانہ سوچ ہے۔ وہ نہ اپنے ماں باپ سے ہدایت لیتا ہے اور نہ اسکول سے۔ اس کا معلم سب سے زیادہ سینما ہے۔ ٹی وی آج کے نوجوان کا سب سے بڑا گرو ہے۔ ۷۰ فیصد تو شراب پینے لگے ہیں۔ کسی بھی تعمیری کام کی ان سے امید نہیں کی جا سکتی۔

کستوربا گرام سے روانہ ہو کر سب سے پہلے ہم مسٹر پربھاش جوشی، ایڈیٹر جن ستا کے مکان پر ٹھہرے۔ وہ اندور ہی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے مکان پر کئی ممتاز مقامی ہندو جمع ہو گئے تھے۔ کچھ دیر ان حضرات سے ملکی حالات پر گفتگو ہوئی۔ ایک سابق منتری بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ دیش شانتی کی طرف جا رہا ہے یا اشانتی کی طرف۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: اشانتی کی طرف۔

یہ ۳۱ مئی صبح ساڑھے ۹ بجے کا وقت تھا۔ ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو کر دولت گنج پہنچے۔ یہاں ایکتا پنچائت کے دفتر میں ایک اجتماع ہوا۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک

تھے۔ مسٹر پربھاش جوشی اور مسٹر مہیش سنگھ نے تقریر کی۔ اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ خطاب کیا۔ میں نے کہا کہ ایکتا پنچائت کا تخیل بہت اچھا ہے۔ اسی انداز پر ہر جگہ کام ہونا چاہئے تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ ایکتا پیدا ہو۔ بتایا گیا کہ مقامی جھگڑے لوگ ایکتا پنچائت میں آکر حل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کبھی فساد نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ طریقہ بہت اچھا ہے اور اس کو ہر جگہ دہرایا جانا چاہئے۔

راستہ میں کچھ دیر کے لئے محمد اقبال خاں صاحب کے مکان پر ٹھہرا۔ یہاں اندور کے کچھ مسلم نوجوان اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ کو میں صرف ایک مختصر نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ ہے میٹھا بول۔ آپ اس کو اپنی مستقل روش بنالیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ آپ کو زندگی میں کبھی ناکامی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ یہاں کے رواج کے مطابق اقبال صاحب نے میری 'دستار بندی' کی۔

اقبال صاحب کے یہاں سے نکل کر ہم لوگ روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک جگہ پولیس کے ساتھ ایک "جلوس" چل رہا تھا۔ وہ لوگ کچھ نعرے بھی لگا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو جلوس میں تقریباً سب کے سب چھوٹے طبقے کے نوجوان نظر آئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ جاہل بھی ہیں اور غیر سنجیدہ بھی ہیں۔ بظاہر سب کے سب کرایہ کے لوگ تھے۔ ایسے لوگوں کا جلوس اگر سازش کے تحت بھی نکالا جائے تب بھی یہ سازش اتنی سطحی ہوتی ہے کہ حسن تدبیر کے ذریعہ اس کو نہایت آسانی کے ساتھ ناکام بنایا جا سکتا ہے۔

۳۱ مئی کی دوپہر کو اندور سے دہلی کے لئے واپسی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی (پرنسپل اسلامیہ کالج) اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ایئر پورٹ پہنچا۔

ہندی اخبار چوتھا سنسار کے نمائندہ مسٹر الوک باجپئی کل رات میری قیام گاہ پر انٹرویو کے لئے آئے تھے۔ مگر اس وقت میں انٹرویو نہ دے سکا۔ چنانچہ آج وہ ایئر پورٹ پر آگئے۔ وہ سوال کرتے رہے اور میں وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا ان کا جواب دیتا رہا۔

ایک سوال یہ تھا کہ ۶ دسمبر کے بعد ۱۲ مارچ کو بمبئی میں جو بام بلاسٹ ہوا، اس کے بارے میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک سرجیکل چیک ہے۔ اور اب اس قسم کا دنگا دیش میں نہیں ہوگا۔

میں نے کہا کہ مجھے اس طریقہ سے سخت اختلاف ہے۔ اگر بالفرض اس کی وجہ سے دنگا رک جائے تب بھی اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان نفرت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اور میرے نزدیک نفرت کا زہر فساد کی آگ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ فساد کی آگ وقتی طور پر جلاتی ہے اور نفرت کی آگ مستقل طور پر جلاتی رہتی ہے۔

ایئرپورٹ سے ہوائی جہاز تک وھیل چیئر کے ذریعہ آیا۔ وھیل چیئر کو ایئرپورٹ کا ایک نوجوان پورٹر چلا رہا تھا۔ اس نے اپنا نام گوپال بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ انٹرمیجیٹ ہے۔ مگر کئی سال ہو گئے اور اب تک اس کو کوئی مستقل جاب نہیں ملا۔ ایئرپورٹ میں اس کا تقرر ۹۰ دن کے لئے ہوا ہے۔ پہلے اس کو روزانہ ۶۲ روپیہ اجرت ملتی تھی۔ اب انڈین ایئرلائنز نے اس کو گھٹا کر ۳۱ روپیہ روز کر دیا ہے۔ جب کہ مستقل پورٹر کو تین ہزار روپیہ ماہانہ ملتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں کروڑوں نوجوان اسی قسم کی غیر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ ان لوگوں کو بہت آسانی سے ایکسپلائٹ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے نوجوان اپنے خاندان کے لئے بھی مسئلہ ہیں اور پورے ملک کے لئے بھی۔

اندور سے دہلی کے لئے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۳۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین ایئرلائنز کا ان فلائٹ میگزین (مئی ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کا ایک مضمون فوٹوگرافی پر تھا۔ اس فن کے ایک اسپیشلسٹ نے اپنا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ فوٹوگرافر کو اپنے فن سے محبت کرنا چاہئے۔ اور اس کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار رہنا چاہئے:

A photographer must love his subject, and if he believes in the end result, he must be prepared to go to any lengths to capture it. (80)

فوٹوگرافی کے ایک اور اسپیشلسٹ نے کہا تھا کہ آخری تجزیہ میں میری نصیحت، جو کسی فوٹوگرافر کے لئے ہے وہ یہ کہ وہ ہمیشہ امتیاز تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہے:

In the ultimate analysis what my advice to any young photographer would be is to keep striving for excellence. (76)

انڈین اکسپرس (۱۳ مئی) دیکھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر کشمیر کے سابق گورنر مسٹر جگموہن کا انٹرویو چھپا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور دوسرے کئی لیڈروں کو اخباری لیڈر

کہا تھا۔ اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ آجکل کے اکثر مسلم اور غیر مسلم (paper leaders) لیڈروں کا بھی حال ہے۔ وہ صرف اخباری لیڈر ہیں۔ وہ میڈیا کی پیداوار ہیں۔ ان کی عوام میں کوئی جڑ نہیں۔ گویا وہ لیڈر دکھائی دیتے ہیں، وہ حقیقۃً لیڈر نہیں ہیں۔

مسٹر آر کے پٹنائک ایم ایل اے (اڑیسہ) کا ایک مضمون اسی اخبار میں تھا۔ یہ شادیوں میں بڑھے ہوئے اخراجات کے بارہ میں تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ایک آل انڈیا قانون بنا کر شادیوں کے بڑھے ہوئے اخراجات کو روکا جاسکتا ہے تو میں اس کو خیالی کہوں گا:

If anybody thinks that through an all-India law, extravagant weddings can be stopped, I would merely call it wishful thinking.

مسٹر پربھاش جوشی اس سفر میں ساتھ تھے۔ وہ مختلف دلچسپ واقعات سناتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسٹر مہاویر تیاگی نے ایک کتاب لکھی اس کا نام ہے "اب میری کون سنے گا" آزادی کے بعد مہاتما گاندھی نے یہ جملہ کہا تھا۔ اسی کو مہاویر تیاگی نے اپنی کتاب کا عنوان بنادیا۔ مہاویر تیاگی نے اس میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے۔ مولانا محمد علی نے ایک بار کہا تھا کہ ایک گنہ گار مسلمان بھی میرے نزدیک مہاتما گاندھی سے بہتر ہے۔ مہاویر تیاگی کو محمد علی کا یہ جملہ بہت ناپسند ہوا۔ انھوں نے کانگریس کی ایک میٹنگ میں اس کے خلاف اپنا رزولیوشن رکھا۔ اس میٹنگ کے چیرمین اتفاق سے خود محمد علی تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اس رزولیوشن کو پیش ہونے سے روک دیا جائے۔ محمد علی نے بحیثیت چیرمین کہا کہ میں کسی کے کہنے سے اس کو روک نہیں سکتا۔ البتہ خود مہاویر تیاگی چاہیں تو اس کو واپس لے سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے مہاویر تیاگی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنا رزولیوشن واپس لینے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد گاندھی جی مہاویر تیاگی کو تھوڑی دیر کے لئے الگ لے گئے۔ انھوں نے مہاویر تیاگی سے کہا کہ اختلافی معاملہ میں بدھیوان کی بات مانی جاتی ہے یا بیوقوف کی۔ مہاویر تیاگی نے کہا کہ بدھیوان کی۔ گاندھی نے کہا کہ پھر یہ بتاؤ کہ تم زیادہ بدھیوان ہو یا میں۔ مہاویر تیاگی نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ بدھیوان ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ پھر میں کہتا ہوں کہ اس رزولیوشن کو واپس لے لو۔ اس لئے کہ محمد علی ہمارے

دوست ہیں۔ اور دوست کی بری بات کا بھی سہن کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد مہا دیر تیاگی نے اپنا رزولیوشن واپس لے لیا۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو جو یورپ کی ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انڈیا میں لوگ تنقید پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ تنقید کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک ایسا ملک جس کے اندر خود اعتمادی نہ ہو وہ تنقید پر اسی طرح بھڑکتا ہے :

A country which lacks self-confidence tends to overreact to criticism.

یہ جواب بالکل درست ہے۔ یہی معاملہ مزید اضافہ کے ساتھ مسلم دانشوروں کا ہے۔ مسلم دانشور اور علماء موجودہ زمانہ میں شکست خوردگی کی نفسیات میں مبتلا ہیں اس لئے اگر ان پر تنقید کی جائے تو وہ فوراً برہم ہو جاتے ہیں۔ وہ تنقید کو ٹھنڈے ذہن سے سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

میں انڈین ایئر لائنز کے جس جہاز میں سفر کر رہا تھا وہ آدھ گھنٹہ لیٹ ہو کر اندور سے روانہ ہوا۔ دہلی سے آتے ہوئے ہمارا جہاز اس سے بھی زیادہ لیٹ تھا۔ اس جہاز میں انڈیا ٹوڈے (۳۱ مئی ۱۹۹۳) کا شمارہ برائے مطالعہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں کے بارے میں میگزین کے پچھلے شمارہ میں ایک مضمون چھپا تھا۔ موجودہ شمارہ میں مسٹر گوتم بھردواج (نوائڈا) کا ایک خط تھا جس کو انھوں نے میگزین کی پچھلی رپورٹ کو پڑھ کر لکھا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں مسافروں کے لئے ایک کلچرل شاک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب یہاں ایسے جہاز ہیں جو بالکل وقت پر روانہ ہوتے ہیں، زیادہ بااخلاق اسٹاف اور زیادہ بہتر کھانا :

Private airlines are a culture shock to the travelling public ..... now we actually have on-time departures, courteous crew and appetising food.

دہلی ایئرپورٹ پر پیشگی اطلاع بھیج دی گئی تھی، چنانچہ یہاں دوبارہ وھیل چیئر موجود تھی۔ وھیل چیئر کو دو آدمی اٹھا کر جہاز کے اندر لے آئے۔ میں اپنی سیٹ سے اتر کر جہاز

ہی میں وھیل چیئر پر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی نے اس کو چلاتے ہوئے باہر کار تک پہنچایا۔ یہ سب بلامعاوضہ ایئرپورٹ کی طرف سے تھا۔

میں نے سوچا کہ دنیا اگر کسی کے بارہ میں جان لے کہ وہ فی الواقع معذور ہے تو اس کے حق میں لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا ہوجاتا ہے اور اس کے لئے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کے علم میں فی الواقع معذور قرار پائیں گے، ان کا معذور ہونا اللہ کے یہاں اس بات کی سفارش بن جائے گا کہ ان کے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جائے۔ معذور ہونا بظاہر ایک نقص ہے مگر خدا کی دنیا ایسی دنیا ہے جہاں نقص میں بھی خوبی کا ایک پہلو پیدا ہوجاتا ہے۔

۳۱ مئی ۱۹۹۳ کی شام کو میں دوبارہ دہلی میں تھا۔ دہلی اب بھی مجھے ویسی ہی نظر آئی جیسی وہ اندور کی چیتنا کانفرنس سے پہلے تھی۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے اندر نئی چیتنا صرف ایک کانفرنس کے ذریعہ نہیں لائی جاسکتی۔ اسی کے ساتھ انتہائی ضروری ہے کہ فرد فرد پر اصلاحی عمل جاری کرنے کے لئے ایک مستقل مہم چلائی جائے۔ کانفرنس ہمارے کام کی حد نہیں کانفرنس ہمارے کام کا آغاز ہے۔ شاید یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف واپسی کہا گیا ہے۔

اورنگ آباد کا سفر

اورنگ آباد پیس ایسوسی ایشن کی دعوت پر اورنگ آباد کا سفر ہوا۔ ۴ ستمبر ۱۹۹۳ کو دہلی سے اورنگ آباد پہنچا، اور ۶ ستمبر کی صبح کو اورنگ آباد سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ پہلی بار میں اپریل ۱۹۸۷ میں کچھ دیر کے لئے اورنگ آباد میں ٹھہرا تھا جس کا مختصر تذکرہ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسری بار دسمبر ۱۹۹۲ میں ایک پروگرام کے تحت اورنگ آباد کا سفر ہوا۔ یہ سفر بھی مختصر تھا۔ اس کی مختصر روداد "شانتی یاترا" کے ذیل میں راقم الحروف کی کتاب اسفار ہند میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جناب ذوالفقار حسین صاحب اورنگ آباد پیس ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔

۴ ستمبر ۱۹۹۳ کو صبح سویرے گھر سے نکل کر ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت عام عادت کے مطابق، میرے اوپر دل شکستگی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھ کو جتنی آفتوں اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا، اتنا شاید ساری تاریخ میں کسی کو پیش نہیں آیا ہوگا۔ آخر میرے جیسے کمزور انسان کے ساتھ اتنے سخت تجربات کیوں پیش آئے۔ یہ سوچتے ہوئے یہ شعر یاد آگیا:

دل شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں ۔۔۔ سنا ہے ہم نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا

شاید اللہ تعالیٰ نے دل شکستگی کا یہ تلخ تجربہ اس لئے کرایا ہو کہ مجھ کو معرفت کا کوئی حصہ دیا جائے۔ تاہم یہ بات بھی اللہ ہی کو معلوم ہے، اور اس کی حقیقت بھی آخرت سے پہلے کھلنے والی نہیں۔

جہاز فضا میں بلند ہوا تو اعلانات شروع ہوئے۔ اناؤنسر نے کہا: "سیفٹی انفارمیشن کارڈ کرسی کی جیبوں میں رکھا ہوا ہے۔ کرپیا اس کو دھیان سے پڑھ لیں"۔ میں نے دیکھا تو کرسی کی جیب خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی کارڈ موجود نہ تھا۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نیچے فرش پر ردی کاغذ کی طرح پڑا ہوا ہے۔

اس چھوٹی سی مثال سے فرد اور سسٹم کے معاملے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ سسٹم میں ہر چیز کا ایک نظام مقرر کر دیا جاتا ہے۔ دفتروں میں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی مشینی سوچ کے تحت سمجھ لیتے ہیں کہ ہر چیز ایسے اور ایسے ہوگی۔ مگر آخر کار جو چیز معاملات کی سٹینگ کو متعین کرتی ہے وہ فرد ہوتا ہے نہ کہ سسٹم۔ سسٹم اپنے متعین ڈھانچہ کے تحت فرض کر لیتا ہے کہ کارڈ کرسی کی جیب میں ہوگا۔ جب کہ فرد اس کو

جیب سے نکال کر باہر پھینک چکا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی سماج کو بہتر سماج بنانے کے لئے جو چیز فیصلہ کن ہوتی ہے وہ ہمیشہ فرد ہوتا ہے نہ کہ سسٹم۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ کل ۵ ستمبر کو چین کے دورہ پر جانے والے ہیں۔ آج کے تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ چین اور ہندستان میں گفت و شنید کے بعد اس امر پر اتفاق ہو چکا ہے کہ آسام کے علاقہ میں لائن آف ایکچول کنٹرول (LAC) کو دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کی حیثیت دیدی جائے۔ ہندستان ٹائمس (۴ ستمبر) کے درمیانی صفحہ پر اس کی بابت ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا نیا امید افزا باب۔

Hopeful new chapter.

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے۔ اس طرح کے نزاعی معاملات میں کبھی بھی آئیڈیلزم کی بنیاد پر سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ ان کو ہمیشہ پرگمیٹزم کی بنیاد پر ختم کرنا پڑتا ہے۔ یہی طریقہ ہندستان اور پاکستان کو کشمیر کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہئے۔ پاکستان کے اخبارات مسلسل یہ تاثر دیتے رہتے ہیں کہ پاکستان کشمیر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بجائے انھیں یہ کہنا چاہئے کہ موجودہ حالات میں پاکستان کی زندگی کا راز یہ ہے کہ وہ کشمیر کو بھلا کر اپنی تعمیر و ترقی کے شعبوں میں مصروف ہو جائے۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ اپنے چھوٹے بچہ میں مشغول تھیں اور مسلسل انگریزی میں بول رہی تھیں، چاکلیٹ لوگے، دیکھو یہ بسکٹ ہے۔ اس کو اپنی جیب میں رکھ لو، یہ لو اسے کھالو، یہ دیکھو کیسا اچھا کھلونا ہے، گھر پہنچ کر اسے پاپا کو دکھانا، وغیرہ۔ اس قسم کے جملے انگریزی میں وہ مسلسل بول رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بچہ میں اتنا زیادہ محو ہیں کہ انھیں اس کا احساس ہی نہیں کہ ان کا اس طرح بولنا دوسرے مسافروں کے لئے شور بن کر ان کی پریشانی کا باعث ہو رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ عورت اپنے پورے وجود کے ساتھ "داخل پسند" بنائی گئی ہے۔ عورت کا ورک پلیس اس کا گھر ہے۔ جو لوگ گھر کے باہر کی دنیا کو عورت کا ورک پلیس بنانا چاہتے ہیں وہ فطرت کے نظام میں ایسی مداخلت کر رہے ہیں جو کبھی کسی مفید نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

جہاز میں ہندی اخبار پنجاب کیسری (۴ ستمبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر ایک باتصویر خبر تھی جس کا عنوان تھا: جب ڈاکٹر ہی روگی کو مارنے لگیں تو۔ خبر میں ایک ڈاکٹر کی داستان تھی جس کی غفلت اور خود غرضی کے نتیجہ میں ایک مریض موت کا شکار ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ آج ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ سب کا یہی حال ہو رہا ہے۔ خود غرضی اور استحصال نے پورے سماج کا یہ حال کر رکھا ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی "ڈاکٹر" کی زیادتی کا شکار ہو رہا ہے۔ ہر آدمی بیک وقت ظالم بھی ہے اور اسی کے ساتھ مظلوم بھی۔

ایک ہندو مسافر نے گفتگو کے دوران کہا کہ آٹھویں دہائی میں ٹی وی پر رامائن اور مہابھارت کے سیریل دکھائے گئے۔ یہ کانگرس نے اپنے فائدہ کے لئے کیا تھا، مگر اس کے ذریعہ سے جو مذہبی احساس ابھرا اس کو بی جے پی نے استعمال کیا:

The telecast of Ramayan and Mahabharat was a Congress play but the resulting brightening of religious feeling was exploited mainly by the BJP.

میں نے کہا کہ جی ہاں، اب کانگرس کی باری ہے۔ چنانچہ بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد کانگرس مندر اور مسجد دونوں کو دوبارہ بنانے کا کریڈٹ لینا چاہتی ہے۔ انھوں نے کہا: مگر کانگرس اپنے اس کھیل میں کامیاب ہونے والی نہیں۔

۴ ستمبر ۱۹۹۲ کو فجر کی نماز نظام الدین (دہلی) کی کالی مسجد میں پڑھی۔ اور اسی دن ظہر کی نماز سے پہلے میں اورنگ آباد پہنچ چکا تھا۔ جب کہ دہلی اور اورنگ آباد میں تقریباً ۲۲ سو کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص فجر کی نماز دہلی میں پڑھے اور ظہر کی نماز اورنگ آباد میں۔ یا وہ ناشتہ دہلی میں کرے اور دوپہر کا کھانا اورنگ آباد میں کھائے۔ مگر جدید مواصلات نے آج اس کو ممکن بنا دیا ہے۔

ان غیر معمولی سہولتوں کا تقاضا تھا کہ آج کا انسان ہمیشہ سے زیادہ خدا کا شکر گزار بنے، مگر معاملہ اس کا الٹا ہے۔ آج کا انسان ہمیشہ سے زیادہ خدا کی سرکشی کرنے والا بن گیا ہے۔

اورنگ آباد ایئرپورٹ سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوکر ہوٹل اشوک پہنچا۔ یہاں کمرہ نمبر ۲۲۳ میں میرا قیام رہا۔ اورنگ آباد میں قیام کے سلسلہ میں ایک قابل ذکر لطیفہ پیش آیا۔

جلسہ کے منتظمین نے ابتداءً میرے قیام کا انتظام یہاں کے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں کیا تھا اور اس کی رسید حاصل کرلی تھی۔ یہ رسید مورلیشورسا نے ایم پی کے نام تھی جو شیوسینا کے ٹکٹ پر الکشن جیتے تھے۔ یہ محض اتفاقاً تھا۔ اگر میں گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرتا تو مخالفین شاید یہ کہتے کہ دیکھو۔ یہ تو شیوسینا کے آدمی ہیں۔ مگر بعض اسباب سے میں گیسٹ ہاؤس نہ جاسکا اور مذکورہ ہوٹل میں قیام کیا۔

سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی منسٹر وغیرہ آجائیں تو اس کے منتظمین رزرویشن کو کینسل کرکے اسے منسٹر صاحب کو دیدیتے ہیں لیکن اگر ریزرویشن کسی ایم پی کے نام ہو تو وہ کینسل نہیں کرتے۔ اس مصلحت کی بنا پر ایک صاحب نے اس کا ریزرویشن ایم پی کے نام کرایا تھا۔

اورنگ آباد کا ابتدائی نام کھڑکی تھا۔ ملک عنبر نے اس کو ۱۶۱۰ء میں آباد کیا تھا۔ بعد کو اورنگ زیب نے اس کا نام بدل کر اورنگ آباد رکھ دیا جو اس علاقہ کا مغل گورنر ہوکر یہاں آیا تھا۔ اس نے یہاں تاج محل کے نمونہ پر بی بی کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب صوبائی حاکموں نے بغاوت کی تو اورنگ آباد نظام حیدرآباد کی ریاست کا جزء بن گیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ انڈین یونین کا حصہ ہے۔ یہاں کی مرہٹواڑہ یونیورسٹی ۱۹۵۸ میں قائم ہوئی۔

اورنگ آباد میں سیاحوں کی دلچسپی کی کئی چیزیں ہیں۔ مثلاً ——— اجنتا اور ایلورا کے غار، خلدآباد میں اورنگ زیب کا مقبرہ، دولت آباد کا قلعہ، وغیرہ۔

اورنگ آباد میں "بی بی کا مقبرہ" دیکھا۔ یہ اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ درانی (دل رس بانو) کا ہے جو اورنگ زیب کے بعد ان کے صاحبزادہ اعظم شاہ نے بنوایا تھا۔ اورنگ زیب کا مقبرہ، ان کی ہدایت کے مطابق، خلدآباد میں بالکل سادہ اور چھوٹا سا ہے۔ مگر رابعہ درانی کا مقبرہ کافی بڑا ہے۔ وہ تاج محل کے انداز پر بنایا گیا ہے۔ تاہم اس کے اندر وہ عمارتی حسن نہیں جو آگرہ

کے تاج محل میں ہے۔

یہ مقبرہ ۱۸۶۰ میں بنوایا گیا تھا۔ اس وقت چھ لاکھ ۶۵ ہزار ۲۸۳ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ آج کے حساب سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑا ہے اور نہایت عمدہ جائے وقوع ہے۔ بورڈ پر معمار کا نام عطاء اللہ اور رہنس پت رائے لکھا ہوا تھا۔

خلد آباد میں اورنگ زیب کی قبر دیکھی۔ یہ قبر چھوٹی سی جگہ پر سادہ انداز میں بنی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر چھت نہیں ہے۔ کنارہ پختہ ہے اور درمیان میں کچی مٹی کے اوپر ایک جھاڑ اگا ہوا ہے۔ قبر کے اوپر سفید چادر ہے۔ قبر کے کنارے سنگ مرمر کی تختی ہے۔ اس پر اورنگ زیب کے نام کے ساتھ "پادشاہ غازی خلد مکاں" لکھا ہوا ہے۔ یہ تختی اور پختہ فرش اور جالی نظام الملک آصف جاہ سابع نے ۱۳۴۱ھ میں بنوایا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ "دام ملکہ واجلالہ" لکھا ہوا ہے۔ آج سارا ماحول خاموش زبان میں اعلان کر رہا ہے کہ خلدیت اور دوامیت صرف ایک ہستی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے نہیں۔

خلد آباد کے علاقہ میں قبریں اور درگاہیں اتنی زیادہ ہیں کہ شاید ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ ہر طرف اسی کے مناظر ہیں۔ کہیں لوگ حاجتیں مانگ رہے ہیں۔ کہیں نذرانے طلب کرنے والے کھڑے ہوئے ہیں۔ کہیں کوئی پھول فروخت کر رہا ہے۔ کہیں عرس کا سامان ہے۔ اس طرح کے ماحول کے درمیان ہم لوگ دیر تک گھومتے رہے۔ یہاں کے مناظر کو دیکھ کر میں نے اپنے ساتھی سے کہا: یہ قبریں اور درگاہیں گویا توہمات کاہلی کے مراکز ہیں۔ یہ قوم کو توہم پرست، اپاہج، حالات زمانہ سے بے شعور بنا رہے ہیں۔

سب سے بڑی درگاہ حضرت خواجہ منتجب الدین زرزری زربخش کی سمجھی جاتی ہے۔ ان کی قبر کے باہر لکھا ہوا ہے:

زربخش ترے در پہ یہ عالم کی صدا ہے   دے داد میرے دل کی تو مقبول خدا ہے

اورنگ آباد میں حضرت بابا شاہ مسافر (م ۱۷۱۴ء) کی درگاہ ہے۔ وہ بخارا سے آئے تھے۔ یہاں ایک عجیب و غریب چیز وہ ہے جس کو "پن چکی" کہا جاتا ہے۔ ہرسول (Harsul) میں پانی کے ایک ذخیرہ کو چینلائز کر کے ایک زیر زمین نہر کے ذریعہ اس کو یہاں لایا گیا ہے۔ اس

پانی کو ایک پائپ کے ذریعہ ایک لوہے کے پنکھے پر گرایا جاتا ہے جس میں گیارہ پتیاں (blades) ہیں۔ پانی ایک کے بعد ایک پتی پر گرتا ہے۔ اس سے ایکسل گھومتا ہے جس کے اوپر پتھر کی بڑی چکی جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ چکی گھومنے لگتی ہے۔ مذکورہ بزرگ کے زمانہ میں لوگ بکثرت زیارت کے لیے آتے تھے۔ ان سب کے لیے اسی چکی میں آٹا پستا تھا جس کی مقدار روزانہ چار من تک ہوتی تھی۔

یہ پورا سسٹم اب بھی باقی ہے۔ البتہ اب اس میں آٹا نہیں پیسا جاتا۔ اب اس پن چکی کو لوگ محض عجوبہ کے طور پر دیکھنے آتے ہیں۔ ۵ ستمبر کی دوپہر کو میں نے اس پن چکی کو دیکھا۔ یہاں سیاح کافی آتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اورنگ آباد میں ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ کو پیدا ہوئے۔ یہ میری پیدائش سے ٹھیک ۲۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ فرق بہت بامعنی ہے۔ مولانا مودودی کی تفکیر کو میں ردعمل کی تفکیر سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جس زمانہ میں ان کے ذہن کی تشکیل ہوئی وہ مکمل طور پر ردعمل کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش سے بچایا۔ میرے حالات نے مجھے یہ موقع دیا کہ میرے اندر مثبت طرز فکر پرورش پائے۔

مولانا مودودی کی اسی نفسیات کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اسلام کی سیاسی اصطلاحوں میں تبئین کو اسلام کی زمانی تشریح سمجھا۔ حالاں کہ اسلام کا زمانی اظہار یہ تھا کہ اس کو وقت کے سائنٹفک اسلوب میں بیان کیا جائے۔ مولا مودودی سیاسی ردعمل میں مبتلا ہونے کی وجہ سے نہ سائنٹفک اسلوب کو سمجھ سکے اور نہ ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ اس کو اپنی تحریروں میں اختیار کرسکیں۔

محمد سلیم صاحب نے بتایا کہ کامرس کی تعلیم کے زمانہ میں میں نے کورس کی ایک کتاب میں پڑھا تھا: بزنس اور جیب کو ایک دوسرے کا دشمن سمجھو۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی بھی مومنٹ کو اس کے رزلٹ سے جانچا جاتا ہے۔ رزلٹ اگر اچھا نہ نکلے تو بظاہر ایک صحیح مومنٹ بھی غلط ہوجاتی ہے۔

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے ۱۹۱۹ میں سول ڈس اوبیڈینس کی تحریک چلائی۔ مگر کھیڑا میں

ان کے آدمیوں نے قانون کو توڑ دیا۔ مہاتما گاندھی نے اس کو ہمالیائی قسم کا غلط اندازہ (Himalayan miscalculation) بتا کر تحریک روک دی۔ (صفحہ ۳۹۱) اس کے برعکس آپ کے آدمیوں نے ۶ دسمبر کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کی کھلی خلاف ورزی کی۔ مگر آپ نے نہ یہ کہا کہ ہم نے اپنے آدمیوں کے بارہ میں بہت غلط اندازہ کیا تھا اور نہ تحریک کو روکنے کا اعلان کیا۔

میں نے کہا کہ آپ کے لوگوں نے ایک مسجد ڈھانچہ کو نہیں توڑا بلکہ ملک کی تمام اعلیٰ روایات کو توڑ دیا۔ حتیٰ کہ اب تمام سنجیدہ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ اب خود ہمارے دیس کا وجود ہی داؤ پر لگا ہوا ہے:

The very survival of our nation is at stake.

مذکورہ صاحب میری باتوں کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پرجوش گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بھارت ہمارا ہے۔ ہم جیسے چاہیں گے اس پر حکومت کریں گے۔

میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں ڈیموکریسی ہے۔ ہر ہندستانی کا یہ حق ہے کہ وہ جس ڈھنگ کی سرکار بنانا چاہے، اس کے لئے وہ کوشش کرے۔ اور اگر عوام اس کا ساتھ دیں تو سرکار بنائے۔ مگر آپ لوگ جو بولی بول رہے ہیں وہ گھمنڈ کی بولی ہے، اور گھمنڈ کی بولی اس دنیا میں نہیں چلتی۔

بھارت ہو یا کوئی دوسرا دیش ہو، وہ کسی بھی قوم یا پارٹی کا نہیں ہے۔ اس کا مالک خدا ہے۔ ہم اس کے امانت دار ہیں، ہم اس کے مالک نہیں۔ ہم کو وہی بولی بولنا چاہئے جو ہمارے لئے سزاوار ہو۔ سیکڑوں سال کا انسانی تجربہ اس ہندستانی مثل میں بتایا گیا ہے کہ "بڑے بول کا سر نیچا"۔

ایک صاحب نے پاکستان کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ پاکستان نام نہاد اسلام پسندوں کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے جو ضروری حالات پیدا کئے بغیر زبردستی وہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس غلطی کا آغاز اقبال سے ہوتا ہے جنھوں نے ۱۹۳۸ میں یہ سمجھا کہ ایک علیحدہ زمینی ٹکڑا حاصل کرنے سے اسلامی قانون کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان

بننے کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ فرض کر لیا کہ اسمبلی میں قرار داد مقاصد پاس ہو جانے سے پاکستان اسلامی ملک بن جائے گا۔ انھوں نے یہ دھمکی دے کر اسلامی قرار داد مقاصد پاس کرائی کہ میں دستور ساز اسمبلی سے مستعفی ہو جاؤں گا اگر وہ پاس نہ کی گئی۔

اس کے بعد سید ابو الاعلیٰ مودودی اٹھے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ حکمرانوں سے ٹکرا کر وہ پاکستان میں نظام مصطفےٰ لا سکتے ہیں۔ اس کا آخری ڈراپ سین یہ ہے کہ جماعت اسلامی سمیت مختلف پارٹیوں کے اشتراک سے "اسلامی جمہوری اتحاد" بنا۔ ۱۹۹۰ کے الکشن میں اس کو مرکزی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو گئی۔ نواز شریف اسلامی وزیر اعظم بن گئے۔ مگر جلد ہی بعد ان میں اور صدر غلام اسحاق خاں میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ صدر غلام اسحاق خاں کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ تھی کہ نواز شریف عہدہ میں ان سے چھوٹے تھے، مگر وہ چھوٹے بن کر رہنے پر راضی نہ تھے (نوائے وقت ۱۳ جولائی ۱۹۹۳)

۱۸ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسحاق خاں نے بدعنوانی اور نااہلی کا الزام لگا کر نواز شریف کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ نواز شریف سپریم کورٹ میں گئے۔ سپریم کورٹ نے ۲۶ مئی ۱۹۹۳ کے فیصلہ میں صدر کے فرمان کو مسترد کرتے ہوئے نواز شریف کو دوبارہ وزیر اعظم بنا دیا اور قومی اسمبلی بحال کر دی۔ مگر دونوں میں چپقلش جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۸ جولائی کو فوجی چیف جنرل عبد الوحید نے مداخلت کر کے دونوں کو استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔

میں نے کہا کہ نواز شریف نے مجبوری کے تحت "چھوٹا" بننا منظور کر لیا۔ مگر اسلامی حکومت وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو آزادی کے تحت اپنے آپ کو چھوٹا بننے پر راضی کر لیں۔ جب تک ایسے کیرکٹر کے افراد نہ پیدا ہوں، اسلامی نظام کی بات کرنا ایک قسم کا مسخرہ پن ہے نہ کہ کوئی اسلامی کام۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ پاکستان جب سے بنا اسی وقت سے اس کی سیاست اینٹی انڈیا سیاست ہے۔ ۱۹۶۲ء میں انڈین نیوی کے کچھ جہاز بمبئی میں کھڑے تھے۔ اس پر اس وقت کے صدر پاکستان جنرل ایوب خاں نے امریکی صدر جان کینیڈی کو ۵ نومبر ۱۹۶۲ کو ایک لمبا خط روانہ کیا۔ اس کا ایک جزء یہ تھا: "انڈیا کے بحریہ کے جہاز، دو چھوٹے

جہازوں کو چھوڑ کر، سب کے سب بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ مرمت بتائی جاتی ہے لیکن دراصل انھیں ہمارے لئے خطرہ پیدا کرنے کے واسطے وہاں اکھٹا کیا گیا ہے (سوانح حیات محمد ایوب خاں، ۳۸ ۔ ۲۴۷)

صدر محمد ایوب خاں نے اس خط میں امریکہ سے اپیل کی تھی کہ وہ انڈیا کو ہتھیار نہ دے۔ کیوں کہ وہ ان ہتھیاروں کو ہمارے خلاف کشمیر میں استعمال کرے گا۔ جیسا کہ وہ اس سے پہلے جوناگڈھ اور حیدر آباد میں ان کو ہمارے خلاف استعمال کر چکا ہے (۲۳۸)

بمبئی میں اگر جہاز کھڑے ہوں تو ان کو کراچی کے لئے خطرہ بتانا، یا جوناگڈھ اور حیدر آباد کو بھی پاکستان کا مسئلہ سمجھنا اور کشمیر کو بھی پاکستان کا مسئلہ سمجھنا، اس قسم کی باتوں کو جو لوگ خارجہ سیاست سمجھتے ہیں، وہ خارجہ سیاست کی الف ب بھی نہیں جانتے۔ پاکستان نے روز اول سے امریکہ کو اپنا دوست اور انڈیا کو اپنا دشمن سمجھا۔ مگر یہ وہمی خارجہ سیاست تھی۔ سچی خارجہ سیاست یہ تھی کہ پاکستان دل سے انڈیا کو اپنا دوست بناتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج برصغیر ہند کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ مسلمانوں سے دور ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کے اجتماع میں آپ بہت کم نظر آتے ہیں۔ البتہ ہندوؤں سے آپ کا تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔ ان کی میٹنگوں میں آپ کو بہت زیادہ بلایا جاتا ہے۔ ہندو پریس میں آپ بہت زیادہ چھپ رہے ہیں۔ ہندوؤں سے آپ کا بہت زیادہ ملنا جلنا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ایک لغو الزام ہے۔ آپ اورنگ آباد میں یا کسی بھی مقام کا سروے کر کے دیکھ لیں۔ آج مسلمانوں میں سب سے زیادہ الرسالہ اور اس کی مطبوعات پڑھی جاتی ہیں۔ میں بار بار مسلمانوں کے اجتماعات میں جاتا ہوں، جن میں سے ایک موجودہ اورنگ آباد کا سفر بھی ہے۔

باقی جہاں تک ہندوؤں میں نفوذ کا تعلق ہے، تو وہ عین ہمارا مقصود ہے۔ ۱۹۷۶ میں جب الرسالہ جاری ہوا، اس وقت سے ہم یہ کہتے رہے ہیں کہ غیر مسلموں میں تعلقات بڑھائے جائیں۔ ان کے درمیان اسلام کی پیغام رسانی کا کام کیا جائے۔ اللہ کے فضل سے

غیر مسلموں میں ہمارے مشن کا جو نفوذ ہوا ہے، وہ لمبی جدوجہد کے نتیجہ میں ہوا ہے۔ اور عین ہمارے نشانہ کے مطابق ہوا ہے۔ جو لوگ اس پر اعتراض کر رہے ہیں انھیں خوش ہونا چاہئے کہ ہندستانی مسلمان اب اس قابل ہو رہے ہیں کہ وہ اسلام کی ایک اہم ذمہ داری کو پورا کر سکیں۔

اورنگ آباد میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرب میں ایک بینک میں کیشیئر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ عرب لوگ امریکنوں سے بہت زیادہ مرعوب ہیں۔ ان کے بارہ میں کہتے ہیں کہ: مخ کثیر۔ یعنی ان کا دماغ بہت زیادہ ہے۔ لیکن انڈیا اور پاکستان جیسے ملکوں کے مسلمانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

انھوں نے مثال کے طور پر بتایا کہ وہ بینک میں اپنی ڈسک پر تھے۔ عرب فوجی تنخواہ کے لئے آتے تھے۔ ان کے پاس چیک ہوتا تھا جس کو لے کر انھیں رقم دینا ہوتا تھا۔ مذکورہ صاحب کاؤنٹر کے پیچھے ایک ایک چیک لیکر اس کی رقم گن کر دے رہے تھے، اتنے میں لائن میں کھڑے ہوئے ایک عرب فوجی کی آواز آئی: یا الله سرعة (یعنی جلدی کرو) انھوں نے کہا: انا مش ماکینة (میں مشین نہیں ہوں) اس جواب کو سن کر فوراً مذکورہ عرب فوجی نے ڈانٹ کر کہا: اسکت یا هندی (اے انڈین چپ رہو)

میں نے اس قصہ کو سن کر کہا کہ ہندستان کے مسلمان عرب میں جاکر وہاں جس طرح موافقت کرکے رہتے ہیں، اس کا ۲۵ فیصد بھی اگر وہ انڈیا میں موافقت کرکے رہیں تو یہاں ہر طرف امن ہی امن ہو جائے۔

شیخ سلیم صاحب (۳۶ سال) ایم کام، ایل ایل بی نے بتایا کہ انڈیا ٹوڈے کے ایک سروے میں انھوں نے پڑھا کہ انڈیا میں ۸۵ حلقۂ انتخاب ایسے ہیں جہاں ایم پی کے الکشن میں مسلمان فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی نادانی سے ان کے ووٹ بٹ جاتے ہیں۔ وہ اپنے موافق پچاس ممبر لوک سبھا میں پہنچا سکتے ہیں۔ مگر اپنی بے شعوری کی بنا پر وہ اس امکان کو کھو رہے ہیں۔

شیخ سلیم صاحب نے دس سال پہلے اپنے کسی دوست سے پانچ سو روپیے لے کر بینک

میں کھاتہ کھولا اور پھر بینک سے قرض لے کر ایک انڈسٹری شروع کی۔ مگر پہلے ہی سال ان کو ۶۰ ہزار روپیہ کا گھاٹا ہوگیا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے بینک سے مزید قرض حاصل کرکے اپنا کاروبار جاری رکھا۔ چنانچہ اگلے سال انھیں ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ کا فائدہ ہوگیا۔ اب اورنگ آباد میں ان کی پانچ انڈسٹری چل رہی ہے ـــــ زندگی نام ہے رسک لینے کا۔ اس دنیا میں رسک لینے والا ہی کامیاب ہوتا ہے اور نقصان کو برداشت کرنے والا ہی آخرکار فائدہ حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر (۴۰ سال) نے ایک انگریزی مثل بتائی جو مجھے پسند آئی۔ وہ یہ کہ اچھے آغاز کا مطلب یہ ہے کہ آدھا کام ہوگیا:

Well begun is half done.

اورنگ آباد میں مسٹر وگھن راجیندر پربھاکر سانے سے ملاقات ہوئی۔ وہ مرہٹی کے ادیب ہیں۔ انھوں نے سیرت رسول پر کئی کتابیں پڑھیں۔ پھر انھوں نے پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ یہ کتاب ان کو بہت پسند آئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے خود اپنے شوق کے تحت پوری کتاب کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کر ڈالا۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Mr. Vighnarajendra Prabhakar Sane

Vice Principal

K.N. Polytechnic (Pharmacy)

P.O. Box 65, Rauzabagh Aurangabad.

وہ اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ کسی بڑے پبلشر کے ذریعہ چھپوانا چاہتے ہیں۔

۴ ستمبر کی شام کو مرہٹواڑہ سانسکرتک منڈل میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں شہر کے تعلیم یافتہ اور مسلمان جمع ہوئے۔ سوال و جواب کے انداز میں گفتگو ہوئی۔ ایک ہندو بھائی نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کو ایجوکیٹ کیا جائے، تو ایجوکیشن کے لئے آپ کے سامنے ماڈل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے سامنے نیچر کا ماڈل ہے۔ لوگوں کی سوچ کو فطری سوچ بنانا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہماری ملی آئیڈنٹٹی

کا تحفظ ہے جو خطرہ میں پڑی ہوئی ہے، اس کا آپ کے پاس کیا حل ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سوچ ہی اپنے خود درست نہیں۔ آپ اسلام کو اس کے فارم سے آئیڈنٹیفائی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ جب کہ صحیح یہ ہے کہ اسلام کو اس کی اسپرٹ سے آئیڈنٹیفائی کیا جائے۔ میں اسپرٹ کو اس معاملہ میں اصل سمجھتا ہوں۔ اور اپنی ساری طاقت میں نے روح اسلام کو زندہ کرنے میں لگا رکھی ہے۔

انھوں نے کہا کہ فارم تو ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ میں فارم کا انکار نہیں کرتا۔ مگر آپ لوگ اس معاملہ میں جو باتیں کر رہے ہیں وہ (shift in emphasis) کے ہم معنی ہے۔ آپ حضرات فارم کو اہمیت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اصل اہمیت کی چیز اسپرٹ ہے۔ ہم کو سب سے زیادہ اسی پر زور دینا چاہئے کیوں کہ جب اسپرٹ آتی ہے تو اس کے بعد فارم اپنے آپ آجاتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کا کوئی قائد نہیں۔ قیادت کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہی ان کے سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے۔ مگر یہ محض بے شعوری کی بات ہے۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس ملک میں کئی بڑے بڑے افراد موجود تھے جو قیادت کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابو الکلام آزاد۔ مگر قوم ان کو چھوڑ کر مسٹر جناح کی طرف دوڑ پڑی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ قیادت کی غیر موجودگی نہیں ہے بلکہ قبولیت قیادت کی غیر موجودگی ہے۔ قوم جب قائد کو قبول ہی نہ کرے تو اچھے سے اچھا قائد بھی بے قائد ہو کر جائے گا۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی سوچ کا بگاڑ ہے۔ جب تک لوگوں کی سوچ درست نہ ہو اس وقت تک ملی ترقی کا کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کوئی صالح قیادت ان کے درمیان ابھر سکتی ہے۔

ایک مجلس میں ذاتی سوالات کے جواب میں میں نے بتایا کہ میری باقاعدہ تعلیم عربی مدرسہ میں ہوئی۔ انگریزی میں نے پرائیویٹ طور پر پڑھی۔ یہ سن کر ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ ایم ایس سی ہیں۔ میں نے کہا کہ میری رسمی تعلیم ساری کی ساری مدرسہ میں ہوئی ہے۔ البتہ

انگریزی سیکھنے کے بعد میں نے ذاتی مطالعہ کے تحت سائنس اور دوسرے جدید علوم کا مطالعہ کیا ہے۔

ایک مجلس میں ہندو اور مسلمان دونوں موجود تھے۔ ایک کانگرسی ہندو بھی اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کا ذکر چھیڑا۔ میں نے کہا کہ میں کسی پارٹی کا نہ مخالف ہوں اور نہ موافق۔ البتہ میں کہتا ہوں کہ یہ سوچ غلط ہے کہ فلاں سیاسی پارٹی کو اقتدار میں نہ آنے دو ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ ملک کو جو چیز تباہ کرنے والی ہے وہ ڈیموکریٹک پراسس کو روکنا ہے۔ یہ ڈیموکریسی کا زمانہ ہے۔ آپ زمانہ کے خلاف چلیں تو زمانہ نہیں بدلتا البتہ آپ تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہمیں یہ کرنا تھا کہ مقرر مدت میں فیر اور فری الکشن ہو۔ جو پارٹی جیتے اس کو چار سال تک حکومت کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہارنے والا اپنی ہار کو مان لے جیسے مغربی ملکوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۹۲ کے صدارتی الکشن میں کلنٹن جیت گیا۔ بش ہار گیا۔ مگر اس کے بعد کلنٹن کو سب سے پہلا مبارک باد کا جو تار ملا وہ جارج بش نے بھیجا تھا۔

اسی طرح یہاں ہونا چاہئے کہ جو ہارے وہ اپنی ہار کو مان لے اور اگلے الکشن تک اپنی باری کا انتظار کرے۔ مگر یہاں یہ ہوتا ہے کہ اولاً تو فیر الکشن نہیں ہوتا اور دوسرے یہ کہ الکشن کے بعد جو ہارتا ہے وہ چاہتا ہے کہ جیتنے والی پارٹی کو چلنے نہ دے۔ درمیان میں ہی اس کو حکومت سے نکال باہر کرے۔

ایک مجلس میں حالیہ مذہب بل کا تذکرہ ہوا۔ میں نے کہا کہ اصولاً میں اس کے خلاف ہوں کہ سیاسی مفاد کے لئے مذہبی نعرہ کو استعمال کیا جائے۔ مگر اس طرح کی کسی برائی کو قانون کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ آپ دیکھئے آج بھی بہت سی سماجی اور سیاسی برائی کے خلاف قانون بنے ہوئے ہیں۔ مگر ان قوانین نے ایک فیصد بھی اس برائی کو ختم نہیں کیا۔ آپ کو سب سے پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ لوگوں کو ایجوکیٹ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہ برائیاں ختم ہوسکتی ہیں۔

اورنگ آباد کے کچھ لوگوں نے "علماء اورنگ آباد" کے نام سے مقامی اخبارات میں

میرے خلاف بیانات چھپوائے تھے۔ ان بیانات میں میری مذمت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اورنگ آباد میں میری تقریر نہیں ہونا چاہئے۔ وغیرہ۔ مگر اورنگ آباد کا جلسہ خدا کے فضل سے بہت کامیاب ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ حتی کہ ہال لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ناکافی ہوگیا۔

ان بے معنی بیانات کو دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے پاس کوئی مثبت کام نہیں اس لئے وہ اس قسم کے منفی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کا حل جوابی مذمت نہیں ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر مثبت سوچ پیدا کر دی جائے۔

مخالفانہ پروپگنڈے کی وجہ سے پولیس چوکنی ہوگئی۔ اس نے جلسہ گاہ میں حفاظت کا خصوصی انتظام کیا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ پیش آیا۔ اجتماع کے دوران (میر ہاشم ایم اے ایل ایل بی کے صاجزادہ) میرے ساتھ تھے۔ وہ اچھے جسم کے تندرست نوجوان ہیں۔ وہ اتفاق سے سیاہی مائل پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ تقریر سے فارغ ہوکر میں مغرب کی نماز کے لئے اٹھا۔ تو وہ میرے ساتھ ہوگئے اور جب میں نے وضو کیا تو پانی لے کر مجھ کو وضو کرانے لگے۔ وغیرہ۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پولیس والے اس نوجوان کو زبردست سلیوٹ دے رہے تھے۔ وہ جدھر جاتے پولیس والے ان کو سلیوٹ دیتے۔ قصہ یہ تھا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی "بلیک کیٹ" ہے جو دہلی سے میری سیکورٹی کے لئے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ میر ہاشم صاحب کے صاجزادے تھے جو الکٹرانکس کے طالب علم ہیں۔ ان کا پورا گھر الرسالہ پڑھتا ہے۔ چنانچہ ان کے گھر کے سبھی لوگ جلسہ میں شریک تھے۔ از راہ خلوص وہ میرے ساتھ ہوگئے تھے۔ نہ کہ برائے حفاظت۔

۴ ستمبر کی دوپہر کو ہم لوگ اورنگ آباد سے خلد آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دولت آباد دیکھا۔ اس کے بعد کاغذی پورہ میں درگاہ والی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ یہ ایک قدیم مسجد ہے۔ اس کے طاق پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس کے اندر قرآن کے سیپارے رکھے ہوئے تھے۔ صندوق کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

برائے ایصال ثواب مرحومہ قمر النساء دودھ والی، طاہر منزل، بمبئی ۸۔ اس مسجد کے وسیع صحن میں ایک قبر ہے۔ کئی عورتیں یہاں اس کی زیارت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ قبر کے دروازہ کے بیرونی سمت میں ایک بورڈ اس مضمون کا لگا ہوا تھا:

شہنشاہ روم و شام حضرت مولانا مخدوم حاجی نظام الدین صاحب چہاردہ صد (۱۴۰۰) اولیاء کامل پیش امام قدس سرہ العزیز کاغذی پورہ تعلقہ خلد آباد ضلع اورنگ آباد۔ مسجد کے بیرونی دروازے پر ایک پتھر دکھائی دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مسجد محمد بن تغلق کے عہد میں بنائی گئی۔ آگے بڑھے تو ایک اور درگاہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: درگاہ پیر مست زندہ ولی، درگاہ حضرت حافظ یحییٰ میاں قادری کاملی قدس سرہ العزیز، درگاہ حضرت حافظ شاہ غلام ربانی قادری کاملی قدس سرہ العزیز، خلد آباد شریف۔

ان چیزوں کو دیکھ کر امت کی موجودہ تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ میں نے سوچا کہ آج امت کا یہ حال ہے کہ اس کے خواص نزاعات میں الجھے ہوئے ہیں اور اس کے عوام توہمات میں۔

۵ ستمبر کی شام کو مرہٹہ سانسکرت کے ہال میں پبلک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تقریر کا موضوع تھا ـــــ اسلام دین رحمت۔ ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ جسٹس دیش مکھ نے صدارت کی۔ انھوں نے اپنی آخری صدارتی تقریر میں کہا کہ محمد صاحب کے بارہ میں اس وقت جو باتیں میں نے سنی ہیں اس کے بعد میری یہ تجویز ہے کہ اس طرح کی تقریریں مرہٹی میڈیم اسکولوں میں اور ہندو نوجوانوں میں کرائی جائیں تاکہ لوگوں کو اسلام کے بارہ میں صحیح جانکاری ہو۔

اس اجتماع کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، ہر مذہب کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ اگرچہ لاؤڈ اسپیکر زیادہ اچھا نہ تھا۔ مگر بعد کو ایک صاحب نے بتایا کہ لوگ آپ کی لمبی تقریر کو اس طرح محو ہو کر سن رہے تھے جیسے اس میں گم ہو گئے ہیں۔

تقریر میں میں نے کہا کہ اسلام کا دین رحمت ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف آیتیں اور حدیثیں پڑھ کر سنائیں۔ دور اول میں دعوت کا کلمہ یہ ہوتا تھا:

ایھا الناس قولو الا الٰہ الا اللہ تفلحوا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صرف کچھ پر اسرار عقائد یا غیر متعلق رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کا تعلق فلاح انسانی سے ہے۔ یہ فلاح دنیا سے آخرت تک چلی جاتی ہے۔

تقریر کے آخر میں میں نے کہا کہ ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام آدمی کے اندر پازیٹو تھنکنگ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ کی پوری زندگی اسی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

پروگرام کے خاتمہ کے بعد بہت سے لوگ ملے اور اپنے اتفاق کا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے ایک چھوٹا سا کاغذ دیا اور کہا کہ اس کا جواب الرسالہ میں دیجئے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ میں نے کاغذ دیکھا تو اس میں ان کا نام یا پتہ کچھ بھی لکھا ہوا نہ تھا۔ اس چھوٹے سے کاغذ پر انگریزی میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

Positive thinking to what extent? And what about positive acting and to what extent? Will you please explain it in your next edition of Al-Risala or any famous Urdu newspaper?

اگر وہ صاحب ملتے تو میں ان سے کہتا کہ پازیٹو تھنکنگ (مثبت طرز فکر) آخر وقت تک مثبت طرز فکر کی ضرورت کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے بلکہ خود ہمارے اپنے لئے ہے۔ مثبت طرز فکر کا تعلق خود اپنی شخصیت کی تعمیر سے ہوتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں وہ افراد جائیں گے جو قلب سلیم (الشعراء ۸۹) لے کر اللہ کے یہاں پہنچیں۔ قلب سلیم سے مراد ربانی شخصیت ہے۔ منفی نفسیات میں جینے سے غیر ربانی شخصیت بنتی ہے اور مثبت نفسیات میں جینے سے ربانی شخصیت۔ ایسی حالت میں یہ مومن کی اپنی ضرورت ہے کہ وہ ناموافق باتوں پر منفی ردعمل کا شکار نہ ہو۔ وہ صبر و اعراض کے اصول کو اختیار کر کے مثبت فکر پر قائم رہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر نہ ہو سکے گی۔ اور جس آدمی کے اندر ربانی شخصیت نہ بنے، اس کا جنت میں داخلہ ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

اگلے صفحہ پر وہ اشارات درج ہیں جو حسب معمول میں نے ایک کاغذ پر نوٹ کئے تھے۔

وما ارسلناك الا رحمة للعالمین ۔ وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمة ۔ الصلح خیر
عرب جاہلیت : فلم یبق من العدوان دنّاهم کما دانوا
الا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا
ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء ۔ لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس (حدیث)
المومن من أمنهُ الناس علی دمائهم و اموالهم
الا اخبرك بافضل اخلاق اھل الدنیا تصلُ من قطعك وتعطی من حرمك وتعفو عمّن ظلمك
رحمت کلچر : اھل ایمان ، اھل تراحُم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بوقت ملاقات یرحمك اللہ ، جواب ، یرحمنا اللہ وایاکم
اولئك یوتون اجرھم مرتین بما صبروا ویدرؤن بالحسنة السیئة (القصص)
صبر کے بغیر رحمت کے اصول پر قائم رہنا ناممکن ۔ یہاں بے رحمی کے تجربہ کے باوجود رحم کرنا پڑتا ہے ۔
گائے کی فیکٹری گھاس کھاکر دودھ ، اسی طرح مومن ، منفی تجربہ کے باوجود مثبت رد عمل ۔
سب کو انسان کے روپ میں دیکھنا ، مدینہ کے پہلے اسکول کے تمام ٹیچر نان مسلم
خیر الناس من ینفع الناس ، برداشت کرنے سے آگے بڑھ کر نفع بخش انسان بننا ۔
بے ظلم تو درکنار ظلم پر بھی دعا دینا ، رب اھد قومی فانھم لا یعلمون
نفس امارہ سے اعراض کرتے ہوئے نفس لوامہ کو متحرک کرنا
مسجد میں پیشاب ، واللہ ماقھرنی محمد واللہ مازجرنی محمد
لا تغضب ، مومن کے سینہ میں ایک شاک ابزاربر ،
دنیا میں پھول کے ساتھ کانٹا ، قلیل شر کو برداشت کرو تاکہ کثیر شر سے محفوظ رہو ۔
جلوس کے لیڈروں کو ہار پہنایا ۔ لیڈر دشمن کے بجائے دوست بن گئے ۔ فساد ختم
سپیریر سولیوشن زندگی کا راز ، اسلام کی یکطرفہ اخلاق کی تعلیم گویا سپیریر سولیوشن ہے ۔
بگ برڈ آف دی اسٹارم ، حالات سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرنا ، تسخیری قوت
سڑک پر نماز پڑھنے نہیں دیتے ، ٹرین میں نماز پڑھنے دیتے ہیں ، انصاف کی بات
رحمت کا انداز برائے مثبت نفسیات ، اپنے آپ کو منفی نفسیات سے بچانا
مدن لال تلوار ، پہلے تلوار تھے ، پھر پھول بن گئے ، کردار کا کرشمہ
مسٹر ساورکر ، پہلے مخالف تھے ، ضمیر کو جگاتے کے بعد گہرے دوست بن گئے ۔

رات کو جب تمام لوگوں سے رخصت ہو کر میں اپنے کمرہ میں آیا تو کمرہ کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو اورنگ آباد کے مشہور فریڈم فائٹر اور پدم وبھوشن گوونند بھائی شراف ایم ایس سی بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کیا اس وقت۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ابھی۔ میں نے کہا کہ اب تو رات ہو چکی ہے۔ اس وقت آپ کو تکلیف ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ میرے گھر سے ہوٹل کا راستہ کار کے ذریعہ ۱۰ منٹ کا راستہ ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ جاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے آجائیے۔ دس منٹ میں وہ آگئے۔

ان کی عمر ۸۳ سال ہے۔ مگر ابھی تک وہ ایکٹو لائف گزار رہے ہیں۔ انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا کہ اس ملک میں ہندو مسلم ایکتا بہت ضروری ہے۔ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو ہوا وہ بہت برا تھا۔ مگر اب ہم سب کو ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر بھائی بھائی کی طرح رہنا چاہئے۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا تعارف اس حیثیت سے کرایا گیا تھا کہ وہ الرسالہ کے مخالف ہیں۔ میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ علما کی مجاہدانہ تحریک کو ناکام بتاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ تو اپنے مقصد میں مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان کا مقصد عالم اسلام سے انگریزوں کا اخراج تھا۔ اور ان کی قربانیوں سے الحمدللہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو گیا۔

میں نے کہا کہ آپ نے ادھوری بات کہی۔ پوری بات یہ ہے کہ انگریز گیا اور امریکہ آگیا۔ گویا کہ یہ دشمن کا بدلنا (replacement) تھا نہ کہ دشمن کا اخراج۔ انگریز کا جسمانی اخراج بذات خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ جہاد کا اصل مقصد مغلوبیت مسلمین کو ختم کرنا تھا، اور وہ ایک فیصد بھی ختم نہیں ہوئی۔

پھر میں نے کہا کہ مزید یہ کہ اب جسمانی موجودگی ایک اضافی چیز بن چکی ہے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ جسمانی موجودگی کے بغیر ایک قوم دوسری قوم کے درمیان نفوذ حاصل کر لے۔ چنانچہ انگریزوں نے جو تدخل جسمانی موجودگی کے ذریعہ حاصل کیا تھا وہ تدخل مزید اضافہ کے ساتھ امریکہ اپنی جسمانی موجودگی کے بغیر ہر مسلم ملک میں حاصل کئے ہوئے ہے۔

۵ ستمبر کی شام کو عشا کے وقت اجتماع گاہ سے ہوٹل واپس آیا۔ یہاں تقریباً دو درجن افراد جمع ہو گئے۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے اور ان میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ہوٹل میں دیر تک ان لوگوں سے باتیں ہوتی رہیں۔

رات کو گیارہ بجے اپنے کمرہ میں پہنچا۔ رات کو جلد ہی نیند آگئی۔ سوتے ہوئے ایک عجیب خواب دیکھا:

یہ اورنگ آباد کے ہوٹل اشوک کا کمرہ نمبر ۲۳۰ ہے۔ میں رات کو تنہا اس میں سو رہا ہوں۔ رات کو میں نے وہاں ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک پاکستانی مسلمان کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ وہ انڈیا آئے تھے اور اب وہ پاکستان واپس جا رہے ہیں۔ راستہ میں انھوں نے چاہا کہ انڈیا کا امرود خرید کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ ہم دونوں بازار میں گئے۔ مگر اتفاق سے امرود نہ مل سکا۔ ہم لوگ ایک جگہ بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک ہندو خاتون وہاں آگئیں۔ کسی طرح انھیں معلوم ہوا کہ ہم امرود کی تلاش میں ہیں مگر بازار میں امرود نہیں مل رہا ہے۔ وہ ہندو خاتون تیزی سے اپنے گھر گئیں اور ایک تازہ امرود جو غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ یعنی چھوٹے بیل کی مانند تھا۔ انھوں نے لاکر ہمیں بطور تحفہ پیش کیا۔ یہ دیکھ کر پاکستانی مسلمان نے انگریزی میں کہا کہ آج میں نے ایک نیا ہندو دریافت کیا:

Today I discovered a new Hindu.

میں نے پاکستانی مسلمان کی زبان سے یہ جملہ سنا تو میں نے انگریزی میں اس کا جواب دیا۔ وہ جواب اس طرح تھا:

Don't say new Hindu, but say real Hindu because all Hindus are like this.

(یہ نہ کہئے کہ نیا ہندو بلکہ یہ کہئے کہ حقیقی ہندو۔ کیوں کہ تمام ہندو ایسے ہی ہیں)

یہ خواب میں نے اٹھ کر رات کو چار بجے ہوٹل کے کمرہ میں لکھا۔

کمرہ میں بڑے سائز کا ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ مگر میں نے اس کو کبھی نہیں کھولا۔ ہوٹل کے ایک ملازم نے کہا کہ آپ ٹی وی نہیں چلاتے۔ میں نے کہا کہ میرا ذہن کچھ ایسا ہے کہ میں اس قسم

کی چیزوں سے انجوائے نہیں کر سکتا۔

۵ ستمبر کو لائٹ جلانے کے لئے میں میز پر لگے ہوئے بٹن دبا رہا تھا کہ ایک بٹن دبلتے ہی ٹی وی چل گیا۔ اس وقت بی بی سی سے "ایشیا ٹوڈے" کے تحت پروگرام آرہے تھے۔ اس میں کوریا کی ترقی دکھائی جارہی تھی۔ ایک منظر میں میں نے دیکھا ایک انٹرویور کسی ذمہ دار کورین سے سوالات پوچھ رہا ہے۔ گفت گو کے پس منظر میں کوریا کی صنعتی ترقیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مذکورہ کورین نے کہا :

The most important thing is the mindset of Korean people. We are a small nation so we want to make everything big.

ذہنی ساخت (mindset) کی بات مجھے بہت پسند آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں سب کچھ اسی ذہنی ساخت پر منحصر ہے۔ منفی ذہنی ساخت سے منفی تاریخ بنتی ہے اور مثبت ذہنی ساخت سے مثبت تاریخ۔

۵ ستمبر کو واپسی کا دن تھا۔ ساتھیوں کے ہمراہ ایئرپورٹ پہنچا۔ ذوالفقار صاحب کے تعلقات بہت وسیع ہیں اور عام طور پر لوگ ان کا احترام کرتے ہیں۔ پہنچانے والوں کے لئے ایئرپورٹ پر اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مگر ذوالفقار صاحب نے ایئرپورٹ کی خاتون ذمہ دار سے کہا تو اس نے ہمارے سب ساتھیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔

یہاں جہاز کی روانگی کے آخر وقت تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگ ۶ دسمبر کو صرف المیہ کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا قانون ہے کہ یہاں ہر المیہ کے اندر سے ایک نیا وسیع تر امکان برآمد ہوتا ہے ۱۹۹۳ کے واقعات اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ نیا امکان ملت مسلمہ کے لئے پوری طرح برآمد ہو چکا ہے۔

آخر وقت میں ساتھیوں سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو چیک ان کے اسٹاف میں مسٹر ڈی ایم جوشی (P.S.I. Airport) نے مجھے پہچان لیا۔ انھوں نے میرے بورڈنگ کارڈ پر اسٹیمپ لگانے کے بعد کہا کہ میں نے آپ کی تقریر سنی ہے اور اخباروں میں بھی کئی بار آپ

کو پڑھا ہے ۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اوپری باتوں میں الجھنا چھوڑ دو اور جو اندر کی آتما ہے اس سے بات کرو۔

مسٹر جوشی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ کیوں کہ انھوں نے ہمارے مشن کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ واقعہ یہی ہے کہ آج تمام لوگ اوپری باتوں میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ اوپری باتیں ہمیشہ کئی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان پر زور دینے سے ہمیشہ جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگ "آتما سے بات کرنے لگیں" تو اختلاف اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ مسٹر وی ایم جوشی کی یہ بات مجھے پسند آئی۔

مسٹر جوشی کو اتنی زیادہ دل چسپی تھی کہ وہ مسلسل بات کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایئر پورٹ کی ایک خاتون آئیں، انھوں نے کہا کہ جہاز کی روانگی کا وقت ہوگیا۔ اس کے بعد میں تیزی سے چل کر جہاز تک پہنچا۔ میں آخری مسافر تھا جو جہاز کے اندر سوار ہوا۔

دوران پرواز راستہ میں کچھ اخبار دیکھے۔ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس (۶ ستمبر ۱۹۹۳) کی پہلی سرخی یہ تھی : ہائی کورٹ کے آدیش پر روک لگانے سے انکار۔ اندر کھولا تو اس کا ایڈیٹوریل ملک کی سیاسی صورت حال پر تھا۔ اس کا عنوان تھا : کیا ایودھیا کے علاوہ کوئی مدا نہیں ؟

میں نے سوچا کہ ہندی اخبار کی یہ زبان اور اس کی یہ باتیں عین مسلمانوں کے موافق ہیں زبان کے اعتبار سے یہ تقریباً اردو ہے۔ اور مضمون کے اعتبار سے وہ تقریباً اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے جو مسلمانوں کا نقطۂ نظر ہے۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان ملک کی صحافت کے شاکی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ انصاف کی عدالت سے ان کو حق بجانب ہونے کا سرٹیفکٹ دیا جا سکتا ہے۔

انگریزی اخبار، دی انڈپنڈنٹ (۶ ستمبر) دیکھا۔ صفحہ اول کی ایک خبر یہ تھی کہ وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ چین کے تاریخی سفر پر روانہ :

Rao leaves on historic China visit today.

خبروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان اور چین نے اپنے سرحدی جھگڑے کو اس طرح ختم کر دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ ایکچول لائن آف کنٹرول کو کم از کم عملی طور پر بطور سرحد تسلیم کر لیا جائے۔ میں

سمجھتا ہوں کہ یہی واحد عملی حل ہے۔ اور اگر کشمیر کے معاملہ میں بھی دونوں ملک اسی اصول پر سمجھوتہ کریں تو دونوں کے لئے ترقی کا دروازہ کھل جائے گا جو ۴۵ سال سے دونوں کے اوپر اسی جھگڑے کی وجہ سے بند پڑا ہوا ہے۔

یہ انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۹۲ تھی، درمیان میں جہاز اودے پور میں اترا۔ "اودے پور میں ہم کیول ۲۵ منٹ رکیں گے"۔ اودے پور ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد جہاز کے اناؤنسر نے اعلان کیا۔ مگر اس کے بعد جب جہاز یہاں سے اڑ کر آگے کے لئے روانہ ہوا تو گھڑی میں ۳۰ منٹ ہو چکے تھے۔ اناؤنسر نے ہندی اعلان میں کہا کہ جے پور میں ہم کیول ۲۵ منٹ رکیں گے۔ انگریزی اعلان میں زیادہ صحیح الفاظ تھے:

In Jaipur we will stay approximately 25 minutes.

یہ غالباً لسانی فرق کا معاملہ تھا۔ کیوں کہ انگریزی میں تحدیدی اسلوب غالب ہے، جب کہ ہندی اور اردو میں ادبی اسلوب کا غلبہ ہے۔

"آپ کی جانکاری کے لئے باہر کا تاپ مان ۲۸ ڈگری سیلسیس ہے"۔ ابھی جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا اور مسافر باہر نہیں نکلے تھے کہ اناؤنسر نے اعلان کیا۔ اس پیشگی خبر رسانی کا نام انتباہ (وارننگ) ہے۔ داعی یہی کام کرتا ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ آئندہ آنے والی صورت حال سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کر دے۔

انڈین ایئر لائنز کا ان فلائٹ میگزین سواگت (ستمبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے ایک صفحہ پر ایک نہایت خوبصورت سہ رنگا اشتہار تھا۔ یہ ایک آیورویدک کارخانہ کی طرف سے اسبغول کا اشتہار تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ قبض (Constipation) بہت نقصان والی چیز ہے۔ اس کو توڑنے کے لئے عام طور پر جو دوائیں ہیں ان سے پیٹ کے اندر گیس پیدا ہوتی ہے یا وہ جسم میں مضر اثرات (side effects) پیدا کرتی ہیں۔ اسبغول واحد قدرتی چیز ہے جو جسم اور معدہ کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر قبض کا علاج کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ اسبغول ایک ہزار سال سے زیادہ مدت سے آیورویدک کا حصہ رہا ہے۔ اور اب جدید تحقیقات سے اس کی افادیت ثابت ہو گئی ہے:

It's been part of Ayurveda for over one thousand years. And is now confirmed by modern medical research.

میں نے سوچا کہ یہی واقعہ ہزاروں گنا زیادہ بڑے پیمانے پر دین خداوندی کے ساتھ ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کی تمام تحقیقات نے دین خداوندی کی علمی صحت کی کامل تصدیق کی ہے۔ مگر اس کا خوبصورت اعلان" کرنے والا کوئی نہیں۔ حتی کہ اعلان کرنے والے اپنے منفی ذہن کی بنا پر اس جدید علمی حقیقت سے باخبر بھی نہیں۔

بمبئی کا سفر

بھارتیہ ودیا بھون (بمبئی) کے تحت مسٹر ایس راما کرشنن کے دستخط سے ایک دعوت نامہ ملا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۳ کو بمبئی میں ایک خصوصی جلسہ ہو رہا ہے۔ یہ کانچی کاما کوٹی پیٹھم (شنکراچاریہ) کی صد سالہ تقریبات (centenary celebrations) کے ذیل میں ہے۔ اس میں مجھے شرکت اور خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق بمبئی کا سفر ہوا۔

بھارتیہ ودیا بھون ہندستان کا ایک بہت بڑا تعلیمی اور اشاعتی ادارہ ہے۔ اس کو ڈاکٹر کے ایم منشی نے ۱۹۲۸ میں قائم کیا تھا۔ اس کے تحت بہت سے تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ اس نے ہندوازم اور ہندستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا چھوٹے سائز پر ۸۰ صفحہ کا ہفت روزہ Bhavan's Journal نکلتا ہے جس کی اشاعت سات لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا شمارہ ۱۶۔ ۳۱ مئی ۱۹۸۸ میں نے بمبئی میں دیکھا جو کانچی شنکراچاریہ کے نمبر کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس کا ایک دلچسپ واقعہ آئندہ صفحات میں نقل کیا جائے گا۔ اس جرنل کا میں نے ایک اشتہار پڑھا۔ اس اشتہار میں میگزین کے بارہ میں یہ تعارفی جملہ لکھا گیا تھا :

More than a magazine, a moral force.

ٹکٹ آیا تو اس کے لفافہ پر ٹریول ایجنسی کا نام سیتا (SITA) لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک مشہور سفری ایجنسی ہے۔ نام کی مشابہت سے بظاہر خیال ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاید رام کی بیوی سیتا ہیں اور کسی ہندو نے عقیدت مندی کے تحت کمپنی کا یہ نام رکھا ہے۔ مگر ایسا نہیں۔ یہ ایک فرانسیسی کمپنی ہے جس کے دفتر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سیتا دراصل مخفف ہے، پورا نام اس طرح ہے :

Society International Telecommunication Aeronatiques

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض ظاہری مشابہت کی بنا پر کسی شخص کو کسی اور کے ساتھ بریکٹ نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً کسی مسلمان کی کوئی بات جزئی یا وقتی طور پر کسی غیر مسلم کی بات سے مطابق نظر آ رہی ہو تو اس بنا پر یہ کہنا درست نہیں کہ یہ مسلمان فلاں غیر مسلم کی بولی بول رہا ہے۔ اس طرح کی ضمنی مشابہت تمام علما اور بزرگوں کے یہاں تلاش کی جا سکتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس

طرح کی ضمنی اور ظاہری مشابہت کی بنا پر کسی عالم یا کسی بزرگ کو کسی بدنام شخص یا جماعت کے ساتھ بریکٹ کرنا جائز نہ ہوگا۔ شریعت کا حکم ہمیشہ حقیقی حالت پر ہوتا ہے نہ کہ ظاہری مشابہت پر۔

۲۰ نومبر کی صبح کو گھر سے روانہ ہو کر دہلی ایرپورٹ پہنچا۔ وہاں پہلی خبر یہ ملی کہ انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۱۸۲ لیٹ ہے۔ اسی ہندستان میں پرائیویٹ کمپنیوں کے جہاز ہمیشہ صحیح وقت پر چلتے ہیں۔ مگر انڈین ایرلائنز کی پروازیں اکثر لیٹ رہتی ہیں۔ حادثات کی تعداد بھی ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۹۳ کو انڈین ایرلائنز کا ایک جہاز دہلی سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا۔ مگر منزل سے پہلے اس کو دھان کے کھیت میں اتارنا پڑا (ملاحظہ ہو تصویر ذیل) اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی مشینی خرابی کی بنا پر اس کا تیل زیادہ خرچ ہوا اور وہ راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ ایک ملک کے دو نظام میں یہ فرق بڑا عجیب ہے۔

ایرپورٹ پر مسٹر گوتم ادسوال (۴۳ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور بزنس بھی کرتے ہیں۔ وہ ۱۹۷۹ سے اچاریہ منی سوشیل کمار کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کے گہرے معتقدین میں سے ہیں۔

گفت گو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ اچاریہ جی کی کوئی خاص بات بتائیے جس نے آپ کو متاثر کیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے بڑی چیز جو میں نے اچاریہ جی میں پائی وہ پیار ہے۔ کتنا ہی دماغ میں ٹنشن ہو، اچاریہ جی کے پاس چلے جائیں تو منٹوں میں سارا ٹنشن ختم ہو جاتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں ٹنشن میں بھرا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ جیسے ہی انھوں نے کہا "کہو گوتم، کیسے ہو، تو ایسا لگا جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے کئی ذاتی واقعات بتائے۔

ایرپورٹ پر ایک غیر مسلم مسافر سے بات ہوئی۔ مجھ کو مسلمان کی صورت میں دیکھ کر انھوں نے کہا کہ معاف کیجئے، آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ مار دھاڑ اور تشدد کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے میگزین پڑھے ہیں۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دشمنوں کا پروپگنڈا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پروپگنڈا کیسے ہے۔ ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کشمیر سے لے کر بوسنیا تک اور مصر سے لے کر الجزائر تک ہر جگہ مسلمان تشدد کا طریقہ اپنائے ہوئے ہیں۔ پھر اس میں پروپگنڈا کی بات کیا ہے۔

ان کو میں نے ایک وقتی جواب دے دیا۔ مگر بعد کو میں نے اس پر سوچا تو میری سمجھ میں آیا کہ اس کا اصل سبب وہ نام نہاد مفکرین اسلام اور نااہل قائدین اسلام ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو الٹا سبق دیا۔ انھوں نے مسلمانوں میں تواضع کے بجائے فخر کا مزاج بنایا۔ انھوں نے اطاعت کے بجائے حاکمیت کا جذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے روحانیت کے بجائے سیاست کو ابھارا۔ انھوں نے مسلمانوں کو خدا کی عظمت کے بجائے ذاتی عظمت کا پیغام دیا۔ انھوں نے مفاہمت کے بجائے ٹکراؤ کا راستہ بتایا۔ اس معکوس رہنمائی نے دور جدید کے مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح بگاڑ دیا ہے کہ اب ان کو جنگجوئی کے سوا کرنے کا اور کوئی کام نظر نہیں آتا۔ فرق یہ ہے کہ کوئی لفظی جنگجوئی میں مصروف ہے اور کوئی شمشیری جنگ جوئی میں۔

جہاز دو گھنٹہ کی تاخیر سے ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا۔ راستہ میں انگریزی اخبار ہندو (۲۰ نومبر) کا مطالعہ کیا۔ اس میں ہر روز پچاس سال پہلے کی چھپی ہوئی کوئی خبر نقل کی جاتی ہے۔ آج کے پرچہ میں ۲۰ نومبر ۱۹۴۳ کے شمارہ سے لے کر ایک خبر شائع کی گئی تھی۔ اس وقت ملک کے بعض حصوں میں قحط پڑا ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح نے پارلیمنٹ میں اس پر ایک جذباتی تقریر کی۔

انھوں نے کہا کہ برٹش گورنمنٹ کا یہ کہنا ہے کہ ھم ۱۹۳۹ سے ہر سال ملک میں غذائی کانفرنسیں (Food Conferences) کر رہے ہیں۔ مسٹر جناح نے قہقہہ کے درمیان کہا وہ گورنمنٹ کے اس عمل پر خوش ہیں۔ اگرچہ ان کانفرنسوں کا انجام یہ ہے کہ ہزاروں ہندستانی اب بھی مر رہے ہیں :

...though the net result of the conferences was that thousands of Indians were still dying. (p.8)

عجیب بات ہے کہ یہی الفاظ خود مسٹر جناح پر زیادہ بڑے پیمانہ پر صادق آئے۔ انھوں نے کانفرنسوں کی دھوم مچا کر پاکستان بنوایا۔ اس وقت وہ پُر جوش طور پر کہتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر اصل نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم سے نہ پاکستانی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ہندستانی مسلمانوں کا۔ پاکستان بننے کے پچاس سال بعد بھی تمام مسائل مزید اضافہ کے ساتھ باقی ہیں۔

ہندستان میں ہوائی سفر کے ترقیاتی پروگرام کے بارہ میں ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ جلد ہی ایسا ہوگا کہ دہلی کی ایک تجارتی کمپنی اپنے منیجر سے کہے گی کہ تم کو فوراً کمپنی کے بمبئی آفس پہنچنا ہے۔ منیجر ایک پرائیویٹ ایر لائنز کو ٹیلی فون کرے گا۔ ادھر سے آواز آئے گی کہ جہاز تیار ہے۔ آپ جلد ایر پورٹ آجائیے۔ ہم آپ کو جہاز کے اندر ہی ٹکٹ دے دیں گے۔ آپ کو اپنا سامان سنبھالنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا آدمی آپ کے گھر سے لے کر اس کو سیدھے ہوائی جہاز میں لاد دے گا۔ اور پھر بمبئی میں خود آپ کے دفتر میں پہنچا دے گا۔ منیجر دہلی سے روانہ ہو کر بمبئی میں اترے گا تو وہاں ایر پورٹ پر ہیلی کاپٹر موجود ہوگا جو اس کو فوراً ہی لے کر اڑے گا اور نریمن پوائنٹ پر اتار دے گا۔ بزنس منیجر اپنے دہلی کے مکان سے بمبئی کے دفتر تک صرف چار گھنٹہ میں پہنچ چکا ہوگا۔

تاہم بعض اوقات جلدی کے بجائے دیر مطلوب چیز بن جاتی ہے۔ جون ۱۹۹۳ میں مسٹر ایل کے آڈوانی کو دہلی سے بنگلور پہنچنا تھا تاکہ وہ بی جے پی کی چودھویں نیشنل کونسل (۱۸ جون) میں شرکت کر سکیں۔ انھوں نے یہ سفر ٹرین کے ذریعہ کیا اور دو گھنٹہ کے بجائے ۴۴ گھنٹہ میں بنگلور پہنچے۔ ایسا انھوں نے اس لیے کیا کہ راستہ میں سترہ اسٹیشنوں پر اکٹھا کیے ہوئے مجمع کو خطاب کر سکیں۔

بمبئی ایر پورٹ پر مسٹر مدھو مہتا اور کئی ساتھی موجود تھے۔ ان کے ہمراہ روانہ ہو کر مسٹر مدھو مہتا کی

رہائش گاہ (نیپین سی روڈ) پر پہنچے ۔یہاں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔اس دوران گفت گو میں بہت سی باتیں سامنے آئیں ۔

مسٹر مدھوجتا نے نہایت درد کے ساتھ کہا کہ مسلمانوں کے رہنماؤں میں آپ کے سوا مجھے کوئی بھی رہنما نہیں معلوم جو ملکی مسائل پر بولتا ہو۔یہ لوگ جب بھی زبان کھولتے ہیں تو صرف اپنی کمیونٹی کے مسائل پر بولتے ہیں۔یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ ملک کے انٹرسٹ میں نہیں ہے ،وہ خود مسلم کمیونٹی کے انٹرسٹ میں بھی نہیں ہے ۔

میں نے کہا کہ مجھے آپ کے اس تبصرہ سے پورا اتفاق ہے ۔یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تمام رہنما ،خواہ وہ باریش ہوں یا بے ریش ،وہ سب کے سب فرقہ وارانہ سوچ میں مبتلا ہیں۔ان کی سوچ ملک کے مفاد پر نہیں چلتی ۔وہ سارے عالم کے قائد ضرور بننا چاہتے ہیں۔مگر سارے عالم کے مفاد سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔یہ روش نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق ۔

جناب آفتاب احمد صاحب نے کہا کہ میں تو اکثر یہ کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے ۔دونوں ہی لکشمی کے پجاری ہیں۔ ہندو لکشمی کا بت باہر رکھ کر پوجتا ہے ۔مسلمانوں نے لکشمی کا بت خود اپنے سینہ کے اندر بنا رکھا ہے ۔ایک ظاہری لکشمی کی پوجا کرنے میں مصروف ہے ،اور دوسرا قلبی لکشمی کی پوجا کرتے ہیں ۔

میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات حدیث کے عین مطابق ہے ۔کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر امت کا ایک فتنہ (سامان آزمائش) ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے ۔اب وہی دور آگیا ہے ۔مال لوگوں کی تمام توجہات کا مرکز بن گیا ہے ۔ظاہری دین کچھ اور ہو ،مگر حقیقی دین ہر ایک کا مال ہے ۔ آج سب سے زیادہ اسی قلبی بگاڑ کی اصلاح کی ضرورت ہے ۔

بمبئی کو انڈیا کی کمرشیل راجدھانی کہا جاتا ہے ۔بمبئی میں سب سے پہلے صنعت کاری (industrialisation) کا عمل شروع ہوا ۔مگر اب بمبئی کی حالت اتنی خراب ہے کہ کہا جانے لگا ہے کہ بمبئی میں اب deindustrialisation کا عمل شروع کرنے کی ضرورت ہے ۔

بمبئی میں صنعتی کثافت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے ۔ورلڈ بینک کے ایک برٹش نمائندہ نے کہا کہ گریٹر بمبئی کے ایریا میں جتنی سڑکیں ہیں ،اتنے ایریا میں لندن اور پیرس میں دگنا سڑکیں بنی ہوئی

ہیں۔ اس وقت بمبئی کی آبادی چودہ ملین سے زیادہ ہو چکی ہے۔

انڈیا میں پہلا بڑا انگریزی اخبار بمبئی سے ۱۸۳۸ میں نکلا۔ یہ بمبئی ٹائمس (Bombay Times) تھا جو بعد کو ٹائمس آف انڈیا کے نام سے مشہور ہوا۔ جب جاپان میں پہلا بڑا روزنامہ Yokohama Mainichi Shimbun ۱۸۷۰ میں جاری ہوا۔ گویا کہ جاپان ابتدائی طور پر جرنلزم میں انڈیا کے مقابلہ میں ۳۲ سال پیچھے تھا۔ مگر آج وہ صحافتی ترقی میں انڈیا سے بہت زیادہ آگے جا چکا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں آگے اور پیچھے کے الفاظ اضافی ہیں، ایک شخص یا گروہ اگر آج پیچھے ہو تو اس کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ محنت کر کے اتنی تیزی سے اپنا سفر طے کر سکتا ہے کہ آگے والوں کو بھی اپنے پیچھے چھوڑ دے۔

مہاتما گاندھی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ کو مرن برت رکھا۔ چار روز بعد ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ کسی بھی وقت گاندھی جی کی موت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد بمبئی میں تمام بڑے بڑے لیڈر جمع ہوئے۔ ان میں ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر بھی تھے۔ یہ برت ہریجنوں کے مسئلہ پر تھا۔

لوئی فشر اس کی تفصیلی روداد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ ہندوازم سے ہمالیائی نفرت (Himalayan hatred) رکھتے تھے۔ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے طے کیا تھا کہ پوری اچھوت کمیونٹی کو مسلمانوں کی مسجد میں لے جائیں:

> He preferred Moslems to Hindus and once thought of leading the untouchable community, as a body, into the Mohammedan Church. (p. 312)

بمبئی کی تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات چھپے ہوئے ہیں جو سوچنے والوں کو عبرت کا درس دے رہے ہیں۔

جے بی ایس ہالڈین (۱۸۹۲-۱۹۶۴) ایک مشہور برٹش سائنس داں ہے۔ برٹش حکومت کی پالیسی سے اس کو اختلاف ہوا۔ حتی کہ انگلینڈ چھوڑ کر ۱۹۵۷ میں وہ انڈیا چلا آیا۔ اس نے یہاں کی شہریت لے لی۔ انڈیا ہی (بھوبنیشور) میں اس کا انتقال ہوا۔

ہالڈین لندن سے پہلے بمبئی آیا تھا۔ یہاں اس نے اردو زبان سیکھی۔ تاہم وہ بمبئی میں زیادہ

قیام نہ کرسکا۔ وہ ہندستان کے مختلف شہروں میں گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ اڑیسہ میں اس نے ایک ملازمت کرلی۔

ہالڈین تعلیم کے اعتبار سے سائنس داں تھا۔ بعد کو وہ کمیونسٹ بن گیا۔ وہ لندن کے کمیونسٹ اخبار Daily Worker کا ایڈیٹر بھی رہا۔ مگر بعد کو اسے کمیونسٹ پارٹی سے مایوسی ہوئی۔ اور وہ اس سے الگ ہوگیا۔ اصل یہ ہے کہ ہالڈین نظریاتی کمیونسٹ سے زیادہ اخلاقی کمیونسٹ تھا۔ اس کی دو کتابیں یہ ہیں:

Science and Ethics (1932)

The Inequality of Man (1932)

ہر تحریک اور ہر جماعت میں یہ معاملہ پیش آتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے ذہنی ڈھانچہ کے تحت کسی تحریک میں چلے جاتے ہیں۔ بعد کو عدم اتفاق ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر وہ دور ہونے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اس سے الگ ہوجاتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آخر عمر میں علاج کے لیے بمبئی آئے تھے۔ ڈاکٹر پانڈے (دہلی) نے مولانا کا خون ٹسٹ کرایا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے۔ ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ کو ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا، گورنر بمبئی شری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق تھے انھوں نے ٹاٹا ہوسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا، ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا۔ ۲۶ فروری کو مولانا دہلی واپس پہنچے۔ مگر حالت بگڑتی گئی۔ ۲ اگست ۱۹۶۲ کو مولانا کا انتقال ہوگیا۔

بمبئی کے ساتھ ٹاٹا کا نام بہت زیادہ جڑا ہوا ہے۔ موجودہ جے آر ڈی ٹاٹا کی عمر اب ۸۹ سال ہوچکی ہے۔ ان کو حال میں گردہ کی تکلیف ہوئی وہ علاج کے لیے جنیوا چلے گئے (جنیوا میں ۲۹ نومبر ۱۹۹۳ کو نیند کی حالت میں ٹاٹا کا انتقال ہوگیا) جے آر ڈی ٹاٹا کو ۱۹۳۸ میں جب ٹاٹا سنز کا چیرمین بنایا گیا اس وقت اس کے تحت چودہ کمپنیاں تھیں۔ مگر ٹاٹا اپنی آخری عمر میں ۹۵ کمپنیوں کو کنٹرول کر رہے تھے جن کا گروپ سیل 10,000 کروڑ روپیہ سالانہ تک پہنچ چکا تھا۔

جے آر ڈی ٹاٹا کی زندگی واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ ۱۹۳۰ میں انھوں نے آسٹریا کی ایک

خاتون تھلما (Thelma) سے شادی کی۔ اس کے بعد وہ ہنی مون منانے کے لیے دارجیلنگ گئے۔ ایک روز وہ سڑک پر نکلے تو ساری ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ کیونکہ بنگال کے انگریز گورنر سر اسٹینلی جیکسن کو وہاں سے گزرنا تھا۔ ٹاٹا کنارے کھڑے ہوئے انتظار کرتے رہے۔ جب گورنر کی کار سامنے آئی تو وہ دوڑ کر اس کے پاس گئے اور چلا کر کہا کہ آخر تم اپنے کو کیا سمجھتے ہو کہ تم کیا ہو۔ تم نے ۵۰۰ لوگوں کو یہاں ٹھنڈ میں ایک گھنٹے سے روک رکھا ہے، تم بڑے ہی احمق ہو۔ تاہم برطانی حکمراں ان سے برہم نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود انھوں نے ٹاٹا کو سر کے خطاب کی پیش کش کی جس کو لینے سے ٹاٹا نے نرمی کے ساتھ انکار کر دیا:

> When Sir Stanley Jackson's car finally came up, JRD, according to Mr. Lala's biography, ran to its window and shouted as it sped off: "Who the hell do you think you are, keeping 500 people, women and children, in the cold for over an hour? You damn fool!" This, however, did not annoy the British rulers who offered to bestow knighthood on him which he politely turned down.

بمبئی سے ایک اُردو اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام مضمون ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ نومبر ۱۹۹۳ میں صفحہ اول پر ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کو آنے والے زلزلہ کی تفصیلات تھیں جس سے مہاراشٹر میں لاتور اور عثمان آباد کے علاقہ میں سخت تباہی برپا ہوئی تھی۔ اس کی دوسطری سرخی یہ تھی:

مرہٹواڑہ کے زلزلہ میں جب ہزاروں انسان موت کے منہ میں چلے گئے

اس وقت بال ٹھاکرے اور ایڈوانی کہاں غائب رہے

گویا کہ ۳۰ سکنڈ جاری رہنے والے اس زلزلہ میں بال ٹھاکرے اور آڈوانی کو دوڑ کر وہاں پہنچنا چاہیے تھا اور زلزلہ کو روک دینا چاہیے تھا۔ مسلمانوں کی صحافت زیادہ تر "نوک جھونک" کا نام ہے۔ مختلف اخبارات میں صرف لہجہ کا فرق ہے، حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

بمبئی کے ایک مسلم دانشور کا مقالہ پڑھا۔ اس میں شکایت کی گئی تھی کہ "ہم جانتے ہیں کہ پولیس بڑی حد تک ہندو فرقہ واریت سے متاثر ہو چکی ہے۔ اگر مسلمان پتھر پھینکتا ہے تو اس کا جواب وہ گولیوں سے دیتی ہے اور اس کا خمیازہ اکثر بے گناہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

اسی مقالہ کے ایک اور پیراگراف میں کہا گیا تھا کہ "پنجاب اور کشمیر کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مسلح گروہ اختلاف رائے کو بالکل برداشت نہیں کر پاتے اور بہت جلد ان افراد کو

گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں جو ان سے ذرا سا بھی اختلاف رکھتے ہوں۔ نفسیاتی طور پر بندوق اٹھانے والے ذہن پر ہمیشہ شک اور خوف کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اسے ہر مخالف دشمن یا دشمن کا ایجنٹ نظر آتا ہے۔ وہ اختلاف اور دشمنی میں فرق کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کشمیر اور پنجاب میں معمولی اختلافات پر اپنوں ہی پر گولی چلا دینے کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

ان دونوں پیراگراف پر غور کیجئے۔ پولیس اگر پتھر کے جواب میں گولی چلائے تو وہ فرقہ واریت کا واقعہ ہے۔ اور ایک کشمیری مسلمان صرف لفظی اختلاف پر دوسرے مسلمان کو گولی مارے تو یہ اسلحہ کی نفسیات کے زیر اثر ہے۔ مسلمان اپنی اسی تضاد فکری کی بنا پر حقائق کو سمجھ نہیں پاتے۔ اصل یہ ہے کہ جس آدمی کے ہاتھ میں اسلحہ ہو وہ نفسیاتی طور پر نارمل حالت میں نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کشمیری مجاہد ہو یا ایک مسلح پولیس۔ مسلمان اگر اس راز کو سمجھ لیں تو وہ مسلح پولیس سے ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے نہایت آسانی کے ساتھ اس کی گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکتے ہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد کے انہدام کے بعد بمبئی اور سورت میں فساد ہوا۔ مسلم رپورٹوں میں اس کی ذمہ داری پولیس اور فرقہ پرست ہندوؤں پر ڈالی گئی ہے۔ مگر شرعی اصول کے مطابق، اس کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ کے اوپر عائد ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ان الفتنۃ نائمۃ لعن اللہ من ایقظھا۔ اس حدیث میں صاحب فتنہ کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ موقظ فتنہ کی مذمت کی گئی ہے۔ اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے۔ بابری مجد کا مسئلہ عرصہ سے ایک نزاعی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس نزاعی مسئلہ کو لازمی طور پر مقامی دائرہ میں محدود رکھنا تھا۔ مگر مسلمانوں کے بے ریش اور باریش رہنماؤں نے مشترکہ طور پر اس کو بڑھایا۔ یہاں تک کہ اس کو پورے ملک کے ہندوؤں کے لیے وقار کا مسئلہ بنا دیا۔ یہ گویا ایقاظ فتنہ تھا اور اسی کی آخری حد تھی بابری مسجد کا ڈھایا جانا۔

۶ دسمبر کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو اس وقت ہندوؤں کے جذبات انتہائی حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ مگر دوبارہ نااہل مسلم لیڈروں نے یہ غلطی کی کہ بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد بمبئی میں پولس اور سرکار کے خلاف توڑ پھوڑ کی۔ سورت میں، دسمبر کو ہڑتال کی کال دی۔ ہندو جب اپنی دکانیں بند کرنے پر راضی نہیں ہوئے تو ان پر پتھراؤ کیا۔ ماحول پہلے ہی سے چارج تھا۔ فوراً فساد بھڑک اٹھا۔

یہ نااہل لیڈرشپ اگر مسجدوں میں بیٹھ جائے اور مسلمانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دے تو ہر قسم کا فساد ہندستان سے ختم ہو جائے، جیسا کہ لیڈروں کی مخلوق کے ظہور سے پہلے اسی ملک میں تھا۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۴ نومبر ۱۹۹۲) میں پاکستان کے نومنتخب صدر سردار فاروق احمد خاں لغاری (بھٹو پارٹی کے سابق چیف آرگنائزر) کے بارہ میں ایک خبر تھی۔ سردار لغاری صدارتی انتخاب میں اپنا ووٹ ڈالنے کے بعد مسٹر آصف علی زرداری، مولانا کوثر نیازی، اور مسلم لیگ کے سکریٹری اقبال احمد خاں کے ہمراہ اسلام آباد سے بذریعہ کار رائے ونڈ گئے تھے جہاں انھوں نے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی اور ایک گھنٹہ قیام کیا۔ رائے ونڈ سے جب وہ لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں انھیں صدر مملکت کے عہدہ پر کامیابی کی اطلاع ملی۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی وہ حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر گئے اور وہاں شکرانہ کے نوافل ادا کیے۔

شاید کوئی صاحب تعجب کریں کہ تبلیغی جماعت کے اجتماع میں شرکت اور داتا گنج کے مزار پر حاضری میں کیا جوڑ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں گہری مناسبت ہے۔ یہ دراصل "برکتی مذہب" کا کرشمہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ زور اسی برکت والے مذہب کا ہے۔ یہ مذہب ہندوؤں میں بھی بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہے۔ اس کے کچھ نمونے مجھے بمبئی کے سفر میں دیکھنے کو ملے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سنا ہے کچھ مسلمانوں نے آپ کے قتل کا اعلان کیا ہے حتی کہ یہ اعلان بھی کیا ہے کہ جو آپ کو قتل کرے اس کو وہ پانچ لاکھ روپیہ انعام دیں گے۔ میں نے کہا کہ اکتوبر ۱۹۹۲ میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا۔ اللہ کے فضل سے وہ مجھ کو قتل تو نہیں کر سکے۔ البتہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے نام نہاد رہنما اور دانشور حضرات ضرور قتل ہو گئے ہیں۔ اس واقعہ نے نام نہاد رہنماؤں کو ایکسپوز کیا اور ایکسپوز کیے جانے کا نام ہی قتل ہونا ہے۔

اس قسم کا اعلانِ موت اسلام میں سراسر حرام ہے۔ یہ ایسا فعل تھا جس پر مسلمانوں کے تمام علماء اور تمام دانشوروں کو تڑپ اٹھنا چاہیے تھا اور اخباروں میں مذمت کا متفقہ بیان چھپوانا چاہیے تھا۔ مگر کسی بھی قابل ذکر عالم یا دانشور کو اس خلافِ اسلام حرکت پر پریشانی لاحق نہیں ہوئی اور نہ کسی نے اس کی مذمت میں کوئی بیان شائع کیا۔

اس واقعہ نے ان تمام لوگوں کو ایکسپوز کر دیا ہے جو ملت کے مسائل پر بولنے کو اپنا صبح و شام کا

مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ مگر اس انتہائی اہم معاملہ میں وہ بالکل خاموش رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہمارے علما، اور دانشوروں پر بے حسی کی مردنی چھائی ہوئی ہے۔ انھوں نے لیڈری کو ذاتی مفاد کے طور پر اختیار کیا ہے نہ کہ خدمت ملی کے لیے۔ یہ سب کے سب مردہ لوگ ہیں۔ ان کی نام نہاد سرگرمیاں در اصل حرکتِ مذبوحی ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی زندہ حرکت۔ زندہ آدمی کی پہچان اصول پر بے چین ہونا ہے اور مردہ آدمی کی پہچان مفاد پر بے چین ہونا۔

تاہم عام مسلمانوں میں سے بعض دردمند حضرات نے اس سلسلہ میں خطوط کی شکل میں اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً قومی آواز (۲۴ نومبر ۱۹۹۲) میں چھپنے والا ایک خط حسب ذیل ہے جو "قتل کی دھمکی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے:

"مورخہ ۱۳ نومبر کے قومی آواز میں جناب مولانا وحید الدین خاں صاحب کا مضمون "قتل مسئلے کا حل نہیں" شائع ہوا ہے جس کے ذریعہ یہ جان کر بے انتہا افسوس ہوا کہ کچھ لوگ ان کے قتل پر انعام واکرام کا بھی اعلان کر چکے ہیں۔ خدا آج کے جذباتی اور اَنا پرست انسانوں کو ہدایت نصیب کرے۔ حضرت مولانا کا مضمون نہایت شستہ اور صاف ستھرا ہے اور مشورہ مفید اور لائق عمل۔ خواہ وہ بالخصوص کشمیری نوجوانوں کے لیے ہو یا عام ہندستانی کے لیے۔ میں سمجھتا ہوں ہر شریف النفس امن کو مولانا کے اس خیال کا قائل ہونا چاہیے کہ جنگ کی طاقت کے مقابلے میں امن کی طاقت زیادہ با اثر ہوتی ہے۔ اور حضرت بل بحران کے معاملہ میں حکومت کا مسلسل طرح دینا اسی مصلحت پر مبنی ہو تو کچھ بعید نہیں"

سید عارف لکھنوی۔ اے ۱۲۔ امیر منزل۔ قلعہ روڈ۔ اے ایم یو علی گڑھ

۲۰ نومبر کی شام کو ودیا بھون کے ہال میں جلسہ تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر کانچی پورم کے سنکر اچاریہ کے علاوہ کئی ممتاز افراد موجود تھے۔ مثلاً مسٹر نانی پالکھی والا، مسٹر مدھو مہتا، مسٹر کھورا کی والا، وغیرہ۔

جلسہ شروع ہوا تو کچھ خواتین اسٹیج پر آئیں۔ پہلے انھوں نے سنسکرت میں کچھ اشلوک پڑھے۔ اس کے بعد انھوں نے اعوذ باللہ اور بسم اللہ کہہ کر سورہ فاتحہ پوری قرأت کے ساتھ پڑھی۔ آخر میں حسب قاعدہ آمین کہا۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں بائبل کے کچھ حصے پڑھے۔ آخر میں سکھ دھرم کے کچھ کلمات پڑھ کر سنائے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اس بات کی علامت ہے کہ انڈیا مذہبی نفرت سے مذہبی رواداری کی طرف جا رہا ہے۔ انڈیا میں سب کچھ ہے۔ مگر ایک چیز یہاں کے سماج سے نکل گئی ہے، اور وہ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے۔ جس دن یہ چیز پیدا ہوگی اس دن ملک ترقی کی طرف بے روک ٹوک اپنا سفر شروع کر دے گا۔ ہم سب لوگوں کو مل کر اسی کی پرارتھنا کرنا ہے۔

مسٹر ایف ٹی خورا کی والا نے اپنی تقریر میں کہا کہ فنڈامنٹلسٹ اور فینٹیک میں ہمیں فرق کرنا چاہیے۔ فنڈامنٹلسٹ وہ ہے جو اپنے مذہب پر فخر کرے۔ جب کہ فینٹیک وہ ہے جو دوسروں کے مذہب سے نفرت کرے۔ اس نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں فنڈامنٹلسٹ کو devout کہنا چاہیے۔

تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ فنڈامنٹلسٹ کی رعایتی تشریح ہے۔ میرے نزدیک فنڈمنٹلسٹ وہ ہے جس میں کٹرپن ہو۔ مذہب کی اصل روح تواضع اور ٹالرنس اور دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ فنڈمنٹلسٹ ان روحانی اوصاف سے خالی ہوتا ہے۔

مسٹر نانی پالکھی والا نے اپنی تقریر میں ایک ریسرچ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ حیوانات کی وسیع دنیا میں کوئی حیوان نفرت کرنے پر قادر نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو نفرت کرنے کی قدرت رکھتا ہے:

> The only one in the entire animal kingdom who is capable of hatred is man.

میں نے اپنی تقریر میں اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہونا کہ وہ نفرت کر سکے، اس کے لیے کوئی برائی کی بات نہیں۔ بلکہ وہ نہایت اونچی بات ہے۔ اس دنیا میں بہتر زندگی کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی دوسرے سے نفرت نہ کرے۔ اس صفت کو خالق نے حیوانات کے اندر مجبورانہ صورت میں پیدا کر رکھا ہے۔ مگر انسان کو خدا یہ اعزاز دینا چاہتا ہے کہ وہ نفرت کی صلاحیت رکھنے کے باوجود دوسروں سے نفرت نہ کرے۔ وہ انتقام لینے کی طاقت رکھتے ہوئے اپنے مخالف سے انتقام نہ لے۔ اسی خاص عمل کی بنا پر انسان کے لیے جنت کا وعدہ ہے، جب کہ جانوروں کے حصہ میں جنت کا داخلہ نہیں۔

میں نے اپنی آدھ گھنٹہ کی تقریر میں دو چیزوں پر خاص طور سے زور دیا۔ ایک، ہندو مسلم

میل ملاپ ۔ اور دوسرے نیشنل کیرکٹر۔ ہندو مسلم میل ملاپ کی اہمیت کو بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ اسی اتحاد کی خاطر مہاتما گاندھی نواکھلی (بنگلہ دیش) چلے گئے تھے۔ وہاں کے قیام کے دوران ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو انھوں نے لکھا کہ میرا موجودہ مشن میری زندگی کا بہت مشکل اور بہت پیچیدہ مشن ہے۔ میں اس کی خاطر سب کچھ جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ کرو یا مرو کا امتحان ہے۔ اس وقت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں امن کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ ورنہ میں اسی راہ میں مرجاؤں گا :

> My present mission is the most difficult and complicated one of my life... I am prepared for any eventuality. 'Do or die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Musalmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt. (p. 449)

نیشنل کیرکٹر کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ نیشنل کیرکٹر یہ ہے کہ نیشن (ملک) کے انٹرسٹ کو سپریم بنایا جائے۔ جہاں ملک کا انٹرسٹ آجائے وہاں ذاتی انٹرسٹ کو سکنڈری بنا دیا جائے۔ جو لوگ جلسہ گاہ کے درمیان ہارس کے پیچھے تھے انھوں نے بتایا کہ لوگوں نے میری تقریر بہت زیادہ دھیان سے سنی۔ میری تقریر کے دوران بار بار God bless you کا جملہ بولتے رہے۔ تقریر کے بعد جب میں باہر جانے لگا تو بہت سے ہندو "السلام علیکم" کہہ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

مختلف باتوں کے ساتھ میں نے ایک واقعہ سنایا جس کو میں نے بھارتیہ ودیا بھون کے جرنل (۱۶-۳۱ مئی ۱۹۸۸) میں پڑھا تھا۔ یہ ۱۹۲۷ کا واقعہ ہے۔ مہاتما گاندھی جنوبی ہند کے دورہ پر تھے۔ کانچی کے شنکراچاریہ جن کے استقبال میں یہ جلسہ کیا گیا ہے، اس وقت وہ وہاں یاترا کے تحت کیرلا کے ایک گاؤں پال گھاٹ میں تھے۔ گاندھی جی ان سے ملنے کے لیے وہاں گئے۔ اچاریہ سنسکرت میں بولے اور گاندھی جی ہندی میں۔ اس طرح دونوں کے درمیان بات چیت ہوئی۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۷ کی شام کو دو مہاتماؤں کی یہ ملاقات ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔

جب شام کو ساڑھے پانچ بج گئے تو سی راج گوپال اچاری کمرہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے گاندھی جی کو یاد دلایا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا ہے اس لیے آپ شام کا کھانا کھالیں۔ واضح ہو کہ گاندھی جی ۶ بجے کے بعد شام کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے راج گوپال اچاری کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اچاریہ سے اس وقت میں جو بات کر رہا ہوں وہی میرا شام کا کھانا ہے :

The conversation I am having now with Acharya is itself my evening meal for today.

سنکراچاریہ آف کانچی نے آخر میں تقریر کی۔ منچ پر سب لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر سنکراچاریہ اپنے روایتی انداز میں منچ کے ایک کنارے گدی پر بیٹھے۔ ان کے ہاتھ میں کندھے سے اوپر تک اٹھا ہوا ایک سادہ بانس کا ڈنڈا تھا۔ انھوں نے پہلے سنسکرت کے کچھ اشلوک پڑھے۔ اس کے بعد سادہ انداز میں ایک تقریر کی۔

انھوں نے کہا کہ مذہب روحانیت کا نام ہے۔ انھوں نے شانتی اور پیار کے ساتھ رہنے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ ہر منش بھگوان کا روپ ہے۔ پھر منش سے نفرت کرنا کتنا زیادہ برا ہے۔ آپ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ من پریورتن ہو کر ہمارے دیش کا کلیان ہوگا۔ ہم سب لوگوں کو مل کر اسی کی پرارتھنا کرنا ہے۔ ان کی تقریر سادگی، روحانیت اور تواضع کی کیفیت سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے یہ بات سادھوسنتوں میں عام طور پر پائی ہے۔

قدیم ہندستان میں صوفیاء کے ذریعہ ہندوؤں کے سادھوسنت کافی حد تک مسلمانوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اب موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر ہندوؤں کے پولیٹکل عناصر سے ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں کا صحیح تعارف مسلمانوں کے سامنے نہیں آتا۔

جلسہ کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسٹر مدھوجتا کے مکان پر گیا۔ اس کے بعد جسٹس قاضی کی رہائش گاہ پر آگیا۔ (Tel: 36345471) رات کا قیام یہیں پر رہا۔

رات کو دیر تک جسٹس قاضی سے اور مسٹر فاروق فیصل اور مسٹر آفتاب احمد سے باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان میں کوئی قیادت نہیں۔ میں نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں قبولیتِ قیادت کا فقدان ہے نہ کہ قیادت کا فقدان۔ میں نے کہا کہ سرسید احمد خاں متفقہ طور پر قیادتی اوصاف کے حامل تھے۔ انھوں نے غدر ۱۸۵۷ کے بعد کہا کہ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ایجوکیشن ہے۔ اس کے ۲۵ سال بعد جاپان کے ہیروہٹو نے بھی کہا کہ جاپان کے مسئلہ کا حل ایجوکیشن ہے۔ جاپان کا مسئلہ حل ہوگیا، ہمارا مسئلہ آج تک حل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ قیادت کا فقدان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان کی قوم نے ہیروہٹو کے مشورہ کو مان کر تعلیم میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے سرسید کے مشورہ کو نہیں مانا۔

میں نے کہا کہ سچا مصلح ہمیشہ لو پروفائل میں بولتا ہے۔ مگر مسلمان اپنی پرفخر نفسیات کی وجہ سے ہائی پروفائل میں بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہی ہمارا اصل قیادتی مسئلہ ہے۔

بمبئی میں قیام کے دوران بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آپ اکثر لکھتے رہتے ہیں کہ مسلمان احتجاج نہ کریں، مسلمان مظاہرہ نہ کریں، مسلمان مطالباتی سیاست نہ چلائیں۔ آخر مسلمان کیوں نہ ایسا کریں جبکہ ملک کا دستور انھیں اس کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ ہی جیسے لوگوں کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ مَن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ زندگی کے فیصلے قانون اور دستور کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتے۔ زندگی کے فیصلے تاریخی حقیقتوں کی بنیاد پر ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کے رہنما بننا چاہتے ہیں تو آپ تاریخ کی طاقتوں کو جانئے۔ قانون اور دستور کے الفاظ کی مہارت پیشہ ور وکیل کے لیے مفید ہے مگر اس قسم کی مہارت مصلح اور قائد کے لیے ہلاکت کے ہم معنی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے بابری مسجد کے لیے جو فارمولا پیش کیا ہے اس میں آپ کی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان چپ ہو جائیں، کیوں کہ مسلمان اس معاملہ میں مضطر ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ آپ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے بارہ میں چپ ہو کر ہندوؤں کو اس پر راضی کریں کہ وہ بھی ایک کے بعد دوسری مسجدوں کے بارہ میں خاموشی اختیار کر لیں۔ آپ کی یہ دوسری بات تو ڈیل (deal) ہے۔ اور مضطر کے لیے ڈیل نہیں ہوتی۔ ڈیل میں داخل ہوتے ہی حالت اضطرار ختم ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ایک بے اصل بات ہے۔ ہجرت کے پانچویں سال قبائل عرب کے مشترک لشکر نے مدینہ پر حملہ کیا۔ ان کی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار تھی۔ یہ لوگ ۲۵ دن تک مدینہ کو گھیرے رہے۔ مسلمان ان سے لڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غطفان کے دو بڑے سرداروں کو بلا کر ان سے یہ گفتگو کی کہ وہ اپنے قبیلہ کے تمام لوگوں کو لے کر واپس چلے جائیں۔ اس کے عوض انھیں مدینہ کی کھجوروں کا ایک تہائی حصہ دے دیا جائے گا۔ وہ لوگ راضی ہو گئے۔ اس معاہدہ کی کتابت بھی ہو گئی۔ تاہم دستخط سے پہلے بعض وجوہ سے وہ زیر عمل نہ آسکا (سیرۃ ابن ہشام ۳/۲۳۹)

یہ واضح طور پر حالتِ اضطرار میں ڈیل کی ایک مثال ہے۔ پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ مضطر آدمی کے لیے ڈیل میں داخل ہونا جائز نہیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو بمبئی میں بم دھماکہ (bomb blasts) ہوا تھا۔ ایک خاتون جرنلسٹ تولین سنگھ نے اس کا جائزہ لینے کے بعد انڈین اکسپرس (۲۳ مئی ۱۹۹۳) میں لکھا تھا کہ بمبئی میں ایسے مسلمان آسانی سے مل جائیں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بم دھماکہ ٹھیک تھا۔ کیوں کہ وہ ہندو انتہاپسندی کا منہ توڑ جواب تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایسے مسلمان مشکل سے ملیں گے جو اس کو ناپسند کریں :

In Bombay, it is easier to meet Muslims who believe that the bombings were a good thing because they amounted to a *moonhtod Jawab* to Hindu fundamentalism than to meet Muslims who disapprove what happened

میرے تجربہ کے مطابق تولین سنگھ کی یہ بات درست ہے۔ مزید یہ کہ اس احساس میں وہ مسلم خواص بھی شریک ہیں جو مسلمانوں کا مقام یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قیادتِ عالم کے منصب پر سرفراز ہوں۔ ان خوش فہم حضرات کو یہ معلوم نہیں کہ قیادت عالم کا منصب کوئی نسلی حق نہیں ہے۔ یہ منصب ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اس عالی ہمتی کا ثبوت دیں کہ وہ لوگوں کی اشتعال انگیزی پر صبر کرنے والے ہیں، وہ لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کے خیر خواہ بنے رہتے ہیں (السجدہ ۲۴)

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ مسلمان مانگ کرتے ہیں کہ انھیں کانسٹی ٹیوشن میں لکھے ہوئے رائٹس دیے جائیں۔ مگر اسی کانسٹی ٹیوشن میں تو کامن سول کوڈ بھی لکھا ہوا ہے۔ پھر مسلمان اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، جب کہ قومی ایکتا کے لیے کامن سول کوڈ کو دیش میں لاگو کرنا ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ کامن سول کوڈ ہے کیا۔ کانسٹی ٹیوشن میں یہ لفظ ضرور لکھا ہوا ہے مگر آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کامن سول کوڈ کیا ہے اور اس کی دفعات کیا ہوں گی۔ جو لوگ کامن سول کوڈ کے حامی ہیں ان کو سب سے پہلے اس کا ایک نقشہ تیار کر کے شائع کرنا چاہیے تاکہ اس پر رائے دینا ممکن ہو سکے۔

دوسری بات یہ کہ کامن سول کوڈ کا قومی ایکتا یا نیشنل انٹگریشن سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی سماج میں قومی ایکتا صحت مند مزاج کے ذریعہ آتی ہے نہ کہ کسی قسم کی قانون سازی کے ذریعہ۔

ایک مسلم دانشور نے کہا کہ "آپ کا الرسالہ مشن کس مرحلہ میں ہے" میں نے کہا کہ الرسالہ مشن اب

میرا کہاں رہا۔ اب تو وہ آپ سب کا ہوگیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد اس میں ایک بریک تھرو ہوا ہے جس کے دو طرفہ اثرات آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

ایک طرف یہ حال ہے کہ تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان الرسالہ کی بولی بولنے لگے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی پچھلی بولیاں چھوڑ دی ہیں۔ اب وہ الرسالہ والی بولی ــــــ دعوت، صبر و تحمل، اشتعال انگیزی پر اعراض، داخلی اصلاح و تعمیر کی باتیں لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ خواہ وہ الرسالہ کا نام نہ لیں مگر ان میں سے ہر ایک بلا اعلان الرسالہ کا نمائندہ بنا ہوا ہے۔ ہر ایک الرسالہ کی عملی ایجنسی لیے ہوئے ہے۔

حتیٰ کہ مسلم عوام بھی اب عملاً الرسالہ کی پالیسی پر آچکے ہیں۔ اس کی ایک مثال بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ الرسالہ میں کہا گیا تھا کہ مسلمان بابری مسجد کے اشو پر چپ ہو جائیں۔ آج آپ دیکھیے کہ سارے مسلمان اس اشو پر عملاً چپ ہیں۔ احتجاج اور مظاہرہ کی پہلے والی پالیسی کو وہ اب چھوڑ چکے ہیں۔ چند پروفیشنل لیڈروں کے سوا کسی کو بھی اب اس سے دلچسپی نہیں۔

ہندوؤں کے سلسلہ میں اس بریک تھرو کا پہلو یہ ہے کہ جدید تاریخ میں پہلی بار ہندوؤں کے درمیان نفوذ حاصل ہوا۔ حالیہ مہینوں میں آپ الرسالہ کے خبرنامے پڑھے تو آپ دیکھیں گے کہ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی مسلم عالم کو ہندو اپنے جلسوں میں بلا رہے ہیں۔ ہندو اخبارات اور نیشنل پریس میں مسلسل اس کی چیزیں چھپ رہی ہیں۔ تعصب کی فضا سے نکل کر وہ کسی مسلمان عالم کی باتیں سن رہے ہیں۔

۲۱ نومبر کی صبح کو میں جسٹس قاضی کی رہائش گاہ پر تھا۔ ان سے مختلف دینی و ملی موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اتنے میں صبح کے اخبارات آگئے۔ انقلاب (۲۱ نومبر) کے صفحہ اول پر بمبئی کی ڈیٹ لائن (۲۰ نومبر) کے ساتھ ایک خبر تھی۔ اس کی سرخی یہ تھی: بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لیے ۴ دسمبر کو یوم دعا منانے کا اعلان۔ اس سرخی کے نیچے حسب ذیل خبر چھپی ہوئی تھی:

"آج یہاں آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ نے ہندستان بھر کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ۴ دسمبر کو یوم دعا منائیں۔ اور نماز جمعہ کے بعد اجتماعی طور پر خدائے تعالیٰ سے دعا مانگیں۔

مذکورہ بورڈ کی جانب سے جاری کردہ ایک اخباری بیان میں کہا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے اس فیصلہ سے حکومتِ ہند کو واقف کرانا چاہتا ہے کہ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں بابری مسجد کی شہادت کے فوراً بعد وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کا وعدہ کیا تھا لیکن حکومت نے آج تک اس وعدہ کو وفا

نہیں کیا۔ حکومت کے اس وعدہ خلافی سے ہندستان کے مسلمان سخت قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا ہیں۔"

انقلاب کی یہ خبر جس وقت میں نے پڑھی، ایک مسلمان میرے پاس موجود تھے جو پرسنل لا بورڈ سے بڑی بڑی امیدیں قائم کیے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس "اعلان" میں کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کے دوبارہ سابقہ مقام پر تعمیر نہ ہونے سے مسلمانانِ ہند سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہیں۔ یہ الفاظ بالکل بے بنیاد ہیں اور اس کا ثبوت خود اس اعلان میں موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ بابری مسجد تو ۶ دسمبر کو ڈھائی گئی تھی۔ ۶ دسمبر ہی کو آپ لوگ دہلی میں وزیر اعظم سے ملنے والے ہیں۔ پھر یہ ملک گیر یوم دعا ۲ دسمبر کو کیوں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام مسلمان اب بابری مسجد کی تعمیرِ نو میں دل چسپی نہیں رکھتے۔ اس لیے وہ صرف اس کے لیے ۶ دسمبر کو مسجدوں میں جمع بھی نہیں ہوں گے۔ اس بنا پر آپ لوگوں نے ۲ دسمبر کا دن منتخب کیا جو کہ جمعہ کا دن ہے اور جمعہ کی وجہ سے ہر مقام کے مسلمان خود بخود اس دن مسجدوں میں اکٹھا ہوں گے۔ اس موقع پر آپ اعلان کرکے ظاہر کریں گے کہ سارے ملک کے مسلمانوں نے لاکھوں مسجدوں میں بابری مسجد کی تعمیرِ نو کے لیے دعا کی۔

اگر فی الواقع مسلمانانِ ہند اس سلسلہ میں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہوتے تو یقیناً وہ ۶ دسمبر کو ملک کی تمام مسجدوں میں جمع ہوتے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانانِ ہند کا نمائندہ نہیں۔ وہ کچھ افراد کا ایک گروہ ہے نہ کہ سارے مسلمانوں کا نمایندہ بورڈ۔

جسٹس قاضی کی رہائش گاہ پر ایک مفید مجلس رہی۔ اس میں جسٹس قاضی، پروفیسر جاوید خاں (Tel: 3630609) مسٹر اختر حسن رضوی (Tel: 6423071) اور مسٹر فاروق فیصل موجود تھے۔ میں نے الرسالہ مشن کے بارہ میں کچھ وضاحت کی۔ یہ لوگ پہلے سے الرسالہ مشن سے واقف تھے۔

مسٹر اختر حسن رضوی نے ایک بات کہی جو مجھے پسند آئی۔ وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھی: دوستی اور دشمنی کے بیچ ایک دیوار ہے۔ یا تو ہاتھ بڑھا کر دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیجیے اور اس کو دوست بنا لیجیے۔ یا دھکا دے کر اس کو دشمنی کی طرف دھکیل دیجیے۔

پروفیسر جاوید خاں نے میری اس بات کو بہت پسند کیا کہ زندگی نام ہے تھرڈ آپشن کو تلاش کرنے کا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہمارا دانشور طبقہ ثنائی طرزِ فکر (dichotomous thinking)

کا شکار ہوگیا ہے اور یہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں لوگوں کو باشعور بنانے کے لیے ہمیں ایک ابھیان چلانے کی ضرورت ہے۔

جسٹس قاضی کے ایک سوال کے جواب میں میں نے ان سے کہا: عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ فقدانِ قبولیتِ قیادت ہے۔ قرآن اور حدیث کی بنیاد پر میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا کبھی کسی گروہ کو قائد سے محروم نہیں کرتا۔ کسی گروہ کے لیے جو چیز محرومی کا سبب بنتی ہے وہ قائد کی غیر موجودگی نہیں ہے بلکہ خود گروہ کے اندر قبولیتِ قائد کی غیر موجودگی ہے۔

جسٹس قاضی کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ گفتگو کے دوران اکثر وہ دوسروں کے اشعار یا اقوال سناتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اللہ نے آپ کو یہ عجیب ملکہ دیا ہے کہ آپ کو کوئی نہ کوئی برمحل حوالہ یاد آجاتا ہے۔ اس پر انھوں نے دوبارہ ایمرسن کا یہ قول سنایا:

Next to the originator of a good sentence is the quoter of it.
—Emerson

۲۱ نومبر کو مسٹر پرتاب بھائی بھوگی لال سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی۔ وہ آنجہانی بھوگی لال جوہری کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے والد اپنی جرأت مندی کے لیے مشہور تھے۔ پورا خاندان نہایت محب وطن اور بے تعصب ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ دیش کو ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ہماری زندگی میں تو ایسا ہونے والا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جیسا درد رکھنے والے ملک میں بہت ہیں۔ بلکہ وہ مجارٹی میں ہیں۔ مگر ان کے درمیان تال میل نہیں ہے۔ یہ لوگ اگر مل کر جوائنٹ ایفرٹ کریں تو یقیناً مثبت نتیجہ نکل سکتا ہے۔

اس کے بعد مسٹر مدھوہتا کے ساتھ ہم دونوں مسٹر رام کشن بجاج (پیدائش ۱۹۲۳) کی رہائش گاہ پر گئے۔ لفٹ کے ذریعہ تیرھویں منزل پر پہنچے۔ یہ سمندر کے کنارے ایک بہت بڑا مکان تھا۔ مگر مسٹر بجاج بیماری کی وجہ سے بالکل نڈھال اس کے ایک گوشہ میں پڑے ہوئے تھے۔ تاہم گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت ذہین اور سمجھ دار آدمی ہیں۔

وہ مشہور صنعت کار جمنالال بجاج کے لڑکے ہیں۔ نوجوانی کی عمر میں عرصہ تک گاندھی جی کے ساتھ رہے ہیں۔ سیوا گرام کی وسیع زمین ان کے والد ہی نے گاندھی جی کو دی تھی۔ اس کے علاوہ

انھوں نے تحریک آزادی کے دوران گاندھی جی کی بہت مدد کی تھی۔ مسٹر کرشن لال بجاج نے گاندھی جی کے کئی ذاتی واقعے بتائے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ مہاتما گاندھی کے بڑپن کا راز کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: گاندھی جی کی بڑائی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہی نہیں تھے۔ ان سے بات کرتے ہوئے ہم لوگوں کو کبھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ ہم کسی مہاتما سے بات کر رہے ہیں۔

۲۱ نومبر کی صبح کو ٹائمس آف انڈیا کے نمایندہ مسٹر سری نواس لکشمن (Tel: 2618923) نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانانِ ہند کے موجودہ مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو ۲۲ نومبر کو ٹائمس آف انڈیا کے بمبئی اڈیشن اور دہلی اڈیشن دونوں میں شائع ہو چکا ہے۔

بمبئی کے ایک مسلمان ملاقات کے لیے آئے۔ گفتگو کے دوران ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کا ڈرائیور مسلمان ہے یا ہندو۔ انھوں نے کہا کہ ہندو۔ میں نے پوچھا کہ کتنے عرصہ سے وہ آپ کے یہاں کام کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چھ سال سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اس کو کیسا پایا۔ انھوں نے کہا کہ: (excellent)

میں نے کہا کہ آپ جس مسلمان سے پوچھئے ذاتی تعلق والے ہندوؤں کے بارہ میں وہ ایسی ہی رائے دے گا۔ مگر انھیں مسلمانوں سے جب فرقہ وارانہ مسائل پر بات ہوتی ہے تو ہر مسلمان فوراً ہندو کی برائی کرنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ صرف بے شعوری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذاتی تعلق والے ہندو کا ذکر ہو تو مسلمان کے سامنے ہندو کی انفرادی تصویر (individual picture) ہوتی ہے۔ مگر جب گفتگو فرقہ وارانہ اعتبار سے ہو تو مسلمان کے سامنے ہندو کی مجموعی تصویر (collective picture) آجاتی ہے۔ پہلی صورت میں اس کے سامنے ایک اچھا ہندو ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ چند برے ہندوؤں کو جنرلائز کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ہندو فرقہ میں شامل ہیں۔ اس بنا پر پہلی شکل میں ہندو کے بارہ میں اس کی رائے اچھی ہوتی ہے اور دوسری شکل میں اس کی رائے ہندو کے بارہ میں خراب بن جاتی ہے۔ یہ جنرلائزیشن ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک اہم بات یہ ہے کہ قرآن اکثر وقتی ریفرنس میں ابدی بات کہتا ہے۔ مثلاً مدینہ کے ایک خاندانی نزاع کے سلسلہ میں یہ آیت آئی ہے کہ الصلح خیر (صلح بہتر ہے) ابتدائی نزول کے اعتبار سے یہ ایک وقتی ریفرنس ہے۔ مگر وسیع تر انطباق کے اعتبار سے وہ ایک ابدی تعلیم ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ جاننا ضروری ہے۔

بمبئی کے زمانہ قیام میں جسٹس قاضی سے کافی باتیں ہوئیں۔ وہ الرسالہ کے قاری بھی ہیں۔ انھوں نے کہا مجھے آپ کے خیالات سے مکمل اتفاق ہے۔ مگر شعر کی زبان میں میں کہوں گا :

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

ایک صاحب نے کہا کہ دوسرے علما تو بابری مسجد کے سلسلہ میں حکومت سے یہ مانگ کر رہے ہیں کہ مسجد دوبارہ عین اسی مقام پر بناؤ۔ اور آپ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بابری مسجد کو بھلا دیں۔ آخر آپ مسلمانوں کو پسپائی کا سبق کیوں دے رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ پسپائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ جو حضرات "مسجد وہیں بناؤ" کا مطالبہ کر رہے ہیں، آپ ان کے ٹاپ کے افراد کو لیجئے اور ان کے سر پر قرآن رکھ کر پوچھئے کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی اس مانگ سے مسجد دوبارہ اسی مقام پر بنا دی جائے گی۔ میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی شخص قرآن ہاتھ میں لے کر یہ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ یہ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب مسجد دوبارہ وہاں بننے والی نہیں۔

ایسی حالت میں عقل کی بات کیا ہے۔ کیا یہ عقل مندی ہوگی کہ آپ مسلمانوں کے ذہن کو ایک ایسی چیز پر اٹکائے رکھیں جس کا وقوع میں آنا ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سوچیں تو آپ مانیں گے کہ ملت کا ذہن ناممکن پر اٹکانے کا نام عداوت ہے، اس کا نام قیادت اور رہنمائی نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کشمیریوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ہندستانی حکومت سے نہ ٹکرائیں۔ بلکہ ہندستان کی سیاسی بالادستی کے تحت انھیں جو مواقع ملے ہوئے ہیں ان کو استعمال کرتے ہوئے ترقی کی راہیں تلاش کریں۔ اسی قسم کا مشورہ آپ ہر جگہ کے مسلمانوں کو دیتے رہے ہیں۔ مگر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو (status quoist) بنا دینا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ حالتِ موجودہ پر قانع رہیں۔ زیادہ بہتر کی طرف کوئی اقدام نہ کریں۔

میں نے کہا کہ یہ (status quoism) کی دعوت نہیں ہے۔ یہ دراصل نقطۂ آغاز (collective picture) حاصل کرنے کی بات ہے۔ زندگی میں اصل مسئلہ نقطۂ آغاز پانے کا ہوتا ہے۔ اگر آپ صحیح نقطۂ آغاز پالیں تو عمل کرتے ہوئے آخر کار آپ اعلیٰ منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نقطۂ آغاز کے بجائے نقطۂ اختتام سے اپنا سفر شروع کرنا چاہیں تو صدیوں کی قربانی کے بعد بھی آپ کہیں

نہیں پہنچیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور آل انڈیا ملی کونسل کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ تو ملت کی مظلومی کو دور کرنے کے لیے اٹھے ہیں، پھر ان کی مخالفت کس لیے۔ میں نے کہا کہ مسئلہ بورڈ اور کونسل کا نہیں ہے بلکہ نوعیتِ بورڈ اور نوعیتِ کونسل کا ہے۔ اسلام میں کسی چیز کی قدر وقیمت اس کے نام سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت سے متعین ہوتی ہے۔ قدیم مدینہ میں کچھ لوگوں نے ایک مسجد بنائی۔ بظاہر اس کا نام مسجد تھا۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ضرار تھی، اس لیے اس کو ڈھادیا گیا۔

اس بورڈ اور کونسل میں عہدے داروں سے لے کر ممبروں تک تقریباً دو سو آدمی ہوں گے۔ آپ ان لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ بلا استثنا یہ پائیں گے کہ ان میں سے ہر شخص کے ادارہ میں یا خاندان میں یا آس پاس کوئی فرد مظلومی کا شکار ہوگا۔ مگر یہ لوگ اس فرد کی مظلومی کو دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ مگر یہی لوگ ملت کی مظلومی کو دور کرنے کے لیے مجاہد اعظم بنے ہوئے ہیں۔

اس کا راز کیا ہے کہ ان حضرات کو فردِ ملت کی مظلومی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن یہی لوگ مجموعۂ ملت کی مظلومی کے لیے صبح وشام تقریر وتحریر کا طوفان برپا کیے ہوئے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ فردِ ملت کی مظلومی میں پڑنے سے لیڈری نہیں ملتی۔ جب کہ مجموعۂ ملت کے نام پر اٹھنے سے لیڈری، شہرت، پیسہ، بڑائی ہر چیز وافر مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریکوں سے لیڈر کو زبردست فائدے حاصل ہو رہے ہیں مگر ملت بدستور محرومی اور مظلومی کے گہرے غار میں پڑی ہوئی ہے۔

انھوں نے کہا کہ انفرادی مظلوم کی دستگیری سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ ابھی بمبئی آنے سے پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ ان کا نام وپتہ یہ ہے :

Shri Mohan Lal
1786/131, Shanti Nagar, Tri Nagar, Delhi-110052
(Tel: 7226034)

شری موہن لال (۶۵ سال) کو میں کئی سال سے جانتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ ظالم کے پنجہ سے

مظلوم کو رہا کرانا یہی خدا کی سچی عبادت ہے۔ وہ نہ اخبار میں پریس اسٹیٹمنٹ دیتے اور نہ جلسہ کرتے۔ بس خاموشی کے ساتھ یہی کام کرتے رہتے ہیں۔

مثلاً ایک روز وہ صبح کو ٹہلنے کے لیے نکلے تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی روتا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے اس کا حال پوچھا، اس نے بتایا کہ میں ایک مزدور آدمی ہوں، کل میں نے مزدوری کر کے چالیس روپیہ کمایا۔ آٹھ روپیہ میں شام کا کھانا کھایا۔ اور بقیہ ۳۲ روپیہ جیب میں لے کر آرہا تھا کہ گشت کرنے والے پولیس نے مجھ کو پکڑا۔ کہا کہ رات میں تم کہاں گھوم رہے ہو۔ اس نے مجھے دو ڈنڈے لگائے اور میرا پیسہ چھین لیا۔ موہن لال اس کو لے کر فوراً قریب کے پولیس اسٹیشن میں گئے۔ وہاں ایس ایچ او نہیں تھا۔ تھانہ انچارج نے کچھ الٹی بات کی تو اس کو ڈانٹ کر کہا کہ "ٹھیک سے بات کرو، اس وقت میں خدا کی طرف سے اسپشل ڈیوٹی پر ہوں" آخر میں اس نے کہا کہ جس روڈ پر یہ واقعہ ہوا ہے وہ فلاں تھانہ میں پڑتا ہے۔

اس کے بعد وہ مزدور کو لے کر دوسرے تھانہ میں گئے۔ وہاں بھی ایس ایچ او نہیں تھا۔ انھوں نے لڑبھڑ کر وہاں رپورٹ درج کرائی۔ اس کے بعد رپورٹ لے کر ایک واقف کار پولیس افسر کے یہاں گئے۔ اس سے ٹیلی فون کر دایا۔ اس کے بعد مزدور کو اپنے گھر لے گئے۔ اس کو کھلایا پلایا۔ اور پھر دوبارہ مذکورہ تھانہ پر پہنچے۔ تھانہ انچارج نے مزدور سے کہا کہ یہ پچاس روپیہ لو اور جاؤ، اپنا کام کرو۔ موہن لال دوبارہ بگڑ گئے کہ میں تم سے خیرات لینے نہیں آیا ہوں۔ تم ملوث کانسٹبل کو بلاؤ اور اس سے اس کے ۳۲ روپیہ دلواؤ۔ آخر کار پولیس والے نے مزدور سے معافی مانگی اور اس کی رقم اسے واپس کر دی۔

اس طرح کے چھوٹے بڑے کام وہ ہر روز کرتے رہتے ہیں۔ اور جب تک پورا کام نہ ہو جائے وہاں سے نہیں ہٹتے۔ اسی کا نام ہے مظلوم افراد کی داد رسی کرنا۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کے بارہ میں میری رائے نہایت سخت ہے۔ یہ لوگ اپنی نااہلی کو قوم کے اوپر انڈیلے ہوئے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے نام پر قوم کو بھڑکاتے ہیں۔ حالانکہ سچا لیڈر وہ ہے جو مواقع کی نشاندہی کرے اور لوگوں کو اس قابل بنائے کہ وہ مواقع کو استعمال کر کے آگے بڑھ سکیں۔

ان نام نہاد لیڈروں میں یہ فرق تو ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی مخلص ہے اور کوئی غیر مخلص، مگر نااہلی کے اعتبار سے ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ پچاس سال سے غیر معمولی سرگرمیاں دکھا رہے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہر اگلا دن مسلمانوں کے لیے زیادہ برا دن بن کر سامنے آرہا ہے۔ لیڈروں کی طوفان خیز سرگرمیوں کے درمیان مسلمانوں کی مصیبتوں میں صرف اضافہ ہو رہا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے وہ تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس خدائی قانون کی روشنی میں دیکھئے تو مصیبتوں کے اضافہ کی کوئی بھی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ نا اہل قسم کے لیڈر ہر روز نیا فتنہ کھڑا کر کے مسلمانوں کو نئے مسائل سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اگر آپ پچھلی مصیبتوں کو برطانیہ کے خانہ میں ڈالیں تو بعد کی ان ناقابل بیان مصیبتوں کو کس کے خانہ میں ڈالا جائے گا جو برطانی اقتدار کے خاتمہ کے بعد انھیں خود ساختہ لیڈروں کے دور قیادت میں پیدا ہوئی ہیں۔

ایک گاندھی وادی نے گفتگو کے دوران پر جوش طور پر کہا کہ جس طرح غلام انڈیا کے لیے ایک گاندھی کی ضرورت تھی، اسی طرح آزاد انڈیا کے لیے بھی ایک گاندھی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کل بات نہیں، یہ صرف آدھی بات ہے۔ آزاد انڈیا کو خود وہی گاندھی دوبارہ مل گیا تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ غلام انڈیا نے جس گاندھی کو ہیرو بنایا تھا، آزاد انڈیا نے اسی گاندھی کو مار ڈالا۔

اس سلسلہ میں سر ٹامس جونس (Thomas Jones) کی ڈائری سے ایک دلچسپ واقعہ معلوم ہوا ہے۔ سر ٹامس برٹش کیبنٹ کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر مان (Dr. Mann) ایک انگریز افسر کی حیثیت سے ہندستان آئے۔ وہ بمبئی میں ڈائرکٹر آف ایگریکلچر تھے۔ ۱۹۲۴ میں وہ یہاں سے ریٹائر ہو کر انگلینڈ واپس گئے۔ وہاں ان کی ملاقات سر ٹامس جونس سے ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر مان سے پوچھا کہ ۳۱۰ ملین ہندستانیوں میں سے کتنے لوگوں نے گاندھی کو سنا ہے۔ ڈاکٹر مان نے جواب دیا کہ ۳۰۹ ملین آدمیوں نے۔

مہاتما گاندھی آزادی سے پہلے انتہائی مقبول لیڈر تھے۔ مگر آزادی کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ انھوں نے خود اپنے بارہ میں یہ کہا کہ اب میری کون سنے گا۔

مگر یہی گاندھی آزادی کے بعد اتنے غیر مقبول ہو گئے کہ انھوں نے کہا : اب میری کون سنتا ہے۔ اس لیے مسئلہ سادہ طور پر ایک اور گاندھی کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ ایک نئے "قسم" کے گاندھی کا ہے۔ پہلے گاندھی نے ہیرو بننے کی قیمت پر اپنا کردار ادا کیا تھا۔ اب دوسرے گاندھی کو زیرو بننے کی قیمت پر اپنا مشکل تر کردار ادا کرنا پڑے گا۔

کچھ ہندو بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران دیش بھگتی کا ذکر ہوا۔ یہ سوال آیا کہ سچا دیش بھگت کون ہے اور اس کی پہچان کیا ہے۔

میں نے پوچھا، کیا آپ جانتے ہیں کہ ماں کو بھی اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے، اور تاجر کو بھی اپنے گاہک سے محبت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا آپ کسی ماں کو جانتے ہیں جو اپنے بیٹے کی محبت میں روئی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایسی تو سبھی مائیں ہوتی ہیں۔ کسی ماں کے بیٹے پر کوئی سنکٹ پڑے تو اس کی خبر جب ماں کو ہوگی تو اس کی آنکھ سے آنسو ضرور نکل آئے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ کیا آپ ایسے تاجروں کو جانتے ہیں جو اپنے گاہک کے لیے روتے ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایسا کوئی تاجر تو ہم کو نہیں معلوم۔

میں نے کہا کہ اب میں سوال بدل کر ایک اور بات آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ سب لوگ الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر پارٹی کے لیڈر اپنے بارہ میں دیش بھگت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کی پارٹی کے لیڈروں میں کون کون لیڈر ہیں جو دیش کی حالت پر روتے ہوں۔ سب نے کہا کہ ایسا تو کوئی لیڈر ہم کو نہیں معلوم۔ دیش بھگتی کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں مگر دیش کے لیے کوئی بھی نہیں روتا۔

میں نے کہا کہ اب میرا فیصلہ سنئے۔ جو آدمی دیش کے درد میں روئے وہ سچا دیش بھگت ہے۔ اور جو آدمی صرف دیش کے نام پر تقریر کرے وہ بناوٹی دیش بھگت۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اعتماد کے لہجہ میں کہا کہ کیا آپ نے اشوک سیلی (Ashok Celly) کا مضمون پانیر میں پڑھا تھا جس میں اس نے بامبے بلاسٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب ہندوؤں کو ہوش میں آجانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ہاں، وہ پانیر (۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳) میں چھپا تھا۔ اس کی کٹنگ میرے پاس موجود ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے بتایا تھا کر ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو بمبئی کے بم دھماکے جن میں زیادہ تر ہندوؤں کا نقصان ہوا وہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کا نتیجہ تھے۔ آخر میں انھوں نے لکھا تھا کر ذلت واہانت کی شکار ایک اقلیت بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ پرامن بقا، باہم کے سوا ہمارے لیے کوئی چارہ نہیں۔ ہم کو مل کر رہنا ہوگا یا ہم ختم ہو جائیں گے :

A humiliated and hounded minority is more dangerous than RDX. There is simply no escape from peaceful coexistence. Hindus and Muslims must learn to live together or perish.

میں نے کہا کر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس پر خوش ہیں کر مسلمان اس ملک میں بس ناگزیر برائی کے طور پر قبول کر لیے جائیں۔ اس طرح تو مسلمان یہاں عزت اور ترقی کی زندگی بھی حاصل نہیں کر سکتے، کجا کر وہ خیر امت کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں جس کا آپ لوگ اپنی تقریروں میں فخر کے ساتھ چرچا کرتے رہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کر جب اور کوئی صورت باقی نہ رہے تو کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کر یہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ دوسری زیادہ بہتر صورت تو موجود ہے۔ مگر آپ نے اس کا تجربہ ہی نہیں کیا۔ انھوں نے پوچھا کر وہ کیا۔ میں نے کہا کر وہ دعوت کا طریقہ ہے۔ یعنی صبر کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے اسلام کی نظریاتی طاقت کو استعمال کرنا۔

۲۱ نومبر کو عصر کی نماز گورنمنٹ کالونی (باندرہ) کی مسجد غوثیہ میں پڑھی۔ یہ ہائی وے کے عین کنارے ہے۔ نہایت وسیع اور خوب صورت مسجد ہے۔ ۱۹۷۴ میں جب کر جناب عبدالرحمٰن انتولے مہاراشٹر کے ہاؤسنگ منسٹر تھے۔ انھوں نے اس مسجد کی تعمیر کی منظوری دی تھی۔ یہ بلاشبہ موصوف کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

کافی نمازی جماعت میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ پنج وقتہ نماز اور ہفتہ وار جمعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت اہل اسلام کو عطا کی ہے۔ اس طرح ہر روز ہر علاقہ کے مسلمان روحانی مرکز کے ماحول میں ملتے ہیں۔ اس سے جو اجتماعی فائدے ہوتے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسجدوں کی تعداد ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ مگر مسجد کا عملی فائدہ اتنا ہی کم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ نا اہل لوگ ہر مسجد میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ مسجد کو اعتقادی اختلاف، سیاسی نزاعات،

حتی کہ تشدد انہ تحریکوں کا اڈہ بنا دیتے ہیں۔ یہ اللہ کی مسجدوں کا غلط استعمال ہے۔ اس غلط استعمال نے مسلم آبادیوں کو مسجد کے حقیقی دینی فائدے سے محروم کر دیا ہے۔

عصر اور عشاء کے درمیان محمد اقبال الدین صاحب کے مکان پر نشست ہوئی۔ کالونی کے بہت سے لوگ یہاں جمع ہوئے۔ ان سے دینی اور ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ صلح حدیبیہ پر بہت زور دیتے ہیں۔ صلح حدیبیہ تو خدا کے حکم سے تھی جس کی حکمت اس وقت صحابہ کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ پھر آج کل کے مسلمان کس طرح اس کو سمجھیں گے۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ سب خدا کے حکم ہی سے تھا۔ مگر اسی کے ساتھ قرآن میں یہ بھی کہا گیا کہ رسولؐ تمہارے لیے نمونہ ہیں۔ تم ان کے نمونہ کو اپنی زندگیوں میں اختیار کرو۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک چیز ہے ایجاد (invention) دوسری چیز ہے تقلید (imitation)۔ ایجاد ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔ اور تقلید ہمیشہ آسان ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں صلح حدیبیہ کا معاملہ پہلی بار پیش آیا تھا اس لیے لوگوں کے لیے اس کی حکمت کو سمجھنا دشوار ہوگیا۔ مگر اب تو وہ ایک معلوم اصول بن گیا اور اس کی پشت پر تاریخ کا کامیاب تجربہ جمع ہو چکا۔ اس لیے اب اس کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اِلّا یہ کہ آدمی ہٹ دھرمی کی بنا پر سمجھنا ہی نہ چاہے۔

عشاء کی نماز کے بعد جناب جمشید علی سید (Tel. 458771) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ افراد اور الرسالہ کے قاری اس میں شریک ہوئے۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ الرسالہ مشن اور موجودہ حالات میں اسلام کا طریق کار کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس کے بعد سوال و جواب کی صورت میں گفتگو دیر تک جاری رہی۔ عام طور پر لوگوں نے الرسالہ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔

جناب خلیل زاہدی صاحب نے میری ایک بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر مسلمان ہندوؤں سے ذاتی تعلق میں اعراض اور ہم آہنگی کے اصول ہی پر عمل کرتا ہے مگر جب ملت کے پلیٹ فارم سے بولنا ہو تو وہ ٹکراؤ کی زبان بولنے لگتا ہے۔ اس دوعملی کو ختم کرنا بہت ضروری ہے۔

حاجی مستان مرزا (۷۰ سال) بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے بہت تجرباتی زندگی گزاری ہے۔ یہ بتایئے کہ مخالف کو جیتنے کا طریقہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: محبت اپیار۔ اگر آپ اپنے مخالف سے محبت کا سلوک کریں گے تو وہ بھی آپ ہی کی بولی بولنے لگے گا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ بقیہ علماء سے میرا کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے دل میں جو کچھ ہے اگر وہ وہی کرنے لگیں تو ان سے میرا اختلاف اپنے آپ ختم ہو جائے۔ حاجی مستان صاحب نے اس کو سن کر کہا: "پھر علماء دین کے جو دل میں ہے وہ اس کو اپنی زبان سے کہہ دیں۔ تمام علماء دین ایک اسٹیج پر آکر اپنے دل کی بات تمام اہل اسلام کو بتادیں۔"

جمشید سید صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ بزنس کرتے ہیں۔ بتایئے کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: کنٹرورسی سے بچنا اور اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو میز پر بیٹھ کر اس کو طے کر لینا۔ میں نے کہا کہ یہی اصول جو ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہے، اسی کو ہم کہتے ہیں کہ ملی معاملات میں بھی اختیار کرلو تو لوگ فوراً کہنے لگتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے۔ آخر لوگوں کی زندگی میں یہ دوعملی کیوں ہے۔ کیا دوعملی کا نام اسلام ہے۔

۲۲ نومبر کی صبح کو بمبئی سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ بمبئی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ یہ شہر کبھی عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ مگر آج وہ بھیڑ، گندگی اور ہوائی کثافت کا شہر بن چکا ہے۔ پانی کی نکاس کا نظام بھی خراب ہوتا جارہا ہے۔ یہی حال رہا تو چند سال میں بمبئی کا شہری ماحول شاید ناقابل برداشت ہو جائے۔

یہ مسائل کم و بیش ساری دنیا میں ہیں۔ چنانچہ شہری صفائی کے موضوع پر بڑی بڑی تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ مگر مسلمان ان تحریکوں میں موجود نہیں۔ ساری دنیا کے مسلمان اپنے خلاف ظلم اور سازش کے نام پر فریاد کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ حدیث کے مطابق، وہ النظافۃ من الایمان کا پیغام دینے کے لیے اٹھے۔

بمبئی ایرپورٹ پر میں انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب میرے قریب آئے "آپ ہی

مولانا وحید الدین خاں ہیں" انھوں نے کہا۔ اصل میں آج ہی ٹائمس آف انڈیا میں میرا ایک انٹرویو تصویر کے ساتھ چھپا ہے۔ اس کو انھوں نے دیکھا تھا۔ یہ مسٹر باسو دیو اگروال تھے جو سر وسز انٹرنیشنل (دہلی) میں ڈائرکٹر ہیں۔ ٹیلی فون نمبر دہلی : 536095

انھوں نے کہا کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیش میں لڑائی جھگڑا ختم ہو۔ ہندو اور مسلمان مل جل کر رہیں۔ گزری ہوئی باتوں کو بھلا کر مستقبل کی تعمیر کی جائے۔ انھوں نے پولیٹکل پارٹیوں کی شکایت کی اور کہا کہ ماحول کو بگاڑنے میں سب سے زیادہ ہاتھ انھیں پولیٹکل پارٹیوں کا ہے۔

ہندوؤں میں اس قسم کے بے شمار لوگ موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے جو احتجاجی سیاست چلا رکھی ہے اس میں مسلمانوں کا سابقہ سنجیدہ ہندوؤں سے نہیں ہوتا۔ ان کا سابقہ صرف چھوٹے طبقہ کے غیر سنجیدہ افراد سے ہوتا ہے۔ یہی موجودہ تمام فرقہ وارانہ مسائل کی اصل جڑ ہے۔

جہاز میں دہلی کے ایک نوجوان تاجر محمد عثمان صاحب (Tel. 6448281) سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بزنس میں فائدہ کے ساتھ نقصان بھی پیش آتا ہے، چنانچہ وہ وقتی نقصان کی پروا کیے بغیر اپنے کاروبار کو منظم کرنے میں سرگرم ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ان سے میں نے پوچھا کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محنت، لگن اور ایمان داری۔ پھر میں نے پوچھا کہ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ مسلمان بزنس میں دوسرے سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی خاص وجہ دو ہے۔ تعلیم کی کمی اور برادران وطن کی طرف سے تعصب اور تفریق کا معاملہ۔ یعنی ۵۰ فی صد ذمہ داری مسلمانوں پر ہے اور ۵۰ فی صد ذمہ داری ہندوؤں پر۔

عام طور پر مسلمان اسی ڈھنگ پر سوچتے ہیں۔ اور ہمارے دانشور اس کو متوازن نظریہ کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف خیالی نظریہ ہے۔ خدا نے یہ دنیا چیلنج کے قانون کے تحت بنائی ہے۔ وہ رکاوٹ جس کو بقیہ ۵۰ فی صد کہا جاتا ہے وہ فطری چیلنج کی بنا پر ہے نہ کہ متعصبانہ تفریق کی بنا پر۔ چیلنج کا یہ عنصر ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ خواہ وہ انڈیا ہو یا پاکستان یا عرب ممالک، ہر جگہ وہ کسی نہ کسی صورت میں پایا جا رہا ہے۔ اس "پچاس فی صد" کے لیے ہمیں شکایت نہیں کرنا ہے بلکہ ایک

قابل عبور رکاوٹ سمجھ کر اس تدبیر کے ذریعہ اپنے راستہ سے ہٹانا ہے۔ یہی اصول انڈیا کے لیے بھی ہے اور یہی اصول دوسرے تمام ملکوں کے لیے بھی۔

محمد عثمان صاحب شمسی (۴۲ سال) نے اپنے کئی تجربات بتائے۔ انھوں نے ایک دلچسپ مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ جانور دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مثلاً نیولا، دوسرا مثلاً بچھو۔ بچھو گھر میں آجائے تو اس کو ہم مار تے ہیں۔ لیکن اگر نیولا ہو تو اس کو صرف بھگانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں انسانوں کو پہچاننا چاہیے۔ کوئی شخص فی الواقع سانپ اور بچھو کی مانند ہو تو اس کے خاتمہ کی بات سوچی جا سکتی ہے۔ مگر نیولا جیسے کو تو صرف بھگانا ہی کافی ہے۔

بمبئی سے انڈین لائنز کی فلائٹ ۱۸۵ کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ حسب معمول کسی قدر تاخیر کے ساتھ جہاز روانہ ہوا۔ راستہ میں جہاز کے اندر کچھ اخبارات پڑھے۔ نیشنل ہیرالڈ (۲۲ نومبر ۱۹۹۲) میں ایک روسی سیاح کی خودکشی کی خبر تھی جس کا عنوان تھا:

Fatal leap by Russian tourist.

اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک ۴۴ سالہ روسی سیاح ولادیمیر (Vladimir V. Baiderin) نئی دہلی کے کنشکا ہوٹل میں بارھویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۲۱۰ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ۲۱ نومبر کو وہ اپنے کمرہ کی کھڑکی سے کود پڑا۔ زمین پر آتے ہی اس کا سر پھٹ گیا۔ ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ فوراً ہی مر گیا۔

ولادیمیر روزانہ لفٹ سے نیچے اترتا تھا۔ لفٹ اس کو محفوظ طور پر اس کی منزل تک پہنچا دیتی تھی۔ مگر جب اس نے کھڑکی کے راستہ سے چھلانگ لگائی تو اس کا انجام یہ ہوا کہ منزل پر پہنچنے کے بجائے وہ قبرستان میں پہنچ گیا۔

موجودہ زمانہ میں کشمیر سے لے کر بوسنیا تک بہت سے پر جوش مسلمان اسی قسم کی چھلانگ لگا رہے ہیں اور اپنی ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں۔ اگر وہ "زینہ" کو استعمال کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کرتے تو شاید آج وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوتے۔ مگر جب انھوں نے زینہ کے فطری طریقہ کو چھوڑ کر چھلانگ کا غیر فطری طریقہ اختیار کیا تو وہ ان کے لیے خودکشی کے ہم معنی بن گیا۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۲ کی دوپہر کو ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ بمبئی میں جہاز کے اناونسر نے اعلان کیا تھا کہ "باہر کا تاپمان ۳۲ ڈگری سلیسس ہے" دہلی میں اعلان کیا گیا کہ مسافروں کی جانکاری کے

لیے باہر کا تاپمان ۲۲ ڈگری سلیس ہے۔

دہلی اور بمبئی دونوں ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔ مگر دونوں کے درجۂ حرارت میں فرق ہے۔ یہی فرق زیادہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ موسموں کے فرق کے خلاف ہمیں شکایت نہیں کرنا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اس کے مطابق بنا لینا ہے۔ یہی معاملہ انسانی آبادی کا بھی ہے۔ انسانوں میں بھی پیدا کرنے والے نے مختلف قسم کے انسان پیدا کئے ہیں۔ اگر آدمی اس فطری حقیقت کو جان لے تو اس کے لیے سماج کے مختلف افراد کے درمیان زندگی گزارنا اسی طرح آسان ہو جائے گا جس طرح مختلف موسموں کے درمیان اس کے لیے زندگی گزارنا آسان بنا ہوا ہے۔

رشی کیش کا سفر

ماسکو میں ایک عالمی ادارہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کلچر کے ذریعہ لوگوں کے درمیان امن واتحاد پیدا کیا جائے۔ اس روسی ادارہ کی اسپانسر شپ میں ہندستان کے مشہور مذہبی مقام رشی کیش میں ایک بین اقوامی عالمی کانگرس روحانی اتحاد کے لیے ہوئی۔ اس کا عنوان یہ تھا :

The World Congress of spiritual concord

اس کانگرس کی دعوت پر رشی کیش کا سفر ہوا۔ اور وہاں مختلف پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔

۵ دسمبر ۱۹۹۲ کو صبح ۹ بجے مسٹر ورگھیز (S. Raphael Verghese) کے ساتھ گھر سے روانگی ہوئی۔ نئی دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر صفائی محکمہ کی طرف سے ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ——— آپ کا کوڑا آپ کی ذمہ داری :

Your dirt, your responsibility

میں نے سوچا کہ یہی زندگی کا عام اصول ہے۔ ہر آدمی اپنی سرگرمیوں کے درمیان کچھ "کوڑا" پیدا کرتا ہے۔ قدرت کا قانون ہے کہ وہ اس کی صفائی کو خود اپنی ذمہ داری سمجھے۔ صاف ستھری دنیا بنانے کے لیے اس کے سوا دوسری کوئی بھی ممکن تدبیر نہیں۔

گھر سے بذریعہ کار چل کر پہلے رشین سنٹر آف سائنس اینڈ کلچر پہنچے۔ یہاں دوسرے ساتھیوں کی آمد کے انتظار میں ٹھہرنا تھا۔ اس سنٹر میں ایک بار میں اس وقت آیا تھا جب کہ سوویت یونین ابھی قائم تھا۔ اب آج دوسری بار آنا ہوا جب کہ سوویت یونین ٹوٹ چکا ہے۔ پہلے یہاں زبردست سرگرمی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ سنٹر کی عظیم بلڈنگ اور اس کا وسیع لان بدستور اسی طرح موجود تھا۔ مگر اب یہاں سناٹے کا منظر دکھائی دیا۔ ریسپشن میں ایک مرد اور ایک عورت بالکل خالی اور غیر مصروف حالت میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے لیے یہاں کوئی کام نہیں۔

بلڈنگ تو پیسہ کے ذریعہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی کی سرگرمیوں کے لیے تخلیقی انسان درکار ہیں۔ اگر تخلیقی انسان نہ ہوں تو بڑی بڑی بلڈنگیں ہوں گی مگر وہاں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا ہوگا۔

یہی آج مسلم دنیا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ پٹرول کے ظہور کے بعد مسلم دنیا میں پیسہ کی افراط ہوگئی

ہے۔ اس بنا پر آج ہر جگہ اسلام کے نام پر عالی شان بلڈنگیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ مگر اندر جا کر دیکھئے تو بڑی بڑی بلڈنگوں میں کوئی بڑا کام نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ کام کرنے کے لیے قابل کار انسانوں کی ضرورت ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں یہ حال ہے کہ تمام قابل کار مسلمان یورپ اور امریکہ کے غیر مسلم اداروں میں جا جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اسلامی اداروں کو صرف کم تر صلاحیت کے افراد ہاتھ آتے ہیں اور کم تر صلاحیت کے لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

دہلی سے تین بس کی صورت میں ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ بس میں ہر آدمی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ ایک خاتون نے دوسری خاتون سے کہا "سب لوگ کہہ رہے ہیں وہاں تو بہت اچھا مارکیٹ ہے"۔ ایک صاحب اس قانونی سوال پر بات کر رہے تھے کہ انڈیا کے نظام میں پریسیڈنٹ کا اختیار کیا ہے اور پرائم منسٹر کا اختیار کیا۔ تیسرے صاحب اپنے ساتھی سے ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین کے فائدہ اور نقصان پر بحث چھیڑے ہوئے تھے۔ ایک خاتون نے کہا : مجھ کو یہ ناول راستہ میں ختم کر لینا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ سارے لوگ رشی کیش جا رہے ہیں تاکہ وہاں "روحانی اتحاد" کی کانگرس میں شرکت کریں۔ وہاں ہر عورت اور مرد کسی نہ کسی طور پر اپنا حصہ ادا کرے گا۔ مگر یہ سب کچھ غالباً پروفیشنل انداز میں ہوگا۔ لوگ عملاً مادیات میں جی رہے ہیں، مگر رسمی طور پر چند دن کے لیے جمع ہو کر وہ روحانی عمل انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کسی انسانی مجموعہ میں حقیقی روحانی انقلاب نہیں آسکتا۔ روحانیت پر اجتماعی کانگرس میں شرکت سے پہلے ہمیں انفرادی سطح پر روحانیت میں جینا ہوگا، اس کے بعد ہی روحانیت کا ماحول دنیا میں آسکتا ہے۔

اس قافلہ میں میرے سوا تقریباً سب کے سب غیر مسلم تھے۔ بیشتر لوگ بیرونی ملکوں کے تھے اور انگریزی بولنے والے تھے۔ ان کا ذوق، ان کا طرز فکر، ان کا ذہنی سانچہ سب کچھ مسلمانوں سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے علماء اور دانشور صرف مسلمانوں کے درمیان سرگرم رہتے ہیں۔ ان کا تعلق غیر مسلموں سے تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ یہی صورت حال ساری دنیا میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مسلم عالم یا مسلم دانشور اپنی موجودہ لیاقت کے ساتھ اس قابل ہی نہیں کہ وہ غیر مسلموں میں ان کے ذہنی درجہ کے مطابق ان سے بات کر سکے۔ یہ حضرات اگر غیر مسلموں میں آئیں تو وہ اپنے آپ کو تقریباً "گونگا" محسوس کریں گے۔

آج (۵ دسمبر) کے ہندستان ٹائمس میں میرا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا تھا۔ سفر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے اس کو پڑھا تھا۔ چنانچہ اپنے آپ وہ زیر بحث آگیا۔

اس سلسلہ میں ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اسلام کا اصل کنسرن (concern) پاور نہیں ہے بلکہ فریڈم ہے۔ پولیٹکل ہیڈ خواہ مسٹر اے ہوں یا مسٹر بی، اگر مسلمان کو قول وعمل کی آزادی حاصل ہے تو بس یہ اہل اسلام کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔

پولیٹکل ہیڈ کا تعلق حقیقۃً انتظام یا بندوبست سے ہے۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر اور اسی طرح ہر شعبۂ حیات میں انتظامی بندوبست کے لیے کسی ایک کو ہیڈ بنانا پڑتا ہے۔ یہ ہیڈ ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ہر آدمی ہیڈ بننا چاہے تو لا متناہی جھگڑا اور ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ حالات جس کو پولیٹکل ہیڈ کا درجہ دے دیں بقیہ لوگ اس کو مان کر اپنے اپنے دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر میں لگ جائیں۔

میں نے کہا کہ تمام مسلم فقہاء اور مسلم علماء اس پر متفق ہیں کہ کسی مسلم حکمراں کا اقتدار جب عملاً قائم ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ حکمراں کو ہٹانے کی کوشش میں مزید خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کی توسیع کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ اسی طرح جب ایک غیر مسلم حکمراں کی حکومت قائم ہو جائے تو اس وقت تک اس کے خلاف بغاوت نہیں کی جائے گی جب تک وہ لوگوں کو قول اور عمل کی آزادی دے رہا ہو۔

دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم یوپی کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں طرف مختلف مناظر ایک کے بعد ایک گزر رہے تھے۔ دکانیں، مکانات، کارخانے، کھیت، باغات، یہ سب گویا انسانی سرگرمیاں تھیں جو مختلف صورتوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا تو بظاہر مختلف سرگرمیوں کے درمیان ایک ہی داعیہ کام کر رہا تھا، اور وہ اقتصادی انٹرسٹ کا داعیہ تھا۔ ہر آدمی اپنے اقتصادی مفاد میں لگا ہوا تھا، ہر آدمی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوڑ رہا تھا۔

آج کی دنیا میں لوگ اپنے معاملات میں اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ ان کو دنیا کے بارہ میں خود سے معلوم کرنے کا کوئی وقت نہیں۔ لوگ دنیا کے بارہ میں صرف اخباروں کے ذریعہ معلومات

حاصل کرتے ہیں۔ اور اخبارات کا یہ حال ہے کہ ان کو صرف "ہاٹ نیوز" سے دلچسپی ہے۔ انھیں سماج میں پیش آنے والے ہزاروں مثبت واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ کوئی ایک منفی واقعہ پیش آجائے تو اس کو وہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح آج کا آدمی خود اپنے سماج کے بارہ میں بہت ناقص واقفیت حاصل کر پاتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا بڑا سبب یہی ہے۔ ہندوؤں کو اپنے اخباروں میں اکثر وہی مسلم خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو ہاٹ نیوز کے قبیل کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے اخبارات بھی ان کو ہندوؤں کے بارہ میں صرف وہی خبریں بتاتے ہیں جن کو لال رنگ کی خون آلود سرخیوں میں چھاپا جاسکتا ہو۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا میں زرد صحافت پائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ زرد صحافت نہیں بلکہ یہ مجرمانہ صحافت ہے اور اسی صحافت نے دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات کو غیر معتدل بنا رکھا ہے۔

راستہ میں چار ندیاں تھیں جن کے اوپر سے پل کے ذریعہ ہماری بس گزری۔ ندی گویا قدرتی واٹر سپلائی کا نظام ہے جو نامعلوم مدت سے جاری ہے۔ یہ واٹر سپلائی ایک آفاقی نظام کے تحت ممکن ہوتی ہے۔ بارش کے موسم میں جب بارش ہوتی ہے تو وہ وقتی طور پر ندیوں کو بھر دیتی ہے۔ مگر وہ پورے سال کی واٹر سپلائی کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ قدرت کے نظام کے تحت پانی کا ایک حصہ پہاڑوں کے اوپر برف کی صورت میں جم کر ٹھہر جاتا ہے۔ ٹھنڈے موسم میں دریا کے اندر پانی اپنے آپ رہتا ہے۔ گرم موسم میں دریا کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس وقت پہاڑ کی برف پگھل کر چشموں کی صورت میں بہنا شروع ہوتی ہے۔ اس طرح ان پہاڑی چشموں کے ذریعہ دوبارہ ہماری دریاؤں میں پانی کی روانی جاری رہتی ہے۔

راستہ میں سڑک کے کنارے چند مسجدیں بھی نظر آئیں۔ مگر یہ مسجدیں زیادہ شاندار نہ تھیں۔ البتہ لاؤڈ اسپیکر ضرور ہر ایک کے اوپر لگا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر مسجدوں کے لیے ایک ضروری جزء سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب پہلی بار لاؤڈ اسپیکر مارکیٹ میں آیا تو مسلم علماء کو اسے مسجد میں استعمال کرنے میں سخت تردد تھا۔ حتی کہ بعض علماء نے کہا کہ اس کی آواز مشین کی آواز ہے۔ اس لیے اس کا استعمال مسجد کے اعمال کے لیے جائز نہیں۔

ایک حدیث میں آنے والے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بتایا گیا ہے کہ مسجدوں میں آوازیں

بلند ہوں گی (رفعت الاصوات فی المساجد) اگر اس حدیث سے لاؤڈ اسپیکر مراد ہو تو لاؤڈ اسپیکر ایک فتنہ ہے نہ کہ کوئی بہت پسندیدہ چیز۔

ہم یوپی کی پُرشور اور گرد آلود سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اعلان ہوا کہ یہ کھتولی ہے۔ یہاں ہم لنچ کے لیے ایک گھنٹہ رکیں گے۔ اس کے بعد ہماری بس سڑک سے مڑکر ایک بہت بڑے احاطہ میں داخل ہوئی۔ یہاں کثیر تعداد میں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

باہر نکل کر دیکھا تو صحرا میں گویا ایک نخلستان کا منظر تھا۔ وسیع وعریض گارڈن کے درمیان ایک خوب صورت اور نئی بلڈنگ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا چیتل گرینڈ:

[1] Cheetal Grand Motels Pvt. Ltd.

یہ ایک جدید طرز کا ریستوراں تھا۔ عمارت، نشست گاہیں، باتھ روم، ہر چیز بالکل نئے انداز پر بنی ہوئی تھی۔ چاروں طرف دور تک سرسبز و شاداب مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ صفائی بھی کامل درجہ میں تھی۔ یہاں قافلہ کے تمام لوگوں نے کھانا کھایا۔ کھانا بھی نہایت صاف ستھرا تھا۔

میں نے وضو کیا اور لان کی گھاس پر ظہر کی نماز ادا کی۔ میں نماز کے لیے کھڑا ہوا تو ایک اور صاحب آکر شریک ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں سوئزرلینڈ سے آیا ہوں۔ میرا موجودہ نام عبد الصمد ہے۔ میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ پھر ایک مسلم صوفی سے متاثر ہو کر میں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعد کو ان سے مزید گفتگو نہ ہو سکی۔

میں سمجھا تھا کہ یہ کسی بڑے ہندو کا ریستوراں ہو گا۔ مگر کھانے سے فارغ ہو کر میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک تندرست اور خوش پوشش نوجوان میرے پاس آئے۔ انھوں نے میرا نام پوچھا۔ پھر انھوں نے کہا کہ میرا نام شارق رانا ہے۔ میں اور میرے بھائی واثق نشار اس ریستوراں کے مالک ہیں۔ یہ ریستوراں دہلی۔ مسوری روڈ پر واقع ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ ریستوراں ہندستانی مسلمانوں کے نئے فیصلہ کی علامت ہے۔ ایک عرصہ تک انڈیا کو مسائل کا ملک سمجھنے کے بعد اب یہاں کے مسلمانوں نے جان لیا ہے کہ انڈیا بہترین مواقع کا ملک ہے۔ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اس ملک کے امکانات کو استعمال کر کے آگے بڑھیں گے، یہاں تک کہ ترقی کی آخری منزل تک پہنچ جائیں گے۔

دہلی میں سڑکیں اچھی تھیں۔ مگر یوپی کے علاقہ کی سڑکیں ناہموار معلوم ہوئیں۔ مسلسل گاڑی میں جھٹکے لگتے رہے۔ مجھے سر میں درد اور چکر پیدا ہو گیا جو آخر وقت تک باقی رہا۔ اس کی وجہ سے مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ میں سوچتا رہا کہ یہ سر کا چکر جو بظاہر دکھائی بھی نہیں دیتا، وہ مجھ کو اتنا پریشان کیے ہوئے ہے کہ اس کے ساتھ اگر دنیا کا سب سے اچھا محل مجھے رہنے کے لیے دے دیا جائے تو اس کے اندر مجھے ایک سکنڈ کے لیے بھی خوشی اور سکون نہیں ملے گا۔ صحت و عافیت کی زندگی بھی اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے۔

دہلی سے ہمارا قافلہ تین اسپشل بسوں کے ذریعہ رشی کیش کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر بیرونی ملکوں کے لوگ تھے۔ روس، جرمنی، سوئزرلینڈ، امریکہ وغیرہ سے مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ دہلی میں جمع ہوئے اور پھر یہاں سے ایک قافلہ کی صورت میں رشی کیش کے لیے روانہ ہوئے۔

رڑکی تک کا سفر اچھا گزرا۔ اس کے بعد سڑک زیادہ اچھی نہ تھی۔ ایک جگہ پل ٹوٹنے کی وجہ سے سواریوں کو سڑک کے نیچے اتار کر کچے راستہ سے گزارا جا رہا تھا۔ ایک جگہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کافی دیر تک رکنا پڑا۔ اس طرح سفر متعب بھی ہو گیا اور طویل بھی۔ زندگی کا آغاز خواہ کتنے ہی ہموار حالات میں شروع کیا جائے، درمیان میں ناموافق حالات کا پیش آنا ضروری ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو وہ اس کو پست ہمتی سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔

ہم لوگ رڑکی میں داخل ہوئے تو گرجا سے ٹن ٹن کی آواز آرہی تھی۔ پہلے میں نے سمجھا کہ یہ ہاتھی کی آواز ہے۔ قریب ہوا تو ایک قدیم چرچ سڑک کے کنارے دکھائی دیا۔ اب میں نے جانا کہ یہ چرچ کے گھنٹے کی آواز ہے۔

دوسرے مذاہب میں عبادت کے وقت کے اعلان کے لیے گھنٹے یا اسی قسم کی کسی اور چیز کا رواج ہے۔ غالباً اسلام واحد مذہب ہے جس میں بامعنی مذہبی کلمات کو دہرا کر عبادت کے وقت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کا اعلان صرف اعلان ہے۔ جب کہ اسلام نے اعلان کے ساتھ دعوت کا پہلو بھی شامل کر دیا ہے۔

راستہ میں کئی جگہ شوگر مل دکھائی دی۔ اونچی چمنیاں دھواں اڑاتے ہوئے اپنے وجود کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس کے قریب دور تک گنّے سے لدی ہوئی گاڑیاں اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔

گنّا قدرت کی ایک پیداوار ہے۔ اس کے اندر رس بھرا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ چھلکے کی بڑی مقدار بھی اس میں شامل رہتی ہے۔ گنے کو مشین میں ڈال کر دباتے ہیں۔ اس طرح اس کا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔ اور سوکھا چھلکا الگ ہوجاتا ہے۔ گنے سے رس لینے کے لیے اس کے اوپر شدید دباؤ کا عمل ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کا میٹھا رس حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان بظاہر ایک جسمانی وجود ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر غیر معمولی اخلاقی، روحانی اور فکری قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان قوتوں کو ظہور میں لانے کا واحد فطری طریقہ یہ ہے کہ انسان کو دباؤ کے عمل سے گزارا جائے۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں کسی فرد یا کسی قوم کو اگر دباؤ کے حالات پیش آئیں تو یہ اس کے اوپر خدا کی عنایت کا نشان ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اس کو چھلکے کے درجہ سے اٹھا کر رس کے درجہ میں پہنچانا چاہتا ہے۔

رشی کیش کے علاقہ میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ حسب قاعدہ گنگا کا پل بند ہو چکا ہے۔ اب ہم کو دریا کے اس پار ایک ہوٹل میں رات گزارنا ہوگا۔ کل صبح کو پل کھلنے پر گنگا پار کر کے آشرم میں پہنچیں گے جہاں کانگرس کی کارروائیاں ہونے والی ہیں، مگر کچھ لوگ ہمت نہیں ہارے۔ وہ چل کر پل کی اتھارٹی سے ملے۔ اس کو بتایا کہ یہ ایک انٹرنیشنل قافلہ ہے جو روحانی اجتماع کے لیے یہاں آیا ہے۔ وہ لوگ مطمئن ہو گئے اور انھوں نے پل کا گیٹ خصوصی طور پر کھول دیا۔

رشی کیش پہنچنے کے بعد پہلے ہم لوگ ایک بڑے شامیانہ میں لے جائے گئے۔ یہاں فادر گریگوریوز نے وہیل چیر پر بیٹھ کر تمام مہمانوں کا سواگت کیا۔ یہاں تمام لوگ تقریباً ایک گھنٹہ تک ٹھہرے۔ اور آپس میں ملاقاتیں کیں۔

ہمارے قافلہ کے ایک صاحب جرمنی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام ولی (Willy Augustat) تھا۔ وہ انگریزی روانی کے ساتھ بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کانفرنس میں جرمنی سے کئی لوگ آئے ہیں۔ چار تو خود ان کے اپنے گھر کے ہیں (وہ اور ان کی بیوی اور ان کی لڑکی اور ان کا لڑکا) یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ انڈیا پر ایک جرمن حملہ (German invasion) ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں، مگر یہ ایک روحانی حملہ (spiritual invasion) ہے اور سچا روحانی حملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا داخل ہونا۔

ولی اگسٹنٹ (Tel. (0) 8106-33903) یورپ میں پیس تھرو کلچر کے پریسیڈنٹ ہیں۔ اور نہایت زندہ دل آدمی ہیں۔ وہ اگرچہ روانی کے ساتھ انگریزی بول رہے تھے۔ مگر انھوں نے کہا: مجھے انگریزی نہیں آتی۔ بس کام چلانے کے لیے بول لیتا ہوں۔

ایک سوامی جی نے "حقیقت" کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم میں سے ہر شخص ایک عظیم کل کا ایک جزء ہے:

Everyone of us is a part of the great whole.

میں نے کہا کہ یہ حقیقت کا وہ بیان ہے جو آریائی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ مگر سامی مذاہب کا بیان اس سے مختلف ہے۔ سامی مذاہب کے نزدیک ہم اور کائنات کی دوسری تمام چیزیں خالق کی مخلوق ہیں نہ کہ خالق کا جزء۔ پہلی تشریح میں خالق ہم سے الگ نہیں ہے، جب کہ دوسری تشریح میں خالق مکمل طور پر ہم سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔

ایک صاحب سے بات ہوئی۔ وہ مجھ کو جانتے نہیں تھے۔ انھوں نے مذاق کے انداز میں کہا کہ ہندوازم زیادہ پرانا مذہب ہے اور اسلام کی تمام باتیں ہندوازم میں موجود ہیں۔ پھر آپ لوگ ہندوازم کو کیوں نہیں لے لیتے۔ اس طرح آسانی سے ریلجس ہارمنی پیدا کی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا کہ اگر میں اس کو الٹ کر یہ کہوں کہ اسلام زیادہ لیٹسٹ ہے اور مذہب کا ریوائزڈ اڈیشن ہے، اس لیے دوسرے قدیم مذہب والوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کو اختیار کر لیں۔ اس طرح وہ ناقص کو چھوڑ کر کامل کو پالیں گے، تو آپ میری اس بات کے جواب میں کیا کہیں گے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس طرح کی باتیں مختلف لوگوں سے ہوتی رہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو ایسی آواز تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں اپنی موجودہ جگہ چھوڑے بغیر کوئی کریڈٹ مل رہا ہو۔ مثلاً موجودہ کانگریس میں ہر آدمی اپنے مذہب کے ساتھ شریک ہو رہا ہے۔ اپنے مذہب سے ہٹے بغیر اس کو ایک نیا اطمینان حاصل ہو رہا ہے کہ اس نے عالمی روحانی اتحاد کے لیے کام کیا۔ مگر ایک ایسی آواز آدمی کو اپیل نہیں کرتی جس میں اس کو اپنی موجودہ پوزیشن چھوڑنی پڑے۔

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخر کار رات کو ۹ بجے میں پرمارتھ نکیتن آشرم میں پہنچا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔ یہ انڈیا کا سب سے بڑا آشرم ہے اور سوامی چیدانند اس کے چیرمین ہیں۔ یہاں شام کا کھانا کھایا۔

سوامی جی شریک نہ ہو سکے۔ کیونکہ رات کا کھانا وہ سورج ڈوبنے سے پہلے کھا لیتے ہیں۔ اسی آشرم میں رات کی نماز پڑھی اور پھر اپنے کمرہ میں سونے کے لیے چلا گیا۔

میں جب سوامی جی کے کمرہ میں داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں صرف کپڑے کا ایک بیگ تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا: آپ کا اور سامان۔ میں ابھی خاموش تھا کہ سوامی جی جو میرے مزاج کو جانتے تھے، بولے: مولانا جی تو سچے فقیر ہیں۔ ان کو زیادہ سامانوں سے کیا کام۔ بس یہی کپڑے کا بیگ ان کا سامان ہے۔

سوامی جی سے میں نے پوچھا کہ ہندو روایات میں "فقیر" کا کیا مطلب بتایا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: جو فکر کا فاقہ کرے اس کا نام فقیر۔

۵ دسمبر کی شام کو منزل تک پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت نکل گیا۔ سوامی چیدانند کے دفتر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے سوامی جی سے کہا کہ مجھ کو نماز پڑھنا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنے خاص کمرہ میں ایک نیا کپڑا مصلی کے طور پر بچھایا۔ وہیں میں نے وضو کیا اور ان کے کمرہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔

میں نے دعا کی کہ خدایا، تو اس ملک پر اور اس ملک کے بسنے والوں پر رحم فرما۔ مسلمانوں نے اس ملک کے باشندوں کے ساتھ یہ نادانی کی کہ انھوں نے ان کو رقیب سمجھا، انھوں نے ان کو مدعو نہیں سمجھا۔ خدایا تو اس ملک کے دونوں فرقوں کے درمیان کشیدگی کا ماحول ختم کر دے تاکہ کھلے ماحول میں تیرا پیغام ایک سے دوسرے کو پہنچنے لگے۔

۶ دسمبر کی صبح ۵ بجے آنکھ کھلی تو آشرم کے معمول کے مطابق، لاؤڈ اسپیکر پر گیتا کے اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ تک ترنم کے ساتھ ایک پنڈت جی اس کو سناتے رہے۔ اس کے بعد ایک اور پنڈت جی نے کٹھن ہندی میں اس کی تشریح پر آدھ گھنٹہ تک تقریر کی۔ تشریح میں انھوں نے خاص طور پر چنتن پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ پرماتما کا کوئی روپ نہیں۔ آخر میں پرارتھنا ہوئی ساز پر "دیا کرو بھگوان" دہرایا گیا اور اس طرح کے دوسرے دعائیہ کلمات۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہندو عقیدہ کے مطابق، دیوی دیوتا پرماتما کی صفات کا مظہر ہیں۔ آدمی انھیں صفات کے ذریعہ پرماتما سے ربط قائم کرتا ہے۔ اسی لیے ہندو سماج میں دیوی دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر ان کے یہاں پرماتما کا کوئی مندر نہیں۔

یہ مجموعی طور پر صبح ایک گھنٹہ کا پروگرام تھا۔ ایک صاحب (مصراجی) مارچ سے کر صبح کو کمرہ کمرہ میں چیک کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ٹھہرنے والے ہر شخص کے لیے ست سنگ کے اس پروگرام میں شرکت کرنا لازمی ہے۔ ایک صاحب کے الفاظ میں، یہ یہاں کے باسیوں کے لیے اسپریچول ٹیکس ہے۔

سورج طلوع ہونے کے قریب تھا کہ مندروں سے گھنٹہ کی آوازیں آنے لگیں۔ گنگا کا پانی یہاں تیزی سے بہتا ہے۔ اس بنا پر اس کی آواز بھی مسلسل رات اور دن سنائی دیتی ہے۔ صبح کو میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو تیز اور ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ یوروپین لوگوں کے لیے اس قسم کی ہوا بہت خوش گوار تھی۔ مگر میرے لیے وہ زیادہ خوش کن ثابت نہ ہوسکی۔ خواہش کے باوجود میں باہر زیادہ دیر تک ٹہل نہ سکا۔

میرے کمرہ کے قریب بلڈنگ کے ایک حصہ میں جلی حرفوں میں بورڈ لگا ہوا تھا: انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم (آفس) یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ یہ ایک جدید طرز کا آشرم ہے۔ آشرم کے چیرمین سوامی چیدانند کا یہ ایک بڑا حوصلہ مندانہ منصوبہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوازم کی انسائیکلوپیڈیا کئی ضخیم جلدوں میں تیار کر رہے ہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو جوڑ کر ایک تھنک ٹینک (Think Tank) بھی انھوں نے تشکیل دیا ہے۔

۶ دسمبر کو صبح کا وقت ہے۔ میں آشرم کی ایک چھت پر کھڑا ہوں۔ چاروں طرف اجالا پھیلا ہوا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کی بلندیاں آشرم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سامنے گنگا پُرشور آواز کے ساتھ بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس کا پاٹ ایک چھوٹی پہاڑی ندی جیسا ہے۔ یہاں وہ اتنی چوڑی نہیں جتنا وہ آگے جا کر ہو جاتی ہے۔ دریا کے کنارے قطار سے کئی مندر بنے ہوئے ہیں۔ پجاری (زیادہ تر عورتیں) آتی ہیں۔ وہ ایک بار گھنٹہ بجا کر اندر جاتی ہیں اور پوجا کی رسم ادا کرتی ہیں۔ یہاں کی ہوا کثافت سے بڑی حد تک خالی ہے۔ اس آشرم کا نام پرمارتھ نکیتن ہے۔ اس میں بیک وقت پانچ ہزار آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ مختلف معیار کے کمرے بڑی تعداد میں بنے ہوئے ہیں۔ گنگا کے عین کنارے یہ آشرم عملاً ایک صحت گاہ بن گیا ہے۔ یہاں ہندو لوگ اس احساس کے ساتھ آتے ہیں کہ برکت بھی حاصل کریں گے اور صحت بھی۔

رشی کیش کے مختلف حصوں میں گھوم کر دیکھا۔ ہر طرف مندر اور اس سے متعلق چیزوں کے مناظر تھے۔ جگہ جگہ کسی دیوی یا دیوتا کا مجسمہ کھڑا ہوا ہے۔ لوگ پرارتھنا اور پوجا میں مصروف نظر آئے۔ مندروں کے

آس پاس دکانوں میں پوجا اور نذر و نیاز کے سامان بک رہے ہیں۔ مثلاً پھول، صندل، موم بتی، جپ مالا، تصویریں، دھارمک کتابیں، وغیرہ وغیرہ۔

ایک ہندو نے مجھ کو مسلمان سمجھ کر کہا۔ ہم میں اور آپ میں کیا فرق ہے۔ ہم لوگ (مندروں میں) کھڑا کرکے پوجتے ہیں اور آپ لوگ (قبروں میں) لٹا کر پوجتے ہیں۔ مندروں کے آس پاس آپ جو چیزیں یہاں دیکھ رہے ہیں وہی سب میں نے آپ کی درگاہوں میں بھی دیکھا ہے۔

رشی کیش کے مناظر کو دیکھنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ ہندو لوگ اتنی زیادہ تعداد میں کیوں درگاہوں میں جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ درگاہوں کے ماحول میں ان کو اسلام کا ہندوائیڈ ورشن (Hinduised version) مل جاتا ہے۔ یہاں اسلام ان کو اپنے مذہب جیسا ہی ایک مذہب دکھائی دیتا ہے۔

رشی کیش گنگا کے کنارے بسا ہوا ہے۔ پہاڑ کے اوپر جہاں سے گنگا شروع ہوتی ہے اس کو گنگوتری کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر گنگا کو سب سے پہلے جہاں ہموار میدان ملتا ہے وہ یہی رشی کیش ہے۔ گنگوتری کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رشی کیش کی ہے۔ گنگا کو ہندو روایات میں "ماں" کہا گیا ہے۔ سوامی چیدانند نے اس کی تشریح یہ کی کہ ماں ہمیشہ دیتی ہے، وہ کبھی لیتی نہیں۔ اسی طرح گنگا یک طرفہ طور پر دیتی رہتی ہے۔ وہ ہم سے کچھ نہیں لیتی۔ اسی لیے ہندو روایات میں گنگا کو ماں کے روپ میں دیکھا گیا ہے۔

بظاہر یہ ایک خوب صورت توجیہہ ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس دنیا کی ساری ہی چیزیں گنگا کی مانند ہیں۔ گھاس اور مولی سے لے کر سورج اور چاند تک اس کائنات کی ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ وہ یک طرفہ نفع رسانی کے اصول پر کاربند ہے۔ ایسی حالت میں جو درجہ گنگا کو دیا گیا ہے وہی درجہ عالم طبیعی کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو دیا جانا چاہیے۔

اس قسم کی غیر منطقی توجیہہ کا رواج موجودہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذہبی فرقوں میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہندوؤں میں۔

گنگا ہندستان کا ایک بہت بڑا دریا ہے۔ وہ شمالی ہند سے شروع ہو کر بنگال کے آخر تک بہتا چلا گیا ہے۔ اس کی مجموعی لمبائی ۲۵۰۰ کیلومیٹر ہے۔ ہندو عقیدہ میں اس کو ایک مقدس دریا مانا گیا ہے۔ گنگا کے کنارے آباد شہروں کو ہندو روایات میں خصوصی مذہبی اہمیت حاصل ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مختلف قوموں میں روحوں (spirits)

کی پرستش کا رواج رہا ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ، درخت، دریا، ہر چیز میں ایک ایسی روح کو مانا جاتا ہے جس کے اندر پُراسرار صفات اور طاقتیں موجود ہیں۔ اسی لیے ان چیزوں کو پوجا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر جو روح ہے اس کی برکت حاصل کی جائے۔ اسی عقیدہ کے تحت گنگا کو بھی پوجا جاتا ہے کیونکہ اس میں دیوی کی روح سمائی ہوئی ہے۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے برٹانیکا کا مقالہ نگار کہتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی کچھ غیر خدائی چیزوں کی پرستش کا رواج ہے۔ مثلاً ساؤتھ ایشیا کے مسلمان اپنے پیروں کو پوجتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے قرآن میں کوئی سند موجود نہیں :

...a practice for which there is no authority in the Qur'an (17/129)

رشی کیش کی یہ سات روزہ کانگرس ایک روسی تنظیم کے تحت ہوئی۔ اس کا نام ہے ——— امن بذریعہ کلچر کی بین اقوامی جماعت :

The International Association Peace Through Culture.

یہ تنظیم ماسکو میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی نکولائی روِرش (Nikolai K. Roerich) تھے۔ وہ ۱۸۷۴ میں ماسکو میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۷ میں بنگلور میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کے موجودہ روسی صدر والنتن سدوروف (Valentin M Sidorov) ہیں۔ اس تنظیم کی پہلی عالمی کانگرس الما اتا (قزاخستان) میں ۱۹۹۲ میں ہوئی تھی۔ دوسری عالمی کانگرس دسمبر ۱۹۹۳ میں رشی کیش میں ہوئی۔ اس کی شاخیں اکثر مغربی ملکوں میں قائم ہیں۔ ان کا خاص پیغام یہ ہے کہ دنیا کا بڑھتا ہوا تشدد روحانی بیماری (spiritual illness) کی بنا پر ہے۔ دنیا کے مسائل کو روحانی طاقت (spiritual energy) کے ذریعہ سے دور کرو۔ اندھیرے کو کوسنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شمع روشن کر دی جائے :

It is far better to light a lamp than to curse the darkness.

رشی کیش کی یہ کانگرس اصلاً میڈیٹیشن (مراقبہ) کے لیے ہوئی تھی۔ یہاں مختلف مذاہب کے لوگوں نے جمع ہو کر اپنے اپنے مذہبی طریقہ کے مطابق میڈیٹیشن کا مظاہرہ کیا۔ روس سے آئے ہوئے ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام میں عبادت کا تصور ہے، میڈیٹیشن کا تصور اسلام میں نہیں

ہے۔صوفیاء نے مراقبہ کا طریقہ نکالا۔ مگر وہ ان کی اپنی ایجاد ہے، اسلام میں اس کا ماخذ موجود نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جب کہ اسلام میں ذکر کی تعلیم ہے۔ اور ذکر میڈیٹیشن یا دھیان ہی کا مسلم طریقہ ہے :

Dhikr is the Muslim form of meditation or *Dhyan*.

میں نے کہا کہ ذکر اور معروف دھیان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ذکر یاد ہے اور دھیان غوطہ خوری۔ ذکر میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرتا ہے۔ جب کہ دھیان میں خدا جیسی کوئی شخصیت سامنے نہیں ہوتی۔ دھیان یہ ہے کہ آدمی خود اپنے اندر چھپی ہوئی حقیقت سے اپنے آپ کو مربوط کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ذکر سے آدمی کے اوپر خدا کی عظمت کا تصور قائم ہوتا ہے۔ جب کہ دھیان یا میڈیٹیشن کا آخری نتیجہ ایک موہوم قسم کا روحانی سکون ہے اور بس۔

یورپ سے آنے والے ایک صاحب نے میڈیٹیشن کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ میڈیٹیشن وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں بحث اور استدلال ختم ہو جاتا ہے :

Meditation begins where discussion and ratiocination stop.

میں نے کہا کہ آپ کے اس جملہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جب بحث اور استدلال کام نہ کرے تو مراقبہ شروع کردو۔ مگر خود اس بات کو ماننے کے لیے بھی بحث و استدلال کی ضرورت ہوگی کہ مراقبہ بھی دریافت حق کا کوئی موثر ذریعہ ہے۔ بحث و استدلال میں ہم معلوم حقائق کی مدد سے کر ایک فکری نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ معلوم حقیقتوں میں غور و فکر کے علاوہ آدمی کے پاس کون سا مزید ذریعہ ہے جو اس کو حقیقت تک رسائی میں مدد کرتا ہے۔ جب تک آپ یہ ثابت نہ کریں کہ یہاں اس قسم کا ایک اور چھپا ہوا ذریعہ موجود ہے اس وقت تک مراقبہ کی معنویت مشتبہ رہے گی۔ یہ اثبات حقیقی دلیل سے ہونا چاہیے نہ کہ مثالوں سے۔

۶ دسمبر کو صبح ۱۰ بجے یہاں کے پرشورام ہال میں کانگرس کا افتتاح ہوا۔ افتتاح کی تقریب میں سب سے پہلے مختلف مذہب کے لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں سے کچھ اجزاء پڑھ کر سنائے۔

ابتدائی تمہید کے بعد سب سے پہلے سوامی چیدانند مائک پر آئے جو ہندو دھرم کے نمایندہ تھے۔ انھوں نے سنسکرت میں کچھ اشلوک ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائے۔ یہاں ترجمہ کا قاعدہ نہیں تھا،

اسی لیے انھوں نے ترجمہ نہیں کیا۔

مقرر پروگرام کے مطابق، سوامی چیدانند کے بعد مجھ کو قرآن کا ایک حصہ تلاوت کرنا تھا۔ میرے نام کا اعلان ہوا تو میں مائک پر آیا۔ اس وقت حاضرین میں زیادہ تر بیرونی ملکوں کے لوگ تھے، اس لیے ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے مائک پر آکر پہلے حسب ذیل الفاظ کہے :

> The recitation of the Qur'an is a highly professional job. Those people who recite the Qur'an are called Qaris. I am not a Qari in that sense of the word. I am simply a student of the Qur'an. So I will recite some verses from the Qur'an in a very simple and non-professional manner.

اس کے بعد میں نے سادہ انداز میں قرآن کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ حاضرین کے چہرہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کو بہت دھیان کے ساتھ سن رہے ہیں۔ اور نہایت ادب اور تعظیم کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا کا کلام خود اپنے صوتی آہنگ میں بھی ایک تاثیر رکھتا ہے، خواہ سننے والا اس کو سمجھ رہا ہو یا نہ سمجھ رہا ہو۔

اس کے بعد اچاریہ منی سوشیل کمار نے جین مذہب کی کتاب سے ایک مختصر حصہ پڑھا۔ اس کے بعد سکھ دھرم کی طرف سے ایک مرد اور ایک عورت اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے باجہ کی دھن پر گوربانی کا ایک حصہ ترنم کے ساتھ سنایا۔ اس کے بعد مقامی ویدک ادارہ کے طلبہ کی ایک ٹیم گیروے لباس میں آئی۔ انھوں نے مل کر اپنا مذہبی گانا گایا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک مختلف شخصیتیں اور جماعتیں اسٹیج پر آتی رہیں اور اپنے مذہب کا تعارف پیش کرتی رہیں۔

آخر میں بشپ گریگوریوز نے ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ حقیقت ایک ہے مگر اس کا اظہار (manifestation) متعدد ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے موجودہ کانگرس کا تعارف پیش کیا، اور بتایا کہ ہم رشی کیش میں کیوں جمع ہوئے ہیں اور ہمیں کیا کرنا ہے۔ تنظیم کے صدر نے روسی زبان میں تقریر کی جس کا ترجمہ ان کے روسی سکریٹری نے انگریزی میں کیا۔

کانگرس کی کارروائی ۶ دسمبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ تک جاری رہی۔ پہلے دن شرکا کا تعارف اور ابتدائی کارروائیوں کے علاوہ ہر مذہب کی مقدس کتابوں کی تلاوت کی گئی۔ ۷ دسمبر کو ہر مذہب کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقہ کے مطابق میڈیٹیشن کا مظاہرہ کیا۔ اس میں گیت اور ڈانس بھی شامل تھا۔ ۸ دسمبر کو بھی اسی قسم کے پروگرام جاری رہے۔ ۹ دسمبر کو میڈیٹیشن اور یوگا کے علاوہ لوگوں کو گنگا کے کنارے لے جایا گیا۔ ۱۰ دسمبر کو

مذکورہ پروگراموں کے علاوہ روحانی پینٹنگ کے نمونے دکھائے گئے۔ ۱۱ دسمبر کو یوگا وغیرہ کے پروگرام کے ساتھ شرکا نے اپنے اپنے تاثرات مختصر طور پر بیان کیے۔ ۱۲ دسمبر کو مختلف مناظر دکھائے گئے اور الوداعی تقریر ہوئی۔

یہ مختصر طور پر اس کانگرس کی روداد تھی۔ تاہم یہ ایک عملی نوعیت کی کانگرس تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس کو دیکھ کر ہو سکتا ہے، کاغذی رپورٹ سے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس اسپریچول کانگرس میں تقریباً ۲۰۰ آدمی مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ روس، جرمنی، سوئزرلینڈ، امریکہ، وغیرہ۔ تقریباً نصف تعداد ہندستانی تھی اور نصف تعداد بیرونی۔ سب کے سب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان میں سکھ ازم، ہندوازم، جین ازم، بدھ ازم، مسیحیت وغیرہ ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ کئی لوگوں سے مذہبی عقائد کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ کسی مذہب میں پیدا ہوئے ہوں ان کو ایک دو ملاقاتوں میں کوئی نئی بات سمجھائی نہیں جا سکتی۔

حدیث میں ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے ایک خاص ماحول میں رہتے رہتے آدمی کی سوچ کنڈیشنڈ ہو جاتی ہے۔ کسی اور نقطۂ نظر کو وہ پکڑ نہیں پاتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ملنا جلنا ہو۔ مختلف مواقع پر تبادلہ خیال ہوتا رہے۔ اسی کے ساتھ مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری ہو۔ اس طرح لوگوں کے ذہن کھل سکتے ہیں۔ کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو ایک گفتگو یا ایک ملاقات سے پوری بات سمجھ جائیں۔ اور اس کا اعتراف بھی کر لیں۔ مگر ایسے لوگ تاریخ میں بہت کم پائے گئے ہیں۔ زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو کسی نئی بات کو دیر سے ہی سمجھتے ہیں۔

سوامی چیدانند رشی کیش کے پرمارتھ نکیتن آشرم کے چیرمین ہیں۔ یہ انڈیا کا سب سے بڑا آشرم ہے۔ اس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سوامی جی کا آفس جو کئی کشادہ کمروں پر مشتمل ہے، بالکل جدید طرز پر بنا ہوا ہے۔ وہ جہاں بیٹھتے ہیں، وہاں تین ٹیلی فون رکھے ہوئے ہیں جس کی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی ہے۔ ہندستان کے مختلف مقامات سے، اس کے علاوہ یورپ، آسٹریلیا، امریکہ سے ٹیلیفون آتے رہتے ہیں۔ سوامی جی اس بات کی ایک زندہ مثال ہیں کہ موجودہ زمانہ کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ نیز یہ کہ کس طرح ایک آدمی ایک کمرہ میں بیٹھ کر ساری دنیا سے مربوط رہ سکتا ہے۔ وہ ایک مقام پر بیٹھ کر جدید مواصلاتی ذرائع سے

ساری دنیا میں اپنی تحریک کو کنٹرول کر سکتا ہے۔

آشرم میں سوامی جی کے دفتر کے سامنے ایک خوب صورت بورڈ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک عالمی نقشہ ہے جس میں ہر ملک میں ہندوؤں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس کے اوپر لکھا ہوا ہے ——— تقریباً ایک بلین ہندو کہاں کہاں رہتے ہیں :

Where nearly a billion Hindus live?

یہ خوب صورت بورڈ "ہندوازم ٹوڈے" کی طرف سے سوامی چیدانند کو ۱۹۹۱ میں اس موقع پر دیا گیا جب کہ سناتن دھرم کے لیے ان کی خدمات کی بنا پر ان کو سال کا ہندو (Hindu of the year) ڈکلیر کیا گیا۔ اس بورڈ میں بتایا گیا تھا کہ ہندو عالمی انسانی خاندان کا چھٹا حصہ ہیں۔ انڈیا میں ۹۳ فی صد ہندو ہیں۔ ہندوؤں کی مجموعی عالمی تعداد ۸۱۶ ملین ہے۔ تقریباً ۶۰ ملین ہندو مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔

ہندوازم ٹوڈے ایک ہفت روزہ ہے۔ اس کو ایک امریکی ہندو نکالتے ہیں۔ وہ کئی زبانوں میں چھپتا ہے۔ اس کی اشاعت کئی ملین تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے دفاتر دنیا کے اکثر حصوں میں موجود ہیں۔ اس کا صدر دفتر امریکہ (ہوائی) میں ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو صبح سویرے رشی کیش سے دہلی کے لیے واپسی تھی۔ صبح پانچ بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ فجر کی نماز آشرم میں اپنے کمرہ میں پڑھی۔ خیال آیا کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے گنگا کے کنارے آباد اس بستی میں خدا کے آگے سجدہ کیا ہو۔ اور یہاں لوگوں کی رحمت اور ہدایت کے لیے دعائیں کی ہوں۔

نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو ست سنگ سے لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے پروچن کی آوازیں آرہی تھیں۔ بولنے والا "صحبت" کا فلسفہ بتا رہا تھا کہ آپ کو ملنے جلنے میں انتخابی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ جس کے ساتھ چاہیں بیٹھیں جس کے ساتھ چاہیں ملنے جلنے لگیں۔ اس نے کہا : جیسا من ہوگا ویسے بچار بنیں گے، جیسا بچار ہوگا ویسا آپ کا جیون بنے گا۔ اپنے من کو ٹھیک کیجئے تاکہ بچار ٹھیک ہوں اور بچار کو ٹھیک کیجئے تاکہ آپ کا جیون سدھرتا چلا جائے۔ آخر میں ہری اوم، ہری اوم کی جاپ پر ست سنگ ختم ہوا۔ یہ ست سنگ یہاں روزانہ کئی بار ہوتا ہے۔ اس کا سلسلہ صبح ۵ بجے شروع ہوتا ہے اور رات کو دیر تک جاری رہتا ہے۔

ہندوؤں نے اس طرح کے آشرم اور ادارے سارے ہندستان میں بے شمار تعداد میں قائم

کر رکھے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ نیچر کو مقدس سمجھتے ہیں اس لیے ان کے مذہبی ادارے اکثر کسی پہاڑ یا کسی دریا کے کنارے ہوتے ہیں۔ اپنے عقیدہ کے مطابق، وہ اس کو نیچر کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بنا پر موجودہ زمانہ میں ہندوؤں کے مذہبی اداروں میں فطرت کا حسن شامل ہو گیا ہے۔ بہت سے غیر مذہبی لوگ بھی یہاں فطرت کے ماحول میں کچھ دن گزارنے کے لیے آنا پسند کرتے ہیں۔

۷ دسمبر کی صبح کو فجر کی نماز اوّل وقت پڑھی۔ اس کے بعد سوامی چیدانند سے رخصتی ملاقات کرنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کانفرنس کے بہت سے مرد اور عورت وہاں چلے آرہے ہیں۔ سوامی جی نے بتایا کہ ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آج آپ جا رہے ہیں تو وہ آپ کے درشن کے لیے اور آپ کا آشیرواد لینے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ یہ زیادہ تر یورپ کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے پہلے سے اس کی بابت معلوم نہ تھا اس لیے کچھ سوچا نہ تھا۔ مگر اس وقت فوری طور پر مجھے بہر حال کچھ بولنا تھا چنانچہ انگریزی میں تقریباً ۱۰ منٹ تک ان کے سامنے خطاب کیا۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ یہاں روحانی اتحاد کے عنوان پر جمع ہوئے ہیں۔ اس نسبت سے چند باتیں میں قرآن کے حوالے سے کہوں گا۔ قرآن میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی صحیح فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف، جھگڑے، غلط فہمیاں یہ سب چیزیں انسانی شخصیت کا اصل حصہ نہیں ہیں، یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ جہالت، حرص، تعصب، کینہ وغیرہ ان کے اسباب ہیں۔ یہ سب چیزیں وقتی طور پر آدمی کی فطرت کو ڈھک لیتی ہیں۔ اگر ان کو ہٹا دیا جائے تو اندر کی یکساں فطرت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روحانی اتحاد تو اپنے آپ سارے انسانوں کے درمیان موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اوپر کے پردوں کو ہٹا دیا جائے۔ پردہ ہٹنے کے بعد جو چیز حاصل ہوگی وہ وہی ہو گا جس کو ہم روحانی اتحاد کہتے ہیں۔

رشی کیش سے دہلی کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ راستہ میں ہمارے ساتھی چائے پینے کے لیے رڑکی میں ٹھہرے۔ ہوٹل کا نام گرین رستوراں تھا۔ میں گاڑی سے باہر آیا۔ میں نے چائے نہیں لی۔ ہندی اخبار امر اجالا کا شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس کی پہلی سرخی یہ تھی: پانچ ٹرینوں میں بم پھٹے۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں بابری مسجد ڈھائے جانے کی پہلی برسی پر دیش کے

مختلف حصوں میں پانچ اہم ایکسپریس ٹرینوں میں رکھے ہوئے بم پھٹے۔ ان سے کئی افراد مر گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہو گئے۔ پیٹریٹ (۷ دسمبر) کی سرخی یہ تھی :

Blasts mark demolition anniversary

بم دھماکہ کا یہ واقعہ بیک وقت۔ بزدلی بھی ہے اور فعل حرام بھی۔ جس نے ایسا کیا ہے اس کو اگر کچھ کرنا ہے تو وہ مجرموں کے ساتھ کرے۔ ٹرینوں میں سفر کرنے والے بے قصور مسافروں کو بم کا شکار بنانا تو انسانیت کے خلاف بھی ہے اور مذہب کے خلاف بھی۔

رڑکی میں ہمارے ساتھی رستوراں میں چائے پینے کے لیے ٹھہرے۔ میں نے چائے وغیرہ نہیں لی۔ میں باہر ٹہلتا رہا۔ رڑکی میں مسلمان بھی کافی آباد ہیں۔ اتفاق سے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ پہلے پڑھا کرتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا آپ آج کل جن باتوں کی تبلیغ کر رہے ہیں ان سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے مزید تفصیل پوچھی تو انھوں نے اخبارات میں چھپنے والے بعض انٹرویو کا حوالہ دیا۔ میں نے کہا کہ رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اسلام کے خلاف ہے۔ اخباری انٹرویو کے متعلق معلوم ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ بات

کو بدل کر اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے میرے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لیے آپ کو الرسالہ کے مضامین کو بنیاد بنانا چاہیے۔ یا خود میرے لکھے ہوئے مضامین (signed articles) جو کسی اخبار یا میگزین میں چھپیں۔ وہ ایسا کوئی حوالہ نہ بتا سکے۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ تازہ آرگنائزر (۵ دسمبر ۱۹۹۲) میں میرا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس کی سرخی انھوں نے یہ قائم کی ہے کہ ——— ہندوازم ہی واحد روادار مذہب ہے :

Hinduism is the only tolerant faith.

حالانکہ میں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہندوازم اور اسلام دونوں میں یکساں طور پر مذہبی رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ جو فرق ہے وہ صرف ریشنیل میں ہے نہ کہ خود رواداری میں۔ ہندوازم تعدد حقیقت کی بنیاد پر رواداری کی تعلیم دیتا ہے، اور اسلام احترام انسانیت کی بنیاد پر۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندوازم میں رواداری کی بنیاد باہمی اعتراف (mutual recognition) پر قائم ہے اور اسلام میں رواداری کی بنیاد باہمی احترام (mutual respect) پر۔

ان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میں علماء کے اس مسلک پر ہوں جو انھوں نے "رجوع" کے بعد اختیار کیا، آپ لوگ علماء کے اس مسلک پر چلنا چاہتے ہیں جو انھوں نے رجوع سے پہلے اختیار کر رکھا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد پہلے ہمارے علماء نے اٹھائی تھی۔ وہ اس کو تشدد کے اصول پر چلاتے رہے۔ مولانا محمود حسن دیوبندی ساڑھے تین سال کی قید کے بعد ۱۹۲۰ میں مالٹا سے واپس آئے تو اس وقت مہاتما گاندھی عدم تشدد کے اصول پر آزادی کی تحریک شروع کر چکے تھے۔ مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے تمام علماء نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا۔ تقریباً ایک سو سال کے بعد انھوں نے متفقہ طور پر تشدد کے طریقہ کو چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔

۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں بھی یہی معاملہ ایک اور صورت میں پیش آیا۔ نئے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو تعصب اور زیادتی کی شکایت ہوئی۔ انھوں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں حقوق طلبی کی جدوجہد شروع کر دی۔ پچاس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ پُرشور جدوجہد بے پناہ قربانیوں کے باوجود ناکام رہی۔

اب سابقہ علماء کی طرح موجودہ علماء اور رہنماؤں کو بھی ایک رجوع کی ضرورت ہے۔ اب تک وہ اپنی تحریک مطالبۂ غیر کی بنیاد پر چلا رہے تھے۔ اب انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تحریک کو تعمیر خویش کی بنیاد پر چلائیں۔ جلسوں اور مظاہروں کی دھوم مچانے کے بجائے وہ صرف داخلی استحکام پر اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

رشی کیش سے دہلی تک دو تعلیم یافتہ ہندو میرے ساتھ تھے۔ سوامی وشومترا (۵۰ سال) اور پنڈت راجیو اگنی ہوتری (۲۵ سال) ان لوگوں سے مذہبی موضوعات پر مسلسل باتیں ہوتی رہیں۔

سوامی وشومترا ساوتھ انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے پوری گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اسلام پر بہت کم چیزیں پڑھی ہیں۔ بنگلور میں ایک مسلمان نے مجھ کو ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس کو میں نے پورا پڑھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میں متاثر تو نہیں ہوا۔ البتہ مجھ کو غصہ بہت آیا۔

یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "رسالہ دینیات" کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سوامی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر کئی صفحات میں اس پر انگریزی میں اپنا تبصرہ لکھ رکھا تھا۔ اس کو انھوں نے اپنے کپڑے کے بیگ سے نکالا۔ اور اس کے مختلف حصے مجھے بتانے شروع کیے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ اپنے مذہب کی بڑائی کو جانتے ہیں مگر وہ دوسروں کے مذہب کی بڑائی کو نہیں جانتے :

People know the greatness of their own religions, they don't know the greatness of other's religions.

میرے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ اسلام میں پرافٹ ہوتے ہیں اور ہندوازم میں رشی ہوتے ہیں۔ رشیوں کا درجہ پرافٹ سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پرافٹ کی مثال اس شخص کی ہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے ٹاور پر چڑھ کر سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر رشی ٹاور سے سمندر کو دیکھنے کے بعد خود سمندر میں اترے۔ انھوں نے اس کو چکھا اور اس کا تجربہ کیا (they tested and tasted it)

میں نے کہا کہ آپ مثال کی زبان استعمال نہ کریں بلکہ حقیقت کی زبان میں تقابل کریں۔ کیوں کہ نہ تو پیغمبر کسی لائٹ ہاؤس پر چڑھے اور نہ رشیوں نے کسی سمندر میں غوطہ لگایا۔ اس طرح کی مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ مثال کا طریقہ استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے :

Analogy is the weakest form of argument.

مگر وہ بدستور مثال کی زبان میں بولتے رہے۔ میں نے کہا، اچھا، اب اپنا دوسرا پوائنٹ بتایئے۔ انھوں نے کہا کہ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلام میں تو صرف ایک پیغمبر نے کہا جو کچھ کہا۔ مگر ویدوں کی خلائقی سیکڑوں رشیوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ویدک سسٹم میں ایک کے بعد ایک سیکڑوں رشیوں نے حقیقت کا تجربہ کیا۔ اس طرح اسلام شخص واحد کی معرفت پر بیس کرتا ہے جب کہ ویدک سسٹم انسانوں کے ایک مجموعہ کے عارفانہ تجربات پر بنی ہے۔

میں نے کہا کہ مسئلہ ایک کا اور کئی کا نہیں ہے بلکہ اصل بات کے استناد (authenticity) کا ہے۔ پیغمبر خدائی الہام کے حوالے سے بولتا ہے۔ اس لیے اس کا کلام مستند ریفرنس پر قائم ہوتا ہے۔ جب کہ رشی اور منی ذاتی تجربہ کے حوالے سے بولتے ہیں۔ اس قسم کے ذاتی تجربات کے سلسلہ میں اصل سوال اس کا استناد ثابت کرنے کا ہے، وہ آپ کس طرح ثابت کریں گے۔

اب سوامی جی نے دوبارہ مثالیں دینا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ رشیوں نے زبردست تپسیا کی۔ وہ دکھ جھیلنے (suffering) کے کورس سے گزرے۔ اس طرح انھوں نے سفرنگ کے راستہ سے معرفت حاصل کی۔ انھوں نے مثال دی کہ آپ کو کھانا بنانا ہے تو آپ یہ کریں گے کہ ایک برتن میں چاول، دال، پانی وغیرہ ڈال کر اس کو تیز آنچ پر پکائیں گے۔ اس طرح آگ پر پک کر وہ آپ کے کھانے کے قابل بن جائے گا۔ اسی طرح آدمی جب تلاش کی آگ میں جلتا ہے تو وہ گیان حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ سفرنگ اور دریافت میں کیا رشتہ ہے۔ آپ کو دونوں کے درمیان منطقی رشتہ بتانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی آپ کی بات ثابت شدہ قرار پائے گی۔ کیوں کہ مثال کسی ثابت شدہ بات کی مزید وضاحت میں کار آمد ہو سکتی ہے۔ مگر خود اصل بات کو ثابت کرنے کے لیے مثال قطعاً کار آمد نہیں۔

مگر یہ لوگ مثالوں کی زبان میں بولنے کے اتنے زیادہ عادی ہو چکے ہیں کہ وہ سائنٹفک یا منطقی زبان میں اپنی بات پیش کرنا جیسے جانتے ہی نہیں۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اچھا، اب اپنا اگلا پوائنٹ بتایئے۔

انھوں نے کہا کہ ویدک مذہب کی ایک عظیم خصوصیت اس کی لامحدود آزادی ہے۔ آپ آستک ہوں یا ناستک، آپ کنزرویٹو ہوں یا لبرل، آپ مورتی پوجا کو مانیں یا نہ مانیں۔ غرض جو بھی آپ کا

عقیدہ ہو، ہر حال میں آپ ہندوازم کے وسیع دائرہ میں شامل رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا نام فریڈم نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کی مذہبی انارکی ہے۔ گیان یا معرفت لازمی طور پر تعین چاہتے ہیں۔ اگر تعین نہ ہو تو گیان اور اگیان میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے گا۔ جس چیز کو آپ فریڈم کہہ رہے ہیں اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ حقیقت اعلیٰ کو ابھی تک دریافت ہی نہ کرسکے۔ سوامی جی نے دوبارہ اپنی بات کی تائید میں مثالیں پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مجھ کو پھر معافی مانگتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

آخر میں انھوں نے رسالۂ دینیات (انگریزی) سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا جو ان کے نزدیک ان کے نقطۂ نظر کے حق میں ایک حتمی دلیل تھا۔ یہ اقتباس کتاب کے اُردو اڈیشن میں "نبوت محمدی کا ثبوت" کے زیر عنوان دیکھا جا سکتا ہے۔

سوامی جی نے کہا کہ دیکھئے، یہاں مصنف خود کہہ رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام ایک اَن پڑھ آدمی تھے۔ وہ جس سماج میں پیدا ہوئے وہاں تعلیم اور تہذیب موجود نہ تھی۔ لوگ وحشیانہ کاموں میں مبتلا تھے۔ جہالت اور لاقانونیت عام تھی۔ پھر ایسے ماحول میں پیدا ہونے والا آدمی کس طرح کوئی اونچا گیان حاصل کرسکتا ہے۔ انھوں نے جوش کے ساتھ کہا کہ ذرا آپ دیکھئے، مصنف کے بیان میں کتنا بڑا تضاد (contradiction) ہے کہ جس آدمی کو وہ خود اَن پڑھ اور وحشی سماج کی پیداوار بتاتے ہیں اسی کو ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کا پرافٹ مان رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ مصنف نے مذکورہ باب میں جو بات کہی ہے وہ پیغمبر کے حق میں بطور استدلال ہے اور آپ اس کو اس معنی میں لے رہے ہیں کہ پیغمبر کی شخصیت کس طرح بنی۔ سوامی جی دوبارہ تھوڑی دیر تک انگریزی میں کچھ بات بولے۔ میں نے نرمی سے یاد دلایا کہ سوامی آپ کی یہ بات اصل بحث سے متعلق (relevant) نہیں ہے۔ آخر میں وہ کار کی سیٹ پر پیٹھ ٹیک کر سیدھے بیٹھ گئے اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: صبح کے وقت میں زیادہ بولنے کا عادی نہیں ہوں، آج صبح میں نے اسنان بھی نہیں کیا، اس لیے میرے سر میں ہلکا درد بھی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہوگئے۔

پنڈت راجیو اگنی ہوتری نے کہا کہ اسلام کی کوئی وشیش بات بتائیے۔ میں نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرو۔ اس کے بعد جو تمہارا دشمن ہے وہ بھی

تمہارا دوست بن جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی آپ کا امکانی دوست ہے۔ نفرت اور دشمنی یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ اوپر سے کوئی غیر انسان دکھائی دے رہا ہو تب بھی اندر سے وہ انسان ہی ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ پہلے زمانہ میں دھرم کا پرچار بہت کم تھا۔ اتنے ست سنگ نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی شانتی تھی۔ اب ہر طرف دھرم کا پرچار ہے۔ ہر جگہ ست سنگ کی دھوم ہے۔ مگر شانتی غائب ہے۔ یہ سوال میں نے کئی لوگوں سے کیا مگر ابھی تک مجھے اتر نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا اپنا خیال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے مَن میں ایک اتر ہے، اور وہ یہ کہ پہلے کہنی اور کرنی ایک تھی۔ اب کہنی اور کرنی میں مَت بھید ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آج مذہب کے نام پر بہت سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں مگر یہ ویسی ہی ہیں جیسے دوسری تجارتی سرگرمیاں۔ موجودہ زمانہ کے نئے حالات نے مذہب میں دنیوی انٹرسٹ کا پہلو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ آج مذہب میں پیسہ بھی ہے۔ لیڈری اور عہدہ بھی۔ عزت اور شہرت بھی ہے۔ دنیا کی سیر بھی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مذہب کے نام پر بھی وہی کچھ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے جس کو پہلے زیادہ تر دنیا کے نام پر حاصل کیا جاتا تھا۔

دہلی پہنچ کر ہماری گاڑی پہلے پرمارتھ نکیتن آشرم (گرین پارک) میں رکی۔ یہاں ڈاکٹر کے ایل سیشاگری راؤ عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ امریکہ کے ورجینیا یونی ورسٹی میں تقابلی مذہب کے پروفیسر ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان سے مفید ملاقات رہی۔ وہ اس سے پہلے میری کئی چیزیں پڑھتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تعجب انگیز خوشی (Pleasant surprise) کا احساس اس پر ہوتا ہے کہ آپ اتنی زیادہ ہوش مندی (sanity) کی بات کرتے ہیں اور پھر بھی آپ اتنے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ یہ آپ کو زمانہ کے لحاظ سے ایک استثنائی نعمت حاصل ہے۔

آج ہی کے ٹائمس آف انڈیا (، دسمبر) میں میرا ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا :

Time ripe to end Ayodhya dispute.

انھوں نے اس مضمون کو دیکھا اور میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ اس پر اور دوسرے موضوعات پر ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں سچا مذہبی آدمی وہ ہے جو سائنس داں ہو، اور سچا سائنس داں وہ ہے جو مذہبی ہو۔ انھوں نے کہا :

A saint cannot be a true saint, if he is not a scientist. A scientist cannot be a true scientist, if he is not a saint.

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے مزید کہا کہ جدید سائنس کی اپنی محدودیتیں ہیں۔کیوں کر وہ سائنٹفک طریقہ پر زندگی کے اندرونی حقائق کا پتہ نہیں لگا سکتی :

Modern science has its limitations as it does not pursue inner life with a scientific outlook.

ڈاکٹر سیشاگری راو ورجینیا یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہاں ان کو ۸۰ ہزار ڈالر سالانہ مل رہے تھے۔ مگر انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم کے لیے انھوں نے یونی ورسٹی کی سروس چھوڑ دی۔ اب وہ رضا کارانہ طور پر انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ یہ بات مجھے بعد کو سوامی چیدانند نے بتائی۔

۷ دسمبر کی سہ پہر کو میں دہلی پہنچا۔ یہاں آج ہی خودکشی کا ایک واقعہ ہوا تھا جس کو ایک صاحب نے مجھے بتایا (اس واقعہ کی تفصیل ٹائمس آف انڈیا ۸ دسمبر ۱۹۹۳ میں دیکھی جا سکتی ہے)

ڈاکٹر دھریندر کانت داس (Dhirendra Kanta Das) انڈین آرمی میں میجر جنرل کی پوزیشن پر تھے۔ وہ میڈیکل شعبہ (Armed Forces Medical Services) کے ڈائرکٹریٹ میں اڈیشنل ڈائرکٹر جنرل تھے۔ سینیریٹی کے اعتبار سے ان کو اب پروموشن ملنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ جاتے مگر ان کے نیچے کے ایک افسر ایس جی نیوگی نے حکومت سے پروموشن آرڈر حاصل کر لیا۔ وہ ان کو سپرسیڈ کر کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر داس اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ اپنے دھولا کنواں کے مکان میں باتھ روم کے اندر ایک رسی کے پھندے سے لٹک گئے اور اس طرح خودکشی کر لی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ سال تھی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ کو وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔

ڈاکٹر داس نہایت صحت مند تھے۔ ان کے دو بچوں میں سے ایک لڑکا ایم ڈی کر چکا تھا۔ وہ ریٹائر ہو کر دہلی میں ایک اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ مادی اعتبار سے ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے کیوں خودکشی کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پروموشن کے معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ایک خیالی بات ان کے لیے تمام حقیقی باتوں سے زیادہ اہم ہو گئی۔

وہ اتنا زیادہ نروس ہوئے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ کسی چیز کو وقار کا مسئلہ بنانا سراسر ہلاکت ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ آدمی پر لازم ہے کہ جو چیز جس درجہ کی ہے اس کو اسی درجہ میں رکھے۔ کسی چیز کو اس کے واقعی درجہ سے بڑھانے ہی کا یہ مہلک نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ چیز وقار کا سوال بن جاتی ہے۔ اگر چیزوں کو ان کے واقعی درجہ میں رکھا جائے تو کبھی وہ وقار کا سوال نہ بنے جو افراد اور قوموں کو خودکشی کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے۔

رشی کیش میں چند دن گزار کر میں دہلی واپس پہنچا تو خیال آیا کہ رشی کیش ہندستان کا روحانی مرکز ہے اور دہلی ہندستان کا سیاسی مرکز۔ رشی کیش میں ہر طرف روحانی سکون کا ماحول تھا، دہلی میں ہر طرف سیاسی اضطراب کا ماحول۔ ملک میں یہ دونوں دھارے اسی طرح الگ الگ بہہ رہے ہیں جس طرح پریاگ (الٰہ آباد) میں گنگا اور جمنا کا پانی الگ الگ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آج ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہ دونوں انسانی دھارے ایک دوسرے میں مل جائیں، روحانیت میں سیاسی آفاقیت پیدا کی جائے اور سیاست کو روحانی غسل دے دیا جائے۔ دو دھاروں کے اسی ملاپ میں ہندستان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

بنگلور کا سفر

لوک سوراج اندولن کی طرف سے بنگلور میں ۳۰ جنوری ۱۹۹۴ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع تھا ـــــــ ہندستانی قومیت کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے :

What constitutes Indian nationalism.

اس کے منتظمین کی دعوت پر بنگلور کا سفر ہوا۔ یہاں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۹ جنوری کی شام کو مجھے دہلی سے روانہ ہونا تھا۔ انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ اس دن دو گھنٹہ لیٹ تھی۔ تاہم ٹیلی فون نے ایئر پورٹ پر دو گھنٹہ تک بیٹھنے کی زحمت سے بچالیا۔ ایئر پورٹ کو ٹیلی فون کر کے پیشگی طور پر معلوم کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق کسی قدر تاخیر کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ کمیونی کیشن بھی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا خدا سے کیا تعلق، یہ تو جدید ٹکنالوجی کی دین ہے۔ میں نے کہا کہ جدید ٹکنالوجی نیچر کے امکانات کا استعمال ہے، اور نیچر کے ان امکانات کو پیدا کرنے والا وہی ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔

دہلی ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں زیادہ عمر کے ایک ہندو آئے۔ اور میرے قریب کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا صاحب، اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ پوچھئے۔

انھوں نے کہا کہ میں اچھی اردو جانتا ہوں۔ میں نے اسلام پر کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر ایک بات ایسی ہے جس کو میں نہیں سمجھ سکا۔ مسلمان بعض چیزوں پر بہت زیادہ بھڑکتے ہیں۔ اور بعض دوسری چیزیں ہوتی رہتی ہیں مگر ان پر وہ بالکل نہیں بھڑکتے۔

جیسے کہ شاہ بانو بیگم کا معاملہ ہے۔ وہ اس بات پر بہت زیادہ بھڑک اٹھے کہ کسی مطلقہ عورت کو اس کا سابق شوہر ماہانہ گزارہ دے۔ مگر اسی دیش میں مسلمان جوا کھیلتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ مار پیٹ کرتا ہے۔ بینک سے سود پر رقم لیتا ہے۔ چوری کرتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی شریعت کے خلاف چیزیں روزانہ مسلم سماج میں ہوتی ہیں۔ مگر ان کے خلاف مسلمان کبھی دھوم نہیں مچاتے۔ لیکن شاہ بانو بیگم نے اپنے پچھلے شوہر سے ۱۸۰ روپیہ ماہوار لیا تو سارے مسلمان اس پر بھڑک اٹھے۔

یہی بابری مسجد کے معاملہ میں ہوا۔ ۱۹۴۷ میں ہزاروں مسجدوں کی بے حرمتی ہوئی۔ وہ ڈھائی گئی۔ مگر مسلمان چپ رہے۔ مگر بابری مسجد پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا قرآن میں کہیں لکھا ہے کہ ساری شریعت معطل ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں مگر مطلقہ عورت اپنے پچھلے شوہر سے گزارہ نہ لینے پائے۔ چاہے دوسری ہزاروں مسجدوں کے ساتھ کچھ بھی، مگر بابری مسجد کے خلاف کچھ ہو تو اس کو برداشت نہ کرنا۔

میں نے کہا کہ قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی بات لکھی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈر جس اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں وہ یہی ہے۔ یہ مسلم لیڈروں کا اپنا گھڑا ہوا اسلام ہے نہ کہ خدا کا اتارا ہوا اسلام۔

شام کو نو بجے جہاز (IC 403) بنگلور کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں ہندی اخبار ساندھیہ ٹائمس (۲۹ جنوری) دیکھا۔ اس کے صفحہ اوّل کی سرخی تھی: دلّی کے ڈیلر کی تلاش۔ اندر کی ایک سرخی ان الفاظ میں تھی: وکیلوں سے بہتر برتاؤ کرو۔ ایک اور سرخی اس طرح تھی: دنیا میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

ہندی اخبار کی اس زبان کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد جب وقتی جوش کے تحت شدہ ہندی کا دور آیا تو بہت سے مسلمان یہ کہنے لگے کہ انڈیا سے اب اردو ختم ہو گئی۔ چالیس سالہ تجربہ کے بعد اب انھیں کہنا چاہئے کہ اسکرپٹ کے اعتبار سے تو ضرور یہاں فرق آیا ہے مگر جہاں تک اصل اردو زبان کا تعلق ہے وہ اب بھی پوری طرح باقی ہے۔ اس میں یہ بھی سبق ہے کہ تاریخی حقیقتوں کو پر جوش بیانات کے ذریعہ بدلنا ممکن نہیں۔

پانیر (۲۹ جنوری ۱۹۹۴) کے ضمیمہ میں ایک رپورٹ ہوائی سفروں کے بارہ میں تھی۔ اس کا عنوان تھا فضا میں مسکراہٹ (A smile in the sky) اس میں دکھایا گیا تھا کہ پچھلے دو سال میں جب کہ انڈیا میں پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں چلائی گئی ہیں، ہوائی سفر میں ایک انقلاب آ گیا ہے۔ انڈین ایئر لائنز کے مقابلہ میں پرائیویٹ ایئر کمپنیاں زیادہ بہتر سروس دے رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں مضمون نگار سومیتا پال نے مختلف ہوائی مسافروں سے ان کی رائے پوچھی۔ ایک مسافر (Agnihotri) نے کہا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے (nothing has changed)۔ ایک

اور مسافر (Kushlani) نے بتایا کہ ڈرامائی تبدیلی ہوئی ہے:

There's a dramatic change in attitude.

رایوں کا یہ فرق ہر معاملہ میں اور ہمیشہ پایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھنے کے کئی زاویے ہوتے ہیں۔ ایک ہی چیز یا شخصیت ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں کچھ نظر آتی ہے اور دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں وہ کچھ اور نظر آنے لگتی ہے۔

تقریباً ڈھائی گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد رات کو ساڑھے گیارہ بجے جہاز بنگلور میں اتر گیا۔ جناب سید تمیز الدین صاحب کے ہمراہ ان کی رہائش گاہ (ملر روڈ) آیا جہاں مجھ کو قیام کرنا تھا۔ تمیز الدین صاحب ایک صنعت کار ہیں۔ وہ صنعت کے دائرہ کی مختلف باتیں بتاتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ وہ کئی بار سنگاپور گئے ہیں۔ سنگاپور ایک بہت چھوٹا ملک ہے۔ اس کے پاس وسائل کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں تک کہ پانی بھی اس کو پڑوسی ملک ملیشیا سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سنگاپور آج اتنا ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے کہ وہ ہندستان کو دینے کی پوزیشن میں ہو گیا ہے۔ چنانچہ بنگلور میں سنگاپور کے تعاون سے انتہائی جدید قسم کا ایک ٹکنکل انفارمیشن سنٹر قائم ہوا ہے جس کا افتتاح ۲۶ جنوری کو کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ سنگاپور میں جرائم برائے نام ہیں۔ صفائی اور ڈسپلن کمال درجہ میں پایا جاتا ہے۔ پولیس اور انتظامیہ میں کرپشن کا وجود نہیں۔ ہر فرقہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی مکمل آزادی ہے۔

سیمینار کے منتظمین نے میرے قیام کا انتظام یہاں کے ایک ہوٹل آشرے انٹرنیشنل (Ashray International) میں کیا تھا۔ مگر میں وہاں نہیں ٹھہرا۔ ایرپورٹ سے سیدھا جناب تمیز الدین صاحب کی رہائش گاہ پر گیا۔ شروع سے آخر تک وہیں میرا قیام رہا۔

۳۰ جنوری کی صبح کو چڑیوں کی آواز کے ساتھ نیند کھلی۔ فجر کی نماز یہاں کی قدیم مسجد قادریہ (ملر روڈ) میں پڑھی۔ نہایت کشادہ اور خوبصورت مسجد ہے۔ ایک بہت بڑا احاطہ ہے جس میں مسجد اور عیدگاہ واقع ہیں۔ شہر کے وسط میں مسجد اور عیدگاہ کے لئے اتنا بڑا علاقہ آج حاصل کرنا ہو تو وہ تقریباً ناممکن ہوگا۔ اس سے حال کے لئے ماضی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

امام صاحب نے پہلی رکعت میں إنّ للمتقين مفازا (النبا ۳۱) پڑھی۔ میں نے سوچا کہ

مسجد صرف ایک رسمی عبادت کا مقام نہیں۔ وہ ایک انقلابی سبق کا مرکز ہے۔ جو لوگ اپنا دن اس طرح شروع کریں کہ انھوں نے صبح کی نماز سے یہ سبق لیا ہو کہ اس دنیا میں کامیابی ان لوگوں کے لئے ہے جن میں تقویٰ کی صفت ہو۔ ان کو آگے بڑھنے سے کوئی بھی چیز اس دنیا میں روکنے والی نہیں۔

تقویٰ زندگی کی ایک روش ہے۔ ایک صحابی کی تشریح کے مطابق، تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کانٹوں اور جھاڑیوں سے بچتا ہوا زندگی کا راستہ طے کرے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں احتیاط اور پرہیز کا اصول بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی اصول دنیا میں بھی کامیابی کا واحد راز ہے اور آخرت میں بھی کامیابی کا واحد راز۔

صبح کو انگریزی اور اردو کے کئی اخبار آگئے جن کا مطالعہ کرتا رہا۔ روزنامہ سالار (۳۰ جنوری) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سابق وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے سکھ مذہب میں واپسی کے لئے ۵۶ دن کی سزا قبول کرلی ہے جو انھیں سکھوں کے سب سے بڑے مذہبی ادارہ اکال تخت نے ۲۶ جنوری ۱۹۹۴ کو سنائی۔ بوٹا سنگھ آٹھ ہفتوں تک سکھوں کے بڑے بڑے گوردواروں میں جھاڑو دیں گے، برتن دھوئیں گے اور یاتریوں کے جوتے صاف کریں گے۔ ان کے گلے میں ایک تختی لٹکی رہے گی جس پر تنکھائیا (گناہ گار) لکھا ہوا ہوگا۔ بوٹا سنگھ کو یہ سزا اس لئے دی گئی کہ انھوں نے وزیر داخلہ کی حیثیت سے ۱۹۸۴ میں سورن مندر (امرتسر) میں آپریشن بلواسٹار کرایا۔ اس کے بعد انھیں سکھ برادری سے نکال دیا گیا تھا۔

مسٹر بوٹا سنگھ نے یہ فیصلہ کسی مادی یا فوجی دباؤ کے بغیر قبول کیا ہے۔ اسی کا نام اخلاقی ڈسپلن ہے۔ اخلاقی ڈسپلن کسی فرد یا قوم کے لئے، بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

بنگلور کو ۱۸۳۰ میں اہمیت حاصل ہوئی جب کہ وہ قدیم میسور اسٹیٹ کا انتظامی ہیڈ کوارٹر بنا۔ اب وہ کرناٹک کی ریاستی راجدھانی ہے۔ بنگلور چھٹا سب سے بڑا ہندستانی شہر سمجھا جاتا ہے۔ وہ سطح سمندر سے ۹۵۰ میٹر بلند ہے اور معتدل آب و ہوا کے لئے مشہور ہے۔ بنگلور میں تین بڑے تعلیمی ادارے ہیں: بنگلور یونیورسٹی، یونیورسٹی آف ایگریکلچرل سائنسز، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے اسکول قائم ہیں۔ بنگلور میں اعلیٰ

تعلیم یافتہ افراد کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

بنگلور میں ۲۵-۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو دلت لوگوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ان کی تنظیم (Council of Indigenous People) کی طرف سے کی گئی تھی۔ انھوں نے ایک متفقہ اسٹیٹمنٹ کے ذریعہ اعلان کیا کہ آرین لوگ سب کے سب بدیسی ہیں جو مغرب سے انڈیا میں آئے۔ انڈیا کے اصل باشندے (مول بھارتی) صرف وہ لوگ ہیں جن کو شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب اور بیکورڈ کلاس کہا جاتا ہے۔ دلت اور قبائلی لوگوں ہی نے وادی سندھ کی تہذیب بنائی۔ مسلمان، عیسائی، سکھ انھیں تینوں سے نکل کر اپنے موجودہ مذہب میں داخل ہوئے:

Dalits and Tribals built the Indus Valley Civilisation. Muslims/Christians/ Sikhs are the converts from the above three sections.

اس کانفرنس کے بارہ میں عام اخباروں میں کچھ نہیں چھپا۔ مذکورہ خبر میں نے بنگلور سے نکلنے والے انگریزی پندرہ روزہ دلت وائس (Dalit Voice) کے شمارہ ۱۶-۳۱ جنوری ۱۹۹۴ میں پڑھی۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا جس کا تعلق بنگلور سے ہے۔ اس کو مسٹر نانی پالکھی والا نے اپنی تازہ کتاب (We, the Nation) میں بیان کیا ہے۔ جون ۱۹۷۵ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلہ میں اندرا گاندھی کے پارلیمنٹ کے الکشن کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اندرا گاندھی نے فوری طور پر نانی پالکھی والا کو بلایا تاکہ عارضی خلاصی (interim relief) کے لئے اپنی اپیل سپریم کورٹ میں فائل کر سکیں۔

سپریم کورٹ میں کیس داخل کرنے کے بعد جب نانی پالکھی والا بمبئی واپس جا رہے تھے تو ۲۵ جون ۱۹۷۵ کو ہوائی جہاز میں ان کی ملاقات ایک کھدر پوش آدمی سے ہوئی جو ان کے پاس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ بنگلور کے گاندھی آشرم میں رہتا ہے۔ وہاں ایک غیب داں (clairvoyant) نے اس کو بتایا تھا کہ عدالت میں اپنا کیس ہارنے کے باوجود اندرا گاندھی دنیا کی سب سے طاقت ور عورت بن جائیں گی۔ تاہم یہ غیر معمولی طاقت

جو وہ حاصل کریں گی وہ مارچ ۱۹۷۷ میں ختم ہو جائے گی۔

نانی پالکھی والا لکھتے ہیں کہ میں بمبئی پہنچا تو اس گفت گو کے ۳۶ گھنٹہ بعد ۲۶ جون ۱۹۷۵ کو اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کر دیا۔ اور عملاً وہ انڈیا کی ڈکٹیٹر بن گئیں۔ اس کے بعد ٹھیک مذکورہ پیشن گوئی کے مطابق مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اندرا گاندھی کو شکست ہوئی اور ان کی سیاسی عظمت اچانک مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۷ کو نانی پالکھی والا کی ملاقات دہلی میں اندرا گاندھی سے ہوئی۔ انھوں نے اندرا گاندھی کو بنگلور کے آدمی کا مذکورہ قصہ سنایا اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اندرا گاندھی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو اتنا زیادہ غم زدہ حالت میں دیکھا:

She had tears in her eyes—the only time I saw her in such a sad mood.
(p.xix)

اندرا گاندھی ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ کو آنند بھون (الہ آباد) میں پیدا ہوئیں۔ ۶۰ سال تک انھوں نے انتہائی کامیاب زندگی گزاری۔ ان کو عیش و آرام سے لے کر شہرت اور اقتدار تک ہر چیز بھرپور طور پر حاصل ہوئی۔ مگر جب یہ چیزیں چھنیں تو ایک لمحہ میں لذت اور مسرت کی ساری کیفیات ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ ۶۰ سال تک اگر وہ پانے کی لذت میں سرشار تھیں تو اگلے ۶۰ سال وہ یادوں کی لذت میں سرشار رہتیں۔

عبد اللہ بری صاحب (۳۵ سال) بنگلور میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کے لئے بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ الرسالہ اور دوسری کتابوں کو پھیلانے کے علاوہ خود بھی وہ کئی نئے نئے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً الرسالہ کے کچھ مضامین کی فوٹو کاپی کر کے لوگوں میں تقسیم کرنا وغیرہ۔

ایک ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ ۶ دسمبر کا حادثہ مسلمانوں کے لئے چشم کشا ثابت ہوا ہے۔ اب وہ الرسالہ مشن کے زیادہ قریب آرہے ہیں۔ اب ان کی سمجھ میں وہ بات آنے لگی ہے جو الرسالہ میں ۲۵ سال سے پیش کی جا رہی تھی۔ اب وہ اس حقیقت کو سمجھ گئے ہیں کہ ٹکراؤ کا دروازہ اگرچہ ان کے لئے بند ہے مگر امن کا دروازہ ان کے لئے پوری طرح

کھلا ہوا ہے۔ یہ ایک امید افزا تبدیلی ہے۔ ان شاء اللہ اس کے مثبت نتائج مستقبل قریب میں نمایاں ہوں گے۔

یہاں کے ایک ۳۵ سالہ کرسچن نوجوان (R.D. Isaac) نے ۱۹۸۶ میں اسلام قبول کرلیا۔ اس وقت وہ دبئی میں مقیم تھے۔ وہ جس بلڈنگ میں تھے اس میں ایک پاکستانی بھی تھے۔ دونوں میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ملاقات کے دوران اکثر اسلام اور مسیحیت پر بھی گفتگو ہوتی۔ مذکورہ کرسچین محسوس کرنے لگے کہ ان کے پاس اپنے عقائد کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جب کہ ان کے مسلمان دوست کا جو عقیدہ ہے اس کے حق میں اس کے پاس پورا ثبوت موجود ہے۔ اس طرح وہ دھیرے دھیرے متاثر ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دبئی میں انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا موجودہ نام محمد عیسیٰ ہے۔

ایک بار مذکورہ کرسچین نوجوان نے پاکستانی مسلمان سے کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ مسلمان نے کہا کہ مسیح حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اب اگر آپ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں تو خدا کا رشتہ مریم سے کیا تھا۔ اس طرح کی باتوں سے کرسچین نوجوان کو دھکا لگا اور دھیرے دھیرے وہ بالکل بدل گئے۔

تعلیم یافتہ افراد کی مختلف مجلسوں میں اظہار خیال کا موقع ملا۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ انڈیا کے مسائل بہت گہرے ہیں، وہ سطحی یا وقتی تدبیروں سے حل ہونے والے نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں میں ایکتا اندولن کے نام سے ایک تحریک چلاؤں۔ اس کے ذریعہ سے ملک میں ایک ذہنی بیداری لانے کی کوشش کی جائے۔ اس تحریک کا پیغام ہو — ایک خدا ایک انسان، ایک قوم۔

اس قسم کی ایک تحریک آج وقت کی ضرورت ہے۔ اگر ان تین نکات پر مشتمل ایک طاقتور تحریک اٹھائی جائے تو مجھے یقین ہے کہ ملک میں بہت سے لوگ اس کی حمایت کریں گے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے صاحبزادہ جناب فاروق مودودی نے لکھا ہے کہ "ایک بار مولانا داؤد غزنوی مرحوم ہمارے والد سے ملنے کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے والد صاحب سے کہا کہ مولانا، آپ نے کام تو وہ کیا جو اپنے زمانہ میں ابن تیمیہ نے کیا تھا،

لیکن آپ اپنے بعد کے لئے کوئی ابن قیم پیدا نہ کرسکے۔ یہ سن کر والد صاحب مسکرائے اور بولے: میرا قیم وہاں سامنے بیٹھا ہے، جاکر زیارت فرما لیجئے (قیم سے مراد طفیل محمد صاحب تھے جو اس وقت قیم جماعت اسلامی تھے)

الرسالہ مشن کے بارے میں بھی بنگلور میں ایک صحافی نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ ان کو جو جواب میں نے دیا وہ مذکورہ جواب سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ مشن کسی فرد واحد کا شخصی مشن نہیں۔ یہ تو ایک عظیم تاریخی پراسس کا ایک جزء ہے۔ یہ تاریخی پراسس خود خدا کا جاری کیا ہوا ہے، اس لئے اس پراسس کو لازماً باقی رہنا ہے۔ اور جب وہ پراسس جاری رہتا ہے جس کا ایک حقیر جزء الرسالہ مشن ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے سیاق میں مذکورہ قسم کے سوال کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تاریخی پراسس ہے، اسلام کا احیاء نو اور مساکن عالم میں ادخال کلمۂ اسلام۔

ایک صاحب نے میرے اس مضمون کا حوالہ دیا جو "مسٹر نکسٹ کا عظیم رول" کے عنوان سے مختلف اخبارات میں چھپا تھا اور بعد کو الرسالہ اپریل ۱۹۹۴ میں شائع ہوا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے فرسٹ اور نکسٹ کی اس تقسیم کے لئے اسلام کا حوالہ دیا ہے۔ حالاں کہ اسلام کا اصول تو یہ ہے کہ سارے انسان برابر ہیں (إن العباد كلهم إخوة)

میں نے کہا کہ دو باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک ہے عزت و احترام، اور دوسرا ہے عملی بندوبست۔ جہاں تک عزت و احترام کا تعلق ہے، بلاشبہ تمام انسان بالکل مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر عملی بندوبست میں فرق کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس لئے مساوات کے باوجود گھر کے انتظام میں مرد کو عورت کے اوپر قوام بنایا گیا ہے۔ اسی لئے خلافت کے انتظام میں مہاجر کو امیر اور انصار کو وزیر کا درجہ دیا گیا۔ یہاں تک کہ حالات کے تقاضے کی وجہ سے اس سیاسی تقسیم پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت فاروق نے آخر عمر میں کہا کہ ہم نے انصار کو وزیر کا درجہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر ہم وہ درجہ بھی ان کو نہ دے سکے۔

اخلاقی حیثیت اور انسانی احترام کے اعتبار سے بلاشبہ تمام لوگ برابر ہیں۔ مگر عملی بندوبست یا اجتماعی انتظام میں کسی کو مسٹر فرسٹ اور کسی کو مسٹر نکسٹ بہر حال بننا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر

زندگی کا نظام چل نہیں سکتا، نہ اسلام میں اور نہ غیر اسلام میں۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ۱۹۷۶ میں الرسالہ کے ذریعہ یہ کوشش شروع کی گئی کہ حالات سے موافقت کر کے ہم کو اپنے احوال کو درست کرنا چاہئے۔ اس وقت یہ آواز مکمل طور پر اجنبی تھی۔ اس وقت ہر آدمی ایک ہی زبان بولتا جاتا تھا۔ اور وہ احتجاج اور ٹکراؤ کی زبان تھی۔ مگر الرسالہ کے طاقت ور پیغام نے فضا کو متاثر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب اللہ کے فضل سے ہر طرف نئی سوچ کا آغاز واضح طور پر نظر آرہا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۲ کو یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ نے لال قلعہ کے اسٹیج سے تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے مورے ٹوریم (Moratorium) کا اصول پیش کیا۔ یعنی باہمی جھگڑوں کو کچھ سال کے لئے بازو میں رکھ کر مثبت تعمیر کے لئے کام کرنا۔

اگست۔ ستمبر ۱۹۹۲ کے اولمپک (بارسلونا) میں ۶۴ ملکوں نے میڈل حاصل کئے۔ مگر ہندستان ۸۵ کروڑ کی آبادی والا ملک ہونے کے باوجود کوئی میڈل حاصل نہ کر سکا۔ اس کے بعد اسپورٹس منسٹر شریمتی ممتا بنرجی کا بیان ہندستان ٹائمس میں چھپا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ ہندستان کی ٹیم اب چار سال کی تیاری کے بعد ہی اولمپک میں حصہ لے گی۔ یہ وہی بات ہے جس کو الرسالہ میں "وقفۂ تعمیر" کے نام سے مسلسل تلقین کی جارہی ہے۔

۱۹۹۲ کا سال مسلمانوں کے لئے حد درجہ اشتعال انگیزی کا سال تھا۔ اجودھیا کا مسجد مندر کا جھگڑا اپنے شباب پر پہنچ گیا۔ ماضی کی روایات کے مطابق ہر طرف خون اور دنگا فساد کا منظر دکھائی دینا چاہئے تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے پہلی بار یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا طریقہ اختیار کریں گے۔

بنگلور کے ایک صاحب (ڈاکٹر عطاء اللہ خاں) نے ایک دو ورقہ انگریزی میں چھاپا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں قرآنی آیتوں کی رہنمائی میں ایک تحقیق کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کا دل جب دھڑکتا ہے تو وہ اللہ کی آواز نکالتا ہے جس کو میڈیکل سائنس نے غلط طور پر محض لب ڈب سمجھ لیا تھا:

Under the guidance of above holy Quranic verses, research was done only to find that every human heart produces the sounds: ALLAH, ALLAH which has been wrongly interpreted as LUB-DUB in medical science.

موصوف نے قرآن کی جو دس آیتیں نقل کی ہیں ان کا کوئی تعلق مذکورہ مسئلہ سے نہیں ہے، حتی کہ ان آیتوں میں "قلب" کا لفظ تک موجود نہیں۔ اسی طرح ایک صاحب نے رازداری کے ساتھ بتایا کہ ۷۸۶ کی نمبر پلیٹ والی کاروں کا سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ صد فی صد ایکسیڈنٹ پروف گنتی ہے۔

میں نے غور کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ یہ زوال یافتہ قوموں کا خاص مزاج ہے کہ وہ انوکھی باتوں کی طرف دوڑتی ہیں۔ فضائل کی پراسرار کہانیاں، بعید از قیاس انکشافات، کچھ الفاظ میں طلسماتی اثرات فرض کر لینا، خوش گمانیوں کی بنیاد پر خیالی قلعے بنانا، یہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ یہ عین وہی امانی ہیں جن میں یہود قدیم زمانہ میں مبتلا ہوئے تھے۔ یہود تو اب سائنسی تعلیم حاصل کر کے ان توہمات سے نکل آئے ہیں۔ البتہ موجودہ مسلمانوں نے اب مزید اضافہ کے ساتھ ان کی جگہ لے لی ہے۔

۳۰ جنوری کو ۲ بجے کیتھولک کلب (میوزیم روڈ) کے ہال میں سیمینار کی کارروائی ہوئی مقررین کے نام یہ تھے: جسٹس راما جوئس، ایم راما کرشنیا، مسٹر مدھوجیتا، اور راقم الحروف۔ ان خصوصی مقررین کے بعد حاضرین کو پانچ پانچ منٹ کا وقت دیا گیا۔ کئی لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذاتی طور پر میرا احساس یہ تھا کہ بہت کم لوگوں نے مقرر موضوع پر کوئی واضح رائے دی۔ زیادہ تر لوگوں نے غیر متعلق باتیں کہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے پرامن نیشنلسٹ موومنٹ کے ذریعہ آزادی حاصل کر لی۔ پھر اب یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ انڈیا زیر تعمیر قومیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے نگیٹو نیشنلزم کافی تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد پازیٹو نیشنلزم کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا کہ نیشنلزم کوئی نافذ کرنے کی چیز نہیں۔ نیشنلزم تاریخی اسباب کے تحت

وجود میں آنے والی چیز ہے۔ نیشنلزم کا ایک ضروری جز زبان ہے۔ دستور ہند میں متعین کیا گیا تھا کہ آزادی کے پندرہ سال بعد انڈیا میں انگریزی کو ختم کرکے ہندی رائج کردی جائے۔ مگر آج بھی انگریزی غالب ہے۔ حتی کہ انڈین نیشنلزم پر یہ سمینار بھی انگلش میں ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کوئی خود ساختہ نیشنلزم انڈیا پر نافذ نہیں کر سکتے۔ بلکہ تاریخی حالات کے مطابق اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔ نیشن ایک تاریخی پراسس ہے، اور وہ پراسس شروع ہو چکا ہے۔

میں نے کہا کہ نیشنلزم کے کچھ کامن اجزا ہیں اور کچھ نان کامن اجزا۔ مثلاً ملک کا سرحدی استحکام کامن کی فہرست میں آتا ہے۔ ہر ہندستانی کو یکساں طور پر اس کا احترام کرنا چاہئے۔ مگر شادی بیاہ کے رواج کا تعلق نان کامن سے ہے۔ اس اعتبار سے کامن سول کوڈ کو، یا نان کامن کو کامن میں داخل کرنے کے ہم معنی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو الگ الگ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہاں مطلوب سماج کی تعمیر کبھی ممکن نہ ہوگی۔

ہندستانی نیشنلزم کی تعمیر کا کام قومی آزادی کی تحریک کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح اس پر اب تقریباً سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ اس کے باوجود آج بھی اس موضوع پر مباحثہ جاری ہے۔ آج بھی ہماری حیثیت زیر تعمیر قومیت (nation-in-the-making) کی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۶ جنوری ۱۹۹۴ کو ہندستان ٹائمس نے ریپبلک ڈے پر جو ضمیمہ شائع کیا ہے، اس کے صفحہ اول پر اس موضوع پر لمبا مضمون شامل ہے جس کا عنوان ہے:

What makes India a nation.

ہمارا موجودہ 'پینل ڈسکشن' بھی خاص اسی موضوع پر ہے۔ چنانچہ اس کی جو تقسیم مقرر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندستانی قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں:

What constitutes Indian nationalism.

قومیت کی تشکیل میں اس تاخیر کا خاص سبب یہی ہے کہ کامن اور نان کامن کے مذکورہ فرق کو ملحوظ نہ رکھا جا سکا۔

بنگلور کا یہ سمینار لوک سوراج اندولن کے تحت کیا گیا تھا۔ یہ تنظیم ۱۹۸۶ سے کام کر رہی ہے۔ اس کے تعارفی پمفلٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم اپنی نسلوں کے

لئے زیادہ بہتر انڈیا چھوڑیں۔ انجام کا خیال چھوڑ کر ہمیں اس کے لئے کوشش کرنا چاہئے۔ آخر میں درج تھا کہ گوپال کرشن گوکھلے آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کی زندگی میں آزادی نہ آئی تو آپ کا کیا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کچھ لوگوں کو یہ سیکھنا ہے کہ انھیں ناکامیوں کے ذریعہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے کام کرنا ہے:

Some people must learn to serve a noble cause through failures.

بنگلور کے انگریزی روزنامہ دکن ہیرالڈ (۳۰ جنوری) کو پڑھتے ہوئے میں اس کے صفحہ ۳ پر پہنچا۔ اس میں ایک کالم آج شہر میں (in the city today) کے نام سے تھا۔ اس میں تقریباً چالیس اندراجات تھے۔ جنرل، کلچرل اور ریلیجس کے زیر عنوان بتایا گیا تھا کہ آج بنگلور میں کون کون سی میٹنگیں کس موضوع پر اور کس مقام پر ہونے والی ہیں۔ اس میں "لوک سوراج اندولن" کا دو پینل ڈسکشن بھی شامل تھا جس میں شرکت کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔

یہ تمام بڑے بڑے اخباروں کا عام کالم ہے۔ شہروں میں مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف موضوعات پر جو علمی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں، ان کی مختصر اطلاع ان کالموں میں روزانہ بلا اجرت چھاپی جاتی ہے۔ ہمارے لئے اس کالم کے دو خاص فائدے ہیں۔ اگر ہم خود اس قسم کا اجتماع کر رہے ہوں تو ہم اس کی خبر رسانی کے لئے اس کالم کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یا اس کے ذریعے دوسروں کے اجتماعات سے باخبر ہو سکتے ہیں تاکہ وہاں جا کر لوگوں سے ملیں اور اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور باشعور افراد کے لئے موجودہ زمانہ میں جو مواقع دعوت کھلے ہیں ان میں سے ایک بلاشبہ یہ بھی ہے۔

ایک صاحب نے کراچی کے اردو میگزین تکبیر کا شمارہ ۴ جنوری ۱۹۹۰ دکھایا۔ اس میں پاکستان کے ہندوؤں کے بارہ میں ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں نے تعلیم کے میدان میں اپنے دور رفتہ کو دوبارہ نئے پاکستان میں حاصل کر لیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ انھوں نے یہاں کے اداروں اور تحریکوں میں دامے درمے سخنے حصہ لے کر خود کو ہر قسم کی نفرت اور امتیازی برتاؤ سے محفوظ بنا لیا۔ دوسری طرف انھوں

نے انجنیرنگ اور میڈیکل تعلیم میں مسلمانوں سے زیادہ محنت کی۔ اس طرح انھوں نے سندھ میں اپنے عددی تناسب سے زیادہ فائدہ حاصل کرلیا (صفحہ ۷)

رپورٹر نے اس کو ہندو سازش سے تعبیر کیا تھا۔ اگر ان کے اندر مثبت ذہن ہوتا تو وہ اس واقعہ میں حکمت حیات کا سبق پالیتے۔ مگر اپنے منفی ذہن کی بنا پر وہ اس میں صرف نفرت حیات کی خوراک پاسکے ـــــ ہندستان اور پاکستان کے مسلم پریس کی یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی بنا پر یہ پریس مسلمانوں کے لئے کوئی تعمیری رول ادا کرنے میں سراسر ناکام رہا۔

مولانا سید کمال احمد صاحب ملٹری مسجد میں ۱۹۷۰ سے امام ہیں۔ برٹش دور سے یہاں کے امام کو گورنمنٹ آف انڈیا سے تنخواہ ملتی ہے۔ ۳۰ جنوری کی شام کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۴ سال کے اندر کبھی بھی مجھ کو کوئی ہدایت گورنمنٹ کی طرف سے نہیں آئی۔ کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ تم خطبہ میں یہ کہو یا وہ کہو۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ مسلم فوجیوں کو دین کی باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے خطبوں میں اختلافات سے ہٹ کر بات کرتا ہوں۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ ٹی وی رکھنا جائز ہے یا ناجائز۔ انھوں نے کہا کہ ٹی وی کو مسلمان بنا کر رکھو۔

۳۰ جنوری کی شام کو جناب تمیز الدین صاحب کے یہاں شام کی چائے پر ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان اس میں شریک ہوئے۔ مسٹر مدھو مہتا (بمبئی) دسمبر ۹۳ میں فلپائن گئے تھے۔ وہاں وہ تین ہفتہ رہے۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن نہایت خوبصورت اور پرامن دیش ہے۔ مگر وہاں عیسائی اور مسلمانوں کا جھگڑا چھڑ گیا۔ میرے زمانہ قیام میں وہاں ایک چرچ میں بم پھٹا۔ اس کے بعد مسجد میں بم پھٹا۔ کئی معصوم لوگ اس کے شکار ہوئے۔

فلپائن کے جنوبی علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس علاقہ میں کچھ جذباتی قسم کے مسلم نوجوانوں نے آزاد مسلم ریاست کی تحریک شروع کر دی۔ یہ سراسر ایک نادانی کا فعل تھا۔ حکومت نے اس کو شدت کے ساتھ دبانا شروع کیا۔ اب جلد ہی وہ مسلم دنیا میں جہاد کے ہم معنی ہوگیا۔ یہ تحریک اب ناکام ہو چکی ہے۔ تاہم مذکورہ قسم کے واقعات کے ذریعہ کچھ لوگ محض ذاتی مقاصد کی خاطر اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں اس کو بالکل غیر عقلی اور غیر

اسلامی فعل سمجھتا ہوں کہ جس ملک کے کسی علاقہ میں مسلمانوں کی علاقائی اکثریت ہو وہاں فوراً علیحدگی کی تحریک چلادی جائے۔ اس قسم کی تحریکوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو بدنام کیا ہے اور مسلمانوں کو بھی سخت نقصان پہنچایا ہے۔ آج کے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مسلم علیحدگی پسند جنگجوؤں نے فلپائن کی حکومت سے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا ہے۔ اس جنگ میں پچھلے ۲۴ سال کے دوران ۵۰ ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ مورو نیشنل لبریشن فرنٹ نے مسلمانوں کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط کئے۔ (سالار ۳۱ جنوری ۱۹۹۴)

۳۰ جنوری کے انڈین اکسپرس میں یہ خبر پڑھی کہ ایر انڈیا اور انڈین ایر لائنز کے بارہ میں ہماری حکومت نے ایک نیا آرڈی ننس جاری کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں کھلے آسمان کی پالیسی انڈیا میں پورے طور پر اختیار کر لی گئی ہے۔ اس خبر کا عنوان تھا:

Monopoly goes, open sky policy comes into force.

اس آرڈی ننس کے بعد ایر انڈیا اور انڈین ایر لائنز کی حیثیت سرکاری کارپوریشن کی نہیں رہی بلکہ عوامی کمپنی کی ہوگئی ہے۔ اب کوئی بھی شخص ان کے شیئر خرید سکتا ہے۔ گویا کہ اب اس بات کا دروازہ کھل گیا کہ دونوں سرکاری ادارے پرائیویٹ کمپنیوں کی طرح عام کمپنی بن کر رہ جائیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے انڈیا میں فضائی پرواز کا ادارہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا جس کو ٹاٹا نے قائم کیا تھا۔ آزادی کے بعد جو لوگ ملک کے سیاسی حکمراں بنے وہ سوشلسٹ افکار سے متاثر تھے۔ انھوں نے تمام اقتصادی اداروں کو سرکاری ملکیت میں لینا شروع کیا جس کا خوب صورت نام نیشنلائزیشن تھا۔ مگر ۴۵ سالہ تجربہ نے بتایا کہ نیشنلائزیشن کی پالیسی نے ملک کو تباہی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچایا۔ چنانچہ اب یہ پالیسی تیزی سے بدلی جا رہی ہے۔

نظریاتی خوش فہمی کے تحت ہر چیز کو بدلنے کا یہ ذہن موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں بھی شدت سے پایا جاتا ہے۔ مگر یہ جنون کے سوا اور کچھ نہیں۔ صحیح فطری طریقہ یہ ہے کہ مروجہ ڈھانچہ کو باقی رکھا جائے۔ ڈھانچہ کو توڑنے کے بجائے سارا زور اقدار (values) کو قائم کرنے پر صرف کیا جائے۔ اسی اصول پر چل کر موجودہ زمانہ میں سنگاپور، کوریا اور جاپان نے

بڑی بڑی ترقیاں حاصل کی ہیں۔ جب کہ ہندستان آج بھی 'ہنوز روز اول' کے مقام پر پڑا ہوا ہے۔ ایک مبصر نے اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا:

It was counter-productive to the overall development of civil aviation to keep protecting Indian Airlines and Air India from competition.

۳۰ نومبر کو جناب تمیز الدین صاحب کے مکان پر کچھ تعلیم یافتہ افراد اکٹھا ہوئے۔ ان سے دیر تک ملی مسائل پر گفت گو ہوئی۔ انجینیرنگ کے ایک طالب علم نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں الرسالہ کو جب میں پڑھتا ہوں تو اس سے میرے اندر دعوت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ مگر جب میں مسلمانوں کے دوسرے اخبار اور رسالہ کو پڑھتا ہوں تو میرے اندر عداوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ میں کنفیوز ہو جاتا ہوں کہ آخر اسلام یہ ہے یا وہ ہے۔

میں نے کہا کہ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ میں دوسری قوموں کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہوں اور عام مسلم اخبار اور رسالے دوسری قوموں کو حریف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ قومیں ہمارے لئے جہاد (یعنی جنگ) کا موضوع نہیں بلکہ صرف دعوت کا موضوع ہیں۔ دوسری قوموں کے بارہ میں ہمارا رویہ کیا ہو، اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔ اگر آپ مدعو کی حیثیت دیں تو ان کے بارہ میں آپ کے اندر خیر خواہی پیدا ہوگی اور اگر آپ ان کو حریف سمجھ لیں تو ان کے بارہ میں آپ کے اندر نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔

بنگلور میں ۳۰ جنوری کو مسلمانوں کا ایک سمینار تھا۔ اس کی رپورٹ مقامی اخبار سالار (۳۱ جنوری) میں اس دوسطری عنوان کے ساتھ چھپی: کرناٹک مسلم گریجویٹس ایسوسی ایشن کا فکرانگیز سمینار، کرناٹک تعلیمی ایکٹ کی اقلیتی اداروں پر راست ضرب۔

یہ سمینار دراصل ایک احتجاجی سمینار تھا۔ اس میں کہا گیا کہ کرناٹک تعلیمی ایکٹ ۱۹۸۳ دستور ہند میں اقلیتوں کو دیے گئے تحفظات پر ایک حملہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے تعلیمی اداروں میں حکومت کو مداخلت کا حق دیتا ہے۔ اس لئے مسلم تعلیمی اداروں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

یہی تحفظاتی سیاست مسلمانوں کے رہنما اور دانشور پچھلے پچاس سال سے پورے ملک میں چلا رہے ہیں۔ میں اس قسم کی سیاست کو بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ ۱۹۴۷ کے بعد بننے والے دستور میں مسلمانوں کو اقلیت کے نام پر واضح قانونی تحفظ دیا گیا۔ جب کہ امریکہ کی یہودی اقلیت کو کسی بھی قسم کا دستوری تحفظ حاصل نہیں۔ مگر پچھلے ۵۰ سال میں مسلمان خود اپنے اعلان کے مطابق صرف پیچھے کی صف میں چلے گئے۔ جب کہ اسی مدت میں امریکہ کی یہودی اقلیت نے وہاں صف اول میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لی۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلم لیڈروں نے تحفظ کے ذریعہ اپنی قوم کو سنبھالنا چاہا۔ جب کہ یہودی لیڈروں نے اپنی قوم کو چیلنج کے طوفان میں ڈال دیا۔ اور فطرت کا اصول اور تاریخ کا تجربہ دونوں بتاتے ہیں کہ تحفظ کے ماحول میں انسان کی ترقی رک جاتی ہے، جب کہ چیلنج کا ماحول انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے اور اس کو ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔

زمین پر انسانی زندگی کے بارہ میں قرآن کا بیان ہے کہ یہاں لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے (بعضکم لبعض عدو) اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وہ چیلنج کے ماحول میں زندگی گزاریں گے یہاں لوگوں کے درمیان مقابلہ آرائی ہوگی۔ اس دنیا کے خالق نے چیلنج اور مقابلہ آرائی کو اس کی ترقی کا زینہ بنایا ہے۔ مسلمانوں کے نادان رہنماؤں کو یہ خدائی زینہ پسند نہیں۔ وہ اس کے بجائے تحفظاتی زینہ کے ذریعہ مسلمانوں کو آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر انھیں جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں خدائی زینہ کے سوا کوئی اور زینہ نہیں۔ جو لوگ کسی خود ساختہ زینہ کے ذریعہ آگے بڑھنا چاہیں وہ یہاں صرف پچھلی سیٹ پر جگہ پائیں گے، اس کے سوا ان کا کوئی اور انجام نہیں۔

مقامی بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر ریش چندر ۱۱ر ۳۱ جنوری کی دوپہر کو میری قیام گاہ پر آئے۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے اور بنگلور کے اپنے کچھ ادارے دکھائے۔ ان کے ساتھ پہلے تو آر ایس ایس کے ادارہ (Rashtrotthana Parishad) میں گئے۔ یہ ایک تعمیری ادارہ ہے۔ اس کے ایک درجن شعبے ہیں۔ وہ ابتدائی اسکول چلاتے ہیں۔ انھوں نے فری میڈیکل سنٹر، بلڈ بینک، ٹیلرنگ ٹریننگ سنٹر اور اس قسم کے کئی رفاہی ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ ان کی چھ منزلہ بلڈنگ کی ایک منزل پر جدید طرز کی لائبریری قائم ہے۔ ان کے مختلف

شعبوں کو دیکھا اور ان کے ذمہ داروں سے باتیں کیں۔ مسٹر ریش چندر رانے کہا کہ آر ایس ایس کا مقصد دیش کے ہر طبقہ کو زندگی کے ہر شعبے میں اوپر اٹھانا ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ ایک اور بلڈنگ میں گئے۔ یہ آر ایس ایس کا اسٹیٹ ہیڈ کوارٹر ہے یہاں ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ کنٹرا ویکلی وکرم کے اڈیٹر (B.S.N. Mallya) نے سوال و جواب کی صورت میں تفصیلی انٹرویو لیا۔ بنگلور سے نکلنے والے ایک اور کنٹرا ہفت روزہ پنگوا (Pungava) کے اڈیٹر نے پرچہ کا ایک شمارہ دیا۔ اس میں انھوں نے میرا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا سے لے کر اس کا ترجمہ کنٹرا زبان میں شائع کیا تھا۔

دوپہر کا کھانا مجھے مسٹر عباس علی بوہرہ کے یہاں کھانا تھا۔ مگر مذکورہ اسٹیٹ ہیڈ کوارٹر کے لوگوں کے اصرار پر دن کا کھانا یہیں کھایا۔ ایک بڑے کمرہ میں ہم لوگ داخل ہوئے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی چٹائی پر ہر ایک کے لئے الگ تھال رکھی ہوئی تھی۔ اس تھال میں کھانا رکھا گیا۔ ہر چیز بالکل سادہ انداز میں تیار کی گئی۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے ایک صاحب نے سنسکرت کے کچھ اشلوک پڑھے۔ اس کا مطلب تھا: ہم لوگ ایک ساتھ جئیں۔ ایک ساتھ کھائیں۔ ایک ساتھ مل کر دیش کو بڑھائیں۔

ایک ملاقات میں بمبئی کے مسٹر اروند دیش پانڈے نے ایک مغربی مصنف پیٹر ڈرو کوز (Peter Drue Koz) کی کتاب کا ذکر کیا۔ وہ کمیونزم کے موضوع پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ کمیونزم کیوں فیل ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا ہے:

> "Communism as a system had its heroes but Marxism as a creed did not have any saints."

مقامی انگریزی روزنامہ دکن ہیرالڈ (۳۱ جنوری ۱۹۹۴) میں مارک ٹوین (Mark Twain) کا ایک قول نقل کیا گیا تھا کہ انسانی زندگی کا نصف اول صلاحیت بغیر مواقع پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا نصف آخر مواقع بغیر صلاحیت پر:

> The first half of life consists of the capacity to enjoy without the chance; the last half consists of the chance without the capacity.

اس کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اصل یہ ہے کہ مواقع تو ہمیشہ آدمی کے لئے موجود ہوتے

ہیں۔ مگر جوانی کی عمر میں آدمی زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ اپنے نصف اول کو ضائع کر دیتا ہے۔ زیادہ عمر کو پہنچ کر اس کے اندر سنجیدگی آتی ہے۔ مگر اب اس کی طاقتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری محنت کر سکے۔ اس طرح اپنی عمر کے دونوں حصوں کو وہ کھو دیتا ہے۔

مسٹر عباس علی بوہرہ بنگلور کے ایک نوجوان تاجر ہیں۔ انھوں نے اپنا طریقہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں ہر فرقہ کے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ ملنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ فرقہ وارانہ دوری ختم ہو۔ انھوں نے کہا کہ جب تک آپ دوسروں کو نہیں اپنائیں گے۔ دوسرا بھی آپ کو نہیں اپنائے گا۔

مہاتما گاندھی کے ایک عقیدت مند سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۳۰ میں مہاتما گاندھی کے ۲۰۰ میل لمبے سالٹ مارچ کے وقت وہ اسکول کے طالب علم تھے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ ہندستانی تہذیب خود یورپ کے لئے رہنما تہذیب بن سکتی ہے۔ ہم کو یورپی تہذیب سے مرعوب نہ ہو کر خود اپنی روایات پر انڈیا کی تعمیر نو کرنا چاہئے۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۶ میں لکھا تھا:

> India is in danger of losing her soul. She must be strong enough to resist it for her own sake and that of the world.

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ تک انڈیا کے واحد سب سے بڑے لیڈر بنے رہے۔ ان کے قتل کے بعد بھی ان کے تربیت یافتہ افراد مسلسل انڈیا کی قسمت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے تقریباً ۷۰ سال تک انڈیا کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر گاندھی کی مکمل حکمرانی قائم رہی۔ ایسی حالت میں کیوں ایسا ہے کہ انڈیا آج بھی اپنی روح کو کھونے کے خطرہ سے دوچار ہے۔ وہ غالب تہذیب کے بجائے مغلوب تہذیب بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ گاندھی کیا چاہتے تھے۔ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ گاندھی جو کچھ چاہتے تھے، اس کو وہ ساری کوشش کے باوجود کیوں بالفعل واقعہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

یہاں میری ملاقات مسٹر رام اوتار گپتا سے ہوئی۔ وہ نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ بنگلور اور بمبئی میں ان کا بڑا کاروبار ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ انڈیا کی قومی ترقی میں خاص رکاوٹ آپ کے نزدیک کیا ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: خود غرضی۔ اسی طرح ایک اور صنعت کار سے میں نے پوچھا کہ سنگاپور اور جاپان جیسے ملک اتنی ترقی کر گئے جن کے وسائل بہت زیادہ محدود ہیں۔ انڈیا کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود ہیں مگر وہ ترقی نہ کر سکا۔ اس کا خاص سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیورو کریسی۔

دونوں جواب کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ کیوں کہ وہ برائی جس کو بیورو کریسی کہا جاتا ہے وہ بھی اسی خود غرضانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو ذاتی مفاد کے جذبہ سے اوپر اٹھایا جائے کیونکہ یہ دراصل بڑھی ہوئی مفاد پرستی ہی ہے جس نے ہندستان کی ترقی کو روک رکھا ہے۔

نسرین سید (اہلیہ جناب تمیز الدین صاحب) اردو کے علاوہ عربی، انگریزی اور فرنچ بھی بخوبی جانتی ہیں۔ ان کے ماموں کا انٹرنیشنل بزنس ہے، اس بزنس میں وہ ان کی ایشیائی نمائندہ ہیں۔ وہ مارکٹنگ کا خاص تجربہ رکھتی ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ کامیاب مارکٹنگ کا خاص راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اپ ڈیٹ ٹکنالوجی:

> Marketing a product basically requires updated technology, worldwide competitive price, versatility on a wide range of usages plus a service back up along with a guidance of installation procedures.

۳۱ جنوری کی شام کو جناب تمیز الدین صاحب کے ساتھ ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں مختلف اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت عائشہ کے ساتھ پوری عالم انسانیت کے لئے عظیم رحمت تھا۔ عائشہ نہایت ذہین تھیں۔ ان کے اندر اخذ کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ رسول اللہ کے ساتھ رات دن اور سفر اور حضر میں موجود رہیں۔ انھوں نے نہایت گہرائی کے ساتھ آپ کو دیکھا اور طریقۂ رسول کے بارہ میں ایسی قیمتی باتیں بتائیں جو کسی اور صحابی سے بہت کم ملتی ہیں۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ کو جب بھی دو میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے تھے۔ (ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما) اس دنیا میں آدمی کے لئے ہر معاملہ میں دو صورت ہوتی ہے۔ ایک آسان تر انتخاب (easier option) اور دوسرا مشکل تر انتخاب (harder option) عائشہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ آسان تر کا انتخاب فرماتے تھے۔ یہ بڑی زبردست حکمت کی بات ہے۔ کیونکہ آسان تر کا انتخاب کرتے ہی فی الفور آپ کو اپنے عمل کے لئے نقطۂ آغاز مل جاتا ہے۔ جبکہ مشکل تر کا انتخاب کرنے کی صورت میں آپ کو اپنے عمل کے لئے کوئی نقطۂ آغاز نہیں ملتا۔

بنگلور سے دہلی کے لئے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۰۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ بنگلور جاتے ہوئے جہاز دو گھنٹہ لیٹ تھا۔ مگر واپسی میں جہاز اپنے وقت پر روانہ ہوا۔ اور جہاز جب روانگی کے مقام سے ٹھیک وقت پر روانہ ہو تو وہ منزل پر بھی ٹھیک وقت پر پہنچتا ہے کیوں کہ راستہ میں اس کو وہ رکاوٹیں پیش نہیں آتیں جو سڑک کے سفر میں کسی سواری کو پیش آتی ہیں۔

راستہ میں دکن ہیرالڈ (۳۱ جنوری) کا ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ ۲۱ ویں صدی میں داخلہ (Stepping into the 21st century) عنوان کافی جاذب تھا۔ مگر اس کے اندر کوئی قابل ذکر بات نہیں ملی۔ موجودہ زمانہ کی صحافت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاندار سرخی کے تحت غیر شاندار مضمون۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاندار سرخی قائم کرنے کے لئے تو صرف زبان دانی کافی ہے۔ جب کہ شاندار مضمون لکھنے کے لئے کافی محنت کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ دوسری چیز بلاشبہ ہماری قومی زندگی میں سب سے زیادہ کم یاب ہے۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۴ کی شام کو ساڑھے نو بجے جہاز دہلی ایئرپورٹ پر اتر گیا۔

ناگپور کا سفر

بھارتیہ مزدور سنگھ کی دعوت پر ناگپور کا سفر ہوا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۹۴ کو دہلی سے ناگپور گیا۔ اور ۱۸ اپریل کو دہلی واپسی ہوئی۔

۱۵ اپریل کو ساڑھے دس بجے ایرپورٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ مسٹر جگدیش جوشی میرے ساتھ تھے۔ دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے قدیم تاریخ کے اوراق ذہن میں گھومنے لگے۔ معلوم تاریخ کے مطابق، دہلی کو تومار راجپوتوں نے ۷۳۶ء میں آباد کیا اور اس کا نام دھلیکا رکھا۔ بعد کو وہ دہلی بن گیا۔

یہ وہی سن ہے جب کہ زید بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کوفہ میں اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج کرنے کے لیے بیعت لے رہے تھے۔ ابتداءً اہل کوفہ کی ایک تعداد نے بیعت کی اور آخر میں بیشتر لوگ بیعت توڑ کر الگ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی زید بن علی کے حامیوں میں سے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کو امام ابوحنیفہ کی اجتہادی غلطی قرار دیا جائے گا، کیونکہ واضح طور پر وہ احادیث اور اجماعِ امت کے خلاف تھا۔ اور اگر اس کو شرعی اعتبار سے اجتہادی غلطی نہ مانا جائے تو سیاسی اعتبار سے اس کو اندازہ کی غلطی کہنا پڑے گا۔ کیونکہ اس وقت کے حالات میں یہ بالکل یقینی تھا کہ زید بن علی کا فوجی اقدام صرف امت کے نقصان میں اضافہ کا سبب بنے گا۔ نتیجہ کے اعتبار سے وہ الٹا (counter productive) ثابت ہو گا۔

زید بن علی سیاسی امور کی مہارت نہیں رکھتے تھے۔ مگر وہ ایک باکمال عالم تھے۔ ان کے بارہ میں امام ابوحنیفہ کا قول ہے: ما رأيت في زمانه افقه منه ولا اسرع جوابا ولا ابين قولا (الاعلام ۳/۵۹)

۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ محمد غوری کے فوجی سردار قطب الدین ایبک نے تیرھویں صدی میں قطب مینار بنایا جو اب تک قائم ہے۔ ۱۳۰۴ء میں علاؤ الدین خلجی کا دور شروع ہوا۔ غیاث الدین بلبن نے ۱۳۲۰ء میں تغلق آباد کا علاقہ بسایا۔

ایرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے ہم لودی روڈ سے گزرے۔ یہاں وسیع لودی گارڈن ہے جو دہلی پر لودی خاندان کی حکومت (۱۴۵۱-۱۵۲۶) کی یاد دلاتا ہے۔

آگے بڑھے تو مقبرہ صفدر جنگ تھا۔ اس وسیع مقبرہ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی شامل ہے۔ صفدر جنگ کا تعلق اٹھارویں صدی کی دہلی سے ہے۔ وہ احمد شاہ کا وزیر تھا۔ احمد شاہ نے ۱۷۴۸ سے ۱۷۵۴ تک حکومت کی۔ احمد شاہ اور صفدر جنگ دونوں اوسط درجہ کے آدمی تھے۔ ان کا کوئی کارنامہ تاریخ میں درج نہیں۔

دہلی کی حکومتوں میں سب سے لمبا دور مغل سلطنت کا ہے۔ وہ سولھویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا، اور اٹھارویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ مسلم حکمرانوں نے کبھی بھی دوسرے مذاہب پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا۔ تاہم فطری عمل کے تحت اس زمانہ میں ایسا ہوا کہ اسلام کے گہرے اثرات ہندو مذہب پر پڑے، مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے قدرتی نتیجہ کے طور پر مقامی مذہب متاثر ہوا اور اس میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں:

The phase of Indian history marked by the domination of the Muslims in most of northern India saw great changes in Indian religion. (8/914)

مغل بادشاہوں میں اکبر کافی بدنام ہے۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی نے اکبر کے مثبت رول کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی جو اسلام کے عمومی تعارف کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اکبر کا مقصد اسی مانع حالت کو ختم کرنا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے:

"بادشاہانِ اسلام نے اولاً اس طرف توجہ ہی نہیں کی، بلکہ وہ تمام باتوں کا قوت سے مقابلہ کرتے رہے، مگر شاہانِ مغلیہ کو ضرور اس طرف التفات ہوا، خصوصاً اکبر نے اس خیال اور اس عقیدہ کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا، اور اگر اس کے جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی، اور اسلام کے دلدادہ آج ہندستان میں اکثریت میں ہوتے، اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا، بلکہ عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا" (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

Mughal Family Tree

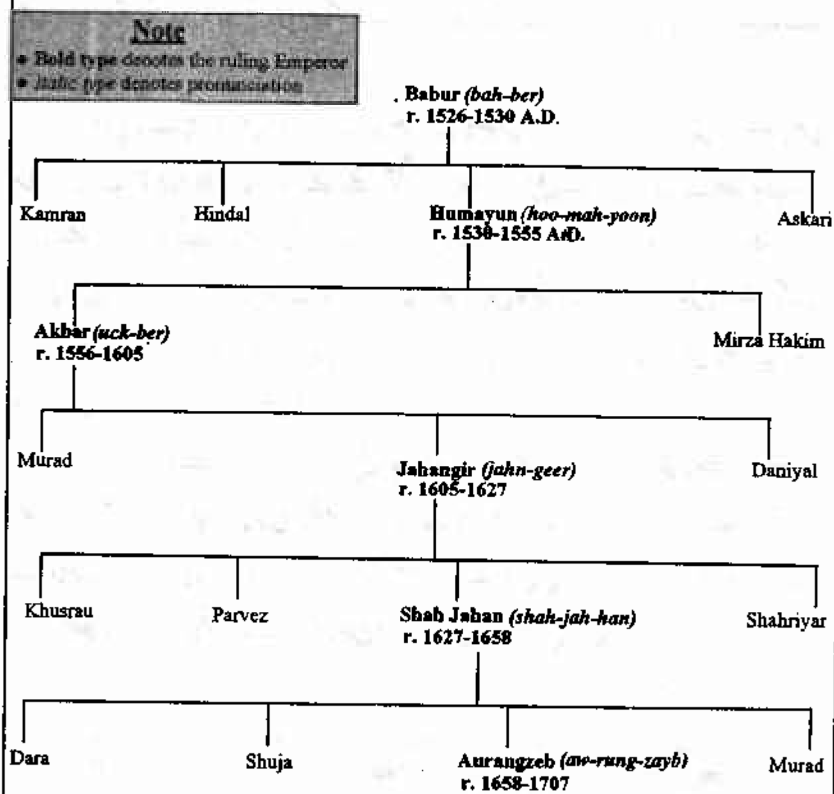

After Aurangzeb, the Mughal Empire declined through a string of numerous Emperors not listed here. One reason for the decline was increasing British influence and power over India. In 1858, the British Crown deposed the last Mughal Emperor, *Bahadur Shah Zafar*, and took direct control of India. Much Indian territory was already under British control at the time, and the Emperor had nominal powers only. The Emperors listed in this "family tree" represent the "Golden Years" of the Mughal Empire.

* During Humayun's reign, he was challenged by many people who wanted control of the Empire. One such individual was *Sher Shah*, who actually defeated Humayun and claimed control of the Empire from 1540-1545. Upon Sher Shah's death, his son, *Islam Shah*, ascended the throne, but was plagued by rival forces who wanted to control the Empire. In 1555, Humayun reclaimed the Empire which his father had established.

راستہ میں مسٹر جگدیش جوشی سے ملکی حالات پر باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ آجکل ہمارے دیش میں جو برائیاں ہیں ان کا اصل سبب سیاست داں ہیں۔ انھوں نے کہا: "پہلے راج نیتی میں جو لوگ آتے تھے وہ دیش کی سیوا کرنے کے لیے آتے تھے، اب وہ کیول پیسہ کمانے کے لیے آتے ہیں"۔

ایرپورٹ میں داخل ہوا تو ایک جگہ سگریٹ کا گھومتا ہوا شاندار اشتہار تھا۔ اس میں بہادری کے مختلف مناظر دکھائے گئے تھے۔ مثلاً گھوڑ سواری، کھیل کے میدان میں کھلاڑیوں کے کارنامے۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ ایک ولولہ دریافت کرو: discover a passion

جوش اور ولولہ کے واقعات بجائے خود درست تھے مگر ان کو سگریٹ نوشی سے جوڑنا بلاشبہہ ایک فرضی بات تھی۔ دو غیر متعلق باتوں کو جوڑ کر اپنی خواہش کا نتیجہ نکالنا موجودہ دنیا میں عام ہے۔ سیکولر دائرہ میں بھی اور مذہبی دائرہ میں بھی۔

روانگی سے پہلے مسٹر ٹھینگڑی نے اپنی ایک کتاب دی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ متشدد مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کسی طرح کی قوم پرستی کی اجازت نہیں دیتا۔ اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نیشنلزم کے خلاف لڑیں۔ مگر نام نہاد مسلم ملکوں میں نیشنلسٹوں نے کامیابی کے ساتھ اس برائی کا مقابلہ کیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تعلیمات پوری طرح حب الوطنی کے موافق ہیں:

> Fanatical Muslims assert that Islam does not permit of any kind of nation-worship and that Muslims must fight against nationalism. But nationalist in the so-called Muslim countries successfully combated this evil. The original tenets of Islam are quite compatible with the spirit of patriotism. (132-33)

موجودہ زمانہ میں نا اہل مسلم رہنماؤں نے نیشنلزم اور حب الوطنی کے خلاف اتنا زیادہ غوغا برپا کیا کہ اب وہ مسلمانوں کی نفسیات کا جزء بن گیا ہے۔ اس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ موجودہ نیشنلزم اور حب الوطنی سے مسلمانوں کا تشخص مٹ جائے گا، وہ ایک مستقل ملت کی حیثیت سے اپنا وجود ختم کر دیں گے۔ مگر یہ خطرہ صرف بے شعوری کی پیداوار تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے نتیجہ میں مسلمان علٰحدگی پسندی کا شکار ہو جائیں گے۔ اور پھر ایک طرف ان کی دنیوی ترقی رک جائے گی اور دوسری طرف دعوت کے عمل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عملاً یہی پیش آیا۔

آج ۱۵ اپریل کو دہلی ایرپورٹ پر ایک عجیب ہوائی حادثہ پیش آیا۔ ایر انڈیا کا ایک جہاز دہلی سے پیرس کے لیے روانہ ہوا۔ اس پر ۲۷۱ آدمی سوار تھے۔ مگر اوپر اٹھتے ہی وہ چڑیوں سے ٹکرا گیا۔ کیونکہ اس کو ایر ٹریفک کنٹرول سے بلند پرواز چڑیوں (high bird movement) کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اس ٹکراؤ سے جہاز کے ایک انجن میں آگ لگ گئی۔ پائلٹ نے بیشتر پٹرول باہر گرادیا اور دوبارہ دہلی ایرپورٹ پر اتر آیا۔

ایک اخباری رپورٹر بچنے والے مسافروں سے ملا۔ ایک مسافر نے کہا کہ جیسے ہی جہاز اُڑا میں نے جہاز کے باہر اس کے پنکھ کے پاس دھواں دیکھا۔ میں فوراً کھڑا ہوگیا اور چلانا شروع کیا کہ روکو، روکو، یہاں آگ ہے۔ ایک خاتون جو میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں انھوں نے مجھے یاد دلایا کہ یہ بس نہیں ہے بلکہ ہوائی جہاز ہے۔ مسٹر سیٹھی نے ہنستے ہوئے یہ بات بتائی:

> Soon after taking off, we saw smoke outside the plane near the wing. I stood up spontaneously and started crying, 'Stop, stop, there is a fire!' The lady sitting next to me reminded it was not a bus but a plane.

بس کو درمیان میں روکنا ممکن ہے، مگر ہوائی جہاز کو اس طرح درمیان میں روکنا ممکن نہیں۔ جہاز کے معاملہ میں ایسی غلطی کرنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ مگر ایک اور معاملہ میں ایسی غلطی کرنے والے

A-I flight No 149 which made an emergency landing at IGI Airport after a bird-hit

بے شمار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوموں کے جہاز کو چلانے کے لیے اٹھتے ہیں۔ وہ نادانی کے جوش میں قوم کے جہاز کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ ایک مدت کے بعد جب نتائج بتاتے ہیں کہ انھوں نے غلط رخ پر قوم کو دوڑا دیا تھا تو کہتے ہیں کہ روکو روکو۔ حالاں کہ درمیان میں رکنا قوم کے لیے تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دہلی سے انڈین لائنز کی فلائٹ ۴۶۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک ہندی اور ایک انگریزی اخبار دیکھا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اپریل) کے صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ امریکہ نے خود اپنے ہیلی کاپٹر مار گرائے :

US downs own copters

۱۴ اپریل کو امریکہ کے دو جہاز (mission of mercy) عراق کے کرد علاقہ پر پرواز کر رہے تھے۔ وہ کردوں کی مدد کے لیے گئے تھے۔ مگر امریکہ کے جنگی جہاز (F-16) کے عملہ نے یہ سمجھا کہ یہ عراق کے جہاز ہیں جو ممنوع علاقہ (no fly zone) پر اڑ رہے ہیں۔ انھوں نے فائر کر کے خود اپنے دو ہیلی کاپٹر مار کر گرا دیے۔ اس حادثہ میں ۲۶ آدمی ہلاک ہو گئے۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے اس پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے دوسروں کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی :

They lost their lives while trying to save the lives of others.

یہ واقعہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ انسان کا علم کتنا زیادہ ناقص اور کتنا زیادہ محدود ہے۔

۱۵ اپریل کو ۲ بجے دن میں ہمارا جہاز ناگپور ایرپورٹ پر اتر گیا۔ یہاں لوگوں نے آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ ان کی طرف سے کئی افراد ایرپورٹ پر آئے تھے۔ مگر میں جناب محمد حنیف صاحب اور جناب عبدالسلام اکبانی صاحب کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شام کو چار بجے ہم لوگ ملاقات کے لیے نکلے۔

سب سے پہلے ہم آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر (ریشم باغ) گئے۔ یہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ بھگت جی آر ایس ایس کے پرانے آدمی ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر ہیڈگیوار (بانی آر ایس ایس) کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نوجوانی کی عمر میں پرجوش انقلابی

تھے۔ انھوں نے ایک بار سرنگ لگاکر ایک سرکاری عمارت سے یونین جیک اتار دیا تھا۔ وہ کانگرس کے ایکٹو ممبر تھے۔

پھر ان کی سمجھ میں آیا کہ موجودہ حالت میں اگر ہم آزادی حاصل بھی کرلیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پہلا کام ہمیں کیرکٹر بلڈنگ کا کرنا ہے۔ قوم کے افراد میں اگر کیرکٹر آجائے تو وہ آزادی کا صحیح استعمال کریں گے اور پھر آزادی پوری طرح بامعنی ہوجائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے کیرکٹر بلڈنگ کے اسی نظریہ کے تحت آر ایس ایس قائم کی۔

یہی بات مسٹر گادرے نے اس سے پہلے مجھ کو بتائی تھی۔ مسٹر گادرے (۸۰ سال) دہلی میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانی کی عمر ہی میں آر ایس ایس کی تنظیم سے وابستہ ہوگیا تھا، اس وقت میں پونہ میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز ڈاکٹر ہیڈگواڑ ہمارے اسکول میں آئے۔ آر ایس ایس سے متعلق نوجوان جمع ہوئے تو انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پونہ کی سڑک پر اگر ایک مسلمان عورت تانگہ پر نکلتی ہے۔ اور ایک ہندو لڑکا مسلمان عورت کو چھیڑتا ہے۔ اس وقت آپ کیا کریں گے۔ پھر انھوں نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت آپ کی یہ لاٹھی ہندو لڑکے کے اوپر پڑے گی۔ یہی آر ایس ایس کی تعلیم ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہیڈگواڑ بھون جانا ہوا۔ یہ آر ایس ایس کا قدیم مرکز ہے۔ یہاں آر ایس ایس کی تاریخ سے تعلق رکھنے والی بہت سی یادگاری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کو تفصیل سے دیکھا اور کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

اسی بلڈنگ کے ایک حصہ میں بالا صاحب دیورس مقیم تھے۔ چنانچہ ہم لوگ ان سے ملاقات کے لیے ان کے خاص کمرہ میں گئے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے دونوں پاؤں سامنے رکھے ہوئے ایک چھوٹے اسٹول پر پھیلائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ فالج کی وجہ سے ان کا ایک ہاتھ اور پاؤں بے کار ہوگیا ہے۔ وہ بول بھی نہیں سکتے۔ سائیں سائیں جیسی آواز میں تھوڑا تھوڑا بولتے ہیں۔ اپنا کان ان کے منہ کے قریب لے جاکر سننا پڑتا ہے۔ مفلوج ہونے کے بعد اس معذوری کی بنا پر انھوں نے آر ایس ایس کے سرسنچالک کا عہدہ چھوڑ دیا اور اپنی جگہ پر پروفیسر راجندر سنگھ کو سرسنچالک نامزد کردیا۔

کسی اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ آر ایس ایس کے چیف کی اس تبدیلی میں سیاست کارفرما ہے۔ اس نے اسے یو پی اور دوسری ریاستوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی انتخابی شکست سے جوڑا تھا۔ مگر بالا صاحب دیورس کو دیکھنے کے بعد مجھے یہ بات بالکل بے بنیاد معلوم ہوئی۔ انھوں نے آر ایس ایس کے چیف کا عہدہ معذوری کی بنا پر چھوڑا ہے نہ کہ کسی سیاست کی بنا پر —— اخبارات بھی کیسی عجیب عجیب غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا کر دیتے ہیں۔

واپسی میں ہم لوگ جناب محمد حنیف صاحب کے دفتر میں گئے۔ یہاں کئی ہندو اور سکھ جمع ہوگئے۔ ان میں سے ایک انبالہ کے پروفیسر سکھ نندن سنگھ تھے۔ محمد حنیف صاحب کی میز پر محمد عمر چھاپرا کی کتاب رکھی ہوئی تھی جو اسلامک فاؤنڈیشن لندن سے چھپی ہے:

Towards a Just Monetary System

سکھ نندن سنگھ معاشیات کے استاد ہیں۔ انھیں اس کے نام سے دل چسپی ہوئی اور کتاب اٹھا کر اس کو دیکھنے لگے۔ کچھ صفحات پڑھ کر ان کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ یہ کتنی دل کش ہے:

It's so fascinating.

ناگپور میں آر ایس ایس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ تنظیم ۱۹۲۵ میں قائم ہوئی۔ ڈاکٹر ہیڈ گوار اس کے بانی صدر تھے۔ ۱۹۴۰ میں ڈاکٹر ہیڈ گوار کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد گورو گولوالکر اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ میں گورو گولوالکر کے انتقال پر بالا صاحب دیورس اس کے صدر بنائے گئے۔ بالا صاحب دیورس جن کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے، انھوں نے ۱۹۹۴ میں صدارت سے استعفا دے دیا۔ اب پروفیسر راجندر سنگھ (رجو بھیا) آر ایس ایس کے صدر مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ صدر کو سرسنچالک کہتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے ترجمان "دعوت" نے شکایت کی تھی کہ آر ایس ایس ایک نیم فوجی تنظیم ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو جماعت اسلامی کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ جماعت اسلامی کا نظریہ بزور نظام باطل کو ختم کرنا ہے۔ اس اعتبار سے جماعت اسلامی خود بھی عسکری نظریہ پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے، اس کے افراد فوراً عملی عسکریت کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ انتہا پسندی فطرت کے خلاف ہے، اس لیے

ہر انتہا پسند تحریک کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعد کے زمانہ میں وہ عام قسم کی ایک معتدل جماعت بن کر رہ جاتی ہے۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۴ کو جب میں پہلی بار آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر (ناگپور) میں گیا۔ اس کو قریب سے دیکھا اور وہاں کے لوگوں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ آر ایس ایس، کم از کم آج، ایک سادہ اور معتدل جماعت ہے۔ جو لوگ دور سے آر ایس ایس کے بارہ میں متشددانہ خیالات رکھتے ہیں وہ یہاں آکر قریب سے اس کو دیکھیں تو اپنے آپ ان کے خیالات بدل جائیں گے۔

آر ایس ایس کے موجودہ سربراہ رجو بھیا نے عہدہ سنبھالنے کے بعد ایک انٹرویو دیا تھا۔ یہ انٹرویو دہلی کے ایک اُردو ہفت روزہ میں چھپا تھا۔ انٹرویو کا ایک حصہ مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ اس کو ناقدانہ انداز میں لیتے ہوئے اخبار نے اس کی سرخی اس طرح بنائی تھی: مسلمان ہمیشہ حکومت کے بھروسے نہیں رہ سکتے، اس ملک میں تو انھیں ہندو سماج سے مل کر ہی رہنا ہوگا (۱۴ اپریل ۱۹۹۴)

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ رجو بھیا کی اس بات پر برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو زندگی کا ایک اصول ہے۔ نہ صرف ہندستان میں بلکہ کسی بھی ملک میں جہاں کوئی کمیونٹی اقلیت کی حیثیت رکھتی ہو، اس کو اکثریتی فرقہ سے مل جل کر ہی رہنا ہے۔ اس کے سوا زندگی کا اور کوئی طریقہ نہیں۔

سندھ میں مہاجرین نے یہ غلطی کی کہ وہ سندھیوں سے مل جل کر نہیں رہے۔ اگر چہ دونوں ہی مسلمان تھے مگر دونوں میں اتنی تلخی پیدا ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ یہی معاملہ بنگلہ دیش میں پنجابی مسلمانوں اور بنگالی مسلمانوں کے درمیان پیش آیا۔

بظاہر آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈ گیوار ہیں۔ مگر اسلامی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کے قیام کی ذمہ داری ان نااہل مسلم لیڈروں پر آتی ہے جنھوں نے غیر ضروری طور پر ضد اور مخالفت کی سیاست چلا کر ہندو احیا پرستی کو خوراک فراہم کی۔

ناگپور میں ستمبر ۱۹۲۲ میں گنیش پوجا کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا۔ مسلم رہنماؤں نے روٹ بدلنے اور مسجد کے سامنے باجا نہ بجانے کا مطالبہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں تناؤ پیدا ہوا۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ

کلکٹر نے حالات کو دیکھتے ہوئے جلوس کو روک دیا۔ اس وقت ہندوؤں نے پابندی کو قبول کرلیا۔ مگر ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۳ کو دوبارہ ڈنڈی جلوس کا مسئلہ پیدا ہوا جو ایک ہندو دیوتا کے نام پر باجے اور گانے کے ساتھ نکلنے والا تھا۔ مسلمانوں کے سخت رد عمل کو دیکھ کر کلکٹر نے دوبارہ اس کی اجازت نہیں دی۔

ہندوؤں نے پابندی کے آرڈر کو نہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ بیس ہزار ہندو اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے، اس کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اس کا نتیجہ ہندو مہا سبھا کا قیام تھا۔ اس وقت اس سبھا کے صدر ڈاکٹر بی ایس مونجے اور سکریٹری ڈاکٹر ہیڈ گیواڑ بنائے گئے۔

ڈاکٹر ہیڈ گیواڑ اور دوسرے لیڈر ہندوؤں سے کہتے تھے کہ تم اپنا جلوس شان کے ساتھ نکالو۔ مسجد کے سامنے باجا بند کرنے کی بزدلی نہ دکھاؤ۔ ناگپور کے اسی فرقہ وارانہ کشیدگی کے ماحول میں آر ایس ایس کی فکری بنیادیں تیار ہوئیں۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۲۵ میں دسہرہ کے موقع پر آر ایس ایس کا قیام عمل میں آیا۔

اسلامی شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں کہ مسجد کے سامنے سے غیر مسلموں کا جلوس نہ نکلے یا باجا نہ بجایا جائے۔ اس قسم کے جلوس پر مشتعل ہونا یا اس کو وقار کا سوال بنانا سراسر جاہلیت ہے۔ مگر نااہل مسلم رہنماؤں نے اسی لایعنی سیاست میں انھیں الجھا رکھا ہے۔ اس نام نہاد سیاست کا بیک وقت دو نقصان ہے ــــــ ایک، ہندوؤں میں غیر ضروری طور پر مسلم مخالف جذبات کا پیدا ہونا۔ دوسرے، مسلمانوں کے اندر منفی سوچ ابھرنا اور اس کے نتیجہ میں تعمیری کاموں سے ان کا دور ہو جانا۔

اُردو اخبارات میں جب بھی میں کوئی "رپورٹ" پڑھتا ہوں تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ رپورٹ نہیں ہے، یہ تو رائے زنی ہے، اردو صحافت جیسے کہ غیر جانبدارانہ رپورٹنگ سے واقف ہی نہیں۔ مگر خدا کے فضل سے میرا ذہن ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ میں ہر چیز کو غیر جانبدارانہ انداز میں سمجھنے اور بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہت پہلے جب کہ میں الجمعیۃ ویکلی مرتب کرتا تھا، اس وقت اس کے شمارہ یکم مئی ۱۹۷۰ میں میں نے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس

کا عنوان تھا : کچھ آر ایس ایس کے بارہ میں ۔ اس مضمون میں کسی رائے زنی کے بغیر اس کا تعارف کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا :

"آر ایس ایس کا بانی ایک ڈاکٹر تھا جس نے قومی خدمت کے لیے شادی نہیں کی ۔ اور جب وہ مرا تو ملک بھر میں اس تنظیم کی ۵۰، شاخیں قائم ہو چکی تھیں ۔ آر ایس ایس سے جو لوگ وابستہ ہیں وہ روزانہ کاروبار شروع کرنے سے پہلے اپنا صبح کا وقت ، اسکول اور کالج کے طلبہ اپنا شام کا وقت اور سالانہ چھٹیاں اس کام میں لگاتے ہیں ۔ جو لوگ باقاعدہ اس کے پرچارک ہیں وہ گھر بار اور روزگار چھوڑ کر مستقل اس میں مصروف رہتے ہیں ۔ وہ تنظیم کی خدمت کے دوران نکاح نہیں کرتے ۔"

پاکستان کے ایک صاحب جو خلافتِ اسلامیہ قائم کرنے کے علم بردار ہیں ۔ انھوں نے راقم الحروف کے بارہ میں لکھا ہے : (مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی بنیادی انقلابی فکر کو غلط قرار دینے والوں) میں سے ایک نمایاں شخص بھارت میں ہیں ، یعنی مولانا وحید الدین خاں ، جو بھارت کے سرکاری حلقوں اور بالخصوص بی جے پی اور آر ایس ایس کے منظورِ نظر ہیں (میثاق ، لاہور ، مارچ ۱۹۹۴، صفحہ ۱۵)

یہ ایک لغو بات ہے ۔ میرا کسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ۔ میرا مزاج چونکہ دعوتی ہے اس لیے جب بھی کسی اجتماع میں مجھ کو بلایا جاتا ہے تو میں وہاں جاتا ہوں ، خواہ یہ اجتماع مسلمان کا ہو یا ہندو کا ۔ حتیٰ کہ مذکورہ پاکستانی بزرگ کے اجتماع میں بھی شریک ہو چکا ہوں ۔

آر ایس ایس کے لوگوں سے میری ملاقات ہوتی ہے یا ان کی دعوت پر میں ان کے جلسہ میں جاتا ہوں تو وہاں میں کس قسم کی بات کرتا ہوں ، یہ خود آر ایس ایس کے لوگوں کی زبانی بخوبی طور پر معلوم ہو سکتا ہے ۔ یہاں میں اس کے لیے دو حوالے دوں گا ۔ آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (دہلی) نے اپنے شمارہ ۵ اگست ۱۹۹۰ میں ایک مفصل مضمون میرے بارہ میں شائع کیا تھا ۔ اس کا عنوان تھا ——— ایک مبلغ مولانا :

A Missionary Maulana

اسی طرح ہندی اخبار راجستھان پتریکا (۱۲ نومبر ۱۹۹۲) میں آر ایس ایس کے ایک رائٹر ڈاکٹر مہیش شرما کا مفصل مضمون میرے بارہ میں چھپا ہے ۔ اس میں انھوں نے میرا اور دوسرے

مسلم رہنماؤں کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــــــ مولانا وحیدالدین خاں کا طریقہ دعوت ہے اور دوسروں کا طریقہ عداوت۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ ہمیشہ مسلم رہنماؤں کی مخالفت کرتے ہیں۔ایسا کیوں ہے۔آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں مسلم رہنماؤں کا مخالف نہیں۔ البتہ کئی بار میں نے ان کی ترجیحات پر تنقید کی ہے۔کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر وہ نان اشو کو اشو بنا لیتے ہیں۔اس کا نتیجہ عام مسلمانوں کے لیے مایوسی اور ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

تقسیم کے بعد انھوں نے کئی بار ایسا کیا ہے کہ ایک اشو کو اٹھایا اور مسلمانوں کو یہ تاثر دے کر بھڑکایا کہ یہ نہیں تو تمہارا وجود بھی نہیں۔کبھی اُردو، کبھی مسلم یونی ورسٹی، کبھی پرسنل لا، کبھی ملی تشخص، کبھی بابری مسجد، کبھی نفقۂ مطلقہ، کبھی تطلیقاتِ ثلاثہ۔میرے نزدیک مسلمانوں کی قسمت اس قسم کے مسائل سے وابستہ نہیں۔اگر ایسا ہوتا تو بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے بعد مسلم ملت بھی ڈھ گئی ہوتی۔اس قسم کی باتیں مسلمانوں کے ذہن کو بگاڑنے کے ہم معنی ہیں۔

ہمارے لیے صحیح ترجیح ہے ـــــــ تعلیم اور اقتصادیات اور اخلاق۔مسلم رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ سارا زور انھیں اصل مسائل پر دیں۔مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی تدبیریں کریں۔مسلمانوں کو اقتصادیات میں آگے لے آئیں۔مسلمانوں کے اندر اعلیٰ کردار پیدا کرنے کی کوشش کریں۔یہ سب جڑ والے کام ہیں۔

۱۶ اپریل کو ۱۰ بجے بھارتیہ مزدور سنگھ کا اجلاس ریشم باغ (ناگپور) میں ہوا۔یہاں میرا افتتاحی خطاب تھا۔میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد ہندستان وہ ترقی یافتہ ہندستان نہ بن سکا جو اس کو بننا چاہیے تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ ملک میں ایکتا نہ ہونا ہے۔چنانچہ میں نے اپنا مشن دیش میں کمیونل ہارمنی کو بنایا ہے۔

اس سلسلہ میں جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس کا سبب دونوں طرف غیر ضروری قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہونا ہے۔دونوں فرقوں میں اگر ملنا جلنا بڑھ جائے تو اپنے آپ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔اور لوگوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

میں نے مختلف واقعات بیان کیے۔ اور واقعاتی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ ہر آدمی انسان ہے۔ کوئی آدمی اگر آپ کو اپنا مخالف دکھائی دے تو یہ اس کی صرف عارضی حالت ہے۔

میں نے کہا کہ بندے ماترم یا اس طرح کی دوسری چیزوں پر کچھ مسلمان جو اتنا زیادہ بھڑکتے ہیں اس کی وجہ حقیقت نہیں ہے بلکہ غیر ضروری حساسیت ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے اس قسم کی حساسیت مسلمانوں میں موجود نہیں تھی۔ اس لیے خود مسلمان اس قسم کی باتیں کہتے تھے مگر کوئی ردعمل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اقبال کے چند اشعار سنائے۔ مثلاً :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے — میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ وطن سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

۱۹۴۷ سے پہلے کوئی مسلمان اقبال کے ان اشعار پر بھڑکتا نہیں تھا۔ آج کوئی ہندو یا مسلمان ایسی کوئی بات کہہ دے تو فوراً اخباروں میں بیان اور مراسلے چھپنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نا اہل لیڈروں نے غیر ضروری طور پر مسلمانوں کو ان باتوں کے بارہ میں حساس بنا دیا ہے۔

کچھ سطحی لوگوں نے اس تضاد سے بچنے کا یہ آسان راستہ نکالا ہے کہ اقبال کے اس قسم کے اشعار کو ان کے مجموعہ کلام سے حذف کر دیں۔ مگر یہ صرف دھوکا ہے۔ اشعار کو حذف کرنے کا حق صرف اقبال کو تھا، بعد کے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں۔ آج کے کسی آدمی کو یا تو اقبال کو ان کے ان اشعار کے ساتھ لینا ہے یا پوری طرح اقبال کو رد کر دینا ہے۔

ہندی، انگریزی اور مراٹھی اخباروں میں میری تقریر کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔ مثلاً انڈین اکسپرس، ہیتا وادا، ترن بھارت، وغیرہ۔ یہ رپورٹیں ۱۷ اپریل اور ۱۸ اپریل کے اخبارات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

منچ پر شری ٹھینگڑی جی، شری بھگت جی وغیرہ تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر جال فیروز گیمی (Jal Pheroze Gimi) تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۸۰ سال ہے۔ وہ ۵۳ سال تک ناگپور یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ استاد کی حیثیت سے بھی اور وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی۔ مگر پوری مدت میں انھوں نے رضاکارانہ کام کیا۔ یونی ورسٹی سے کبھی کوئی تنخواہ نہیں لی۔ حتیٰ کہ جب وہ وائس چانسلر تھے

تو یونی ورسٹی کی گاڑی کے بجائے سائیکل پر اپنے گھر سے یونی ورسٹی جایا کرتے تھے۔

اس قسم کی بہت سی باتیں ان کے بارہ میں معلوم ہوئیں۔ میں نے سوچا کہ اب بھی کیسے کیسے باکردار لوگ ہمارے ملک میں ہیں۔ جب تک ایسے افراد موجود ہیں ملک کے مستقبل کے بارہ میں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

آر ایس ایس کے ایک لیڈر مسٹر ٹھینگڑی (D.B. Thengadi) نے اپنی ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ اس کا نام تھا :

The Perspective

یہ کتاب مصنف کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۹۵۵ سے ۱۹۷۰ تک کے مضامین موجود ہیں۔ اس کے آغاز میں کسی کا یہ قول لکھا ہوا تھا کہ فوجوں کے حملہ کی مزاحمت کی جاتی ہے مگر نظریات کے حملہ کی مزاحمت نہیں ہوتی :

The invasion of armies is resisted

the invasion of idea is not.

یہ آر ایس ایس کے ایک لیڈر کی کتاب ہے۔ گویا کہ زبانِ حال سے وہ کہہ رہا ہے کہ ہماری طرف اگر تم متشددانہ طور پر آؤ گے تو ہم کو تم اپنا مزاحم پاؤ گے۔ اور اگر تمہارے پاس اعلیٰ نظریہ ہو اور اس کو لے کر تم پُرامن طور پر ہماری طرف آؤ تو ہمارا سینہ اس کے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے۔

۱۶ اپریل کی شام کو انگریزی اخبار ہیتاوادا (The Hitavada) کے سینیر رپورٹر مسٹر وراگ پچ پوڑا (Virag Pachpora) نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کمیونل ہارمنی کی جو بات کرتے ہیں وہ نیشنل معنوں میں نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کی سیکوریٹی کے لیے کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ میں ہم آہنگی اور اعراض کی جو بات کرتا ہوں وہ اس لیے کرتا ہوں کہ یہی فطرت کا قانون ہے۔ ہر جگہ اسی کو اختیار کرنا ہے۔ گھر کے اندر بھی، کمیونٹی کے اندر بھی اور پورے دیش میں بھی۔

مسز شُشما پچ پوڑا ایک فری لانسر ہیں۔ وہ مرہٹی اخباروں میں لکھتی ہیں۔ انھوں نے ۱۹ اپریل کی شام کو انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد کے انہدام کے بعد کی مسلم سیاست سے تھا۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل (پیدائش ۱۹۴۹) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ اپنی تازہ کتاب "ناگپور میں اُردو" کا ایک نسخہ انھوں نے عنایت فرمایا۔ اس کتاب میں موضوع سے متعلق کافی معلومات جمع کی گئی ہیں۔

کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ناگپور سے ایک اُردو ہفت روزہ ۱۹۲۸ میں جاری ہوا۔ اس کا نام مسلم تھا۔ "اس کے ایڈیٹر علی برادران کے تربیت یافتہ اور جبل پور کے مشہور صحافی تاج الدین تھے۔ یہ اخبار کانگرسی نظریات کا حامل تھا۔ چونکہ وہ دور مسلم لیگ کے عروج کا تھا اس لیے اس کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار وہ مسلم لیگ کے نظریات کی حمایت کرنے لگا" (صفحہ ۲۸۶)

ناگپور وسط ہند میں واقع ہے۔ یہ بالکل یقینی تھا کہ اس علاقہ میں کبھی بھی مسلم لیگ کا "پاکستان" بننے والا نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہاں پاکستانی تحریک کی اتنی دھوم تھی کہ اخبار کو اپنی پالیسی بدل دینا پڑا۔ یہ جذباتی سیاست کی انتہا ہے۔ جن نااہل لیڈروں نے مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی سیاست چلائی ان کی یہ جسارت حیرت انگیز ہے۔ کیوں کہ وہ اسلامی اصول اور تاریخی عوامل دونوں سے آخری حد تک بے خبر تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ مَن صمت نجا یعنی ان کی عافیت اس میں ہے کہ وہ چپ رہیں۔

۱۷ اپریل کی شام کو ۶ بجے ہم لوگ ناگپور کے ایک ادارہ میں گئے۔ اس کا نام انڈیا پیس سنٹر ہے۔ اس کی ڈائرکٹر ایک عیسائی خاتون (Hansi De) ہیں۔ مگر آج اتوار کی وجہ سے وہاں ایک چوکیدار کے سوا اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اس ادارہ کی طرف سے یکم ۔ ۶ نومبر ۱۹۹۲ کو ایک نیشنل اسٹڈی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کا موضوع تھا :

Minorities in India and the National Mainstream

اس موقع پر انھوں نے مجھے خطاب کرنے کی دعوت دی تھی مگر بعض وجوہ سے میں اس میں شرکت نہ کر سکا۔ آج یہاں بالکل سناٹا تھا۔ تاہم پیس سنٹر کے خوب صورت لان میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے۔ یہاں کے پُرسکون ماحول میں ایک روحانی کیفیت مل رہی تھی۔ سورج غروب ہوا تو چوکیدار نے لان میں ایک بڑا فرش بچھا دیا۔ یہاں ہم لوگوں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ میرے علاوہ محمد حنیف صاحب اور عبد السلام اکبانی صاحب شریک تھے۔ نئی جگہ پر نماز پڑھنے میں ہمیشہ

مجھ کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا: شاید ہم پہلے شخص ہوں جس نے یہاں اللہ کے لیے سجدہ کیا۔ آخر میں مسز ہنسی ڈے کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور ہم لوگ وہاں سے واپس آ گئے۔

روزنامہ انقلاب (بمبئی) کے شمارہ ۱۶ اپریل ۱۹۹۴ میں صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ الہٰ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے ایک مقدمہ میں فیصلہ دیا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دستور ہند کے تحت غلط ہیں۔ اسی اخبار کے آخری صفحہ پر ایک باتصویر خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ بمبئی کی ایک مسلمان خاتون نے اپنے مسلمان شوہر کے مظالم سے تنگ آکر خود کشی کر لی۔

اس کو پڑھنے کے بعد میں نے ناگپور کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ انسانی نقطۂ نظر سے دونوں میں سے کون سا واقعہ زیادہ سنگین ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم خاتون کا خودکشی کرنا۔ میں نے کہا کہ میری بھی رائے یہی ہے۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ ایک مسلمان عورت کی خودکشی کا واقعہ تو صرف مقامی اخبار میں ایک بار چھپ کر رہ جائے گا۔ مگر تین طلاق والے مسئلہ پر تمام خودساختہ رہنما شور وغل کا طوفان مچا دیں گے۔ اس کے بعد جب میں دہلی پہنچا تو اخباروں میں نام نہاد مسلم رہنماؤں کے پرشور بیانات کی دھوم تھی۔ قومی آواز (۱۹ اپریل ۱۹۹۴) کے پہلے صفحہ کی ایک رپورٹ کی سرخی یہ تھی: طلاق کے مسئلہ پر ہائی کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مسلم رہنماؤں کا شدید ردعمل، یکم مئی کو احتجاجی اجلاس۔

یہاں کے ہندی روزنامہ لوک مت سماچار (۱۷ اپریل ۱۹۹۴) میں صفحہ اول کی پہلی خبر کی سرخی یہ تھی: دیش کے بڑوں کو ۵۲ کروڑ روپے دیے گئے۔

یہ کوئی ایک خبر نہیں۔ ایسی خبریں ہر روز ہمارے اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی ایک خبر دوسرے ملکوں میں آدمی کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر ہندستان میں اس قسم کی خبریں اس طرح چھپتی ہیں جیسے کہ وہ معمول کے واقعات ہوں۔ جس ملک میں اخلاقی حساسیت اس حد تک کم ہو جائے وہ ملک اگر ترقی نہ کر رہا ہو تو اس میں تعجب کرنے کی کوئی بات نہیں۔

ناگپور میں میرا قیام دو جگہوں پر تھا۔ پہلے جناب محمد حنیف صاحب کی رہائش گاہ پر اور اس کے بعد جناب عبدالسلام اکبانی کی رہائش گاہ پر۔ اس دوران یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمان

مسلسل آتے رہے اور ان سے مختلف دینی موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔

چھٹی کلاس کے ایک مسلم طالب علم سے میں نے کئی سادہ قسم کے سوالات کیے۔ مثلاً اسلام کے بنیادی ارکان کیا ہیں۔ دنیا میں مسلمان کتنے ہیں۔ مسلم ملکوں کی تعداد کیا ہے۔ اسلام میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔ اس قسم کے کئی سوال کیے۔ مگر کسی سوال کا وہ درست جواب نہ دے سکے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگلش اسکولوں میں پڑھنے والے مسلم نوجوان اسلام سے کتنا زیادہ بے خبر ہیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں جہاد کا تصور کیا ہے۔ اس کے جواب میں مسلم طالب علم نے کہا کہ جہاد کا مطلب ہے اسلام کو پھیلانے کے لیے لڑنا۔ میں نے کہا کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے دعوت کا طریقہ ہے، لڑائی کا طریقہ نہیں ہے۔

ایک اعلیٰ افسر نے بتایا کہ ایک بار مقابلہ کا امتحان تھا۔ میں بھی انٹرویو بورڈ میں شامل تھا۔ کئی دن تک انٹرویو ہوتے رہے۔ مگر کوئی مسلمان نہیں آتا تھا۔ آخری دن ایک مسلمان لڑکا آیا۔ اس نے ۵۲ فی صد نمبر حاصل کیے۔

انٹرویو بورڈ کے ایک سینیر ہندو ممبر نے کہا کہ ایڈمنسٹریشن کو متوازن بنانے کے لیے ہمیں مسلمانوں کی ضرورت ہے۔ اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہمیں مسلمانوں کو خصوصی طور پر لینا ہے، ورنہ ہمارا ایڈمنسٹریشن غیر متوازن (lop-sided) ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس کے نمبر کو بڑھا دینا چاہیے :

Let us raise his marks.

چنانچہ انھوں نے اس مسلم امیدوار کا نمبر بڑھا کر ۶۰ کر دیا۔ مذکورہ افسر نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقابلہ کے امتحانوں میں آئیں۔ اوپر کے حلقوں کا یہ احساس گویا ان کے لیے ایک نیا موقع کھول رہا ہے۔

۱۷ اپریل کی شام کو پانچ بجے میں عبد السلام اکبانی صاحب کے ساتھ نکلا۔ آج ہمیں شام کا کھانا کہیں اور کھانا تھا۔ اس کے بعد ایک اجتماع تھا۔ اس طرح ہمیں رات کو کافی دیر کے بعد گھر لوٹنا تھا۔ عبد السلام صاحب اپنی گاڑی پر بیٹھ چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ۱۲ سالہ گھریلو ملازم کو بلایا اور کہا "آصف، دیکھو بیٹے آج رات کو تم یہیں سو گے۔ اپنے گھر جا کر کہہ آنا۔

یہ عبد السلام صاحب کا گھریلو ملازم تھا۔ ملازم سے اس طرح مشفقانہ خطاب کرنا یہ اسلامی

تہذیب کا ایک خاص پہلو ہے۔ اس میں ایک طرف اسلامی اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے۔ دوسری طرف ملازم اپنے کو ملازم نہیں سمجھتا بلکہ اپنے کو گھر کا ایک فرد سمجھتا ہے۔ اور یہی وہ بات ہوتی ہے جو فارسی شاعر نے کہا:

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

عبد السلام اکبانی صاحب اگرچہ تاجر ہیں۔ مگر ان کے اندر ادبی اور اصلاحی ذوق بھی کافی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے بھی رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا ایک مجموعہ "سچی بات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان ہے "مثبت سوچ کا بٹن دبائیے" اس کے سرورق پر یہ حکیمانہ جملہ لکھا ہوا ہے: سچ ہر حال میں سچ ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

۱۷ اپریل کی شام کو محمد حنیف صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ انھوں نے کچھ انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شام کے کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے کے بعد گفتگو ہوئی۔ میں نے قرآن اور حدیث اور سیرت کی روشنی میں تقریباً آدھ گھنٹہ خطاب کیا۔ پھر سوال وجواب ہوا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمانوں کی جدید نسل کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب نے اس کو اسلام سے دور کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ مسلسل مغربی تہذیب کی برائیاں بیان کرنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ اس کے فتنہ سے نئی نسل کو بچا سکیں۔

مگر یہ درست نہیں۔ نئی نسل کی اسلام سے دوری کا سبب مغربی تہذیب کی یلغار نہیں ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ جدید ذہنی معیار پر اس کو اسلام پیش نہ کیا جا سکا۔ میں نے قرآن وحدیث سے کئی مثالیں دے کر لوگوں سے پوچھا کہ اس طرح اگر اسلام کو پیش کیا جائے تو کیا کوئی شخص اس کو ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔

ہر زمانہ کا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا بھی ایک اسلوب ہے۔ اس اسلوب میں اسلام کو پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جدید نسل کو ذہنی انحراف سے بچانے کی اور کوئی صورت نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ آج کل آپ ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل ہیں اور مسلمانوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ایک جھوٹا پروپگنڈا ہے جس کا

اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ میں جو کچھ بھی کرتا ہوں اس کا اظہار ماہنامہ الرسالہ میں ہوتا ہے۔ آپ الرسالہ کا کوئی بھی شمارہ نکال کر دیکھئے کہ وہ کیا گواہی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی الماری سے ایک الرسالہ نکالا۔ میں نے ایک ایک ورق الٹ کر بتانا شروع کیا کہ دیکھئے، اس کے مضامین سے کیا ثابت ہورہا ہے۔ اس شمارہ کے تمام مضامین مسلمانوں سے متعلق تھے۔ صرف خبرنامہ کے بعض انٹرویو کا تعلق ہندوؤں سے تھا۔

ایک اور صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے مشن کے دو رُخ ہیں۔ ایک کا تعلق مسلمان سے ہے، اور دوسرے کا تعلق غیر مسلموں سے۔ مسلمانوں کے سلسلہ میں ہمارا مشن یہ ہے کہ ان کے لیے اسلام کو از سر نو دریافت (rediscovery) بنائیں۔ ان کے روایتی ایمان کو زندہ ایمان بنائیں۔ ہماری توجہ اور محنت کا زیادہ بڑا حصہ اسی پر خرچ ہورہا ہے۔

غیر مسلموں کے سلسلہ میں ہمارا مشن یہ ہے کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات بڑھائے جائیں۔ قدیم زرعی دور میں یہ تعلقات پوری طرح موجود تھے۔ مگر اب جو صنعتی دور آیا ہے اس میں یہ تعلقات باقی نہیں رہے۔ دو قومی تحریک جیسی فرقہ وارانہ تحریکوں نے اس میں اور زیادہ بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان فطری تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ اس تعلق کو دوبارہ قائم کرنا ہر اعتبار سے انتہائی ضروری ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے اعتبار سے بھی اور دعوت کے اعتبار سے بھی۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد حالات تیزی سے بدلے ہیں۔ اب بیشتر لوگ الفاظ کے فرق کے ساتھ وہی بات کہنے لگے ہیں جو الرسالہ میں ۱۹۷۶ سے کہی جارہی تھی۔ یہ بلاشبہ الرسالہ مشن کے حق میں اللہ تعالیٰ کی ایک تائید ہے۔

کچھ لوگ جو الرسالہ مشن کی مخالفت کررہے ہیں ان کی مخالفت محض نافہمی کی بنا پر ہے۔ ان کا معاملہ الناس اعداء ما جھلوا کا معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت ایک داعی امت کی ہے اور اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ طویل عرصہ سے دعوت کا عمل رک گیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ وہی صورت حال ہے جو دور اول میں "حدیبیہ" سے پہلے پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت عرب میں یہ صورت حال تھی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت، کشیدگی

اور ٹکراؤ کا ماحول قائم ہوگیا تھا۔ اس طرح وہ معتدل حالات ختم ہوگئے تھے جن میں دعوت کا عمل اپنے فطری انداز میں جاری رہتا ہے۔

ان حالات میں ایک مصالحانہ تدبیر کے ذریعہ غیر معتدل حالات کو معتدل حالات میں تبدیل کر دیا گیا۔ آج کل کی زبان میں یہ جمی ہوئی برف کو توڑنے (to break the ice) کا ایک معاملہ تھا۔ صلح حدیبیہ محض ایک وقتی صلح نہیں۔ یہ ایک سنت رسول ہے جس کو تعطل کو توڑنے کا عمل (break the ice act) کہہ سکتے ہیں۔

سنت رسول کی پیروی میں ایسا ہی ایک عمل آج بھی درکار ہے۔ حدیبیہ کے وقت مخصوص حالات پیدا ہوئے تھے، جس کو استعمال کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جمی ہوئی برف کو توڑا۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد بھی اسی نوعیت کے کچھ حالات پیدا ہوئے۔ "تین نکاتی فارمولا" موجودہ جمی ہوئی برف کو توڑنے کے لیے اسی قسم کی ایک تدبیر تھی۔ یہ تدبیر خدا کے فضل سے موثر ثابت ہوئی۔ نارملائزیشن کا مطلوب عمل بالفعل جاری ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عمل (پروسس) جاری رہے گا اور وہ وقت آکر رہے گا جب کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا قائم ہو اور دعوت کا عمل اپنے فطری انداز میں پوری طرح جاری ہو جائے۔ جو لوگ اس کوشش کی مخالفت کر رہے ہیں یا مسلمانوں کو اس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ ان کی یہ منفی کارروائی کہیں صد عن سبیل اللہ کے ہم معنی نہ قرار پائے۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۴ کی سہ پہر کو ناگپور سے واپسی ہوئی۔ محمد حنیف صاحب اور عبد السلام اکبانی صاحب کے ساتھ ایرپورٹ پہنچا۔ دونوں صاحبان تاجر ہیں۔ عبد السلام اکبانی صاحب سے میں نے کہا کہ مسلمانوں میں تجارتی شرکت کامیاب نہیں ہوتی، اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مسلمان یا غیر مسلمان کی بات نہیں، اصل یہ ہے کہ جب بھی شرکت قریب کے لوگوں میں جائے تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر دور کے لوگوں کے ساتھ شرکت کی جائے تو وہ کامیاب رہتی ہے۔

محمد حنیف صاحب کی تعلیم راجکمار کالج، راجکوٹ میں ہوئی ہے۔ یہ کالج ۱۹۴۷ سے پہلے راجکماروں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد طلبہ کے اندر لیڈرشپ کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ میں نے پوچھا کہ لیڈرشپ کے لیے وہ لوگ کون سی خاص صفت پیدا کرتے تھے۔ محمد حنیف

صاحب نے کہا کہ خود اعتمادی (self-confidence) انھوں نے بزنس کے موضوع پر بتایا کہ بزنس میں اسٹڈی انکم (steady income) کوئی چیز نہیں۔ جو آدمی اسٹڈی انکم چاہے وہ بزنس میں کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

محمد حنیف صاحب نے بتایا کہ ۱۲ اپریل کو وہ بمبئی سے ناگپور آرہے تھے۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ان کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی عمر غالباً ۸۰ سال سے زیادہ تھی، ایک مرتبہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا تو کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مگر حنیف صاحب نے نہایت تیزی کے ساتھ اٹھ کر اس کو سنبھال لیا۔ اس کو نیچے گرنے نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ حنیف صاحب سے بہت مانوس ہو گیا۔ بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو، زندگی میرے لیے کتنی مصیبت بن گئی ہے، آخر میں مر کیوں نہیں جاتا:

Son, why I am not dying.

محمد حنیف صاحب نے اس کو زندگی اور موت کا اسلامی تصور بتایا۔

جہاز میں بمبئی کا ٹائمس آف انڈیا (۱۸ اپریل) موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے ایک خبر پر نگاہ ٹھہر گئی۔ عنوان تھا اچانک موت (sudden death) اس میں بتایا گیا تھا کہ میجر جنرل فرنینڈیز (Eustace William Fernandez) جو بمبئی کے رہنے والے تھے۔ وہ ۲۹ مارچ ۱۹۹۴ کو بادام باغ (کشمیر) کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۶ سال تھی۔ وہ یکم اپریل کو دہلی آکر ملٹری انٹلیجنس کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدہ کا چارج لینے والے تھے مگر قسمت نے دوسرا فیصلہ کر دیا:

He was to take charge as director general of military intelligence in New Delhi on April 1, but fate decided otherwise.

یہی کہانی ہر آدمی کی ہے، ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اگلے دنوں میں وہ ایک بڑے مقام پر پہنچنے والا ہے۔ مگر عین اس وقت موت آتی ہے اور اس کو ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

انڈین ایرلائنز کا فلائٹ میگزین (اپریل ۱۹۹۴) دیکھا۔ قدیم فرنچ کالونی پانڈیچری اور قدیم پرتگالی کالونی گوا پر تفصیلی مضامین تھے۔ مگر ان میں کوئی خاص سبق والی بات نہیں ملی۔ جب کہ میں ہمیشہ سبق والی بات تلاش کرتا ہوں۔ گوا سے متعلق مضمون میں تھا کہ یہاں ایک پرتگالی شہزادی یادولا اور ایک غریب ہندستانی گا سپر میں محبت ہو گئی۔ شہزادی کی زبان پرتگالی تھی اور ہندستانی کی زبان کونکنی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی زبان سیکھی اور دونوں ایک دریا کے کنارے ملنے لگے۔ گورنر کو معلوم ہوا تو اس نے پاولا کو واپس پرتگال بھیجنے کا حکم دے دیا۔ مگر جس صبح کو روانگی تھی، اس سے پہلے رات کو دونوں دریا کے کنارے اکٹھا ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ریشم کی ڈور میں باندھا اور بھری ہوئی ندی میں کود کر خودکشی کر لی:

And finally when the time came to part, Paula and Gaspar preferred death to separation. (p. 30)

اس قسم کے خودکشی کے واقعات اس لیے ہوتے ہیں کہ انسان صرف آج کے خوشی اور غم کو جانتا ہے، وہ کل کے خوشی اور غم سے واقف نہیں۔ اگر آدمی موت کے بعد کو جانے تو وہ کبھی خودکشی نہ کرے۔

ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سیاحوں کی آمد و رفت سے ساری دنیا میں جو انٹرنیشنل ٹورسٹ ارننگز ہوتی ہیں ان کی مقدار ۲۰۰ بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ مگر ہندستان کا حصہ اس میں ایک فی صد سے بھی کم (0.4 per cent) ہے۔ اس سے عالمی مقابلہ میں ہندستان کی اقتصادی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ناگپور سے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۱۰۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ اسی جہاز سے شری اوم پرکاش اکھی (۶۶ سال) بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ آر ایس ایس میں کل ہند آرگنائزنگ سکریٹری ہیں۔ جہاز کے اندر اچانک ان سے ملاقات ہوئی۔ میرا طریقہ ہے کہ میں ہر آدمی سے اس کے اپنے میدان کی باتیں جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنانچہ ان سے بھی اسی ڈھنگ پر باتیں کرتا رہا۔

انھوں نے بتایا کہ آر ایس ایس کی تنظیم میں جتنے لوگ بھی آپ کو اوپر دکھائی دیں گے وہ سب غیر شادی شدہ ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پارٹی میں لگا سکیں۔ یہ لوگ پہلے اچھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نہ سروس کرتے اور نہ نکاح کرتے۔ وہ اپنی پوری زندگی پارٹی کی خدمت میں لگا دیتے ہیں۔ یہی تنظیم کے بانی ڈاکٹر ہیڈگوار نے کیا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ مگر ایک دن بھی پریکٹس نہیں کی۔ انھوں نے اپنا سارا جیون تنظیم کی خدمت میں لگا دیا۔ ہم لوگ اپدیش کے بجائے عمل پر یقین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کوئی بھی آدمی اپدیش سے نہیں سیکھتا، وہ تمہارے جیون کو دیکھ کر سیکھتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ آر ایس ایس میں کوئی آپ کو شراب پینے والا نہیں ملے گا۔ اسموکنگ سے بھی آر ایس ایس والے دور رہتے ہیں۔ یہ اپدیش سے نہیں بلکہ ماحول کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار میں بھٹنڈا میں تھا۔ آر ایس ایس کا ایک نوجوان سگریٹ پی رہا تھا۔ میں اس سے قریب ہوا تو وہ مجھ کو دیکھ کر گھبرا گیا اور جلدی سے سگریٹ کو اپنی کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے اس کو ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے کہا کہ اس طرح تو تمہارا کوٹ جل جائے گا۔ سگریٹ کو جیب سے نکالو۔ اس نے سگریٹ کو جیب سے نکال کر پھینک دیا۔ مگر وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ اس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔

شری اوم پرکاش اکھی سے میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اپنا نام اُردو میں لکھ کر دیا۔ وہ پاکستان (ٹوبہ ٹیک سنگھ) سے ۱۹۴۷ میں ہندستان آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں ان کے پڑوس میں ایک مسلمان (شیخ صادق) رہتے تھے۔ شیخ صاحب کسی معاملہ میں پھنس گئے۔ پولیس نے ان کے خلاف کیس کر دیا۔ شری اکھی کے پتا جی نے گواہی دے کر شیخ صاحب کو بچایا۔ دونوں خاندان پڑوس میں تھے اور دونوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔

۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں کچھ دنگائی مسلمانوں نے اوم پرکاش اکھی کا مکان گھیر لیا۔ اس وقت شیخ صادق کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر ان کا بیٹا فوراً نکل آیا اور مسلمانوں کے خلاف سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو بھگایا آخر وقت تک وہ شری اکھی کے خاندان کی حفاظت کرتا رہا۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۴ کی شام کو دہلی واپس آگیا۔

شملہ کا سفر

اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام شملہ میں ۵۔ ۶ جولائی ۱۹۹۴ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس دو روزہ کانفرنس کا موضوع تھا:

Redefining the good society

اس کانفرنس کی دعوت پر شملہ کا سفر ہوا۔ یہ شملہ کے لئے میرا پہلا سفر تھا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۴ جولائی ۱۹۹۴ کو صبح ۵ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ مگر فضا میں اجالا پھیل چکا تھا۔ جو لبتیاں رات کے اندھیرے میں گم تھیں وہ صبح کی روشنی میں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ آفاقی ماحول خاموش زبان میں کہہ رہا ہے کہ جھوٹ اور سچ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جھوٹے پروپگنڈوں کا طوفان تھوڑی دیر کے لئے حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ مگر خود فطرت کے نظام کے تحت یقینی ہے کہ سچائی کا آفتاب طلوع ہو اور جھوٹے پروپگنڈوں کا اس طرح خاتمہ کر دے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

منتظمین نے سفر کا انتظام ہمالین کوئن اکسپرس سے کیا تھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو انسانوں کی ایک بھیڑ آتی اور جاتی نظر آئی۔ ریلوے کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر ٹرینوں کے بارہ میں مختلف اعلان کیا جا رہا تھا۔ ہمالین کوئن کے بارہ میں بتایا گیا کہ وہ اپنے سمے پر ٹھیک ۶ بجے روانہ ہوگی۔ البتہ آج خلاف معمول اس کی روانگی کا انتظام پلیٹ فارم نمبر ۱ سے کیا گیا تھا۔

پلیٹ فارم پر پہنچے تو "اے سی فرسٹ" کی دو اسپیشل بوگی سامنے نظر آئی۔ یہ کانفرنس کے شرکاء کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ میری کیبن میں میرے علاوہ پی آر چاری (IAS) تھے۔ اس طرح کے کیبن میں عام طور پر چار مسافر ہوتے ہیں۔ مگر اس میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ بوگی کے اندر کھانے وغیرہ کے تمام انتظامات ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کے معیار پر کئے گئے تھے۔

راستہ میں ٹائمس آف انڈیا (۴ جولائی ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں ایک رپورٹ بہتر زندگی (Living Better) کے زیر عنوان تھی۔ ڈاکٹر رانی راؤ نے لکھا تھا کہ ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ چلانا

ایک صحت مند عمل ہے۔ چلّانے کو روکنا نہیں چاہئے۔ کیوں کہ ذہنی تناؤ کو ختم کرنے کے لئے چلّانا بہت ضروری ہے:

Crying is very crucial for relieving tension. It should not be suppressed.

میرے ہم سفر مسٹر پی آر چاری نے کہا کہ ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میرا تجربہ ہے کہ جو جلوس جوشیلے نعرے لگاتا ہوا آرہا ہے وہ خطرناک نہیں ہے۔ البتہ جو جلوس خاموش مظاہرہ کررہا ہو وہ زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ نعرہ باز جلوس تو اپنا ٹنشن خود ہی نکال رہا ہے۔ جب کہ خاموش جلوس کے ٹنشن کو نکالنا آپ کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔

باہر دونوں طرف سرسبز مناظر تھے۔ جن کے درمیان سے ہماری ٹرین گزر رہی تھی۔ کیبن میں مسٹر پی آر چاری تھے جو اپنے تجربات سنا رہے تھے۔ اس طرح سفر بہت آسانی کے ساتھ طے ہوتا رہا۔

اس طرح کے مواقع پر میں خود بہت کم بولتا ہوں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں سوال کرتا رہتا ہوں اور اس طرح دوسرے کو بولنے کا موقع دیتا ہوں۔ یہی میں نے مسٹر چاری کے ساتھ کیا۔ اکثر میرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنا کوئی خاص انبھو بتائیے۔ آپ کی زندگی کی خاص دریافت کیا ہے۔ ان سے بھی میں نے اسی قسم کے سوالات کئے۔ انھوں نے اپنے کئی قصے بتائے۔

مسٹر چاری (آئی اے ایس) اس سے پہلے کلکٹر تھے، پھر وہ سکریٹری کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ اب انھوں نے انتظامی سروس سے پیشگی ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔ کیبن میں چوں کہ صرف ہم دو آدمی تھے، ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے ایک بڑا اسبق آموز تجربہ بتایا۔

انھوں نے بتایا کہ ۳۰ سال پہلے وہ مدھیہ پردیش کے ضلع چھترپور میں کلکٹر تھے۔ وہاں ان کا کلکٹریٹ کا آفس راجہ کے قدیم محل میں تھا۔ جون ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے، وہ اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ وائرلیس پر پولیس افسر کا یہ پیغام ملا کہ شہر کے ہندوؤں کی ایک بھیڑ کلکٹریٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کلکٹر کو ایک میمورنڈم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ بپھرے ہوئے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ اجازت دیں کہ ہم فورس کو استعمال کرکے انھیں یہیں روک دیں۔ اگر وہ کلکٹریٹ تک پہنچ گئے تو وہ ضرور تشدد کریں گے۔

مسٹر چاری نے بتایا کہ میں نے پولیس افسر کی رپورٹ پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ اپنا آدمی بھیجا کہ

جاکر معلوم کرو کہ حقیقی صورت حال کیا ہے۔ آدمی نے بتایا کہ پولیس افسر کی رپورٹ تو درست ہے۔ البتہ وہ لوگ سخت دھوپ سے پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں اور پیاس کی وجہ سے ان کے گلے اتنے سوکھ گئے ہیں کہ نعرہ لگانا بھی ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ مسٹر چاری نے فوراً اپنے ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ بہت سی بڑی بڑی ناند منگواؤ اور اس میں ٹھنڈا پانی بھر کر کلکٹریٹ کے سامنے کے میدان میں رکھوا دو۔ اور وہاں پینے کے لئے بہت سے کوزے بھی رکھ دو۔

فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب جلوس والے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹھنڈا پانی وہاں بڑی مقدار میں موجود ہے۔ تمام لوگ پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک نے جی بھر کر پانی پیا۔ اس کے بعد اپنے آپ تمام لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ جلوس کے لیڈر کلکٹر صاحب کے دفتر میں آکر ان سے ملے۔ مگر انھوں نے نہ سخت کلامی کی اور نہ کوئی تشدد کیا۔ بلکہ کلکٹر سے معافی مانگ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

مسٹر چاری نے یہ واقعہ مجھ سے ٹرین میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ان کے حوالے سے کانفرنس کی صدارتی تقریر میں دہرایا۔ مسٹر چاری نے بعد کو بتایا کہ کانفرنس کے ایک ڈیلی گیٹ (مسٹر پی این دھر) ان سے پوچھ رہے تھے کہ یہ واقعہ ہے یا افسانہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ ترین دماغ بھی مثبت انداز میں سوچنے سے کس قدر عاجز ہیں۔

ایک صاحب نے زمانہ کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ جب ریلوے ٹرین ایجاد ہوئی تو کہا جانے لگا کہ تاریخ ٹرین کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by train.

اب زمانہ کی تیز رفتاری بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ چنانچہ آج کہا جاتا ہے کہ تاریخ فیکس مشینوں کے ذریعہ سفر کرتی ہے:

History travels by Fax machines.

ایک ہم سفر نے کہا کہ ہم لوگوں کی سوچ زمانہ کی رفتار کے مطابق نہیں۔ ہم نے ہندی زبان کو پہلے نیشنل لینگویج کہا۔ مگر وہ ناکام ہو گیا۔ اب ہم ہندی کو لنک لینگویج کا نام دے رہے ہیں۔ پہلے ہم نے ریجنل زبانوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ہندی کو لنک لینگویج کہہ کر ہم ریجنل زبانوں کی اہمیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اندر دور اندیشی کی کمی ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔

ہماری سوچ زمانہ سے بہت پیچھے ہے۔

دن میں گیارہ بجے ہماری ٹرین کالکا پہنچی۔ یہاں سے ہمارا قافلہ گاڑیوں کے ذریعہ آگے روانہ ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سے پہلے ہم لوگ ہوٹل شوالک لے جائے گئے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنا تھا۔ میں نے غسل کیا۔ پھر مسٹر انور جعفری (بھوپال) سے تبادلہ خیال کرتا رہا۔ آخر میں ہوٹل کی طعام گاہ میں لمبی میز پر سب لوگوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ یہیں ظہر کی نماز پڑھی۔

ہوٹل شوالک میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ایک دوست فرقہ پرستی کے بہت مخالف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی میں ایک میگزین نکالا ہے جس کا نام ہے —— فرقہ پرستی سے لڑو (Combat Communalism) میں نے کہا کہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اخوت کو فروغ دو (Promote Brotherhood) کے نام سے اپنا میگزین نکالتے۔

میں نے کہا کہ وہ لوگ جن کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے، وہ کوئی بھیڑیوں کی مانند ہم سے الگ نوع نہیں ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ ان کے اندر بھی وہی فطرت ہے جو ہمارے اندر ہے۔ البتہ ان کی فطرت پر کچھ عارضی پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ حکمت سے ان پردوں کو ہٹا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح شریف انسان بن گئے ہیں۔

ڈیڑھ بجے کالکا سے شملہ کے لئے روانگی ہوئی۔ میں جس کار میں تھا اس میں میرے ساتھ جسٹس آر ایس پاٹھک بھی تھے۔ وہ چیف جسٹس آف انڈیا رہ چکے ہیں۔ انٹرنیشنل کورٹ میں وہ دو سال تک رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات بتائے۔ راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں شاہ اردن کی دعوت پر وہ چار روز کے لئے اردن بھی جا چکے ہیں۔ جسٹس پاٹھک سے میں نے کہا کہ آپ نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر بہت کچھ دیکھا ہے۔ آپ اپنا کوئی انوکھا واقعہ (incident) بتائیے۔ مگر اس وقت انھوں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں بتایا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ پھر بتائیں گے۔

جسٹس آر ایس پاٹھک نے بتایا کہ جب وہ انٹرنیشنل کورٹ میں پہنچے اور پہلا فیصلہ لکھا تو میرا فیصلہ رد کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ میں نے اسی عام زبان میں لکھا تھا جس کا میں ہندستان کی عدالت میں عادی ہو چکا تھا۔ یعنی ایک فریق کی جیت اور دوسرے فریق کی ہار کا اعلان۔ مگر

انٹرنیشنل کورٹ کے فیصلوں میں یہ زبان نہیں چلتی۔ وہاں فریقین کی سماعت کے بعد جج جب فیصلہ دیتا ہے تو اس کو وہ ایسی زبان میں لکھتا ہے کہ جیتنے والا تو اس میں فاتح نظر آئے مگر ہارنے والا بھی اپنے کو مفتوح نہ سمجھے۔

کالکا سے شملہ کا سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ یہ سفر تقریباً تین گھنٹہ کا تھا۔ پورا راستہ سرسبز وادیوں کے درمیان سے گزرا۔ میں نے سوچا کہ یہ مناظر کتنے حسین ہیں۔ ان کو دیکھ کر جی چاہنے لگتا ہے کہ انھیں کے درمیان زندگی گزاری جائے۔ مگر جب آدمی یہاں شہر بساتا ہے تو طرح طرح کی آلودگی بہت جلد اس کے حسن کو غارت کر دیتی ہے۔ اور اگر شہر نہ بسایا جائے تو انسان جیسی مخلوق کے لئے ان کے درمیان زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ کیسا عجیب عجز ہے جس سے انسان اس دنیا میں دوچار ہے۔ شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ ــــ لقد خلقنا الانسان فی کبد۔

ہماری کار کے ڈرائیور گردیال سنگھ تھے۔ ان سے میں نے گاڑی چلانے کی بابت سوالات کئے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی چلاتے ہوئے ہم کو ہر وقت سجگ رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم آپ ٹھیک چل رہے ہیں، دوسرا غلط آ گیا تو اس سے بھی ہمیں کو بچاؤ کرنا پڑتا ہے۔

دوسری بات انھوں نے میدانی سفر اور پہاڑی سفر کے بارہ میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ میدان میں تو سڑک دور تک دکھائی دیتی ہے۔ وہاں آپ گاڑی کو تیز بھی دوڑا سکتے ہیں۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر آپ ۳۰۔ ۳۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں جاسکتے۔ یہاں بار بار موڑ آتا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ہوتا کہ موڑ کے ادھر کیا ہے۔ اس لئے ہم کو سلو چلنا پڑتا ہے، ورنہ ٹکراؤ کا بہت ڈر ہے۔ راستہ میں کئی جگہ گاڑیاں الٹی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ شاید وہی لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑی سڑک پر بھی اپنی گاڑی اس طرح دوڑانی شروع کر دی تھی جیسے کوئی شخص میدانی سڑک پر گاڑی دوڑاتا ہے۔

ایک جگہ لینڈ سلائڈ ہوا تھا۔ مٹی اور پتھر بہت بڑی مقدار میں اوپر سے گر کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ تاہم یہ سڑک کافی چوڑی ہے۔ اس لئے ملبہ آدھی سڑک تک پھیلا۔ وہ پوری سڑک پر پھیل کر سواریوں کے لئے رکاوٹ نہ بن سکا۔

سڑک کے ذریعہ تقریباً ڈھائی گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم 'بادلوں' کے اندر داخل ہوگئے۔ شملہ ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس لئے یہاں موسم بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں آتے ہی ہم بادلوں کی اونچائی پر پہنچ جاتے ہیں۔

زمین پر جس طرح کبھی کبھی کہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ سے سڑک پر کسی قدر اندھیرا ہوگیا تھا۔ اس طرح بادلوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم شملہ میں داخل ہو گئے۔

شملہ میں میرا قیام ہوٹل ہالی ڈے ہوم (کمرہ نمبر ۳۰۶) میں تھا۔ میدانی ہوٹلوں کی طرح اس سے ملحق لان اور گارڈن نہیں ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر جو ہوٹل بنائے جاتے ہیں وہ عام طور پر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یہاں ایک سرکاری افسر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جب میں طالب علم تھا تو میرے بہت سے دوست تھے۔ پھر جب میں جونیئر افسر کی پوسٹ پر تھا تب بھی میرے دوستوں کی تعداد کافی تھی۔ مگر جب میں ترقی کرکے اعلیٰ افسر بن گیا تو میرے دوست بہت کم ہوگئے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی وجہ آپ کے خیال سے کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ رقابت (rivalry) اسی کو مذہب کی اصطلاح میں حسد کہا جاتا ہے۔

حسد کا مرض اس دنیا میں بہت زیادہ عام ہے۔ بلکہ شاید کوئی بھی شخص اس جذبہ سے خالی نہیں۔ دوسرا آدمی جب تک آپ کو اپنے سے کم یا برابر دکھائی دے، آپ کے احساسات اس کے بارہ میں نارمل رہتے ہیں۔ مگر جب آپ کو محسوس ہو کہ دوسرا شخص عہدہ یا مال یا شہرت میں آپ سے آگے بڑھ گیا ہے تو فوراً آپ کے اندر اس کے خلاف جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اس کی کاٹ کرنے لگتے ہیں تاکہ اس کو غلط بتا کر اپنے اس جذبہ کو تسکین دیں کہ اب بھی آپ اس سے بلند ہیں۔

یہ نفسیاتی کمزوری کبھی شعوری طور پر آدمی کے اندر آتی ہے لیکن زیادہ تر آدمی کے دماغ میں غیر شعوری طور پر داخل ہوجاتی ہے۔ بطور خود آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے اندر کسی کے خلاف جلن اور حسد نہیں۔ حالاں کہ آپ مکمل طور پر حسد کی ذہنیت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔

شملہ ہماچل پردیش کا صدر مقام ہے۔ وہ ہمالیہ کے اوپر ۲۲۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ وہ ہندستان کے چند انتہائی مشہور پہاڑی مقامات میں سے ایک ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ کیلومیٹر ہے۔

شملہ کو ۱۸۱۴-۱۶ میں انگریزوں نے بسایا تھا۔ اس وقت اس کا مقصد برطانی فوجی دستوں کو وہاں رکھنا تھا۔ بعد کو وہ گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے ایک مقبول پہاڑی مقام بن گیا۔ ۱۸۶۵ سے ۱۹۳۹ تک وہ گرمیوں کے لئے ملک کی راجدھانی رہا۔

جب تک میں نے شملہ کو نہیں دیکھا تھا، شملہ ایک افسانوی شہر معلوم ہوتا تھا۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی دوسری بستیوں کی طرح ایک بستی ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں فطرت کا حسن ہوگا۔ صحت بخش ہوا لوگوں کو ملتی ہوگی۔ سکون کا ماحول نظر آتا ہوگا۔ مگر آج وہ شملہ کہیں موجود نہیں۔ اس کے راستوں میں چلتے ہوئے میرا احساس یہ تھا کہ یہ گویا مکانوں کا ایک جنگل ہے جس میں کچھ انسان نما مخلوق ہر طرف بھیڑ لگائے ہوئے ہے۔ پچاس سال پہلے کا شملہ اب یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

جیسے ہی ہماری گاڑی شملہ کے اندر داخل ہوئی، اس سے میری دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ میں دن اور گھنٹہ گننے لگا کہ کب یہاں سے واپسی ہوگی۔ مجھ کو فطرت کا ماحول پسند ہے۔ مگر آج کے شملہ کے لئے فطرت کا حسن ایک قصۂ ماضی بن چکا ہے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو ہندستان پر برطانیہ کی حکومت قائم تھی۔ اس نے ہندستان کو بھی جنگ میں شریک کر دیا۔ مہاتما گاندھی کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان ایک عدم تشدد کا ملک ہے۔ اس کو تشدد کے معاملہ میں فریق نہیں بننا چاہئے۔

وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے بذریعہ ٹیلی گرام مہاتما گاندھی کو شملہ آنے کی دعوت دی تاکہ اس مسئلہ پر گفتگو کی جاسکے۔ مہاتما گاندھی فوراً ٹرین سے سفر کر کے شملہ پہنچے۔ لوئی فشر کی رپورٹ کے مطابق، مہاتما گاندھی نے شملہ میں کہا کہ میں خدا سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی متشددانہ چیزوں کو ظہور میں آنے کی کیوں اجازت دیتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدم تشدد ناکام ہوگیا اور خدا بھی ناکام ہوگیا:

non-violence had failed, God had failed. (p. 350)

مگر اس تبصرہ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ دوسری عالمی جنگ ہٹلر نے چھیڑی تھی۔ یہ جنگ کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک سرکش انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے جنگ چھیڑی۔ مگر خدا نے اس جنگ کی آگ کو بجھا دیا۔ اس کو زیادہ بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد پاکستان کے ۹۰ ہزار فوجی گرفتار ہو کر ہندستان لائے گئے۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ وہ اپنے فوجیوں کو چھڑا کر لے جانے کے لئے ہندستان آئے۔ مسز اندرا گاندھی سے ان کی بات چیت بھی شملہ میں ہوئی۔ آخر کار وہ اتفاق نامہ طے پایا جس کو شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس میں طے پایا تھا کہ دونوں ملک اپنے اختلافات کو (بشمول جموں وکشمیر) دو طرفہ گفتگو کی بنیاد پر پر امن طریقہ پر حل کریں گے (کلاز ۲)

اس ایگریمنٹ کی رو سے پاکستان نہ کشمیر کے مسئلہ پر جنگ چھیڑ سکتا تھا اور نہ ہندستان کے خلاف وہ گوریلا وار شروع کرا سکتا تھا جو ان کی مدد سے ۱۹۸۹ سے جاری ہے۔ ۱۹۹۲ کے پاکستانی الکشن میں جماعت اسلامی پاکستان نے اس کو اپنا اشو بنایا۔ اس نے کہا کہ شملہ ایگریمنٹ ہمارے لئے کشمیر کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ کشمیر جنگ کے بغیر نہیں مل سکتا اور اس ایگریمنٹ نے ہم کو جنگ چھیڑنے سے روک دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں ووٹ دو تا کہ ہم اس ایگریمنٹ کو ختم کر کے انڈیا سے جنگ کریں اور کشمیر کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس زمانہ میں ان کا نعرہ ہوتا تھا:

ٹوٹے شملہ کی زنجیر لینا ہے اب تو کشمیر

مگر پاکستانی قوم جماعت اسلامی کے اس نعرہ سے متاثر نہیں ہوئی۔ الکشن ہوا تو امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب سمیت جماعت کے تمام لیڈر بری طرح ہار گئے۔

برطانی دور میں شملہ گرمی کے لئے ملک کی راجدھانی سمجھا جاتا تھا۔ آزادی ہند کی بہت سی گفت گوئیں شملہ میں ہوئیں۔ شملہ سے بہت سی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں شملہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ لارڈ ویویل اس وقت برطانیہ کے وائسرائے تھے۔

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے اونچے لیڈر اس میں شریک ہوئے۔

اس بات چیت میں برطانی حکومت کی طرف سے جو نقشہ پیش کیا گیا، اس میں مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو برابر کا تناسب دیا گیا تھا:

The plan provided for equal proportion of Moslems and Caste Hindus in the Viceroy's Council. (p. 114)

مگر مسٹر جناح کے انکار کی وجہ سے یہ منصوبہ منظور نہ ہوسکا۔ کیوں کہ برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کوئی منصوبہ نہ طے کرے۔ مسٹر جناح نے ایک اخباری بیان میں کہا:

We could settle the Indian problem in ten minutes, if Mr. Gandhi would say, 'I agree that there should be Pakistan; I agree that one-fourth of India, composed of six provinces — Sind, Baluchistan, the Punjab, the Northwest Frontier Province, Bengal, and Assam — with their present boundaries, constitute the Pakistan State. (p. 413)

شملہ میں ہر طرف نیچے اونچے راستے ہیں۔ اس لئے شہر کے اندر رسال بر داری کا کام جزئی طور پر سواریوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ یہاں بے شمار مزدور ہیں جو ہر وقت یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب منظر بار بار یہ دکھائی دیا کہ ایک مزدور کوکنگ گیس کے دو بھرے ہوئے سلنڈر اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے ہے، اور جھکی ہوئی حالت میں اس کو لے کر چل رہا ہے۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ اس قسم کی پر مشقت مزدوری کرنے والے زیادہ تر کشمیری لوگ نظر آئے۔

۱۹۸۹ سے پہلے کشمیر میں سیاحوں کی مسلسل آمد کی وجہ سے کشمیریوں کے لئے روزی کمانا بہت آسان تھا۔ اس کے بعد وہاں سیاحوں کی آمد رک گئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کشمیری لوگ مجبور ہیں کہ وہ باہر جاکر سخت محنت کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کریں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان کی مصیبتوں کے اصل ذمہ دار دو ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح، اور جواہرلال نہرو۔ مسٹر جناح کی فرقہ وارانہ سیاست نے ملک کو ہندو مسلم نفرت سے بھر دیا۔ پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارا ازلی دشمن ہے، زیادہ صحیح طور پر انھیں کہنا چاہئے کہ جناح کی تفریقی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ازلی طور پر ایک دوسرے کا

دشمن بنادیا۔

اس کے بعد جواہر لال نہرو کی سوشلسٹ اقتصادیات نے ہندستان کو تباہ کر دیا۔ اس نے ملک کو بے شمار نقصانات پہنچائے۔ انھیں میں سے ایک عام نقصان یہ ہے کہ اس اسکیم نے قوم کی قوم کو کاہل (Lethargic) بنا دیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ پہلے دہلی میں کوکنگ گیس کا یہ حال تھا کہ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد وہ کئی دن پر آتی تھی۔ اب لبرلائزیشن کے بعد یہ حال ہے کہ ایک ٹیلی فون کیجیے، اور اسی دن گیس کا سلنڈر آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کے علاقہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوبارہ اس علاقہ میں جمانے کے لئے سب سے زیادہ جس نے کام کیا وہ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا گیا، اس کی ایک مثال مولانا ممتاز احمد قاسمی ہیں۔ ۱۹۶۳ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ وہ دہلی آکر مولانا محمد میاں صاحب سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا محمد میاں ان کے لئے حکیم عبد الحمید صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تاکہ طبیہ کالج میں آسانی سے ان کا داخلہ ہو جائے۔ مولانا محمد میاں نے ان کی بات سننے کے بعد کہا کہ اگر تم میرا مشورہ مانو تو میں تم کو ایک اور زیادہ بہتر کام بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ دیکھو، یہ ہماچل پردیش کے ایک گاؤں سے خط آیا ہے کہ یہاں ایک عالم بھیجئے۔ میری رائے ہے کہ تم وہاں چلے جاؤ۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اللہ کے بھروسہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ شملہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی مسجد میں آکر وہ مقیم ہو گئے۔ مگر شروع میں یہ حال تھا کہ اتنے مسلمان نہیں ملتے تھے کہ باجماعت نماز قائم ہو سکے۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں صرف دو آدمی تھے۔ تیسرے کی تلاش میں وہ باہر نکلے۔ ایک جاہل مسلمان گھاس کا گٹھر باندھ کر کھڑا ہوا تھا۔ مولانا ممتاز صاحب نے اس سے مسجد چلنے کے لئے کہا۔ اس نے کہا کہ تم مولویوں کو اور تو کوئی کام نہیں۔ پھر وہ بولا کہ اگر تم میرا یہ گھاس کا گٹھر اٹھا لو تو میں تمہارے ساتھ مسجد چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مولانا ممتاز صاحب نے فوراً دونوں ہاتھوں سے گھاس کا گٹھر اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اب وہ دیہاتی مسلمان مسکرانے

لگا اور مسجد میں آکر نماز میں شریک ہوگیا۔ آج یہ گاؤں کافی ترقی کر چکا ہے۔ اب وہاں نہ صرف مدرسہ اور مسجد آباد ہیں، بلکہ وہاں کے مسلمان تعلیم اور اقتصادیات میں بھی کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ممتاز صاحب شملہ منتقل ہو گئے۔

ہماچل پردیش پہلے پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ میں یہاں جو قتل و خون ہوا اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ علاقہ اب ہمیشہ کے لیے ناقابل رہائش ہو چکا ہے۔ مگر آج دوبارہ یہاں مسلمان معتدل حالات میں آباد ہو رہے ہیں۔ ہماچل پردیش اور پنجاب کے ہر حصہ میں مسلمان دوبارہ نظر آنے لگے ہیں۔

پنجاب کے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جائدادیں اور ان کی مسجدیں دوبارہ ان کو حاصل ہو گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی تازہ خبر یہ ہے کہ پنجاب کے شہر مکتسر میں ایک بڑی مسجد تھی جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق "بابا ٹھاکر سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے مکتسر کی اس جامع مسجد کو آپسی بھائی چارہ کے فروغ کے لئے مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہاں سے سکھوں کے جھنڈے اور شری گورو گرنتھ صاحب کو بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۹۴۷ کے بعد گوردوارہ کے طور پر استعمال کی جارہی تھی۔ اور مقامی شری گورو سنگھ سبھا اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ تقریباً ۱۵ سال پہلے سردار کرتار سنگھ بھنڈراں والا نے اس مسجد میں سکھوں کا جھنڈا نصب کیا تھا۔ (اخبار نو، نئی دہلی۔ ۱۵–۲۱ جولائی ۱۹۹۴)

فساد خواہ کتنا ہی بڑا ہو، بہت جلد اس کی حد آجاتی ہے، اور آخرکار جس چیز کو فتح اور بقا حاصل ہوتی ہے وہ امن ہے۔ فساد ایک وقتی حادثہ ہے اور امن ایک دیرپا حقیقت۔

۴ جولائی کی شام کا وقت ہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا ہے۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں ہوں اور شیشہ کے اُس پار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قریب میں کچھ درخت کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور بھورے رنگ کے بادلوں میں ہر چیز ڈوبی ہوئی ہے۔ دیکھنے سے پہلے شملہ ایک پراسرار مقام محسوس ہوتا تھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بعض ظاہری فرق کے ساتھ وہ بھی دوسرے شہروں کی طرح ایک شہر ہے۔ کسی پہلو سے اگر شملہ زیادہ ہے تو کسی اور پہلو سے وہ کم ہے۔ اسی طرح ہمارے عام شہر اگر کسی سے کم نظر آتے ہیں تو کسی اور پہلو

سے وہ زیادہ دکھائی دیں گے۔

کانفرنس ۵ جولائی ۱۹۹۴ کو راشٹرپتی نواس (وائسریگل لاج) کے ایک ہال میں شروع ہوئی۔ افتتاحی اجلاس میں سب سے پہلے ایک مرد اور ایک عورت نے مل کر گیتا (سنسکرت) کا ایک حصہ ترنم کے ساتھ پڑھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ کسی بھی مذہبی کتاب کی تلاوت میں وہ شان پیدا نہیں ہوتی، جو قرآن کی تلاوت میں پائی جاتی ہے۔ دوسری مذہبی کتابوں اور قرآن کو اگر ایک ساتھ پڑھا جائے تو صرف لفظی تلاوت ہی قرآن کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی۔

اس کے بعد مسز سونیا گاندھی نے افتتاحی خطبہ انگریزی میں پڑھا۔ اس کانفرنس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اور اس کی تمام کارروائیاں از اول تا آخر انگریزی میں ہوئیں۔

شملہ کی اس کانفرنس کا افتتاح پرائم منسٹر نرسمہا راؤ کرنے والے تھے۔ مگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ ان کا پیغام مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے پڑھ کر سنایا۔ ان کے علاوہ مسز سونیا گاندھی، مسٹر نٹور سنگھ اور ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور بہت سی اعلا شخصیتیں اس میں شریک ہوئیں۔

اس طرح کی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں باشندوں کے اعتبار سے دو ملک پائے جاتے ہیں۔ ایک لور انڈیا، اور دوسرے اپر انڈیا۔ لور انڈیا ۹۹ فیصد لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ایک فیصد انگریزی دانوں کی سطح پر ایک اپر انڈیا ہے۔ یہاں ہر چیز بقیہ ملک سے مختلف ہے۔ یہ تقریباً وہی تقسیم ہے جو برطانوی دور میں انگریزوں اور غیر انگریزوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔

راشٹرپتی نواس کے بڑے ہال (ball room) کی ۲۵۰ کرسیاں سب کی سب بھری ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کناروں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد میں اپنی نشست کی طرف خاموشی سے بڑھ رہا تھا کہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک معمر خاتون نے میرا نام پوچھتے ہوئے کہا:

Sir, due to your impressive personality, I want to know your name.

ہال کے اندر تمام لوگ شاندار کپڑوں میں ملبوس تھے۔ میں اپنے سادہ کپڑے اور لمبی سفید

داڑھی میں ان کو ایک 'درویش' دکھائی دیا۔ ہندو قوم فقیروں اور درویشوں کے حلیہ سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ غالباً اسی طرح کے احساسات کے تحت مذکورہ خاتون نے میرے بارہ میں دریافت کیا۔

موجودہ وائسریگل لاج جون ۱۸۸۸ میں بن کر تیار ہوا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ وائسرائے کی رہائش گاہ تھا۔ آزادی کے بعد اس کا نام راشٹرپتی نواس رکھا گیا اور وہ گرمیوں کے موسم میں ہندستانی صدر کی رہائش گاہ قرار پایا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اکتوبر ۱۹۶۵ میں اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے حوالے کر دیا، اب اسی ادارہ کے دفاتر اس عمارت میں قائم ہیں۔ تاہم اب یہ عمارت جگہ جگہ سے خستہ ہوگئی ہے۔ اس کی دیکھ ریکھ (maintenance) کے لئے مرکزی حکومت سالانہ ۲۰ لاکھ روپیہ دیتی ہے۔ مگر وہ ناکافی ہے۔ اور اس کے منتظم مرنیال میری نے حکومت سے دو کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا ہے۔

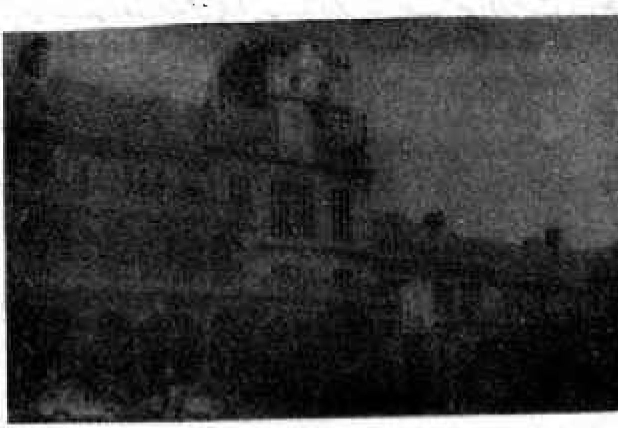

The viceregal lodge in Shimla which now houses the Indian Institute of Advanced Studies

راشٹرپتی نواس (قدیم وائسریگل لاج)، جہاں یہ کانفرنس ہوئی، وہ بہت بڑا ہے اور عالی شان محل کی مانند ہے۔ اس میں تین سو سے زیادہ کمرے ہیں اور کئی بڑے بڑے ہال ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اپنی تقریر میں اس بلڈنگ کی تاریخی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ملک کی تقسیم کا

منصوبہ اسی عمارت کے ایک کمرہ میں مکمل کیا گیا تھا جو ہمارے اس ہال سے زیادہ دور نہیں ہے:

The partition plan (1947) was finalised here in a room not far from this one.

تاہم یہ سو سالہ عمارت اب کافی حد تک قابل مرمت ہو چکی ہے۔ اور عمارت کے ذمہ داروں کے پاس اتنا فنڈ نہیں کہ وہ اس کے شایان شان اس کی مرمت کر سکیں۔

اس کانفرنس کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ گڈ سوسائٹی کیسے بنائی جائے۔ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گڈ سوسائٹی کے بارہ میں فلسفی کا پرسپشن ایک ہے، اور کامن مین کا پرسپشن گڈ سوسائٹی کے بارہ میں دوسرا ہے۔ کیا یہاں اچھے سماج کا کوئی عالمی نظریہ پایا جاتا ہے:

Is there a universal definition of a good society.

اس طرح کے معاملات میں نظریاتی وحدت صرف مقدس کتاب کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے مباحثہ کے ذریعہ ایسے معاملات میں نظریاتی وحدت حاصل کرنا ممکن نہیں۔

مرکزی وزیر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے حکومت کی جدید اقتصادی پالیسی (لبرلائیزیشن) پر تقریر کی۔ تقریر کے بعد لوگوں نے ان پر سوالات کی بوچھار کر دی خاص طور پر خواتین نے۔ کیونکہ باروزگار خواتین زیادہ تر پبلک سکٹر میں ہیں اور پبلک سکٹر کے ختم ہونے سے عورتوں کے لئے روزگار کے مواقع بہت کم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ (وزیر مالیات) نے نہایت جرأت کے ساتھ سوالات کا سامنا کیا۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ من موہن سنگھ کی ایک صفت میں نے یہ دیکھی کہ انھوں نے کسی سوال کا جواب ٹالنے والے (evasive) انداز میں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا: جو آدمی ڈبل ٹاک نہیں کرتا وہ کبھی ٹالنے والا جواب (evasive reply) نہیں دے گا۔

ڈاکٹر من موہن سنگھ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم باہر پیسہ لانے کے لئے گئے تو ایک افسر نے ہم کو جواب دیا کہ ہز اکسیلنسی، آپ کے ملک سے جتنا پیسہ باہر جا رہا ہے اس کو ملک میں روک لیجئے۔ پھر باہر سے آپ کو پیسہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

میں نے ڈاکٹر من موہن سنگھ سے کہا کہ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ پہلے شخص

ہیں جو میرے خواب کو پورا کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ میں جب جواہر لال نہرو نے سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی کا نعرہ دیا اس وقت سے میں اس کا مخالف رہا ہوں۔ میرے نزدیک ہندستان کے تمام اقتصادی مسائل کا سبب یہی ہے۔ آپ بہادرانہ طور پر اس کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ آپ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ سب سطحی سوچ کا شکار ہیں۔ آپ اس مہم کو جاری رکھئے، مستقبل میں لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ سوشلسٹ پالیسی کے مقابلہ میں لبرل پالیسی ہی زیادہ درست تھی۔

ہماچل پردیش کے چیف منسٹر راجہ ویربھدر اسنگھ نے اپنی تقریر میں ایک ہندو دعا کا ذکر کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ انھوں نے اس طرح سنایا:

Lead us from untruth to truth
Lead us from darkness to light.
Lead us from death to immortality.

ہم کو غیر سچائی سے نکال کر سچائی کا راستہ دکھا۔ ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آ۔ ہم کو موت سے نکال کر ابدیت میں لے آ۔

اس دعا کا آخری حصہ کس قدر مبہم ہے۔ موت خاتمۂ حیات نہیں، وہ بجائے خود ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت اگلے مرحلۂ حیات میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پولٹیکل سسٹم اور پولٹیکل کلچر کے درمیان بہت فرق ہے۔ ہمارے یہاں کہنے کے لئے ڈیموکریسی ہے۔ مگر ڈیموکریسی کی اسپرٹ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ راستہ روکو، ریل روکو، یہ ڈیموکریسی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ڈیموکریٹک کلچر نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ ڈیموکریسی کے ساتھ ڈیموکریسی کی روایات بھی ضروری ہیں۔ ہمارے یہاں ڈیموکریسی تو آگئی۔ لیکن ڈیموکریسی کی روایات قائم نہیں ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ڈیموکریسی عملاً انارکی بن کر رہ گئی ہے۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغربی طرز فکر آج بھی ہمارے سماج پر غلبہ حاصل کئے ہوئے ہے:

Western framework of thinking is dominating our society

ٹھیک اسی قسم کی باتیں پاکستان کا روایت پسند طبقہ بھی پاکستان میں دہرا رہا ہے۔ دونوں نے اولاً مغرب کو برا بتا کر اس کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کی۔ مگر اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ دونوں ہی نے دوبارہ مغرب کے تہذیبی غلبہ کو مزید شدت کے ساتھ قبول کر لیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مذہب کی ترقی رک جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ مذہب میں سوال یا شبہ کو امر ممنوع سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ شبہ ثبوت کا آغاز ہے:

Doubt is the beginning of proof.

میں نے کہا کہ آپ اگر مذہب کے بجائے اہل مذہب کا لفظ بولیں تو مجھے اس سے اتفاق ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ تو غور وفکر اور تحقیق کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسی بنا پر دور اول میں مسلمانوں نے علم وتحقیق کے میدان میں غیر معمولی ترقیاں کیں۔ مگر مسلمانوں کی موجودہ نسلوں میں فکری زوال کی بنا پر ضرور ایسا ہے کہ وہ سوال اور تنقید سے بھڑکتے ہیں۔ اور اس کی قیمت انھیں اس صورت میں مل رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم وفکر کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔

ایک ہندو جرنلسٹ سے موجودہ جرنلزم پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ہندستانی جرنلزم کی سطحیت کی شکایت کی۔ انھوں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہمارے قومی مزاج سے آجکل محنت نکل گئی ہے۔ اس کا اثر جرنلزم پر بھی پڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آجکل تحقیقی صحافت (investigative journalism) نام ہے دو رپورٹ پڑھ کر ایک آرٹیکل لکھ دینے کا۔ اور اگر آپ نے تین رپورٹ پڑھ لی تو آپ ایوارڈ کے مستحق بن جائیں گے۔

ایک صاحب کیمونزم سے متاثر تھے۔ ان سے گفتگو ہوئی مگر انھوں نے کیمونسٹ فکر کی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ کیمونسٹ روس کی ناکامی کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ کیمونسٹ سسٹم کے ٹوٹنے کو اس معنی میں نہیں لیا جاسکتا کہ تاریخ نے اشتراکی طرز معیشت کو رد کر دیا ہے:

The collapse of communism should not be regarded as history's rejection of the socialist pattern.

میں نے کہا کہ یہ دلیل صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ ایک شخص اگر یہ کہے کہ لوگوں کے اندر خوف خدا

آجائے تو سماجی برائیاں مٹ جائیں گی تو اس نظریہ کی صحت کو اس سے جانچا جائے گا کہ خوف خدا آنے کے بعد سماجی برائی مٹی یا نہیں۔ مگر اشتراکیت کی بنیاد فکری تبدیلی پر نہیں ہے بلکہ پیداوار اور تقسیم کے خارجی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ اس لئے اگر خارجی نظام بدلنے کے باوجود سماجی برائیاں نہ مٹیں تو اس سے اشتراکی نظریہ رد ہو جائے گا۔ اول الذکر کو جانچنے کا معیار فکری تبدیلی ہے اور ثانی الذکر کو جانچنے کا معیار خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی۔ چوں کہ سوویت یونین میں خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی کے باوجود سماجی برائیاں ختم نہیں ہوئیں، اس لئے سوویت یونین کی ناکامی خود اشتراکیت کی ناکامی کے ہم معنی قرار پائے گی۔

ایک صاحب نے مہاتما گاندھی کا یہ قول دہرایا کہ دنیا میں آدمی کی ضرورت کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر آدمی کی حرص کے لئے بہت زیادہ نہیں:

> There was enough in the world for every ones's need but not for everyone's greed.

یہ بات بالکل درست ہے۔ موجودہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں اتنا ہی سامان رکھا گیا ہے جو آزمائش کے لئے ضروری ہو۔ انسان کی خواہشات کی لامحدود تکمیل کے لئے آخرت کی دنیا ہے۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنی آزمائش میں پورے اتریں گے وہ آخرت میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لامحدود سامان پالیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں خوش قسمتی سے امپیریلزم اور نسل پرستی انسانیت کے ایجنڈے پر نہیں ہیں۔ اب ایک نئے ورلڈ کی باتیں ہر طرف کی جارہی ہیں:

> Colonialism, imperialism and racialism are fortunately no longer on the agenda of humankind. There is much talk of a new world order.

یہ بات درست ہے کہ مختلف تجربات کے بعد اب انسانی ذہن کسی نئی چیز کی تلاش میں ہے۔ یہ نئی چیز مذہب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ سیکولر نظریات سب کے سب ناکام ہو چکے ہیں۔ اس نے دین حق کے لئے دوبارہ نئے مواقع دے دیے ہیں۔ مگر دین حق کو نئی دنیا میں عظمت کا مقام

دینا گن کلچر کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف دلیل کے زور پر ہی ہو سکتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دین حق کو جدید انسان کے فکری مستوی پر پیش کیا جائے۔ اگر ایسا ہو سکے تو دین حق کو دوبارہ تاریخ میں واپسی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

دسمبر ۱۹۹۰ میں جے پور میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کا ایک اجلاس ہوا۔ وہاں کچھ ہندوؤں نے یہ نعرہ لگایا: جو ہندو ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔

کچھ اور ہندوؤں کو یہ نعرہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ حتی کہ اگلے دن اجلاس ہوا تو انھوں نے نعرہ لگایا: جو راشٹر ہت میں بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا۔ (ہندستان ٹائمس، سنڈے اڈیشن، صفحہ ۲)

یہ واقعہ علامتی طور پر اس صورت حال کو بتا رہا ہے جو اس وقت ہندو قوم کے اندر موجود ہے۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی نمائندگی اول الذکر نعرہ میں ہو رہی ہے، اور دوسرے وہ جن کی نمائندگی ثانی الذکر نعرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اسی کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے (البقرہ ۲۵۱، الحج ۴۰) یہ فطرت کا نظام ہے کہ وہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ دفع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مفسد یا انتہا پسند کبھی زیادہ تک یا بہت دور تک اپنا کام نہیں کر پاتا۔ جب بھی کوئی شخص یا گروہ ایسا اٹھتا ہے تو فطرت کی طاقتیں اس کا مقابلہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے سیناروں کے بارہ میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں۔ یہاں بھی میں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر خوبصورت الفاظ کے فرضی قلعے بناتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذاتی زندگی میں آخری حد تک پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ مگر سیمنار میں آتے ہی وہ آئیڈیلسٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی باتیں خوبصورت الفاظ بکھیرنے کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر نہیں کر پاتے۔ خوبصورت الفاظ سے میری مراد کیا ہے، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں انڈیا کی اقتصادیات پر بولتے ہوئے کہا:

We have to see that the economy becomes sound and we are able to integrate with the global economy.

بظاہر یہ الفاظ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔ اور نہ اس طرح کے الفاظ سے ملک کا کوئی اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

ایک دانشور نے کہا کہ آپ کو اپنے سماجی حالات کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا ہوگا:

You will have to combine your social conditions to the modern technology.

یہ بھی اسی قسم کا ایک خوبصورت جملہ ہے۔ وہ سننے میں تو اچھا لگتا ہے مگر اس کے اندر ہمارے لئے کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں۔

یہاں جن لوگوں نے تقریریں کیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز تھا۔ مگر مجھے سب سے زیادہ شری ارجن سنگھ (مرکزی وزیر) کا انداز پسند آیا۔ ان کے ہاتھ میں چند ٹائپ شدہ اوراق تھے۔ انھوں نے اس کو پڑھا نہیں۔ بس درمیان تقریر میں کبھی کبھی وہ اس یادداشت پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، اور پھر برجستہ انداز میں اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر سنجیدہ لہجہ میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ نہ کبھی زور سے بولے اور نہ کبھی جوش دکھایا۔ شروع سے آخر تک یکساں سلجھا ہوا انداز رہا۔

چائے کا وقفہ ہے۔ لوگ ایک ہال کے اندر جمع ہیں۔ میں ایک کنارے کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ لوگ خوش ہیں۔ وہ شوق سے کھا پی رہے ہیں اور آپس میں تفریحی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ غمگین دل کے ساتھ میری زبان سے نکلا: آہ، کس طرح لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ "چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات" کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو حقیقت سے باخبر کرنے کی صورت صرف یہ تھی کہ مسلمان صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے داعیانہ کردار پر قائم رہتے۔ وہ ہر قیمت پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نارمل تعلقات کو باقی رکھتے۔ وہ نفرت اور کشیدگی اور ضد کو ختم کر دیتے، خواہ اس کے لئے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ اگر ایسا ہوتا تو دونوں فرقوں کے درمیان معتدل حالات میں انٹرایکشن ہوتا۔ اس کے درمیان بالکل فطری طور پر علم حقیقت لوگوں تک پہنچتا رہتا۔ اس کوتاہی کے ساتھ اگر مسلمانوں کا ایک ایک شخص تہجد گزار ہو جائے تب بھی اللہ کے یہاں وہ بری الذمہ ہونے والے نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے پر فخر انداز میں کہا کہ سیمٹک مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ سچائی ایک

ہے۔ مگر ہندوازم میں اس قسم کا ریجڈ نظریہ نہیں۔ ہندوازم میں مانا گیا ہے کہ حقیقت کے مختلف روپ ہو سکتے ہیں۔ سبھی مذاہب اپنی اپنی جگہ پر سچے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات کہنے میں تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو آپ کو اس میں کئی خلا نظر آئے گا۔ مثلاً اس تصور میں اخلاقی ویلوز سب کی سب اضافی (relative) قرار پاتی ہیں۔ جب دو مختلف اخلاقی رویہ کو بیک وقت درست سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایک اخلاقی معیار اور دوسرے اخلاقی معیار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں پائے جانے والے موجودہ غیر معمولی کرپشن کی۔

۶ جولائی کو میری صدارت میں جو اجلاس ہوا۔ اس میں لیڈ اسپیکر ڈاکٹر پی آر چاری (آئی اے ایس) تھے۔ پہلے میں نے مختصر طور پر تعارفی تقریر کی۔ اس کے بعد مسٹر چاری نے اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد جن افراد نے بحث میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں ـــــ مسٹر رائنا، ڈاکٹر جگوٹانی، ڈاکٹر برار، پروفیسر پی این دھر، پروفیسر رونددر کمار، پروفیسر رندھاوا، پروفیسر ریٹپال، پروفیسر راؤ، مسٹر نلنی سنگھ، ڈاکٹر کرن بیدی، مسٹر سٹوار سنگھ، مسٹر سریندر ناتھ۔ آخر میں میں نے مفصل طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ پر امن سماج بنانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

مسٹر پی ایس چاری (آئی اے ایس) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷) کے بعد جب بنگال اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر انگریزوں کا سیاسی قبضہ ہو گیا تو ہیسٹنگز (Warren Hastings) کو اس کا پہلا گورنر جنرل بنایا گیا۔ ۱۷۷۸ تک وہ یہاں کا گورنر جنرل رہا۔ اس وقت یہاں کوئی انتظامی ڈھانچہ نہیں تھا۔ دیہاتوں میں زمیندار بے زمین لوگوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ ہیسٹنگز نے بنگال کو انتظامی یونٹوں میں تقسیم کیا اور ہر یونٹ کے لئے ایک انگریز کلکٹر بھیجا۔ ان انگریزوں کو اس نے کوئی تفصیلی قانون یا قاعدے نہیں بتائے۔ ان کو صرف ایک بنیادی ہدایت دیدی ـــــ تم ظالموں اور کسانوں کے درمیان کھڑے ہو جاؤ:

Thou shalt stand between the hand of oppression and the peasantry.

یہی سماجی انتظام کا خلاصہ ہے۔ سماجی حالات کو درست کرنے کے لئے ایک ہی کام کرنا ہے۔ مظلوموں کے خلاف ظالموں کا ہاتھ پکڑ لینا۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو بقیہ حالات خود فطرت کے

رذر پر درست ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں جو حلف الفضول ہوا ، اس کی روح بھی یہی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ پیشگی طور پر تین صفحہ میں لکھ لیا تھا۔ اس کی کاپیاں منتظمین کی طرف سے کانفرنس میں تقسیم کی گئیں۔ یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ لوگوں کا تاثر بہت اچھا تھا۔ مسز انجنا سانیال نے کہا: آپ کا پیپر میں نے پڑھا، اور اس کی کاپی بھی اپنے پاس رکھ لی۔ وہ بہت سرل ہے اور فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کا تاثر جسٹس پاٹھک نے بھی بیان کیا۔

ڈاکٹر کرن بیدی بھی اس کانفرنس میں شریک تھیں۔ وہ انسپکٹر جنرل آف پولیس (آئی جی) ہیں۔ اور اس وقت دہلی جیل (پریزن) کی انچارج ہیں۔ کانفرنس کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ میں آپ کے مضامین ہندی اور انگریزی اخباروں میں پڑھتی رہتی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جیل میں ہم آپ کے لکچر کا انتظام کریں۔ آپ وہاں آئیں اور ہمارے قیدیوں کے سامنے اسلام کی روشنی میں اخلاق اور انسانیت والی باتیں بتائیں۔

انھوں نے بتایا کہ میری ماتحتی میں اس وقت نو ہزار قیدی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیل کا ہر آدمی دھرم میں بشواس رکھتا ہے، اور اگر پہلے وہ ایسا نہیں تھا تو اب وہ ایسا ہو گیا ہے۔ جب میں پولیس افسر بنی تو میرے اندر روحانیت (spirituality) نہیں تھی۔ مگر جیل والوں کو دیکھ کر مجھے بھی دھرم اور روحانیت کے بارہ میں پڑھنا پڑا تاکہ میں ان کو بتا سکوں۔ انھوں نے ہر روز ایک گھنٹہ کے لئے جیل میں سرو دھرم سبھا شروع کر دیا۔ کیوں کہ جیل میں ہر مذہب کے لوگ موجود تھے۔ ان تجربات نے خود ان کے اندر بھی روحانیت پیدا کر دی۔

شملہ سے واپسی کے بعد ۱۰ جولائی کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کرن بیدی کو مشہور میگ سیسے ایوارڈ (Magsaysay Award) دیا گیا ہے جو ۵۰ ہزار ڈالر پر مشتمل ہے۔ یہ ایک انٹرنیشنل ایوارڈ ہے۔ جب ان کو اس ایوارڈ کی خبر ملی تو وہ ناچ اٹھیں۔ انھوں نے کہا :

I am thrilled. It's God's grace.

ڈاکٹر کرن بیدی ایک بہادر اور دیانت دار خاتون ہیں۔ اخبار پڑھنے والے جانتے ہیں کہ

پچھلے دنوں انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انٹرنیشنل سطح پر اعتراف کے بعد اب ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ مشہور مثل ان کے اوپر صادق آئی کہ آدمی پہلے باہر پہچانا جاتا ہے، اس کے بعد اندر کے لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ پہلی بار ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جولائی ۱۹۹۴) میں ان کے بارہ میں مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے:

Kiran Bedi as the ideal police officer.

مسز نلنی سنگھ ٹی وی کی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ وہ اپنے کیریئر میں نہایت کامیاب سمجھی جاتی ہیں۔ ایک عام آدمی ان کو کامیاب خاتون سمجھے گا۔ مگر ایک ملاقات میں انھوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی صرف پیسہ اور شہرت کا نام تو نہیں۔ میں جب زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتی ہوں تو مجھے یہ ساری سرگرمیاں بے کار (futile) نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھ کو جینے کے لئے بظاہر سب کچھ ملا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جیو تو کس کے لئے جیو۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ جب تک آخرت کو نہ جوڑا جائے، زندگی کی معنویت سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ سطحی قسم کے لوگ اس کے بغیر خوش رہ سکتے ہیں مگر ایک سنجیدہ آدمی کبھی اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا کہ زندگی بس اتنی ہے کہ ــــ پیدا ہو، کھاؤ پیو اور مر جاؤ۔

ڈاکٹر محمود صاحب اور اقبال احمد صاحب عرصہ سے شملہ میں رہتے ہیں۔ ۲۴ جولائی کی رات کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ میں تقریباً تین ہزار مسلمان ہیں جن میں زیادہ تر لیبر کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں سات مسجدیں اور ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ۱۹۴۷ تک شملہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کی زمینیں زیادہ تر مسلمانوں کے پاس تھیں۔ مگر تقسیم کے بعد جب پنجاب میں مار کاٹ ہونے لگی تو یہاں کے مسلمان گھبرا کر یہاں سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد پھر یہاں مسلمان دوبارہ جم نہ سکے۔

تقسیم کے نتیجہ میں جو بربادیاں پیدا ہوئیں ان کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ تاہم سب سے بڑی برائی جو تقسیم نے پیدا کی ہے وہ نفرت ہے۔ تقسیم کی تحریک بظاہر اسلام کے نام پر اٹھائی گئی۔ مگر حقیقۃً یہ نفرت کا ایک ہنگامہ تھا۔ اولاً اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل نفرت پیدا کی۔ اور اس کے بعد خود مسلمانوں اور مسلمانوں میں گہری نفرتیں جگا دیں۔ چنانچہ پاکستان

ہیں باہمی نفرت اور تشدد جتنا زیادہ پایا جاتا ہے اتنا کسی بھی دوسرے مسلم ملک میں نہیں۔ اسی بنا پر مسٹر مجید نظامی نے پاکستان کو ناپاکستان کہا ہے (نوائے وقت)

مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ ہوٹل کی روم سروس کو ٹیلی فون کرکے اپنا ناشتہ اور کھانا اپنے کمرہ میں منگا لیا کریں۔ مگر میں قصداً ڈائننگ ہال میں جاکر کھاتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح لوگوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے۔

جب میں لوگوں کو جوش اور انہماک کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اکثر میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ لوگ آخر کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک تو یہ دنیا چپ ہوجانے کی جگہ ہے نہ کہ بولنے کی جگہ۔ اس دنیا کی ہر چیز آدمی سے کہہ رہی ہے کہ خدا کی عظمتوں کو پہچانو، اپنا احتساب کرو، اپنے حال پر غور کرکے اپنے مستقبل کا خاکہ بناؤ۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھیں سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ صرف ایک چیز جانتے ہیں ـــــ بے محابا بولتے رہنا۔

۵ جولائی کی صبح کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کچھ لوگ میرے قریب کی لمبی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا: '۲۵ نکال دو، پھر دیکھو کہ کتنا بچا'۔ دوسرے نے کہا: دیکھو ان گدھوں کو، میرا پروموشن چار سال سے روک رکھا ہے۔ تیسرے نے کہا: اجی سروس میں کیا رکھا ہے، فلاں کو دیکھو۔ چند سال پہلے ٹھیکہ داری شروع کی تھی۔ آج ماروتی کار میں گھوم رہا ہے۔

یہی حال ۹۹ فیصد لوگوں کا ہے۔ سنجیدگی اور گہرائی آج لوگوں سے اٹھ گئی ہے۔ سطحی باتوں کے سوا کسی اور چیز سے لوگوں کو دلچسپی نہیں۔

مسز اجنتا سانیال منتظمین کی ٹیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ شملہ کے راستہ میں مجھ کو چکر آ گیا، اور وہاں قیام کے دوران بھی چکر آتا رہا۔ موصوفہ نے میرے علاج اور آرام کا ہر طرح اہتمام کیا۔ وہ برابر میری خبر گیری کرتی رہتی تھیں۔ راشٹرپتی نواس میں ایک کمرہ انھوں نے میرے لئے خاص کرادیا تھا کہ میں اس میں آرام کروں اور جب جی چاہے، کانفرنس میں آجاؤں۔

میں نے موصوفہ کا شکرادا کیا تو انھوں نے کہا: مجھ کو تو بس آپ آشیرواد دیجئے کہ میں بھی چل سکوں سچائی پر، جیسے کہ آپ چل رہے ہیں سچائی پر۔

شملہ کانفرنس کی میزبانی ہماچل پردیش سرکار نے اپنے ذمہ لی تھی۔ چنانچہ ہماچل پردیش کے گورنر اور چیف منسٹر اور دوسرے سرکاری افراد برابر اس کانفرنس میں ذاتی طور پر شریک رہے۔

ہماچل پردیش (نیز پنجاب اور چنڈی گڑھ) کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ کی کرسی میری کرسی سے ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ گورنری کی میعاد پوری ہونے کے بعد وہ مذہبیات پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام پر کئی کتابوں کے نام مجھ سے پوچھ کر نوٹ کئے۔ ۷ جولائی کی شام کو انھوں نے گورنر ہاؤس میں نہایت اہتمام کے ساتھ تمام شرکاء کانفرنس کو ڈنر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے تمام افراد خاندان کا مجھ سے تعارف کرایا۔ سب کے سب بہت خوش نظر آتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ جب میں کانفرنس سے فارغ ہو کر دہلی واپس آیا تو یہاں خبر ملی کہ ۹ جولائی کی صبح کو ان کے تمام افراد خاندان (گورنر صاحب کو لے کر دس افراد) ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ موصوف اپنی بیوی، لڑکی اور داماد، ان کے دو لڑکے، ایک بیٹا اور اس کی بیوی، اور ان کی دو لڑکی کے ساتھ شملہ سے چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کا چھوٹا جہاز پہاڑی سے ٹکرا گیا اور جہاز کے عملہ سمیت تمام کے تمام مسافر ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کی خبر پاکستانی اخبار (نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۴) میں اس سرخی کے ساتھ چھپی: بھارتی پنجاب کا ہندو گورنر خاندان سمیت طیارے کے حادثہ میں مارا گیا۔

پہاڑوں کے اوپر اس وقت گہرا کہر تھا۔ غالباً دھند (Poor Visibility) کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ جس سرکاری جہاز پر یہ لوگ سفر کر رہے تھے اس کا نام سپر کنگ (super king) تھا۔ مگر فطرت کے مقابلہ میں نہ کوئی سپر ہے اور نہ کوئی کنگ۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے سامنے کانگرس پارٹی کے ایک شخص نے کہا کہ نرسمہا راؤ کو ابھی دس سال اور پرائم منسٹر کے عہدہ پر رہنا چاہئے۔ نرسمہا راؤ نے فوراً جواب دیا کہ یہ بہت بڑی بھول ہے کہ کسی کے لئے دس سال یا بیس سال کی اصطلاح میں سوچا جائے۔ دیکھئے پنجاب کے گورنر سریندر ناتھ کے ساتھ کیا ہوا:

It is a big mistake to think in terms of 10 or 20 years. See what happened to the Punjab governor Surrendra Nath.

شریمتی گایتری رے (Gayatri Ray) اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ وہی اس کانفرنس کی آرگنائزر تھیں۔ جب میں شملہ پہنچا تو وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں کہ یہاں جو لوگ جمع ہوئے ہیں وہ سب آپ کو خصوصی طور پر سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ خوب کھل کر اپنے خیالات رکھیں۔ ۶ جولائی کی شام کو مجھے اس کا موقع ملا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی۔ موضوع تھا: پرامن دنیا کی طرف (Towards a non-violent world)

شریمتی گایتری رے نے اپنا ایک عجیب قصہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۱ میں جب بنگلہ دیش کی جنگ ہوئی، اس وقت ان کے شوہر ہندستانی سفیر کی حیثیت سے ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ پاکستانی فوج نے ان کو ہاؤس ارسٹ (خانہ قید) کر دیا۔ اتفاق سے انھیں دنوں وہ حاملہ تھیں۔ ڈاکٹری حساب کے مطابق، ۱۸ ستمبر کو ان کے یہاں ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے پاکستانی حکام تک اپنی فریاد پہنچائی۔ مگر انھوں نے گھر سے نکل کر اسپتال جانے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کو ان کی مدد کے لئے گھر پر بھیجا۔ لیکن انھوں نے پاکستانی ڈاکٹر کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بھگوان سے خوب پرارتھنا کی کہ وہ ان کی ڈیلیوری کو روک دے۔ ان کی دعا قبول ہوئی۔ اور ڈیلیوری کی تاریخ ایک مہینہ کے لئے مؤخر ہوگئی۔ چنانچہ ان کی دہلی واپسی کے بعد ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ کو ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔

مڈیکل تحقیق کے مطابق، بچہ کی پیدائش ۲۸۰ دن میں ہو جانا ضروری ہے۔ مگر دعا نے اس کو ایک مہینہ تک کے لئے روک دیا۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ: لَا يَرُدُّ القَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ (احمد)

یہاں جو وی آئی پی تھے وہ سب مجھ کو پہلے سے جانتے تھے۔ وہ اخباروں میں میرے مضامین پڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک بڑے شوق سے ملا۔ ہماچل پردیش کے گورنر مسٹر سریندر ناتھ نے کہا کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں مذہب پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمام مذہبوں کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہیں۔ میں اس کے بارہ میں مزید تفصیلی اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس موضوع کی کتابیں بتائیے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر مسلمانوں نے بہت کم

کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے کئی انگریزی اور اردو کتابوں کے نام انھیں نوٹ کرائے۔

میں نے کہا کہ مسلم علما اس نظریہ سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ البتہ غیر مسلم حضرات کو اس سے کافی دل چسپی ہے اور انھوں نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

رشید طالب صاحب ایک کافی تجربہ کار صحافی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ اوسط قاری کی پسند یا ناپسند اس اعتبار سے ہوتی ہے کہ کالم نگار اس کے اپنے خیالات کی تائید کرتا ہے یا تائید نہیں کرتا۔

The average reader approves or disapproves of a columnist depending on how far the columnist rationalises the reader's prejudices.

یہ صرف اخبار کے قاری کی بات نہیں ہے۔ یہی بیشتر انسانوں کی بات ہے۔ بیشتر لوگ صرف وہی باتیں سننا پسند کرتے ہیں جو ان کے مخصوص فکر کی تصدیق کرنے والی ہوں۔ اگرچہ اس مزاج کی یہ بھاری قیمت انھیں دینا پڑتا ہے کہ ان کا فکری ارتقا رک جاتا ہے۔

مسٹر رشید طالب ایک لبرل مسلمان ہیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ اسلام میں نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق کیا جا سکے۔ انھوں نے تسلیمہ نسرین کے خلاف قتل کے فتوے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بد دین کے خلاف اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا کیا جدید معیار انصاف کے مطابق ہے:

Is the Islamic punishment for apostasy fair by modern standards of justice?

میں نے کہا کہ یہ بات آپ اس مفروضہ پر کر رہے ہیں کہ تسلیمہ نسرین کے قتل پر جو لوگ انعام کا اعلان کر رہے ہیں وہ اسلام کے نمائندہ ہیں۔ حالاں کہ وہ ہرگز اسلام کے نمائندہ نہیں۔ یہ تو کچھ بے علم لوگوں کا شور وغل ہے۔ اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ قرآن پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ مخالفوں کی اس قسم کی باتوں کا جواب دلیل سے دیا جا رہا ہے۔ یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ پھر وہ کون سا جدید معیار ہے جس سے اسلام ٹکرا رہا ہے۔

۶ جولائی ۱۹۹۴ کو مسجد بابو گنج دیکھی۔ ۱۹۴۷ میں یہ مسجد نامکمل حالت میں تھی۔ تقسیم کے ہنگامہ میں یہاں کے مسلمان اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس لئے مسجد بھی نامکمل حالت میں پڑی رہی۔ حالات

نارمل ہونے کے بعد دوبارہ مسلمان یہاں آنا شروع ہوئے۔ اب یہ مسجد آباد ہے اور تعمیری اعتبار سے مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے اطراف میں مسلمانوں کے پانچ گھر ہیں۔ مسجد میں ایک مدرسہ ہے اور مختلف شعبے قائم ہیں۔ وہ ہماچل پردیش کے لئے اسلامی مرکز کا کام کر رہی ہے۔

اس دنیا میں وقتی نقصان ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ مگر یہ قدرت کا قانون ہے کہ وقتی نقصان ہمیشہ وقتی نقصان رہے، وہ کسی کے لئے مستقل بربادی نہ بنے۔

بابو گنج کی مسجد کے پاس ایک صاحب پنڈت دیارام رہتے ہیں۔ یہاں کے مندر کا انتظام بھی وہی کرتے ہیں۔ پچھلے رمضان میں ایسا ہوا کہ رات کو جس وقت مسجد میں تراویح ہوتی، عین اسی وقت مندر میں لاؤڈ اسپیکر پر بھجن ہوتا۔ اس سے نمازیوں کو الجھن پیش آرہی تھی۔ آخر ایک روز ایک مسلمان نے پنڈت جی سے اس کا ذکر کیا۔ پنڈت جی نے فوراً کہا کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ انھوں نے اسی دن ہدایت کر دی کہ تراویح کے وقت مندر کا لاؤڈ اسپیکر بند کر دیا جائے اور دوبارہ اس وقت کھولا جائے جب کہ تراویح ختم ہو چکی ہو۔

پنڈت دیارام مجھ سے ملنے کے لئے مسجد میں آئے۔ ان کی عمر ۷۲ سال ہو چکی ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کا زمانہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے دونوں میں کیا فرق پایا۔

پنڈت جی نے کہا کہ بہت زیادہ فرق ہے۔ اس وقت انسان کی قدر تھی۔ لوگ ایماندار تھے۔ ہم سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ لاٹ صاحب (انگریز وائسرائے) سڑک پر صرف ایک گاڑی میں چلتے تھے۔ کل دہلی کے منسٹر صاحب آئے ہیں۔ جب وہ ایئرپورٹ سے یہاں پہنچے تو میں نے ان کے موٹروں کے قافلہ کو گنا تو کل ۲۲ گاڑیاں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔

انھوں نے کہا کہ اب جو اختلاف اور لڑائی جھگڑا ہے وہ سب پالی ٹکس کی وجہ سے ہے۔ "ووٹ کے چکر میں سارے اختلافات پیدا ہو گئے"۔

انھوں نے بتایا کہ یہاں کے سیسل ہوٹل (Cecil Hotel) کا لان اس وقت بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے گیٹ کے سامنے یہ بورڈ لگا رہتا تھا ـــــــ کہ ہندستانی اور کتے اندر داخل نہ ہوں:

Indians and dogs are not allowed.

اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ کتے کی عادت ہے کہ وہ گھاس کو اپنے پنجہ سے کریدتا ہے۔ اسی طرح بوٹ پہن کر جانے سے لان کی گھاس خراب ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں کو اندر جانے سے روکتے تھے۔ انگریز جو یہاں آتے تھے، وہ بوٹ پہن کر اس کے اندر نہیں جاتے تھے۔ ان کے پاس فوم جیسا چپل ہوتا تھا۔ وہ لان میں جاتے ہوئے یہی چپل پہن لیتے تھے۔ اس منظر کو پنڈت جی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر جگدیش شرما شملہ ریڈیو کے پروگرام ایگزیکیٹو ہیں۔ وہ ریڈیو کے لئے انٹرویو چاہتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ ۷ جولائی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ میرے ہوٹل پر آئیں گے۔ مگر مجھ کو بالوگنج کی مسجد میں دیر ہوگئی۔ ہوٹل کے رسپشن میں ٹیلی فون کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔ جب ان کو بتایا گیا کہ اس وقت میں بالوگنج کی مسجد میں ہوں تو انھوں نے کہا کہ کوئی ہرج نہیں۔ میں وہیں آجاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ریکارڈنگ کے سامان کے ساتھ مسجد میں آگئے۔ یہاں انھوں نے تفصیلی انٹرویو لیا (Tel. 3471-77301)

میں نے خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا کہ سماجی اور قومی زندگی میں امن لانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ تحمل اور رواداری کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ تحمل اور رواداری فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کے بغیر ایک پر امن گھر بھی نہیں بنایا جاسکتا، کجاکہ اس کے بغیر کوئی پرامن سماج بنایا جاسکے۔

انگریزی روزنامہ ٹریبون (The Tribune) کے پریس رپورٹر مسٹر سریش گری نے ۷ جولائی ۱۹۹۴ کی شام کو انٹرویو لیا (Tel. 01886-32088)

ایک سوال یہ تھا کہ شملہ کانفرنس کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح کی کانفرنس بجائے خود منزل نہیں ہوتی۔ یہ تو راستہ طے کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں ٹاپ کے لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے اپنے علم اور تجربہ سے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا۔ خود میں نے یہاں کئی نئی باتیں سیکھیں۔ مجھے امید ہے کہ دو دن کا یہ اجتماع ملک کی تعمیر وترقی کی طرف ایک مثبت قدم ثابت

ہوسکتا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اور گلزار محمد بھارتی (چیئرمین حج کمیٹی، ہماچل پردیش) نے بتایا کہ ۱۹۹۰ میں جب کہ ہماچل پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی، اس کے کارکنوں نے ریاست میں بہت طوفان مچایا۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جگہ جگہ جلوس نکالے جس میں اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ مثلاً، مندر تو ایک بہانہ ہے، مسلمانوں کو دور بھگانا ہے۔ ہماچل پردیش کی کل آبادی ۵۵ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ ریاست کے مسلمان سخت گھبرا اٹھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال ہوگیا کہ ریاست کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

مولانا ممتاز صاحب اور گلزار محمد صاحب ۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو راجہ ویربھدر اسنگھ سے اُن کی رہائش گاہ (شملہ) پر ملے۔ اب وہ چیف منسٹر ہیں۔ مگر اس وقت وہ صرف ایم ایل اے تھے۔ مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے ہماچل پردیش کے مسلمانوں کی حالت بتائی اور کہا کہ شاید آپ کو وہ دن دیکھنا پڑے کہ ہماچل پردیش میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے۔ تو ویربھدر اسنگھ رونے لگے۔ ان کی آواز رندھ گئی۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسلمانوں کو شملہ میں میری کوٹھی پر لے آؤ۔ میں یہاں گیٹ پر بندوق لے کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ پہلی گولی میرے سینہ پر لگے گی، اس کے بعد وہ کسی مسلمان تک پہنچے گی۔

راجہ ویربھدر اسنگھ نے اسی وقت خود اپنے ہاتھ سے ایک درخواست ٹائپ کی اور اس کو لے کر گورنر ہماچل پردیش کے یہاں پہنچے۔ ان کی باتیں سن کر گورنر نے اسی وقت چیف منسٹر کو بلایا۔ اور پھر طے ہوا کہ ریاست کے تمام ایم ایل اے اپنے اپنے حلقہ میں جائیں اور مسلمانوں کو ڈھارس دلائیں کہ تم لوگ بے ڈر ہو کر رہو۔ تمہارے خلاف کوئی شرپسند کچھ بھی کرنے نہیں پائے گا۔ اس کے بعد حالات معتدل ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ٹوٹ گئی۔ نئے الکشن میں راجہ ویربھدر اسنگھ چیف منسٹر ہو گئے۔ حال ہی میں ان کی حکومت نے ریاست میں ایک سو اردو ٹیچر بھرتی کرنے کا اعلان کیا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے بتایا کہ شملہ میں وشو ہندو پریشد کا یگیہ بڑے پیمانہ پر ۲۲ - ۲۵ مئی ۱۹۹۴ کو ہوا۔ انھوں نے اس کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس موقع کو

استعمال کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ لے کر وہاں اسلامی کتابوں کا اسٹال لگایا۔ ہندی اور انگریزی کتابیں دہلی سے لاکر یہاں رکھی گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندو بہت کثرت سے ہمارے اسٹال پر آئے۔ انھوں نے دیکھا۔ باتیں کیں اور بہت سے ہندوؤں نے کتابیں خریدیں۔ آنے والوں میں سے ایک ہندو نے حسب ذیل تاثرات ہندی زبان میں لکھے ،

اسلام کو اپنی آتما سے تو جانا تھا ، سمجھا تھا۔ پرنتو اس کا اتہاس یا کھیہ کتاب قرآن نہیں پڑھا تھا۔ آپ کی یہ پر درشنی بہت اچھی لگی۔ تھا اس سے بہت اپیوگی کتابیں ملیں۔ ایسی پردرشنی ہر جگہ، ہر شہر میں کبھی کبھی ایسے موقعوں پر لگتی رہنا چاہئے تاکہ ایک دوسرے کے دھرم کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔

گیان چند شرما ، بال وکاس پریوجنا ادھیکاری ، گھاری ، بلاسپور ۔

مولانا ممتاز صاحب ۱۹۶۳ سے شملہ میں مقیم ہیں۔ وشومیدہ یگیہ (۲۲-۲۶ مئی ۱۹۹۴) کے بارہ میں انھوں نے بتایا کہ وہ بہت کامیاب رہا۔ دوسری ہندی کتابوں کے علاوہ ۵۵ عدد ہندی ترجمۂ قرآن لوگوں نے حاصل کئے۔

بک اسٹال پر یگیہ کے ایک بڑے مہاتما آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو تو آپ کا یہ اسلامی بک اسٹال بہت اچھا لگا۔ اب بتائیے کہ آپ کو ہمارا یگیہ کیسا لگا۔ مولانا ممتاز صاحب نے کہا کہ ہم کو آپ کے یگیہ میں بہت بڑی کمی محسوس ہوئی۔ انھوں نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا ــــ مولانا ممتاز صاحب نے کہا : جیسے ہم نے یہاں ہندی زبان میں اسلامی لٹریچر لاکر رکھا ہے اسی طرح آپ کو بھی اردو میں ہندوازم پر لٹریچر یہاں رکھنا چاہئے تھا۔ سوامی جی اس جواب سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ آپ نے جو کہا سچ کہا۔

بالوگنج کی مسجد میں تین نمازیں پڑھیں ــــ مغرب ، عشاء اور فجر۔ یہاں شام کو دیر تک نشست ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹہ تک چلتا رہا۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ البروج پڑھی۔ اس میں یہ آیت تھی ... وَاللّٰهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ۔ فجر کے بعد میں نے اسی کو درس کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہے۔ وہ دشمنان اسلام کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ یہ آیت

اہل ایمان کے لئے حوصلہ کی آیت ہے۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم دانشوروں اور رہنماؤں نے دعوت کے لئے کوئی مثبت کام تو نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے دعوت کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ ہندستان میں ایسی قومی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہری نفرتیں پیدا ہوگئیں۔ یورپ میں مختلف واقعات کے نتیجہ میں غیر مسلموں کے اندر شدید غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔

میں نے کہا کہ یہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس لئے مسلم رہنماؤں اور دانشوروں کو اپنی کارروائیوں میں سخت احتیاط کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر، سلمان رشدی کے معاملہ میں تمام لوگوں نے جو موقف اختیار کیا اس کا مثبت نتیجہ تو کچھ نہیں نکلا۔ البتہ میڈیا کی رپورٹنگ کے نتیجہ میں وہ ساری دنیا میں اسلام کی بدنامی کا سبب بن گیا۔ اب مسلمان میڈیا کی شکایت کر رہے ہیں، حالاں کہ اس قسم کی شکایت غلطی پر مزید سادہ لوحی کا اضافہ ہے۔

ایک صاحب سے آر ایس ایس کے مسئلہ پر بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں آر ایس ایس کو مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آر ایس ایس اپنی عمر پوری کرکے اب ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ باعتبار ڈھانچہ زندہ ہے نہ کہ باعتبار تحریک۔

آر ایس ایس ۱۹۲۵ میں قائم ہوئی۔ اس وقت انڈیا زراعتی دور میں تھا۔ لوگوں کے پاس کافی وقت تھا۔ وہ صبح سویرے بڑی تعداد میں شاکھاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ مگر اب انڈیا صنعتی دور میں پہنچ چکا ہے۔ اب لوگوں کے پاس اس قسم کی لگژری کے لئے وقت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ آر ایس ایس کو قریب سے دیکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں زیادہ بوڑھے لوگ ہیں۔ نوجوان طبقہ اب آر ایس ایس کی طرف رخ نہیں کر رہا ہے۔ آر ایس ایس کے رہنماؤں کی قدیم کتابوں میں خواہ جو الفاظ بھی لکھے ہوئے ہوں۔ مگر آر ایس ایس اب ایک ختم شدہ طاقت (spent force) ہے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو چکی ہے کہ وہ کسی کے لئے خطرہ بن سکے۔

شملہ کی مال روڈ یہاں کی بہت خاص سڑک سمجھی جاتی ہے۔ مولانا ممتاز صاحب اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں مال روڈ سے گزر رہا تھا۔ اس سڑک پر ایک جگہ بلندی پر لالہ لاجپت رائے کا

اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ اس اسٹیچو میں ان کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ ان کا بایاں ہاتھ کمر سے اٹکا ہوا ہے۔ اور دایاں ہاتھ اس طرح اٹھا رکھا ہے کہ ہاتھ کی ایک انگلی (شہادت کی انگلی) اوپر آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

مولانا ممتاز صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں اپنے ایک ہندو واقف کار کے ساتھ اس سڑک سے گزر رہا تھا۔ ہم لوگ اس اسٹیچو کے سامنے پہنچے تو ہندو ساتھی نے کہا: ایک انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر لالہ جی کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا ممتاز صاحب نے جواب دیا: وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ ہندو ساتھی نے یہ سنا تو ہنس کر بولا کہ یہاں بھی تم نے اپنے دھرم کی تبلیغ شروع کر دی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر دعوتی ذہن ہو تو کس طرح وہ ہر موقع پر اپنی بات کہنے کے مواقع پا سکتا ہے۔

یہاں ایک مسلم خاتون (عائشہ) نے مخصوص حالات میں ایک ہندو ڈاکٹر کیدار ناتھ سے شادی کر لی۔ چند سال پہلے ہندو ڈاکٹر کا انتقال ہو گیا۔ اپریل ۱۹۹۴ میں تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں مذکورہ مسلم خاتون کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت خاتون نے وصیت کی کہ مجھ کو جلایا نہ جائے بلکہ مسلم طریقہ پر مجھ کو قبرستان میں دفن کیا جائے۔ خاتون کے داماد نے ایسا ہی کیا۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے خاتون کے ہندو داماد سے کہا کہ "آپ سوچئے کہ وہ عورت جس نے اپنی پوری زندگی آپ لوگوں کے ساتھ ہندو فیملی میں گزاری، پھر وہ کون سی طاقت تھی جو موت کے وقت اس سے یہ کہلوا رہی تھی کہ مجھ کو دفنایا جائے، مجھ کو جلایا نہ جائے۔"

یہ سن کر مذکورہ ہندو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے مولانا ممتاز صاحب سے کہا کہ مجھ کو اسلامی لٹریچر دیجئے۔ میں اس کا مطالعہ کروں گا تاکہ اسلام کے بارہ میں واقفیت حاصل کروں۔

۷ جولائی کی صبح کو ہم لوگ شملہ کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے نکلے۔ مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ساڑھے نو بجے ہم لوگ ایک گلی میں پہنچے جہاں ایک دروازہ پر "جامع مسجد" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو بہت سے کشمیری مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے لئے مسجد گویا مفت جائے قیام ہے۔ مسجد کے ذمہ دار بھی اس کو گوارا کئے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح مسجد آباد رہتی ہے۔

اگر کشمیری مزدور یہاں نہ ہوں تو مسجد میں سناٹا نظر آئے۔

جامع مسجد کے امام مولانا محمد عالم ندوی ہیں۔ مولانا ندوی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان سے دیر تک الرسالہ مشن کے بارہ میں بات ہوئی۔ انھیں کچھ شکوک تھے۔ خدا کے فضل سے گفتگو کے بعد ان کے شکوک رفع ہو گئے۔

جامع مسجد کے دروازہ پر گھڑی کی ایک دکان نظر آئی۔ یہ محمد لیسین کشمیری کی دکان تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ مگر غالباً حالات کی بنا پر ابھی تک اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔

چنڈی گڑھ کے انگریزی اخبار ٹربیون (The Tribune) کے شمارہ ۷ جولائی میں ایک مضمون تھا اس کا عنوان تھا:

Privitisation is no panacea

اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں اس وقت پبلک سکٹر کے ۲۴۶ یونٹ ہیں۔ ان میں حکومت نے ۱۵۰ ہزار (150,000) کروڑ روپیہ لگایا ہے۔ مضمون میں پبلک سکٹر کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

> If the public sector failed in India, it was because of the command system imposed on it by politicians and the bureaucracy in their frantic search for power.

انٹلکچول کس طرح لوگوں کی سوچ کو بگاڑتا ہے اس کی یہ ایک مثال ہے۔ یہ مضمون پبلک سکٹر کو باقی رکھنے کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔

روزگار میں لگی ہوئی خواتین کی سب سے بڑی تعداد پبلک سکٹر میں ہے۔ اس طرح کے اور بھی بعض طبقات ہیں جن کا مفاد پبلک سکٹر کو باقی رکھنے میں ہے۔ اس لئے پبلک سکٹر کی حمایت میں برابر مضامین چھپوائے جا رہے ہیں۔ مذکورہ اقتباس میں ذہن کو خراب کیا گیا ہے۔ پبلک سکٹر کی ناکامی کا سبب اقتصادی عمل سے محرک (incentive) کو ختم کر دینا ہے۔ مگر غیر متعلق طور پر اس کا ایک اور سبب نکال کر اس پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔

۷ جولائی کی دوپہر کو شملہ سے واپسی ہوئی۔ شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے کرنا تھا۔ میں اور ڈاکٹر چاری ایک گاڑی میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں کچھ دیر کے لئے ہوٹل پائیں وڈ

(Hotel Pinewood) میں ٹھہرے۔ یہ ایک خوبصورت ہوٹل ہے جو پہاڑی کے دامن میں بنایا گیا ہے۔

راستہ میں ڈاکٹر چاری نے کئی سبق آموز باتیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے جبلپور میں انگریز کلکٹر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار شیعہ لوگوں نے آکر کلکٹر سے کہا کہ جس راستہ سے ہمارا تعزیہ گزرنے والا ہے وہاں ایک درخت کی شاخ سڑک کے اوپر آگئی ہے۔ ہم تعزیہ کی اونچائی کم نہیں کرسکتے۔ انگریز کلکٹر نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ہم اس کو کٹوا دیتے ہیں۔ کلکٹر کے آدمیوں نے دیکھ کر کلکٹر صاحب سے کہا کہ یہ درخت تو پیپل کا درخت ہے۔ اس کی شاخ کاٹی جائے گی تو ہندو لوگ بگڑ جائیں گے۔ اب کلکٹر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر میں ایک تحصیلدار نے کہا کہ میری سمجھ میں ایک تدبیر آتی ہے۔ میں اس کو استعمال کرتا ہوں۔

تحصیل دار نے ایک ہاتھی والے کو پکڑا اور اس سے کہا کہ تم اس مسئلہ کو حل کردو۔ ہاتھی والے نے اپنا ہاتھی اس سڑک پر چلایا۔ ہاتھی درختوں کی پتیاں اور شاخیں توڑتا ہوا مذکورہ پیپل تک پہنچا۔ یہاں ہاتھی والے نے اپنے ہاتھی کو کچھ دیر روکا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ ادھر اُدھر گھمائی۔ آخر کار اس نے مذکورہ شاخ توڑ کر گرادی۔ ہاتھی چوں کہ ہندوؤں کی نظر میں گنیش دیوتا کا روپ مانا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہاتھی کے عمل پر غصہ نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ شاخ راستہ سے ہٹ گئی۔ اور تعزیہ آسانی کے ساتھ اس سے گزر گیا۔ یہ سطریں واپسی میں ہوٹل پائن وڈ کے کمرہ نمبر ۱۰۳ میں بیٹھ کر لکھی گئیں۔

مسٹر چاری (سابق کلکٹر) نے کہا کہ مدھیہ پردیش میں ان کے چیف سکریٹری مسٹر اوتار تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ضلع کلکٹر کے پاس کسی معاملہ سے نپٹنے کے لئے اتنے زیادہ ذرائع ہوتے ہیں کہ فورس کا استعمال اس کے لئے ناکامی کے ہم معنی ہے:

Use of force means his failure.

میں اضافہ کروں گا کہ ہر آدمی کے پاس خدا کے دئے ہوئے اتنے زیادہ ذرائع ہیں کہ اس کے لئے طاقت کا استعمال اس کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ آدمی کی عقل بے حساب طاقتوں کا خزانہ ہے۔ یہ کلکٹر کی پولیس فورس سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ معاملہ پیش آنے کی صورت میں آدمی اگر حواس باختہ

نہ ہو، اور وہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے تو وہ ہر چیز پر قابو پاسکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی آدمی اپنی عقل کو کام میں لانے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھاتا ہے یا اپنے ہاتھ میں گن سنبھالتا ہے تو یہ اس کی ہار کی بات ہے نہ کہ جیت کی بات۔

شملہ سے کالکا تک کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا، میں کار سک (car sick) ہوں چنانچہ مجھ کو دوبارہ چکر آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر چاری کو آگے کی سیٹ پر بٹھا دیا اور پیچھے کی سیٹ پر لیٹ گیا۔ لیٹنے کی وجہ سے بقیہ راستہ میں کافی سکون رہا۔

کالکا سے دوبارہ ہمالین کوئن کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میری طبیعت چوں کہ ٹھیک نہیں تھی، اس لئے منتظمین نے ایک کیبن تنہا مجھ کو دیدیا۔ یہاں بھی دوبارہ لیٹے لیٹے سارا راستہ طے ہوا۔ ۷جولائی ۱۹۹۴ کی رات کو گیارہ بجے ہم لوگ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

میں دہلی سے شملہ گیا، اور شملہ سے دوبارہ واپس آیا۔ اوپر کی سطریں اسی سفر کی مختصر روداد ہیں۔ یہ ایک جسمانی سفر تھا۔ اس طرح ہر آدمی ذہنی سفر کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات ذہنی سفر کی اہمیت جسمانی سفر سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر شاید ذہنی سفر کی روداد کو انسانی زبان میں قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ ذہنی سفر کی روداد کو الفاظ کی صورت دینے کے لئے ہمیں اگلے مرحلۂ حیات کا انتظار کرنا چاہئے۔

بڑودہ کا سفر

بڑودہ میں ۱۲-۱۳ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس سمینار کا موضوع تھا —— ریلیجن اینڈ پالی ٹکس۔ اس کی دعوت پر بڑودہ کا سفر ہوا۔

بڑودہ (موجودہ نام وڈودڑا) گجرات کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر کا قدیم ریکارڈ ۸۱۲ء کی ایک دستاویز میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جب کہ اس وقت کے سب سے بڑے اسلامی شہر بغداد کو ایک بڑی فوج اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ یہ کسی دشمن کی فوج نہیں تھی۔ بلکہ المامون کی فوج تھی جو اپنے بھائی الامین کو عباسی تخت سے ہٹانے کے لئے اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ تقریباً ایک سال کے محاصرہ کے بعد الامین کو قتل کر دیا گیا اور المامون عباسی سلطنت کا ساتواں خلیفہ بنا۔

بڑودہ کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دس فیصد مسلمان ہیں۔ پچھلے ہزار سال کے دوران یہ شہر مختلف سلطنتوں کے ماتحت رہا۔ اس اعتبار سے اس کا نام بھی بار بار بدلتا رہا۔ چنانچہ تاریخ میں اس شہر کے حسب ذیل مختلف نام پائے جاتے ہیں:

Vadapadraka, Chandanavati, Varavati, Vatpatraka, Baroda, Vadodara.

دہلی سے ہوائی جہاز کا وقت صبح ۶ بجے تھا۔ ۱۲ نومبر کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکوں پر اور چاروں طرف سیکڑوں کی تعداد میں، بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب جلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اگر سورج نکل آئے تو اچانک یہ تمام بلب یا تو بجھا دئے جائیں گے یا اپنے آپ بے نور ہو جائیں گے —— حقیقت اعلیٰ کا ظہور وحدت پیدا کرتا ہے اور تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ تعدد کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔

فجر کی نماز ساڑھے پانچ بجے ایئر پورٹ پر پڑھی۔ کچھ دیر کے بعد گیٹ کے اوپر لگے ہوئے شیشہ کے بورڈ پر جل اٹھا:

Now Boarding — 817

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمارا جہاز تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے چل کر انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ

نمبر ۸۱۷ میں داخل ہو گئے۔

دہلی سے جہاز تقریباً وقت پر روانہ ہوا۔ آسمان کے کنارے شفق کی سرخی نظر آنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ غائب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ روشن سورج افق پر نمایاں ہو گیا۔ حسب معمول میں کاغذ نکال کر کچھ تاثرات لکھنے لگا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے بزرگ نے کہا: آپ اردو لکھ رہے ہیں یا فارسی" میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ یہ مسٹر مکند دوبے (Muchkund Dubey) تھے۔ وہ فارین سروس سے ۱۹۶۹ میں ریٹائر ہوئے۔ اب وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 3718047)

انھوں نے بتایا کہ ملازمت کے زمانہ میں فارسی سیکھنے کے لئے انھیں ایران بھیجا گیا تھا۔ وہاں وہ ڈھائی سال رہے۔ انھوں نے اتنی کافی فارسی سیکھ لی کہ فارسی میں تقریر کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ فارسی کا کوئی مقولہ جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے شیخ سعدی کا یہ مقولہ لکھ دیا: چگونہ شکر نعمت گزارم کہ مردم آزاری ندارم (خدا کی نعمت کا میں کس طرح شکر ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا)

ہماری پہلی منزل احمد آباد تھی۔ یہاں جہاز اترا تو میں باہر آ گیا۔ احمد آباد کے مناظر دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ پہلی بار میں ۱۹۷۱ میں احمد آباد آیا تھا۔ دہلی سے احمد آباد کا سفر میں نے ٹرین کے ذریعہ کیا تھا۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ یہ ہوائی جہاز سے میرا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد سے اب تک میں ۱۰۰ سے زیادہ سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ کر چکا ہوں۔ اور اگر آمد و رفت دونوں کو ملا کر شمار کیا جائے تو ۲۰۰ سے زیادہ۔

احمد آباد کا یہ سفر اگست ۱۹۷۱ میں ہوا تھا۔ الجمعیۃ ویکلی ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ میں اس کی روداد شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر نامہ کا ایک سبق آموز پیراگراف یہ تھا:

"یہاں میں ایک مسلم نوجوان سے ملا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنا کام کتنے سرمایہ سے شروع کیا۔ انھوں نے بتایا کہ دس روپیہ سے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اتنے کم سرمایہ سے کس طرح کام کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا: زبان سچی ہو اور ایمان دل میں ہو تو سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ آپ زبان دے کر کتنا بھی سودا بازار سے اٹھا سکتے ہیں۔"

احمد آباد گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سلطان احمد شاہ نے ۱۴۱۱ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی کے نام پر اس کو احمد آباد کہا جانے لگا۔ ۱۵۷۲ء میں مغل حکمراں اکبر نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۸ء میں وہ برطانیہ کے ماتحت آ گیا۔ انگریزی دور میں یہاں پہلی کاٹن مل ۱۸۵۹-۶۱ء میں قائم کی گئی۔ احمد آباد اس وقت ہندستان کا پانچواں سب سے بڑا شہر ہے۔

راستہ میں مختلف اخبار دیکھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ نومبر) کے ادارتی صفحہ کے اوپر حسب معمول ویلیس (W.R. Wallace) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ جو ہاتھ گہوارہ کو چلاتا ہے وہی وہ ہاتھ ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے:

The hand that rocks the cradle
is the hand that rules the world.

یہی عورت کا اصل مقام ہے جو فطرت نے اس کو عطا کیا ہے۔ وہ اس نسل کو تیار کرتی ہے جو بالآخر باہر آکر دنیا کے تمام کاروبار کو سنبھالتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت گویا معمار انسانیت ہے۔ مگر جدید تہذیب نے برابری کے مصنوعی اور غیر فطری تصور کے تحت عورت کو گھر کے اندر کے عظیم کردار سے محروم کر دیا۔ اور گھر کے باہر کا رول ادا کرنے کے قابل تو وہ تھی ہی نہیں۔

انگریزی اخبار دی ہندو (۱۲ نومبر) میں مسٹر اندرسین کے ایک آرٹیکل (ہندو ۲۲ اکتوبر) کی حمایت میں مسٹر ڈی کیسوران (مدراس) کا خط چھپا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے کانسٹی ٹیوشن کے بنانے والوں نے یہ بہت بڑا بلنڈر کیا کہ انھوں نے بالغ رائے دہی (adult franchise) کے اصول کو دستور میں جگہ دی۔ ہمارے ملک کی اکثریت جاہل اور بے شعور ہے۔ ایسی حالت میں ہر بالغ آدمی کو ووٹ کا حق دینا گویا قوم کو ایسے لیڈروں کے حوالے کرنا ہے جو خوشنما نعروں کے ذریعہ انھیں بے وقوف بناتے رہیں۔

اس کے نتیجہ میں جو سیاسی کرپشن پیدا ہوا اس کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ رومن ایڈمنسٹریٹر پبلی کولا (Publicola) جب مرا تو اس نے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی آخری رسوم ادا کی جاسکیں۔ جب کہ ہمارے ملک کے حکمراں ایک بار حکومت میں آنے کے بعد اتنی دولت جمع کر لیتے ہیں جو ان کی کئی پشتوں کے عیش کے لئے کافی ہو۔

جہاز بڑودہ پہنچا تو یہاں سیمنار کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ چوں کہ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اس لئے ٹھہرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایر پورٹ سے مسٹر عظیم بندوق والا کے ساتھ روانگی ہوئی۔ وہ مسٹر جے ایس بندوق والا کے صاحبزادے ہیں اور کمپیوٹر انجنیرنگ کا کورس کر رہے۔ جب میں بڑودہ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو یہاں کی ہر چیز مجھے دہلی کے مقابلہ میں پسماندہ نظر آئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اسی طرح دہلی، یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلہ میں پسماندہ محسوس ہوتا ہے۔ ذہن کا مسافر مزید آگے بڑھا تو خیال آیا کہ آدمی جب جنت کے شہر میں داخل ہوگا تو وہ پائے گا کہ پیرس اور واشنگٹن بھی مزید اضافہ کے ساتھ جنتی شہر کے مقابلہ میں انتہائی پس ماندہ تھے۔

ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ اس علاقہ میں پہنچ گئے جس کو فرٹلائزر نگر کہا جاتا ہے۔ یہاں گجرات فرٹیلائزر کا وسیع گیسٹ ہاؤس (Shin Atami Guest House) ہے۔ میرے قیام کا انتظام اس کے اندر کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو ریسپشن ڈسک پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف سیکورٹی گارڈ کا ایک آدمی پستول لٹکائے ہوئے گھوم رہا تھا۔ عظیم بندوق والا ڈھونڈنے کے لئے نکلے اور کچھ دیر میں ایک آدمی کو لے کر آئے۔ اس نے روم نمبر ۶ ہمارے لئے الاٹ کیا۔

ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے اس لئے یہاں ایسا پیش آیا۔ اگر یہ پرائیویٹ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک شخص یہاں آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔

ایک گفتگو کے دوران ایک "گاندھی بھگت" نے کہا کہ مہاتما گاندھی تو دیش کے بٹوارہ کے لئے آخر وقت تک راضی نہیں تھے۔ مگر نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے دیکھا کہ انگریز مسٹر جناح کے ذریعہ آزادی میں اڑنگا لگائے ہوئے ہے۔ وہ اس اڑنگے کو استعمال کرتا رہے گا اور کبھی ہم کو آزادی نہیں دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم لوگ ایک ایک کرکے مرجائیں گے اور بھارت کو اپنے خوابوں کا دیش نہیں بنا سکیں گے۔ اس بنا پر نہرو وغیرہ نے بٹوارہ کو مان لیا تاکہ انگریزوں کے سیاسی قبضہ سے چھٹکارا حاصل کرکے دیش کی تعمیر کی جاسکے۔

نہرو کا خواب کیا تھا۔ وہ پہلے ہی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دیا تھا کہ میں انڈیا کو ایک سوشلسٹ انڈیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ اقتدار پر قبضہ کرکے ہم بڑے پیمانہ پر پبلک سکٹر بنائیں گے اور ہر شعبہ میں ایسے معیاری ادارے قائم کریں گے جو پرائیوٹ سکٹر کے لئے بطور نمونہ کام دے گا۔ چنانچہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد نہرو اور ان کے ساتھیوں نے ملک کی دولت کا بڑا حصہ پبلک سکٹر قائم کرنے میں جھونک دیا۔ مگر چالیس سالہ تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ نام نہاد پبلک سکٹر صرف کرپشن کا ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ اس نے پوری قوم کو کاہل (lethargic) بنا کر رکھ دیا۔

اس طرح نہرو کی قیادت نے ملک کو دوہرا نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے مسٹر جناح کے "اڑنگے" کو غیر ضروری اہمیت دی جس کے نتیجہ میں ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور دوسری طرف حاصل شدہ ہندستان کو اقتصادی تباہی کی خندق میں گرا دیا۔ نہرو کو ہندستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ ان کے وصیت نامہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر سوچ درست نہ ہو تو محبت بھی الٹا نتیجہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مسلم ملکوں کے اسلام پسند مخلصین نے اپنی فکری غلطی کے تحت ہر جگہ سیاسی چھلانگ لگائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید میں اسلامی دعوت کے تمام امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دیواروں کے پردے ہٹا دئے۔ اس طرح کے کمروں میں عام طور پر باہر کی طرف قدرتی مناظر ہوتے ہیں۔ مگر جدید تہذیبی رواج کے مطابق، اس پر لمبا پردہ پڑا رہتا ہے۔ مجھے ایسا پردہ پسند نہیں۔ پردہ کو ہٹانے کے بعد لمبے شیشہ کے اُس پار فطرت کے ہرے بھرے مناظر دکھائی دینے لگے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسٹر بندوق والا سے گفتگو ہوئی۔

مسٹر عظیم بندوق والا گویا مسلمانوں کی "کمپیوٹر جنریشن" کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میرے گھر کے لوگ اگرچہ روایتی طور پر مذہبی رہے ہیں۔ مگر میں تو ایک ملحد (atheist) ہوں۔ میں مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتا:

I don't believe in religion.

سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ اس الحاد کے پیچھے کوئی گہرا شعور یا کوئی سوچا سمجھا فکر نہیں ہے۔ بس آزادی اس کا سبب ہے۔ ایسے نوجوانوں کو اینٹی مذہب سے زیادہ اینٹی اتھارٹی (anti authority) کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری نسل کے لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو وہ مذہب یا پالی ٹکس کی بات نہیں کرتے۔ ان کی بات چیت کا موضوع فلم، کھیل، وغیرہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنے کو لامذہب نہ کہئے بلکہ آزادی پسند کہئے۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی لامذہبیت کے پیچھے کوئی عقلی یا سائنٹفک دلیل نہیں ہے۔

یہاں انڈین ایکسپریس کا بڑودہ اڈیشن (۱۲ نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں لیٹرس کے کالم میں احمد آباد کے مسٹر سدھیر ترویدی کا خط تھا۔ انھوں نے ایک صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سردار پٹیل کو انڈیا کا لوہ پرش (Iron Man) کہا جاتا ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کو سنہہ پرش (Lion man) کہا جائے۔ یعنی شیر ہند۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سر فضل الحق کو شیر بنگال کہا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبد اللہ کو شیر کشمیر کا لقب دیا۔ وغیرہ۔ مگر شیروں کی اس کثرت کے باوجود ہمارے ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہمیں دھاڑنے والے شیروں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسے خاموش انسانوں کی ضرورت تھی جو تدبیر اور حکمت کے ساتھ ملک کو ترقی کی طرف لے جانے کا منصوبہ بنائیں۔

۱۲ نومبر کو دوپہر سے پہلے میں بڑودہ پہنچ چکا تھا۔ ایک بجے گیسٹ ہاؤس کا آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔ میں کمرہ سے نکلا تو دروازہ کا تالا بند کرنے کے لئے چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے آدمی سے کہا کہ " چابی تو تم نے دی نہیں "۔ اس نے جواب دیا : " چابی کا ضرورت نہیں صاحب "۔ چنانچہ میں دروازہ مقفل کئے بغیر نیچے اتر گیا۔

کھانے کی میز پر میں اور پروفیسر رشید الدین صاحب (جامعہ ہمدرد) تھے۔ جو آدمی کھانا رکھ رہا تھا، اس سے میں نے نام پوچھا۔ اس نے کہا " عبدل بھائی "۔ میں نے کہا کہ یہ تو اصل نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا کہ میرا اصل نام عبد الغنی ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو عبدل بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

پروفیسر رشید الدین ایک ذی علم اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو کانپور میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس جلسہ کے صدر جن ستا کے اڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی تھے۔ اور پروفیسر رشید الدین اس میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کی بنیاد چار چیزوں پر ہے ــــــ علم، عقل، عدل، رحمیت (compassion) ۔ پربھاش جوشی جو پہلے سے پروفیسر رشید الدین کو جانتے تھے، انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے اگر پروفیسر رشید الدین جیسے ۱۰۱ مسلمان مل جائیں تو میں اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پروفیسر رشید الدین نے الرسالہ مشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کا دل جیتا جائے۔ آج ہمیں کنفرنٹیشن کی نہیں بلکہ پرسویشن (Persuasion) کی ضرورت ہے۔

۱۲ نومبر کی شام کو میں اپنے کمرہ کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ یہ دروازہ ایک پارک کی طرف کھلتا تھا۔ دور تک پھول اور درخت اور ہریالی کا منظر تھا۔ میں نے سوچا کہ پارک اس گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی رونق ہے۔ عمارت کے ساتھ اگر یہ "باغ" نہ ہو تو گیسٹ ہاؤس بالکل سونا دکھائی دینے لگے۔

یہ سوچتے ہوئے قرآن کی آیت یاد آئی: ومساکن طیبۃ فی جنات عدن۔ ان الفاظ میں قرآن نے جنت کی منظرکشی کی ہے۔ یعنی جنت میں پاکیزہ مکانات ابدی باغوں میں ہوں گے۔ ایک عمدہ مکان کے بارہ میں انسان کا تصور یہی ہے کہ وہ باغ کے درمیان ہو۔ انسانی تخیل آج بھی اس سے آگے نہ جاسکا۔ قرآن یا اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر بات اپنے آخری معیار پر ہے۔ کوئی فلسفی یا کوئی آرٹسٹ کسی بھی چیز میں قرآن کے معیار سے آگے کا معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔

۱۲ نومبر کی شام کو کھانے کا اجتماعی نظام جیوتی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد پروفیسر رشید الدین، پروفیسر امریک سنگھ اور میں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ

تقریباً آدھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ میں دونوں صاحبان بات کرتے رہے۔ میں زیادہ تر ان کی باتیں سنتا رہا۔

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ گری لال جین (سابق اڈیٹر ٹائمس آف انڈیا) سے میری بہت باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام صرف اپنے کو برحق بتاتا ہے، باقی جتنے مذہب ہیں سب اس کے نزدیک کمتر یا غلط ہیں۔ پروفیسر امریک سنگھ نے ان کو جواب دیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تمام آدمی سماجی دباؤ (social compulsion) کے تحت کام کرتے ہیں۔ مسلمان اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ سماجی دباؤ مسلمانوں کو اپنے آپ معتدل بنا دیتا ہے۔

پروفیسر رشید الدین نے کہا کہ یہ صرف اسلام یا مسلمانوں کی بات نہیں۔ جب بھی آدمی کسی راستہ کو اختیار کرتا ہے تو اس کو یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ یہی واحد راستہ ہے:

It is the only right path.

آدمی کو جب تک اپنے مذہب پر یقین نہ ہو وہ اس کو پوری طرح اختیار نہیں کرسکتا۔ اس لئے لوگوں کو اپنے اپنے یقین پر رہنے دیجئے۔ البتہ ان کو یہ بتائیے کہ اپنے مذہب پر یقین رکھتے ہوئے تم دوسرے مذہب والوں کا احترام کرو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہماری گاڑی جیوتی گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوگئی۔ یہ شہری ماحول کے درمیان گویا ایک نخلستان تھا۔ یہاں خوبصورت لان میں لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کھانا کھایا۔ یہاں تمام لوگ صرف انگریزی زبان استعمال کر رہے تھے۔ یہاں ہر چیز "انگلش" معیار پر نظر آئی۔

میں نے سوچا کہ ہندستان دو ہندستان ہے۔ ایک وہ ہندستان جس میں اس ملک کے ۹۵ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ دوسرا وہ جس میں صرف پانچ فیصد لوگ آباد ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پونچھنا ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو ہندستان بنا وہ عملاً اس کے برعکس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک، محض سیاسی حکمرانوں کی تبدیلی سے سماجی حالات نہیں بدل سکتے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آگئے۔ خلاف معمول آج مجھے دیر میں نیند آئی۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو نہ مروجہ ماحول میں خوش رہ سکے۔ اور نہ وہ دوسرا ماحول اپنے موافق بنانے پر قادر ہو۔

سیمینار میں شریک ہونے والے لوگوں سے، نیز شہر کے اہل علم سے مختلف اوقات میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو باتیں ہوئیں ان میں سے کچھ مختصر طور پر یہ ہیں۔

ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ جین دھرم کے بانی مہاویر ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کا گرنتھ بہت دنوں تک زبانی طور پر چلتا رہا۔ صرف ایک ہزار سال پہلے اس کو لکھا گیا۔ ہندوؤں کے وید اور بھی ہزاروں سال پہلے سے ہیں۔ مگر وہ بھی صرف پہلی صدی عیسوی میں لکھے گئے۔ ایسی حالت میں کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ جین دھرم اور ہندو دھرم کے جو گرنتھ پستکوں کی صورت میں ہمارے پاس ہیں وہ ٹھیک وہی ہیں جیسا کہ وہ شروع میں تھے۔ زبانی روایت میں ہمیشہ بات بدل جاتی ہے۔ اس لئے ان گرنتھوں میں بھی ضرور تبدیلی آئی ہوگی۔ پھر انھوں نے کہا کہ قرآن میں بھی ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آج جو قرآن ہے وہ وہی نہیں ہوسکتا جو پیغمبر صاحب کے زمانہ میں تھا۔

میں نے کہا کہ دوسرے مذہب کے گرنتھوں کے بارہ میں آپ کی بات درست ہے۔ مگر قرآن کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں۔ کیوں کہ قرآن جب اترتا تھا اسی وقت وہ لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ دوسرے مذہبی گرنتھوں کے برعکس، قرآن وہ استثنائی کتاب ہے جس میں تلاوت اور تحریر دونوں اول دن سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس لئے قرآن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں ایک بلین سے زیادہ ہیں۔ اگر سب مل کر کام کریں تو ہم بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے چند تجویزیں پیش کیں ـــــ مسلم ممالک اپنے درمیان کامن ڈیفنس کا ایک نظام بنائیں۔ مسلمان اپنی ایک عالمی نیوز ایجنسی قائم کریں۔ مسلم ملکوں کی ایک یونائیٹڈ آرگنائزیشن ہو۔ مسلم ملکوں کا ایک سنٹرل بینک بنایا جائے۔ مسلم ملکوں کا ایک کامن مارکٹ قائم کیا جائے۔ اس قسم کی کچھ بڑی بڑی تجویزیں پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا:

A beginning has to be made. Let us make a beginning.

میں نے کہا کہ یہ آغاز نہیں ہے۔ آپ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ آغاز تو ہمیشہ ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک ہی نقطۂ آغاز ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ ہمارے درمیان جب تک تعلیم عام نہ ہوجائے، کوئی بھی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کی غیرتِ ملّی کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غیرتِ ملّی کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ حیثیتِ ملّی کا مسئلہ ہے۔

مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں ہیں۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان کو دعوت کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے پیغمبر آیا کرتے تھے۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

مسلمان کی یہی حیثیت اس کے اوپر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اپنی مدعو قوموں کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ اس ملک میں مسلمان پندرہ فیصد ہیں اور غیر مسلم پچاسی فیصد۔ ایسی حالت میں لازماً ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے مسلمانوں کو ناخوش گواری یا زیادتی کا تجربہ ہوگا۔ اس ناخوش گواری یا زیادتی کے مقابلہ میں انھیں دَعْ اَذَاهُمْ کے قرآنی اصول پر عمل کرنا ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں تو اس کے بعد ان کا امت محمدی ہونا خدا کی نظر میں غیر متحقق ہو جائے گا۔ جو ماں اپنے بچہ کی باتوں کو برداشت نہ کرے وہ ماں ہی نہیں۔

ایک طالب علم نے کہا کہ آج کا نوجوان پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ صرف آگے کے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے کتنے نوجوان ایسے ہیں جو سائنٹفک ریسرچ میں دل چسپی رکھتے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی اسٹوڈنٹ ایسا نہیں ملا جو یہ کہے کہ میں اپنی زندگی سائنسی ریسرچ کے لئے وقف کردوں:

My intention is to devout my life in scientific research.

میں نے کہا کہ پھر آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ آج کا نوجوان صرف پیسہ یا کیریر کے بارہ میں سوچتا ہے۔ یہ آگے کی طرف سوچنا نہیں ہے۔ آگے کی طرف سوچنا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ریسرچ کا شوق ہو۔

. وہ نئی نئی چیزیں دریافت کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دنیا کو کوئی نیا سائنسی تحفہ دینے کا حوصلہ رکھیں۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ہم لوگ اپنی قیام گاہ سے وانیجا بھون (ریس کورس سرکل) لے جائے گئے یہاں کے ہال میں ساڑھے نو بجے سیمنار کا پہلا سیشن شروع ہو رہا تھا۔ اس کے چیئر پرسن پروفیسر رشید الدین خاں تھے۔ اس کا موضوع تھا ——— کیا پالی ٹکس اور مذہب کو الگ کیا جاسکتا ہے:

Can politics and religion be separated?

انیس آدمیوں نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ سیمنار گویا ذہنوں کا اختلاط (interaction of minds) ہے۔ تاہم میرا تجربہ ہے کہ یہ اختلاط تو ہے مگر وہ اتحاد نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کا ہر فرد خود پسند (egoist) ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی ایک نقطۂ نظر پر متفق کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس سیمنار میں ہر آدمی نے کوئی ایک پہلو لے کر اس پر ایک خوبصورت تقریر کر ڈالی۔ چند باتیں بطور مثال یہاں نقل کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے کہا کہ اجودھیا میں رام رحیم ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے تمام مسائل کی جڑ جہالت اور ناخواندگی ہے۔ کسی نے کہا کہ تمام مسائل کی جڑ اقتصادی پسماندگی ہے۔ کسی نے مذہب کو، کسی نے پولٹیکل کرپشن کو، کسی نے پارٹیشن کو، کسی نے سیکولر کانسٹی ٹیوشن کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار بتایا۔

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جس دن مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے گا اس دن انڈیا تباہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے ملانے ہی کی وجہ سے انڈیا تباہ ہوا ہے، اس لئے دونوں کو الگ کر دینا ضروری ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے مذہب کو اس کے اصل پہلو کے لحاظ سے لیا تھا اور آجکل کے لوگ مذہب کو سیاسی استحصال کے لئے لے رہے ہیں۔

ایک صاحب کی بات کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔

۱۴ نومبر کی سہ پہر کو دوسرا سیشن تھا۔ اس کا موضوع تھا: ہیومن رائٹس اینڈ ریلیجن۔ اس سیشن میں مجھ کو لیڈ اسپیکر بنایا گیا تھا۔ جب کارروائی شروع ہوئی اور میرے بولنے کا وقت آیا۔ تو میرے پاس بیٹھے ہوئے پروفیسر گوہن نے کہا کہ صبح کے سیشن میں آپ نے "ہندی" میں تقریر کی۔ میرا تعلق کیرالا سے ہے اور میں ہندی بالکل نہیں جانتا۔ اس لئے آپ انگریزی میں بولیں تاکہ میں بھی سمجھوں:

Dr. S. Guhan, Institute of Development Studies
79, Second Main Road, Gandhi Nagar,
Adyar, Madras 600 020 (Tel. 4914191)

میں نے پہلے سے انگریزی میں بولنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ مگر ڈاکٹر گوہن کے کہنے پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے انگریزی ہی میں بولنا ہے۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ خدا کے فضل سے دیر تک نہایت کانفیڈنس کے ساتھ انگریزی میں بولتا رہا۔ ڈاکٹر گوہن بہت خوش ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ انشاء اللہ آپ کو انگریزی لٹریچر بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں نے ۹ نومبر کے ٹائمس آف انڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں مسٹر روسی مودی (Russi Mody) کا ایک بیان چھپا ہے۔ وہ ایرانڈیا اور انڈین ایرلائنز کے مشترک چیرمین مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دونوں ہوائی کمپنیوں کے بڑھتے ہوئے مسائل کو کس طرح حل

1. Soli Sorabjee, New Delhi
2. Madhu Mehta, Bombay
3. Maulana Wahiduddin Khan, New Delhi
4. Dharma Kumar, New Delhi
5. Veenaben, New Delhi
6. Kaokab Durry, New Delhi
7. Rasheeduddin Khan, New Delhi
8. Nirmal Verma, New Delhi
9. Satish Chandra, New Delhi
10. Amrik Singh, New Delhi
11. Nagindas Sanghavi, Bombay
12. Arvind Deshpande, Bombay
13. Nikhil Wagle, Bombay
14. Teesta Setalvad, Bombay
15. S. Guhan, Madras
16. M.N. Srinivas, Bangalore
17. Sofia Khan, Ahmedabad
18. Narayan Sheth, Ahmedabad
19. Manubhai Pancholi, Ahmedabad
20. Vishnu Pandya, Ahmedabad
21. Hasanali Firashta, Surat
22. Joseph Mecwan, Anand
23. Chunibhair Patel, Baroda
24. V.N. Kothari, Baroda
25. Tulsi Boda, Baroda
26. Bhaskar Vyas, Baroda
27. I.G. Patel, Baroda
28. Nanubhai Amin, Baroda
29. G.N. Devy, Baroda
30. Alaknanda Patel, Baroda
31. J.S. Bandukwala, Baroda
32. Sanjeev Shah, Baroda

کریں گے، خاص طور پر پائلٹوں کے مسائل جو آئے دن اسٹرائک کرکے سارا نظام درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یونین کے پاس صنعتی تعلقات پر لکھی ہوئی بہترین کتاب کے ساتھ جاؤں گا۔ یہ بائبل ہے۔ اس کے مشہور دس احکام میں سے دو یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو، اور اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرو جیسی محبت تم اپنے لئے پسند کرتے ہو:

Iwill go to the unions by the best book on industrial relation ever written — The Bible. As two of the ten commandments say: do unto others as you would do unto yourself, and love your neighbour as you would love yourself.

میں نے کہا کہ یہ دونوں حکم تمام مذہبوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ بلاشبہ سماجی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ اخلاقی اصول لوگوں کی زندگیوں میں آجائے تو تمام سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

میرا مقالہ اور میری یہ تقریر دونوں ہی سیمنار کے منتظمین نے اپنی رپورٹ کے ساتھ شائع کر دی ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے:

12 Amee Society
Old Padra Road
Baroda 390015

مسٹر الکنندا پٹیل (Alaknanda Patel) مسلم صوفیوں سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کا خلاصہ ایک لفظ "اخلاق" میں بتایا تھا۔ اور راماکرشنا دیو نے دھرم کا خلاصہ ایک لفظ میں مہربانی بتایا:

The Prophet of Islam is supposed to have summarised his philosophy with one word, 'Akhlaq', - sincerity, and Ramakrishnadev with the word 'compassion'.

نئی دہلی کی وینا بہن (Tel. 4620066) نے یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں کہا کہ مسلمانوں کے اوپر جبراً ایک سول کوڈ لاگو کرنا اس وقت الٹا نتیجہ پیدا کرے گا۔ ان کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادانہ طور پر خواہ یونیفارم سول کوڈ کے تحت اپنے نکاح کو رجسٹر کروائیں یا مسلم پرسنل لا کے تحت:

Imposing a civil code on Muslims will produce a negative result at this moment. An option should be thrown open and they should be free to get their marriages registered under either uniform civil code or Muslim personal law.

مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ پالی ٹکس آج کریمنل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پولیس کو اپنے مجرمانہ منصوبوں کے لئے ٹولی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کو یہ کہنا پڑا کہ مجھ کو پولیس سے بچاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وینکٹ چلیا (Mr. Venkatachelliah) نے کہا تھا کہ یہ رول آف لا کے خاتمہ کا آغاز ہے:

This is the beginning of the end.

بڑودہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر وی این کوٹھاری نے کہا کہ ہندستان کی مسلم کمیونٹی ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو شاید کسی بھی دوسرے ملک کی مسلم کمیونٹی کو درپیش نہیں۔ ماضی میں وہ اس ملک میں ایک حکمراں اقلیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج وہ ایک ایسی اقلیت ہے جس کو حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں۔ مسلم جماعتیں عام طور پر اقتدار کی حیثیت میں رہی ہیں۔ ہندستان میں اس نے یہ حیثیت کھو دی ہے۔ اب اس غیر حاکمانہ حیثیت کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے:

The Islamic community in India faces a problem which perhaps Islamic community in no other country faces. It has been in the past a minority community in a ruling position in India. Today it is a minority community without that status. Islamic communities have been either in majority or if in minority, generally in ruling position. In India today, it is in a minority without the status of a ruling class. Acceptance of this status has been difficult for it.

بمبئی کے مسٹر اروند دیشس پانڈے نے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کے کمیونل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہندستانی ایتھوز کو مانیں اور یہاں کے مذہب، عقائد، روایات اور ہندو ہیروؤں کا احترام کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ قوم کو ذات، زبان، نسل، فرقہ وغیرہ سے اوپر

رکھیں :

Muslims should accept the Indian ethos and respect for the faith, beliefes, heritage and heroes of Hindus.
Hindus must put the nation above caste, language, race, sect, etc.

سیمنار میں ایک صاحب کی تقریر مجھے پسند آئی۔ وہ بڑودہ شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

G.N. Devy, Department of English
M.S. University, Baroda 390 002

انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانفلٹ بھی پارٹ آف لائف ہے۔ اس دنیا میں کانفلٹ فری سوسائٹی (Conflict-free society) ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں کانفلٹ کے خلاف شکایت کرنے کے بجائے کانفلٹ کے ساتھ جینے کا گر سیکھنا چاہئے

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ دو قومی نظریہ کا الزام مسٹر محمد علی جناح پر نہیں جاتا۔ کیونکہ سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۱۶ میں یہ کہا تھا کہ ہندستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ تاہم یہ بات نہایت عجیب ہے کہ کیوں مسٹر جناح نے اس کی تردید نہیں کی۔ اور اس کے بجائے انھوں نے اسی کو اپنی تحریک کی بنیاد بنالیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑے کی جڑ تاریخی یادیں ہیں۔ مسلمان کے دماغ میں یہ ہے کہ ہم نے ہندستان کے اوپر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اور ہندوؤں کے دماغ میں ہے کہ مسلمانوں نے یہاں آکر ہمیں ایک ہزار سال تک غلام بنائے رکھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب کا ہیرو ایک ہو جائے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں پر اسی طرح فخر ہونے لگے جس طرح خود ہندوؤں کو ہے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

ایک سردارجی نے کہا کہ پارٹیشن نے مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں مسلمانوں کی پوزیشن ۲۵ فیصد تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد وہ کم ہوکر ۱۰ فیصد پر آگئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک وقت آئے گا جب مسلمانوں کو اس کا احساس ہوگا اور اس وقت یہ حال ہوگا کہ جس طرح روس میں لینن کا مجسمہ گرایا گیا

اسی طرح مسٹر جناح بھی مسلمانوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائیں گے۔

سیمنار ۵ بجے شام کو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ پریانند ساہتیہ سدن کے لئے روانہ ہوئے۔ میرے علاوہ مسٹر بندوق والا، مسٹر مدھوبتا، مسٹر اروند دیش پانڈے بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ملکی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔

مسٹر اروند دیش پانڈے نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے جسٹس کھنا نے مسٹر لال کرشن آڈوانی سے کہا تھا کہ "دیکھو آڈوانی، ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو انڈیا میں رہتے ہوئے شرم آئے"۔ مسٹر پانڈے نے بتایا کہ بھاجپا کے ایک لیڈر سے ان کی ایک گھنٹہ تک بات ہوئی۔ ان کی باتوں کا وہ جواب نہ دے سکے۔ آخر میں مسٹر اروند دیش پانڈے نے ان سے کہا: "آئندہ جب انڈیا کی ہسٹری میں آپ کا نام درج کیا جائے گا تو آپ کے خانہ میں صرف دو کارنامہ لکھا جائے گا ایک یہ کہ مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا دیا"۔

پریانند ساہتیہ سدن کے ہال میں میری تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ وسیع ہال پورا کا پورا بھرا ہوا تھا۔ نشست کا انتظام فرش پر کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کا اعلان میرے نام کے ساتھ مقامی گجراتی اخبارات میں کر دیا گیا تھا۔ کافی لوگ اس میں شریک ہوئے۔ شرکاء میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو مثبت سوچنے والا (Positive thinker) بنایا جائے۔ یعنی وہ انسان جو خلاف مزاج باتوں پر نہ بھڑکے۔ جو ناموافق چیزوں کے درمیان معتدل طور پر رہ سکے۔ حتی کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر دے۔ تفصیلی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا۔

صدر جلسہ ایک مقامی ہندو تھے۔ انھوں نے آخر میں بولتے ہوئے میری تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "جب مولانا صاحب بول رہے تھے تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے مہان رشی بول رہا ہے"۔

جلسہ کے بعد اسٹیج سے اترا تو مختلف لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے آٹوگراف لیا۔ ادھیڑ عمر کے ایک مسلمان جو ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور جن کے چہرے پر داڑھی بھی تھی،

انھوں نے قریب آکر پوچھا: آپ کا رسالہ ابھی نکل رہا ہے۔ اس عجیب سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ پوچھ رہے ہوں: "آپ کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی"۔ مذکورہ بزرگ کی طرف میں نے حیرانی کے ساتھ ایک نظر ڈالی اور پھر ان کو سلام کرکے خاموشی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوگیا جو مجھ کو قیام گاہ لے جانے کے لئے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔

۱۴ نومبر کی صبح کو نیند کھلی تو باہر پھیلے ہوئے درختوں کی قطاروں سے مختلف چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوّا، کوئل اور بلبل وغیرہ۔ صبح کے سہانے میں یہ آوازیں عجیب کیفیت پیدا کررہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کے باغ میں کوّے کی کائیں کائیں بھی ہے اور بلبل کے چہچہے بھی۔ یہاں کوئل کی کوک بھی ہے اور فاختہ کی غٹرغوں بھی۔ یہ خدا کی تخلیقی اسکیم ہے۔ اب جو لوگ انسانی زندگی میں یکسانی لانے کے لئے اس کے اوپر اپنا کلچرل رولر چلانا چاہتے ہیں وہ خدا کی تخلیقی اسکیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا منصوبہ فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والی نہیں۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر پروفیسر رشید الدین خاں (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) کا ساتھ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جواہر لال نہرو کو اقبال کے یہ معنی خیز اشعار بہت پسند تھے، اور وہ اکثر ان کو اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے:

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے　　اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

انڈین ایکسپریس کے بڑودہ اڈیشن (۱۴ نومبر ۱۹۹۴) میں ایودھیا ورڈکٹ پر مسٹر کلدیپ نیّر کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندو یہ دعوٰی کرتے ہیں بابری مسجد کے مقام پر ایک رام مندر تھا، اس کو توڑ کر عین اسی مقام پر مسجد بنائی گئی۔ مسلمان اس دعوٰی کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسجد بنانے کے لئے مندر کو ڈھایا گیا تھا تو وہ خود اس کو چھوڑ دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون اس کو طے کرے کہ وہاں کون سی عمارت موجود تھی، مندر یا مسجد:

They (Muslims) have gone to the extent of saying that if it is proved that the temple was destroyed to raise the mosque, they would themselves disown it. Who is to decide? Which structure was there initially: temple or mosque?

مسٹر کلدیپ نیر یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گئے جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں پیش آیا تھا۔ یہاں بابری مسجد اور رام مندر کے سوال پر ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں خود مسٹر کلدیپ نیر بھی موجود تھے۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہ بحث کلیم اور کاؤنٹر کلیم کی صورت میں دیر تک چلتی رہی۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس طرح کی بحث سے تو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ثالثی (آربٹریشن) کے اصول پر اس کو حل کیا جائے۔ میں نے کہا کہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنادیا جائے یہ بورڈ تاریخی جائزہ لے کر جس نتیجہ تک پہنچے اس کو دونوں فریق مان لیں۔

اس تجویز سے کلدیپ نیر سمیت، شرکا کی اکثریت نے اتفاق کیا۔ قریب تھا کہ وہ اتفاق رائے سے منظور ہو جائے کہ عین اسی وقت بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر صاحب نے بآواز بلند کہنا شروع کیا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مانتے۔ اس کے بعد انھوں نے اتنا شور مچایا کہ مزید گفتگو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ مجلس چائے کے لئے اٹھ گئی اور کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میرے کمرہ میں ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا، مگر میں نے اس کو کبھی نہیں کھولا۔ ۱۴ نومبر کی صبح کو روانگی کے وقت تجربہ کے لئے میں نے اس کی سوئچ دبا دی تو اسکرین پر روشن حروف میں ہندی، اردو، انگریزی میں یہ الفاظ لکھ اٹھے:

نمستے جی، خوش آمدید، ہیلو۔

یہ انتظام شاید اس لئے ہوگا کہ آنے والا آدمی جب کمرہ میں داخل ہو کر اس کو کھولے تو وہ نئے آنے والے کو گیسٹ ہاؤس کی طرف سے استقبال کا کلمہ پیش کر سکے۔ مشین نے اپنا کام کیا۔ مگر مشین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت اسے اپنے مہمان کو الوداع کہنا ہے نہ کہ خوش آمدید۔

مشینی دماغ اور انسانی دماغ کا فرق یہی ہے۔ مشینی دماغ فیڈ کئے ہوئے سبق کو دہراتا ہے، جب کہ انسان خود اپنی سوچ کے تحت اپنا جواب وضع کرتا ہے۔

۱۴ نومبر کو واپسی کا دن تھا۔ صبح چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اور پروفیسر رشید الدین

صاحب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کہیں امیری کے مناظر تھے اور کہیں غریبی کے مناظر۔ میں نے سوچا کہ آدمی کا حال بڑا عجیب ہے اگر وہ غریب ہو تو پست ہمت ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خوش حال ہو تو گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ امیری میں معتدل رہتا ہے اور نہ غریبی میں۔

راستہ میں پروفیسر رشید الدین صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی معلومات وسیع ہیں اور حافظہ بھی اچھا ہے۔ وہ چالیس سال کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ نہایت وضع دار ہیں۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے نکلے تو انھوں نے وہاں کے آدمی کو حسب قاعدہ ٹپ دی۔ اسی طرح ایرپورٹ پہنچے تو یہاں بھی وہ ڈرائیور کو ٹپ دینا نہیں بھولے۔

رشید الدین صاحب ۱۹۷۹ میں پاکستان گئے تھے۔ وہاں کے بارہ میں بہت سے لطیفے سناتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک شاعر ہیں۔ ان کا تخلص فارغ ہے۔ ان کا ایک شعر رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ پاکستانی تجربہ کے بعد ہی یہ شعر نکل سکتا ہے:

اب تو یوں لگتا ہے فارغ کہ عیاذاً باللہ   جیسے اسلام یزیدوں کے لئے آیا ہو

انھوں نے دو شعر سنایا جو ان کے الفاظ میں گویا اس ملک میں اردو اور مسلمان دونوں کی کہانی کا خلاصہ ہے۔ ۱۹۰۵ میں داغ دہلوی نے فخر کے ساتھ کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ   ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج کیا حال ہے، اس کا اظہار مجروح سلطانپوری کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا یہ شعر اردو زبان کی موجودہ حالت کی تصویر ہے:

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح   ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

ایک اور شعر انھوں نے شاہد صدیقی کا سنایا۔ وہ حیدرآبادی تھے اور جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا:

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعور سفر نہ تھا   کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے

اس طرح بات کرتے ہوئے ہم لوگ ایرپورٹ پہنچ گئے۔ بڑودہ سے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۱۷ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک ہی پرواز ہے جو دہلی۔ احمد آباد۔ بڑودہ۔ دہلی کے درمیان

روزانہ چلتی ہے۔

راستہ میں انڈین ایر لائنز کی فلائٹ میگزین سواگت (نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے ہندی حصہ میں پہلا مضمون تھا ——— مہان صوفی سنت، حضرت نظام الدین اولیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں جو شخص بھی پرائم منسٹر بنتا ہے، وہ درگاہ نظام الدین جاکر وہاں چادر ضرور چڑھاتا ہے۔ کیوں کہ عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین کی مرضی کے بغیر کوئی شخص دہلی پر حکومت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ سلطان جی کہے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے سب کو ہمیشہ مانو پریم کا سندیش دیا (صفحہ ۴۹)

انگریزی میں ایک مضمون مسٹر ہومی جے وکیل کے قلم سے تھا۔ اس کی تصویریں مسٹر ڈی بالو نے فراہم کی تھیں۔ اس کا موضوع تھا تلاش امن :

In search of Peace

اس مضمون میں اقوام متحدہ کے ادارۂ امن کے لٹریچر سے ایک جملہ نقل کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چوں کہ جنگیں لوگوں کے دماغ میں شروع ہوتی ہیں، اس لئے انسانی دماغ ہی سے ہمیں امن قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کرنا چاہئے :

Since wars begin in the minds of men, it is there that we must begin to construct the defences of peace. (p. 12)

پرامن سماج بنانے کا ذریعہ پرامن انسان بنانا ہے۔ جب تک پرامن سوچ والے انسان وجود میں نہ آئیں پرامن سماج کا وجود بھی ممکن نہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کی دوپہر کو جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں دوبارہ واپس آگیا۔ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آتا ہے اور دوبارہ پھر وہ آخرت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ دنیا میں ہماری واپسی پردیس سے گھر کی طرف ہوتی ہے، آخرت میں ہماری واپسی عمل کی دنیا سے انجام کی دنیا کی طرف ہوگی۔

واپسی کے بعد بڑودہ سے چند خطوط ملے۔ مسز الکنندا پٹیل (Tel. 0265-339026) جو سمینار

کی آرگنائزر تھیں، ان کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں اپنا خط لکھنے کی کوشش کی۔ پہلی سطر میں لکھا "عزیز مولانا صاحب، آداب" اس کے بعد اس طرح انگریزی میں شروع کیا:

Unfortunately, my Urdu writing does not go beyond this. So I will continue in English. It is difficult for me to express how grateful we are that you came for the seminar last Sunday. For all of us it was a special blessing and I would not belittle the experience of hearing you and being with you by trying to thank. Both the Rajiv Gandhi Institute and we in Baroda are very keen that a volume containing a few papers and the proceedings should come out soon. It will be wonderful for us if you write a piece, even a short one. An article from you will mean so much.

گوہاٹی کا سفر

گوہاٹی (آسام) میں ۳ - ۶ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت پر گوہاٹی کا سفر ہوا۔ اس سیمنار کا موضوع تھا ـــــ نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی:

North-east India and the 21st century.

آج گوہاٹی کے لئے روانگی کا دن تھا۔ میں تیاری میں مصروف تھا۔ دو صاحبان ملاقات کے لئے آگئے۔ دونوں پڑھے لکھے اور دیندار مسلمان تھے۔ دونوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے مشن سے اختلاف ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اختلاف ہے۔ ایک نے کہا کہ آپ ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ آپ ہندوؤں کے مقابلہ میں صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ دونوں سے صرف ایک بات کہتا ہوں۔ آج رات کو جب آپ بستر پر سونے کے لئے جائیں تو یہ سوچیں کہ کل اگر آپ کی موت ہو جائے اور خدا آپ سے پوچھے کہ تم الرسالہ مشن کے مخالف کیوں بن گئے تھے۔ تو کیا آپ کا یہ جواب وہاں کام آئے گا کہ ہم اس لئے مخالف ہو گئے کہ یہ شخص ان لوگوں پر تنقید کرتا تھا جس کو ہم نے بطور خود اکابر کا درجہ دے رکھا تھا۔ اور وہ ہندوؤں سے صبر کرنے کے لئے کہتا تھا جن کو ہم اپنا قومی دشمن بنائے ہوئے تھے۔

جنوری ۱۹۹۵ کی دو تاریخ ہے اور صبح ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔ میں دہلی ایرپورٹ پر گوہاٹی جانے والے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ نشست گاہ میں نسبتاً کم آدمی نظر آرہے ہیں۔ تاہم تقریباً ہر آدمی کے ہاتھ میں آج کا اخبار ہے۔ اخبار کیا ہے۔ خارجی دنیا کا خبرنامہ۔ میں نے سوچا: ہر آدمی دوسروں کا خبرنامہ پڑھ رہا ہے۔ خود اپنا خبرنامہ پڑھنے کا شوق کسی کو نہیں۔

کچھ دیر میں گیٹ پر روشن حروف میں یہ الفاظ نمایاں ہو گئے (Now Boarding—889) یہ اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ گوہاٹی جانے والا جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے گیٹ سے گزر کر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۸۹ میں داخل ہو گئے۔

جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ دہلی سے گوہاٹی کے لئے یہ سوا دو گھنٹہ کی نان

اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ایئر پورٹ پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جہاز ٹھیک وقت سے گوہاٹی کے لئے روانہ ہوگا۔ مگر جب تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ کچھ ٹکنکل سبب کے تحت جہاز لیٹ ہے۔ چنانچہ ۴۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ جہاز پونے ایک بجے روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ ہندستان میں آدمی خواہ ہوائی جہاز سے سفر کرے یا ٹرین کے ذریعہ، ہر جگہ ناقابل قیاس مسائل ہیں۔ کل دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایک ناقابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ہمارے دفتر کے ایک کارکن نصیر احمد صاحب کے بوڑھے والد اپنے بیٹے سے مل کر واپس اپنے وطن یوپی جارہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نیا سوٹ کیس تھا جس میں کچھ نئے کپڑے اور کھانے کا سامان تھا۔ بزرگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیٹے سیٹ دیکھنے کے لئے گاڑی میں گئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: بڑے میاں چلئے آپ کو گاڑی میں بٹھادیں۔ یہ کہہ کر فوراً اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ بڑے میاں کہتے رہے کہ میرے ساتھ میرا لڑکا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ مگر وہ آدمی تیزی سے بیگ لے کر غائب ہوگیا۔

اس قسم کے جرائم ہر روز ہر بستی اور ہر شہر میں ہورہے ہیں۔ ان کے مسلسل جاری رہنے کا واحد سبب یہ ہے کہ مجرمین کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ انھیں کوئی سزا ملنے والی نہیں۔ اگر انھیں یقین ہو کہ جرم کرنے پر مجھے کوڑا مارا جائے گا، میرا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، مجھے گولی ماردی جائے گی، تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

پرواز کے دوران ۲ جنوری کے اخبارات ہندو، بزنس لائن، دی آبزرور پڑھا۔ مگر ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ملی۔ ہندستان کے اخبارات پر سیاسی ذوق اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ میرے جیسے آدمی کو کوئی کام کی بات مشکل ہی سے ملتی ہے۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ مگر وہاں بھی صرف یہ فرق ہوا ہے کہ اخباروں کے صفحات پر سیاست کی جگہ تجارت نے قبضہ کرلیا ہے۔

انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ میگزین سوا گت کا شمارہ جنوری ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کی سیاحت پر تھا جو مارک نکلس (Mark Nicholls) کے قلم سے تھا۔ وہ بذریعہ ٹرین مختلف مقامات کا سفر کرتا ہوا آگرہ پہنچتا ہے۔ وہاں وہ تاج محل کو دیکھتا ہے۔ تاج محل کو وہ عجوبۂ عالم (Wonder of the World) قرار دیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایک بلڈنگ کو انڈیا

کی علامتی تصویر بتانا ہو تو وہ ممتاز محل کا مقبرہ (تاج محل) ہے :

If one building was to sum up an image of India it is the tomb of Mumtaz Mahal. (p. 74)

لوگ تاج محل کو غیر معمولی اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر تقریباً ۲۵ سال پہلے جب میں پہلی بار آگرہ گیا اور تاج محل کو دیکھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر قریب کی مسجد میں چلا گیا۔

۴ جنوری کی سہ پہر کو ۳ بجے جہاز گوہاٹی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ایرپورٹ کے لاؤنج میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا پڑا۔ یہاں ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ پروفیسر بی کے رائے برمن تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 641194) انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر کئی کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں :

Prism in Islam
Muharram in two cities
by B.K. Roy Burman
1779, C.R. Park, New Delhi

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مختصر طور پر بتائیں گے کہ آپ کے مطالعہ کے مطابق اسلام کی اسپرٹ کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا تاثر بیان کیا :

Human brotherhood, man's basic nature is in quest of his humane essence, social justice.

پروفیسر رائے برمن نے کثرت سے ملک کے مختلف حصوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان مختلف اور متضاد کلچروں کا ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گوہاٹی سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مندر ہے۔ وہاں سال میں ایک دن باجماعت نماز ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے بتایا کہ بھوٹان کی سرحد پر ایک قبیلہ ہے۔ وہ اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے سال میں ایک دن گائے کی قربانی کرتا ہے۔ اس طرح کی مختلف باتیں انھوں نے بتائیں۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً پون گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ

میں سڑک کے دونوں طرف گوہاٹی کے مناظر سامنے سے گزرتے رہے۔ ہر چیز پر پسماندگی کے آثار دکھائی دیئے۔ یہاں کے مکانات، یہاں کی دکانیں، یہاں کے مرد اور عورت، سب کچھ کم (Miniature) سے دکھائی دیئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز پر پسماندگی کی اسٹیمپ لگی ہوئی ہے۔

ایک آدمی جب دہلی کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو پر عظمت شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گوہاٹی کو دیکھتا ہے تو گوہاٹی اس کو مقابلۃً نمبر ۲ کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ فرق اس کے اندر وہ احساس جگاتا ہے جس کو "علیحدگی پسندی" کہا جاتا ہے۔ ہندستان کی یہی نامساوی ترقی یہاں کی سیاسی بے چینی کی اصل ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس آپ امریکہ میں جائیں یا یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک کا سفر کریں تو وہاں بڑے شہر اور چھوٹے شہر میں اس قسم کا فرق آپ کو نہیں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہمارے ملک جیسی علیحدگی کی تحریکیں بھی ابھرنے نہیں پاتیں۔

گوہاٹی میں میرا قیام اشوک گروپ کے ہوٹل برھم پترا کے کمرہ ۳۰۱ میں تھا۔ ہوٹل کے کمرہ میں پشت کی طرف "شیشہ کی دیوار" کے باہر سبزہ اور درخت کے مناظر ہیں۔ اس کے بعد جھیل ہے جس کا پانی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اوپر چڑیوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جھیل کے اس پار سبز پوش پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ مناظر بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ قدرتی وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہاں پانی کی افراط ہے جس سے زراعت اور باغبانی کو بہت ترقی دی جا سکتی ہے۔ نیز، سستی بجلی بڑی مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ علاقہ پسماندہ پڑا ہوا ہے۔ ایک ریٹائرڈ افسر نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حکومت نے اس علاقہ کی مدد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے اس علاقہ کو بے پناہ مالی مدد بھیجی ہے۔ مگر اس مدد کا بڑا حصہ تھوڑے سے لوگوں کی جیب میں چلا گیا۔ اس کا بہت کم حصہ ڈیولپمنٹ کے کاموں میں استعمال ہوا۔ ہندستان میں آپ جس مسئلہ کی تحقیق کریں، آخر میں سب کی جڑ میں یہی کرپشن نظر آئے گا۔

اس صورت حال کی بنا پر اب میرا حال یہ ہے کہ حکومت جب "ڈولپمنٹ" کے نام پر کسی بڑی رقم کا اعلان کرتی ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ عوامی ٹیکسوں پر لوٹ کی ایک نئی مد کھل گئی۔

۲ جنوری کی شام کو میں اپنے کمرہ میں تھا کہ داخلی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ جسٹس بھاگوتی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ بھی سیمنار میں آئے ہوئے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ضرور تشریف لائیں۔ چند منٹ کے بعد وہ کمرہ میں آگئے۔

جسٹس پی این بھاگوتی (سابق چیف جسٹس آف انڈیا) انٹرنیشنل شہرت کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے واپسی کے بعد میں اریٹریا جا رہا ہوں۔ وہاں کی حکومت نے اپنے دستور کا ڈرافٹ تیار کرنے کے لئے مجھے بلایا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد میں دہلی میں آپ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ گفتگو کے بعد ۱۵ جنوری کی تاریخ طے ہوئی۔ میں نے تجویز کیا کہ دہلی میں کچھ معروف افراد پر مشتمل ایک حلقہ بنایا جائے۔ اس کی ماہانہ میٹنگ ہوا کرے۔ دوسرے کاموں کے علاوہ اس کا ایک خاص کام یہ ہو کہ پیش آمدہ اشوز پر وہ تبادلہ خیال کے بعد ایک اسٹیٹمنٹ تیار کرے اور فوری طور پر اس کو اخبارات میں شائع کرایا جائے۔ انھوں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ اور کہا کہ میں سفر سے واپسی کے بعد ۱۵ جنوری تک آپ سے ملوں گا اور اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے گفتگو کروں گا۔

آج شام کو مغرب کی نماز ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھایا تو یہ دعا زبان سے نکلی : اللّٰھم ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنك سلطاناً نصیراً

۲ جنوری کی شام کو ۸ بجے ایک ہال میں تفریحی پروگرام تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ میں رنج وغم میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے قرآن کی آیت (الجمعہ ۱۱) یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ آج کی دنیا میں آدھے انسان لہو میں مبتلا ہیں۔ اور آدھے انسان تجارت میں۔ ذکر خداوندی میں مشغول ہونے والا انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اس سے واپسی میں مسٹر چترنجن ڈیب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اگرتلا کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۶ میں جب گاندھی جی نواکھالی گئے تھے تو وہ وہاں جاکر گاندھی جی سے ملے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی۔ میں نے گاندھی جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو گاندھی جی

ہنس پڑے۔ یہ ہنسی غضب کی تھی۔ وہ آدمی کو مسحور کر دینے والی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ سرونسٹن چرچل نے کیوں اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ اس ننگے فقیر سے (naked Fakir) مت ملنا۔ اس کی ہنسی تم کو کھا جائے گی۔

اشوک ہوٹل میں مولانا اسعد مدنی کے صاحبزادہ جناب محمود اسعد مدنی (۲۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس وقت سے میرے اندر تجارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں سے سنتا تھا کہ چندہ لے کر کھا گئے تو میں نے طے کیا کہ میں بزنس کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکڑی کی تجارت شروع کی ہے۔ ٹیک کی لکڑی وہ آسام سے خرید کر لے جاتے ہیں اور لکھنؤ میں ہول سیل میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ عام طور پر علماء کے خاندان کے لوگ مدرسہ اور چندہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے بجائے تجارت کا کام شروع کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔

مولانا محمود اسعد مدنی سے میں نے کہا کہ میں گوہاٹی کے کچھ مسلمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کچھ مقامی مسلمانوں سے ربط قائم کیا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو نماز مغرب کے بعد کچھ لوگ آگئے۔ ہوٹل کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ ان میں جمیل الدین احمد صاحب، رقیب الحسین صاحب آصف احمد صاحب، علی رضا صاحب، غلام اکبر صاحب وغیرہ موجود تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی اس نشست میں گوہاٹی اور آسام کے مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آسام میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰ فیصد ہے اور گوہاٹی میں تقریباً پندرہ فیصد۔ گوہاٹی شہر میں تقریباً ایک سو مسجدیں ہیں۔ بہت سے مدرسے قائم ہیں۔ ایک بڑا مدرسہ جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ تاہم پورے آسام میں مسلمانوں کا کوئی اخبار موجود نہیں۔ روایتی طور پر آسام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد یہاں کے کچھ مسلمانوں نے انتہائی نادانی سے کام لیتے ہوئے اجودھیا کا غصہ آسام میں اتارنا چاہا۔ اس کے نتیجہ میں تعلقات میں کچھ بگاڑ آگیا۔

۳ جنوری کی صبح کو ناشتہ کی میز پر کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک مسٹر رو ندر کیلے کر (Ravindra Kelekar) ہیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہے اور وہ گوا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ بتائیے۔

انھوں نے ۱۹۵۲ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ واردھا (سیواگرام) میں تھے۔ وہاں سے گجراتی زبان میں ایک پرچہ نکلتا تھا جس کا نام منگل پربھات تھا۔ اس پر اڈیٹر کی حیثیت سے کاکا صاحب کالیلکر کا نام ہوتا تھا۔ مگر عملاً اس کو روندر کیلے کر ہی مرتب کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے سنسکرت کا ایک اشلوک گجراتی میں نقل کیا تو سنسکرت میں زیادہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو انھوں نے غلط طور پر لکھ دیا تھا۔ لوگوں نے کاکا صاحب کالیلکر کو توجہ دلائی تو انھوں نے روندر کیلے کر کو ایک خط لکھا تھا کہ تم سنسکرت کے اشلوک غلط لکھتے ہو، اس طرح تو میری بدنامی ہوجائے گی۔ اس کے جواب میں روندر کیلے کر نے انھیں لکھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ پرچہ میں میرا نام ورکنگ اڈیٹر کے طور پر لکھ دیا جائے۔ اس طرح اس قسم کی غلطیاں میرے خانہ میں چلی جائیں گی۔ اور آپ کی بدنامی نہیں ہوگی۔

کاکا صاحب کالیلکر (وفات ۱۹۸۱) نے جواب میں لکھا کہ ایسا کرنا تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔ جب تک تم تیاری کے مرحلہ میں ہو تب تک تمہاری غلطیاں مجھے لینا چاہئے۔ اِس وقت تم کو بدنامی سے بچانا زیادہ ضروری ہے تاکہ تمہارا صحافتی مستقبل خراب نہ ہونے پائے۔

۳ جنوری کو سیمنار کا افتتاح تھا۔ ہم لوگ ہوٹل سے رابندر بھون لے جائے گئے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو دو درجن کی تعداد میں ناگالوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تھے۔ روایتی انداز کا نیم برہنہ لباس ان کے جسم پر تھا۔ ہاتھوں میں بلم لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان میں ایک گانا گایا جو سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کے بعد مہمانوں کو دونوں طرف سے اپنے جلو میں لے کر اندر ہال میں لے گئے۔ یہاں دوبارہ وہ لوگ اسٹیج کے پیچھے اپنے روایتی اسلحہ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

مسٹر نٹور ٹھکر جو اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ناگا لوگ ہیں۔ ان کا کلچر جنگ پر مبنی ہے۔ ان کا پورا کلچر وار کلچر ہے۔ آج کی تقریب میں انھوں نے فتح کا منظر دکھایا تھا، جیسے

کہ ہم نے اس شہر کو فتح کیا ہے۔ اور اب فتح کی تقریب منانے کے لئے ہم اس ہال میں آئے ہیں اور فوجی دستے ہمارے ساتھ ہیں۔

مسٹر نشور تھکر نے اپنے ویلکم ایڈریس میں کہا کہ جواہر لال نہرو کہتے تھے کہ ہم سب چھوٹے لوگ ہیں جو ایک بڑے کام میں مشغول ہیں:

We all are small men engaged in great mission.

میں نے سوچا کہ یہ بات تو بڑی اچھی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سو سالہ محنت کے باوجود ہماری کوششوں کا رزلٹ کیوں نہیں نکل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک الٹی جانب سفر کر رہا ہو۔

جسٹس پی این بھاگوتی نے اپنے افتتاحی ایڈریس میں دہرایا کہ نہرو نے کہا تھا کہ اپنی کامیابی کو جانچنا ہو تو ملک کے سب سے چھوٹے آدمی کو دیکھو:

...see the smallest man of India.

یہ سمینار ناگالینڈ گاندھی آشرم کے زیر انتظام منعقد کیا گیا تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا پی این بھاگوتی نے اس کا افتتاح کیا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی کا جو طاقت ور رجحان پایا جاتا ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ مرکز کا اقتدار اسٹیٹ کے اوپر سے کم کیا جائے۔ غیر مرکزی نظام ہی اس کا واحد حل ہے:

the only solution is decentralisation of power.

چند اور تقریریں ہوئیں۔ مقامی انگلش اخبار کے اڈیٹر ڈاکٹر بیزبورہ (D.N. Bezboruah) نے کہا کہ اکیسویں صدی میں ہمارے ملک میں کوئی معجزہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا آدمی صرف اپنے حقوق کو جانتا ہے۔ اس کو ملک کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا پتہ نہیں:

No miracle was going to happen in the 21st century in the country. This was due to our obsession with our rights rather than duties to our country.

افتتاحی اجلاس ۳ جنوری کو راج بھون میں ہوا تھا۔ بقیہ تمام اجلاس ہوٹل برہم پتر

اشوک کے ہال میں ہوئے۔ مقررین نے بہت سی باتیں کہیں۔ ساری باتیں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چند باتیں متفرق طور پر یہاں درج کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے گاندھی جی کا یہ قول دہرایا کہ "سارے مذہب اچھے ہیں، سارے مذہب سچے ہیں، مگر سارے مذہب کچے ہیں"۔ یہ بات کہنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ غیر منطقی ہے۔ سچائی کو آدمی اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اعتقادی یقین حاصل کر سکے۔ مگر مذکورہ فارمولا آدمی کو ہمیشہ کے لئے یقین سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا فارمولا تلاش حق کے جذبہ کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ جو لوگ انگریزی زبان کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ ممکن نہیں۔ لوگ انگریزی زبان کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ وہ تین باتوں کے لئے ایسا کرتے ہیں —— پاور، ریسپکٹ، جاب۔ یہ تینوں باتیں جب تک آپ ملکی زبان میں پیدا نہ کر سکیں، انگریزی کی طرف دوڑ بھی ختم ہونے والی نہیں۔

مسٹر دوارکا شرما نے بتایا کہ میزورم میں ایک نوجوان سے انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ ہم انڈیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیوں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے:

They are not treating us as equal.

ایک صاحب نے کہا کہ ان نوجوانوں میں گھومنے کے بعد میں سمجھا ہوں کہ ان کے نزدیک پرامن ذرائع کا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ ہتھیار کے سوا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ نوجوان مایوس ہیں، اور یہی اصل مسئلہ ہے:

Youths are disillusioned, this is the problem.

۳ جنوری کو دوپہر بعد کے سیشن میں ہیومن رائٹس کے مسئلہ پر غور ہوا۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر جو بے چینی ہے اس کی وجہ کیا یہ ہے کہ ان کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی باتیں سامنے آئیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اصل مسئلہ بے شعوری کا ہے نہ کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا۔

۴ جنوری کو تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح شروع ہوا۔ آج بھی حقوق انسانی کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا۔ سرکاری افسروں کا خیال تھا کہ گورنمنٹ بہت کام (tremendous work) کر رہی ہے۔ تحفظ حقوق کا قانون (Protection of human rights act) بنایا گیا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کا نیشنل رجسٹر بنایا گیا۔ کمیشن کے نام چار ہزار شکایتیں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی وصول ہوئیں۔ وغیرہ۔

ایک اہم مثال یہ ہے کہ کمیشن نے تجویز کیا کہ ٹاڈا پر نظر ثانی کی جائے۔ اسی طرح جیل کا معائنہ کرکے تجویز کیا کہ قیدیوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ مثلاً جیل میں جگہ کی تنگی (over crowding in jails) وغیرہ۔

میں نے کہا کہ حقوق انسانی کے جو واقعات اخباروں میں چھپتے ہیں وہی مجالس میں زیر بحث آتے ہیں۔ حالانکہ وہ کل ہونے والے واقعات کا بمشکل ۵ فیصد حصہ ہوتا ہے۔

۳ جنوری کی شام کو میں پروگرام سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آرہا تھا۔ گاڑی میں میرے علاوہ دو اور صاحبان تھے۔ دونوں دو الگ الگ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: آپ کی یونیورسٹی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ جس یونیورسٹی میں پرابلم نہ ہو وہ یونیورسٹی ہی نہیں:

University minus of problems is not a university.

یہ حال اب ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کا ہو چکا ہے۔ اب تعلیمی اداروں میں تعلیم سے زیادہ سیاست کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے لئے جو اشو استعمال کئے جاتے ہیں انھیں کا نام پرابلم ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں کا یہ حال کیوں ہے۔ اس کا سبب بہت پیچھے تک جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ میں تعلیم گاہوں میں سیاست داخل کی گئی تاکہ آزادی کی تحریک کے حق میں نوجوانوں کی تائید حاصل کی جاسکے۔ ۱۹۴۷ کے بعد دوبارہ یہ سیاست جاری رکھی گئی کیونکہ نئے حکمرانوں کو الکشن میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے طلبہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار تعلیمی ادارے تعلیم سے زیادہ سیاست بازی کا مرکز بن گئے۔
اس علاقہ کی سات ریاستوں میں تعلیم کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوگا:

Percentage of literacy to total population 1981 & 1991

States	1981			1991		
	Average	Male	Female	Average	Male	Female
Arunachal Pr.	20.70	28.94	11.32	41.22	51.20	29.37
Assam	—	—	—	53.42	62.34	43.70
Manipur	41.35	53.29	29.06	60.96	72.98	48.64
Meghalaya	34.08	37.89	30.08	48.26	51.57	44.78
Mizoram	50.88	64.46	54.91	81.23	84.06	78.09
Nagaland	42.57	50.06	33.89	61.30	66.09	55.72
Tripura	42.12	51.70	32.00	60.39	70.08	50.01
India	43.56	56.37	29.75	52.11	63.86	39.42

ایک مقامی بزرگ نے بڑے دردمندانہ انداز میں اس علاقہ کے حالات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ علیحدگی کی تحریک میں ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور پایا کچھ بھی نہیں۔ نئی دہلی کے لوگوں سے کہئے کہ وہ کوئی مؤثر ڈائیلاگ شروع کریں، اور یہ ڈائیلاگ کسی پیشگی شرط (pre-condition) کے بغیر ہو۔ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ جلنے کے لئے نہیں ہے:

The North-East is not for burning.

میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ غیر حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ اور اب حقیقت پسندی کا طریقہ کرکے ہم اس کو ختم کرسکتے ہیں۔

گوہاٹی کو اگرچہ دوسرے ہندستانی شہروں کے مقابلہ میں ایک بی کلاس سٹی کا درجہ حاصل ہے۔ مگر اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ وہ پورے نارتھ ایسٹرن علاقہ کے لئے ہندستانی دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے:

Gauhati is the gateway to the entire north-eastern region.

نارتھ ایسٹ انڈیا کا علاقہ اپنی مخصوص جغرافی پوزیشن کی وجہ سے مرغ کی گردن

(chicken's neck) کہا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کا اندازہ ہوگا:

سیمنار میں جو کاغذات تقسیم کئے گئے ان میں کچھ معلوماتی صفحات تھے۔ ان میں سے ایک میں بتایا گیا تھا کہ ان ساتوں ریاستوں میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کا تناسب کیا ہے، یہ اعداد و شمار اگلے صفحہ پر نیچے نقل کئے جارہے ہیں۔

واضح ہو کہ ہندستان میں اس وقت چھ بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں ——— ہندوازم، اسلام، مسیحیت، سکھ ازم، بدھزم، جین ازم، آبادی کے اعتبار سے ان مذاہب کا تناسب یہ ہے:

(1)	Hindu	....	76.4%
(2)	Islam	....	12.6%
(3)	Christian	....	7.3%
(4)	Jaina	....	2.2%
(5)	Buddhist	....	2%
(6)	Sikh	....	2.8%

مسٹر نٹور ٹھکر مشنری انسان کا کامیاب نمونہ ہیں۔ انھوں نے نیشنل انٹگریشن کا مشن لیکر ۱۹۵۵ میں ناگا پہاڑیوں میں گاندھی آشرم بنایا۔ اس وقت سے اب تک ہر قسم کی مشکلات کے باوجود وہ اس ایک مقصد کے تحت یہاں جمے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں علیحدگی کی تحریک جارحانہ بنیاد پر چل رہی تھی، وہاں انھوں نے ملکی اتحاد کے لئے خاموش محنت شروع کی۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے کئے گئے، مگر آج وہ ناگاؤں کے درمیان ایک محبوب شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصد میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔

یہ کامیابی انھیں کیسے ملی۔ اس کے لئے سب سے پہلے انھوں نے یہ کیا کہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے پوری طرح ناگا کلچر کو اختیار کرلیا۔ وہ انھیں میں کے ایک فرد بن گئے۔ وہ نہایت سخت قسم کے سبزی خور ہیں اور پورے معنوں میں گاندھی وادی ہیں۔ مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ گوشت ناگاؤں کی روزمرہ کی غذا ہے۔ ایسی حالت میں سبزی خوری کی عادت کو لے کر وہ ناگاؤں میں گھل مل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد کی خاطر گوشت خور (non-vegetarian) بن گئے۔ انھوں نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا:

Distribution of Religion in North Eastern State (in percentage)

States	Hinduism	Islam	Christ.	Sikh	Buddhists	Jains	Others
Arunachal Pr.							
Assam*	58.57	24.28	6.3	0.12	0.43	0.12	0.03
Manipur	60.04	6.99	29.6	0.06	0.03	0.06	3.15
Meghalaya	18.02	3.10	52.6	0.12	0.20	0.04	25.76
Mizoram	7.14	0.45	83.8	0.08	8.19	—	0.23
Nagaland	14.36	1.52	80.1	0.00	0.07	0.15	3.68
Tripura	89.34	6.74	1.20	0.01	2.69	0.01	0.01

*—1971 census figures for Assam

I remember trying to eat meat which tasted like rubber to me, but as a mark of respect for my religion I refused to eat beef.

مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں گوشت کھانے کی کوشش کرتا تھا جس کا ذائقہ مجھے بالکل ربر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ البتہ اپنے مذہب کے احترام میں گائے کا گوشت کھانے سے میں نے انکار کردیا۔

مسٹر ٹھکر اپنے آشرم سے ایک انگریزی پرچہ اشانی (Ishani) کے نام سے نکالتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کا دور ختم ہوگیا۔ مستقبل اب سائنس اور روحانیت کے لئے ہے:

The days of politics and religion are now over and the future belongs to science and spirituality.

میں نے کہا کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست کا رول اب محدود ہوگیا ہے۔ مگر سچا اور حقیقی مذہب بدستور علم اور روحانیت دونوں کے لئے گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گوہاٹی کے سیمنار (اور اس طرح کے دوسرے سیمناروں میں جو باتیں میں نے سنیں اور مسلم اجتماعات میں جو باتیں کی جاتی ہیں، جب میں دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اس طرح کے سیمناروں میں ہمیشہ ملکی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مثلاً گوہاٹی کے سیمنار میں ساری بحث دو نکتہ پر مرکوز رہی۔ اس علاقہ میں علاحدگی پسندی کے رجحان کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اس علاقہ کی معاشی پس ماندگی کو کس طرح دور کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم اجتماعات میں ساری بحث صرف مسلم کمیونٹی کے مسائل پر ہوتی ہے۔ یہ بحث بھی اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں تعصب اور ظلم کا شکار ہورہے ہیں، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم سے الگ کردیا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ کوئی الگ قوم ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اس ملک میں ایک محروم اور مظلوم طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان بزرگ سے میں نے کہا کہ ہندستان کی قیادت کی سو سالہ سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ —— پہلے ہنگامہ کرکے تقسیم کرانا، اور جب تقسیم

سے ان کے مسائل حل نہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر دوبارہ فریاد شروع کر دینا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اعداد و شمار پیش کر کے ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ گراس نیشنل پروڈکشن (جی این پی) میں اضافہ ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر جی این پی بڑھا ہے تو ساتھ ہی ایک اور جی این پی بھی بڑھا ہے۔ یہ دوسرا جی این پی ہے ــــــ گراس نیشنل پاورٹی۔

ایک صاحب نے کہا کہ نارتھ ایسٹ انڈیا کا سارا مسئلہ مصنوعی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کیجئے، اور بنگلہ دیش کی سرحدوں کو ختم کر کے سارے علاقہ کو ایک جغرافی وحدت بنا دیجئے، اور پھر سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش کی طرف سے روزگار کی تلاش میں جو لوگ آتے ہیں، ان کو ایک صاحب نے ناخواندہ مہمان (unwelcome guests) بتایا اور کہا کہ ان کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کا تعلق "بنگلہ دیش" سے نہیں ہے۔ یہ تو تقسیم کے بہت پہلے سے رائج ہے۔ معاشی ضرورت کے تحت ساری دنیا میں لوگ ادھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی آتے ہیں، اور پھر اکثر واپس چلے جاتے ہیں۔

گوہاٹی کے انگریزی اخبار نارتھ ایسٹ ٹائمس (The North East Times) کا شمارہ ۳ جنوری دیکھا۔ اس میں نیو گوہاٹی کے جیبون سائیکیا (Jibon Saikia) کا خط پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کانگرس کی ووٹ بنک کی پالیسی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش سے مسلمانوں کی آمد برابر جاری ہے۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اگلے ۲۰ سال میں آسام ایک مسلم اکثریت کا علاقہ بن جائے گا:

> It has now become crystal clear that Assam is going to be a Muslim majority state in India, in the course of near about twenty years. (p. 4)

اسی کے ساتھ اخبار میں بہت سی خبریں تھیں جو بتا رہی تھیں کہ یہاں کے جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ اپھال کے علاقہ میں پانچ کوکی مار ڈالے گئے اور تین آدمی بری طرح زخمی ہو گئے۔ جورہاٹ میں پانچ مسلم نوجوان ایک بنک میں داخل ہوئے اور دو لاکھ ۴۴ ہزار روپیہ لے کر فرار ہو گئے۔ گرام دیو گاؤں میں پندرہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایک اسکول ٹیچر مہندر داس کے گھر

میں گھس گیا۔ انھوں نے گھر والوں کو مارا اور ایک ہزار روپیہ نقد اور قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے دوموتی میں ایک ہتھیار بند گروہ ایک بنک میں داخل ہوا اور پچاس لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ وغیرہ

آسام میں بنگلہ دیشیوں کی آمد کا افسانہ صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر، آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ ریاست اگر بالفرض مسلم اکثریت کا علاقہ بننے والی ہو تو ان کو سخت پریشانی ہوگی، لیکن اگر ان کی ریاست جرائم اکثریت کا علاقہ بن رہا ہو تو اس کے لئے انھیں کوئی پریشانی نہیں۔ یہی غیر حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے ملک کو موجودہ تباہی کے مقام پر پہنچایا ہے۔

مسٹر چارلس چاشی (Charles Chashie) انگریزی روزنامہ ناگالینڈ آبزرور کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کی ٹریجڈی دراصل لیڈرشپ کا فقدان ہے۔ انھوں نے آر ایم لالہ کی کتاب قیادت کی تلاش (In Search of Leadership) کا حوالہ دیا۔ مصنف نے اس میں میک گریگر (Mac Gregor) کا قول نقل کیا ہے کہ عوام کو بہتر حالت کی طرف لے جانے کا راز قیادت کو بہتر بناتا ہے:

That people can be lifted into their better selves is the secret of transforming leadership.

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف اس علاقہ کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا اور ہر کمیونٹی کا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے لیڈر نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عمومی جہالت اور بے شعوری کی وجہ سے لوگ اچھے آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ کیوں کہ اچھا لیڈر ہمیشہ حقیقت پسندی کی بات کرتا ہے جس کی اہمیت کو بے شعور عوام سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے برعکس برا لیڈر جذباتی باتیں کرتا ہے جس کو ہر آدمی سمجھ لیتا ہے اور پرجوش طور پر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

کلکتہ سے مبارک کریم جوہر صاحب بھی اس سمینار میں آئے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ اس مدت میں وہ بنگلہ زبان میں پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں صوفی ازم پر ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی معرفت کی بات جو آپ نے اپنے مطالعہ میں پائی ہو اس کو بتائیے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ اپنے قلم سے لکھے: انسان اپنے کو جاننے سے تمام ادیان کا جاننا ہو جاتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ کلکتہ کے ہندو پبلشر ایران سے اسلامی کتابیں مانگتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کی فرمائش پوری نہیں کر پاتے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر ہندو پبلشر نے چھاپی ہیں۔ صحیح بخاری اور اس طرح کی کئی دوسری کتابوں کا بنگلہ ترجمہ وہ چھپوا چکے ہیں۔ انھوں نے کلکتہ میں انڈین صوفی سماج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ (Tel. 400475)

ایک مجلس میں ملک کی تقسیم پر بات ہونے لگی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر محمد علی جناح تو ۱۹۳۰ میں لندن چلے گئے تھے اور وہاں پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ پانچ سال بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور ان کو ہندستان واپسی کے لئے آمادہ کیا۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کے سب ملک کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اور ہم ہی کو اس کی قیمت ادا کرنا ہے:

We all are responsible for partition and we have to pay the price.

ایک صاحب نے بتایا کہ راج موہن گاندھی نے اپنی انگریزی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح جب ہندستانی پالٹکس سے الگ ہو کر لندن چلے گئے تو اس کے بعد برٹش سرکار کے کسی ذمہ دار نے بات کرتے ہوئے جواہر لال نہرو سے پوچھا کہ جناح کا معاملہ کیا ہے۔ نہرو نے جواب دیا کہ جناح تو سیاسی اعتبار سے ختم ہو گئے (Jinnah is finished) جناح تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اچھا، میں ان کو دکھاؤں گا کہ میں کس طرح زندہ ہوں:

Finished, I will show him.

اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور مسٹر جناح کو ہندستان واپس آنے کے لئے کہا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ آپ ہندستان واپس جائیے اور لوگوں کی رائے معلوم کرکے مجھے بتائیے۔ لیاقت علی خاں واپس آئے۔ اور لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد مسٹر جناح کو ایک ٹیلی گرام بھیجا۔ یہ ٹیلی گرام صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا ——— آجائیے (come) اس طرح مسٹر جناح دوبارہ ہندستانی پالٹکس میں واپس آ گئے۔

انھوں نے بتایا کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد جناح کانگرس سے الگ ہو گئے اور ملک کی تقسیم پر پختہ ہو گئے۔ مگر مولانا آزاد کے بیان کے

مطابق ، یہ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ یوپی کیبنٹ میں کانگریسی مسلمان لئے جائیں یا مسلم لیگی مسلمان۔ اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے جن دو آدمیوں کو کیبنٹ میں شامل کرنے کے لئے جو دو نام دئے تھے، وہ لیاقت علی خاں اور عبد الرحمان نشتر تھے۔ دونوں زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا جو کسان لیڈر تھے، وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہ لوگ سوشلسٹ ذہن کے تھے اور اس زمانہ میں زمینداری کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم زمینداروں کو اپنی کیبنٹ میں لیں تو ہم عوام کو کیا جواب دیں گے۔ یہ وجہ تھی جس کی بنا پر مسلم لیگ کے نامزد افراد کو کیبنٹ میں لینے سے انکار کیا گیا۔

مسٹر بی کے رائے برمن نے اپنے مفصل پیپر میں نارتھ ایسٹ کے قبائل کے لئے حق خود اختیاری (right of self-determination) کی وکالت کی اور اس علاقہ کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ان کو اٹانومی دی جائے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ حق خود اختیاری سے ان کی مراد حق خود انتظامی (right of self-management) ہے نہ کہ انقطاع (secession)۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دستور ہند کے علاوہ اقوام متحدہ کے ڈیکلریشن اور انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا حوالہ دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں شہریوں کے حقوق کی دفعہ تو موجود ہے۔ مگر اس میں شہریوں کی ذمہ داری کی کوئی دفعہ نہیں۔ چنانچہ اب سارے ملک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو تو آخری حد تک جانتے ہیں، مگر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انھیں خبر نہیں۔ ہمارا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے جیسے کہ آزاد ملک کے لوگوں کے صرف حقوق ہوتے ہیں، ان کے کوئی فرائض نہیں ہوتے:

Citizens of a free country have only rights and rights and rights, but no duties.

اس معاملہ میں مسلمانوں کا کوئی استثناء نہیں۔ میں مسلم دانشوروں کی جتنی بھی تحریریں پڑھتا ہوں ہر ایک میں صرف مسلمانوں کے حقوق بتائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جو مسلمانوں کو بتائے کہ مسلمان جس ملک میں یا جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں ان کے

تیئیں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب پرجوش تقریر کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش سے مسلمان برابر سرحد پار کرکے ہمارے یہاں آرہے ہیں، یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ بنگلہ دیش کو ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، پھر ہم کیا کرسکتے ہیں۔ مسٹر سنجے ہزاریکا نے کہا کہ مائیگریشن موجودہ زمانہ کی ایک عام چیز ہے۔ امریکہ بھی اس کو روک نہیں سکا، پھر ہم کیسے اس پر روک لگا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے کہا کہ نصف ملین ہندستانی نیپال چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا جانا نیپال کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے کہ ان ہندستانیوں کو وہاں سے واپس لانے کی بات کریں۔ پھر بنگلہ دیش والوں پر اتنا شور کیوں۔ ہم ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں ہوسکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس علاقہ میں علاحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ترقیات کا فائدہ خواص تک رہ جاتا ہے، وہ عوام تک نہیں پہنچتا:

The fruit of developments do not perculate to the grassroot level.

دوسرے صاحب نے کہا کہ یہی اصل بات نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کو ترقیاتی پروگراموں کا اتنا فائدہ پہنچا کہ وہ ملک کی سب سے زیادہ خوش حال ریاست بن گئی۔ وہاں اس معاملہ میں عوام وخواص میں کوئی تفریق نہیں۔ اس کے باوجود پنجاب میں علاحدگی کی خوں ریز تحریک شروع ہوئی۔

۴ جنوری کی شام کے اجلاس میں مجھے موقع دیا گیا۔ میں دہلی سے ایک انگریزی پیپر تیار کرکے لے گیا تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی علاقائیت پسندی کے خلاف تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ علاحدہ خطہ بنانا کسی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس معاملہ کو پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دونوں ہی مسائل کے حل کے نام پر علاحدہ ملک کے طور پر وجود میں آئے۔ مگر دونوں میں سے کسی جگہ بھی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ بلکہ مسائل پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جغرافی تقسیم یا علاحدگی سے مسائل کے حل کا کوئی تعلق نہیں۔

سمینار کے ناظم مسٹر ٹھاکر نے آخر وقت میں کہا کہ آپ کو ایک اور موضوع پر بھی بولنا ہے۔

وہ مذہبی ہم آہنگی اور کلچرل ٹالرنس کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر پہلے سے میں نے کچھ تیار نہیں کیا تھا۔ اسی وقت بیٹھ کر انگریزی میں ایک پیپر لکھا اور اس کو وہاں پیش کیا لوگوں نے بہت پسند کیا۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی اختلافات یا کلچرل اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو ٹالریٹ کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے آخر میں میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل سوامی دیویکانند نے ایک جملہ میں اس طرح بتایا ہے ۔۔۔ ایک کی اتباع کرو، اور کسی کے خلاف نفرت نہ کرو:

Follow one, and hate none.

میرا پیپر، دوسرے پیپروں کی طرح، حاضرین کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ ہر پیپر کی کاپیاں پہلے سے تیار کی جاتی تھیں اور وہ ہال میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔

۴ جنوری کی شام کا اجلاس تاخیر کے ساتھ ساڑھے چھ بجے ختم ہوا۔ ہر آدمی جو اسٹیج پر آتا وہ لمبی تقریر کرنے لگتا۔ جب مقرر مدت سے زیادہ وقت ہو گیا تو صدر اجلاس مسٹر پی ایچ تریدی (آئی ایس آئی) نے بحث کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہوئے مائک اٹھایا تاکہ وہ صدر کی حیثیت سے اپنے آخری کلمات کہہ سکیں۔ عین اسی وقت حاضرین میں سے ایک خاتون نے بلند آواز سے کہا "کیا میں ایک منٹ لے سکتی ہوں"۔ صدر نے جواب دیا کہ نہیں، اب وہ ایک منٹ کسی کے لئے باقی نہیں رہا:

We have no that one minute.

یہ سن کر مجھے موت کے لمحہ کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی کی عمر کا آخری وقت جب آ لے گا اور موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچے گا تو آدمی کہے گا کہ ایک منٹ کی مہلت مجھے اور دے دو۔ فرشتہ جواب دے گا کہ اس ایک منٹ کا وقت گزر چکا۔ اب وہ ایک منٹ کہاں۔

منی پور کے مسٹر نیل کنٹھ شرما نے کہا کہ ہمارے علاقہ کے نوجوان کثرت سے ہتھیار اور ڈرگ کی طرف جا رہے ہیں۔ حتی کہ ڈرگ سے بچانے کے لئے ان کے والدین اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ تم کو شراب پینا ہو تو پی لو، لیکن ڈرگ کے قریب نہ جاؤ۔ یہ سب اس لیے کہ ان

نوجوانوں میں بے روزگاری اور وسائل معاش کی کمی نے سخت فرسٹریشن پیدا کردیا ہے۔

انفرادی ملاقات میں مسٹر پی ایچ ترویدی نے کہا کہ یہاں جو لوگ اکٹھا ہوئے ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو فساد نہیں کرتے۔ فساد کرنے والے تو دوسرے لوگ ہیں اور ہمارے ان کے درمیان کوئی لنک نہیں۔ میں نے کہا کہ اس کو میں اس طرح کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ایک پرابلم گروپ ہے اور دوسرا نو پرابلم گروپ۔ چنانچہ میں پچھلے دو سال سے پرابلم گروپ کے لوگوں سے ربط قائم کرکے ان کی سوچ کو بدلنے کی کوشش کررہا ہوں۔

انتہاپسند ناگاؤں کے خیالات کتنے سخت ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ۶۲ سالہ مسٹر مویئوا (Thuingaleng Muivah) مشہور ناگا لیڈر ہیں۔ وہ نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالینڈ کے فاؤنڈر ہیں۔ ان کے اوپر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔

سنڈے کے نمائندہ مسٹر سوبیر بھومک (Subir Bhaumik) اور ان کے ساتھی تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ایک خفیہ مرکز میں ان سے ملے۔ وہ لوگ ۸ گھنٹہ تک جنگلوں میں سفر کرکے مسٹر مویئوا کے یہاں پہنچے تھے۔ انھوں نے ناگا لیڈر کا انٹرویو لیا جس کو خود ناگا لیڈر انٹرویو کے بجائے انٹرایکشن کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنڈے کے شمارہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ میں یہ انٹرویو پانچ صفحات پر چھپا ہے جس کے ساتھ کئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Q. But unless you start talking, how do you know how sincere India is about a settlement?

A. Mr. Bhaumik, it may hurt your feelings as an Indian if we tell you how bad our experience has been in this regard. India's government, her bureaucrats are masters of double-talk, your society has so much double standard. I have read your epics and even your heroes like Rama and Krishna have made and broken rules at their convenience. Rama used dissension to subjugate Bali's kingdom, a kingdom of tribals. His brother Sugriv was used. Krishna signalled to Bhim to hit Duryodhana below his waist when Bhim was all at sea. Whenever rules have proved to be problem, your society and its leaders have flouted it, expecting everyone else to observe them.

Sunday weekly, Calcutta, 16-22 June 1996, p. 50

اشانی کے شمارہ اپریل ۱۹۹۶ میں منی پور کے شری رتن تھیم (Ratan Thiyyam) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں مجھ سے زیادہ غم گین شاید اور کوئی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج میرے وطن منی پور کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی:

Nothing seems to be in place in Manipur today.

انھوں نے کہا کہ پہلے ہم منی پور کے لوگ بہت آسودہ زندگی گزارتے تھے۔ ہمارا ہر معاملہ درست تھا۔ کھانا پینا، ہر چیز فراغت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ آج سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔ قدیم روایتیں ختم ہو گئیں۔ ہمارا اعتماد جاتا رہا۔ ۲۰ سال کی مدت میں پوری زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

یہ سب نتیجہ ہے علیحدگی پسندی کی انتہاپسندانہ اور متشددانہ تحریک کا۔ میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ آج ٹھیک یہی حال ان تمام مسلم علاقوں کا بھی ہے جہاں آزادی کے نام پر اسی قسم کی تحریکیں چلائی گئیں۔ مثلاً بوسنیا، چیچنیا، برما، فلپائن، فلسطین، وغیرہ۔ ہر جگہ آج سے "۲۰ سال" پہلے مسلمان نہایت عمدہ حالت میں تھے۔ ہر قسم کی ترقی کے مواقع انھیں حاصل تھے۔ مگر انھوں نے متشددانہ قسم کی سیاسی تحریکیں چلا دیں۔ اس کے نتیجہ میں ملا ہوا بھی تباہ ہو گیا۔ اور مزید کچھ تو ملنے والا ہی نہ تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ لوگوں کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وائلنٹ ایکٹوزم کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب صرف نان وائلنٹ ایکٹوزم یا پیس فل ایکٹوزم ہی ممکن ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ فی الواقع اس کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔

نارتھ ایسٹرن انڈیا میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے اور اس کو ملک کی مین اسٹریم میں لانے کے لئے بار بار نئی دہلی اور مقامی لیڈروں کے درمیان میٹنگیں ہوئیں اور اکارڈ طے پائے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ مثلاً:

Shillong Accord 1975, Assam Accord 1985, Mizoram Accord 1986, Tripura Accord 1988, Bodo Accord 1994

اس کے باوجود اس علاقہ کی بے چینی ختم نہیں ہوئی۔ درجنوں عسکری تنظیمیں بدستور پورے علاقہ میں سرگرم ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کی معاشی اور تمدنی پسماندگی بدستور باقی ہے۔

ہندستان ٹائمس کے اسسٹنٹ اڈیٹر مسٹر آش نرائن رائے کا ایک مقالہ جنرل آف پیس اسٹڈیز (نئی دہلی) کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۵ میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں امن اور ہم آہنگی کی کنجی محض اکارڈوں پر دستخط کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقتصادی ترقی لائی جائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل فراہم کئے جائیں:

The key to peace and harmony in the region lies not in merely signing accords but in the rapid economic development and the widening of economic opportunities. (Ash Narain Roy)

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، خرابی کی اصل جڑ کرپشن ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کی ترقی کے لئے بہت بڑی رقمیں منظور کی گئیں مگر وہ زیادہ تر لوگوں کی جیبوں میں چلی گئیں۔ اس علاقہ کے ترقیاتی کاموں میں وہ بہت کم استعمال ہو سکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ نارتھ ایسٹ ایریا ایک پرابلم ایریا بن گیا ہے۔ لیکن ہر مسئلہ کا الزام حکومت کو دینا صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم اپنے عمل کی قیمت بھگت رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہمارے سیاسی لیڈر ہر مسئلہ کا الزام برٹش گورنمنٹ کو دیدیتے تھے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ اس وقت یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ کیوں کہ اس طرح عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ رہے تھے اور وہ عوامی طاقت ظہور میں آرہی تھی جو ہماری بے تشدد تحریک آزادی کو طاقت ور بنانے کے لئے ضروری تھی۔

اس طرح عوام کی نفسیات یہ بن گئی کہ تمام مسائل کی ذمہ دار حکومت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اپنے اس مزاج کی بنا پر اب وہ اسی طرح ہر خرابی کا الزام قومی حکومت کو دے رہے ہیں۔ یہ قیمت ہمیں اس وقت تک بھگتنا ہوگا جب تک عوام میں نیا شعور پیدا نہ کر دیا جائے۔

ایک پرانے گاندھی وادی نے بتایا کہ جب وہ نوجوان تھے، وہ کھادی کی ایک کانگرس دکان پر کپڑا خریدنے گئے۔ دکان والے نے پوچھا: ہاتھ کھادی یا مل کھادی۔ یعنی ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کی کھادی یا مل میں تیار کئے ہوئے سوت کی کھادی۔ مذکورہ نوجوان کو اس سے بہت دھکا لگا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ میرے ساتھ ایسا ایسا واقعہ گزرا۔ کیا کھادی بھی دو کھادی ہوتی

ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب اپنے پرچہ ینگ انڈیا میں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ نوجوان کو اس طرح کے معاملات میں زیادہ حساس (oversensitive) نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا یہ نہایت صحیح جواب تھا۔ اگر معاملہ حق اور ناحق کا ہو تو آدمی کو ضرور بہت زیادہ حساس ہونا چاہئے۔ مگر جو معاملہ حق اور ناحق سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس فرق کے بغیر زندگی کا نظام نہیں چلایا جاسکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ گاندھی جی جب ساؤتھ افریقہ سے آئے تو وہ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا کہ آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے پہلے میں سارے دیش میں گھوم کر لوگوں سے ملوں گا۔ چنانچہ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ملک میں بے شمار لوگ ابھی تک غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جسم پر پورا کپڑا بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جس دیش میں غریبوں کی اکثریت ہو وہاں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے مجھے خود بھی غریب ہندستانی کی طرح رہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر انھوں نے کوٹ پتلون اتار دیا اور وہ کپڑا پہن لیا جس کو دیکھ کر برطانیہ کے سرونسٹن چرچل نے ان کو ننگا فقیر (naked fakir) کہا تھا۔

کوہیما سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام جرنل (The Journal) ہے۔ اس کے شمارہ ۷، نومبر ۱۹۹۴ میں ایک جائزہ چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— جبری استحصال کی زمین (A Land of Extortion) اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ کے بیرونی آئی اے ایس افسران بہت غیر مطمئن حالت میں ہیں۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں:

> Non-local IAS officers want to be transferred out of Nagaland as quickly as possible.

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر وقت ان کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ غیر مقامی افسروں کو یہاں کے لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریز افسران کو دیکھا جاتا تھا۔ مقامی لیڈروں کی تقریروں نے اس معاملہ میں لوگوں کو اتنا جذباتی بنا دیا ہے کہ غیر مقامی افسروں کو دیکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہم کو غلام بنانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔

اگرتلہ (تری پورہ) کی شریمتی کرابی دیو برمن نے اپنے پیپر میں نارتھ ایسٹ انڈیا کے بارہ پرابلم گنائے۔ ان میں سے بارھواں یہ تھا —— سب سے زیادہ اہم یہ کہ اس علاقہ کے لوگوں میں ایسے مشترک رشتہ کی غیر موجودگی کہ وہ اپنے آپ کو انڈین محسوس کریں:

Above all absence of a common chord or a binding force to feel 'Indian'.

یہ بلاشبہ سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ اگر انڈین ہونے کا مشترک احساس موجود ہو تو بقیہ مسائل اپنے آپ غیر اہم بن جاتے ہیں۔ اور اگر یہ مشترک احساس باقی نہ رہے تو اس کے بعد غیر اہم چیز بھی اہم بن جائے گی۔

مقامی انگریزی اخبار ناگالینڈ ٹائمس (۲۳ نومبر ۱۹۹۴) میں اس علاقہ کی سات ریاستوں کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا:

Symphony of the Seven Sisters.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کی سات ریاستوں (آسام، ناگالینڈ، منی پور، میگھالیہ، میزورم، اروناچل پردیش، تری پورہ) میں ہر ایک کا مخصوص کلچر ہے۔ ہر ایک کا مذہب اور زبان الگ الگ ہے۔ ان پر پڑوسی ممالک برما، چین، تبت کلچر کے اثرات ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ کی کوئی مشترک زبان نہیں۔ اس کی وجہ سے "سات بہنوں" کا باہمی اتحاد بے حد مشکل ہو گیا ہے۔

ناگالینڈ ٹائمس کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ درحقیقت انڈیا کا ہندو کلچر ان قبائل کے لئے اجنبی ہے جو کہ بنیادی طور پر گوشت خور ہیں:

Hindu culture is much alien to the psyche of the tribals who are basically non-vegetarians and liberated in their way of life.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ ۱۸۲۶ میں امریکن اور یوروپین مشنری کے زیر اثر آیا۔ اور اس پہاڑی علاقہ میں مسیحیت نے اپنی جڑیں قائم کرلیں۔ یہ ان مسیحی مبلغین کے ذریعہ ہوا جنھوں نے ان پہاڑیوں میں انتھک محنتیں کیں۔ مثال کے طور پر میگھالیہ کے قبائل کی بولی کو لکھنے پڑھنے کی زبان بنانے کا کارنامہ ٹامس جونز (Rev. Thomas Jones) وغیرہ نے کیا۔ ان لوگوں نے میگھالیہ کے قبائل کو ان کی پہلی مطبوعہ کتاب دی۔ انھوں نے یہاں اسکول اور اسپتال

قائم کئے۔ انھوں نے اس علاقہ کے لوگوں کو پہلی بار علم سے آشنا کیا۔ تاہم ان مسیحی مبلغوں کے اثرات سے منی پور اور ارونا چل بچا رہا۔

۴ جنوری کی شام کو کھانے کی میز پر کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبان تھے۔ وہ گاندھی واد میں یقین رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جینت پاٹل (ممبر پلاننگ کمیشن) نے کہا کہ ساری سمسیاؤں کا حل گاندھی واد میں ہے۔ گاندھی کے وچاروں کو دیش میں لانا ہوگا، تبھی دیش کا بھلا ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد مہاتما گاندھی کے اپنے بنائے ہوئے ساتھی ان سے پھر گئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جو گاندھی ہیرو بنا ہوا تھا، وہ ۱۹۴۷ کے بعد خود اپنے ملک میں زیرو ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "اب میری کون سنے گا"۔ ان کے اس جملہ کو پیارے لال نے اپنی کتاب کا ٹائٹل بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں خود گاندھی جی اپنے وچاروں کو عمل کی صورت نہ دے سکے۔ پھر اب کون ہوگا جو ان کو عملاً قائم کرے۔ کیا آپ کہیں سے ایک سپر گاندھی لا سکتے ہیں۔ بمبئی کے پروفیسر رو ندر کیلکر بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔

پھر میں نے کہا کہ وہ مقام جہاں گاندھی واد فیل ہوا ہے وہ لارڈ ایکٹن کے الفاظ میں انسان کی یہ کمزوری ہے کہ طاقت اور اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے:

Power currupts and absolute. power corrúpts absolutely.

کانگرس کے لیڈروں کے بگڑنے کا اصل سبب یہی تھا۔ اب ہمیں اس انسانی کمزوری کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے خوابوں کا نیا ہندستان بننے والا نہیں۔

ایک مجلس میں یہ بحث تھی کہ سیاسی استحکام کیسے حاصل کریں۔ (how to attain political stability) مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد کوئی بھی پارٹی اپنے حق میں نئی سیاسی روایات قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ کانگرس بعد از آزادی کارکردگی پر زندہ نہیں تھی بلکہ قبل از آزادی روایات کے سہارے زندہ تھی۔ کانگرس کا سارا سرمایہ جدوجہد آزادی کے دور کی روایات تھیں۔ یہ سرمایہ اب اپنی آخری حد پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

بھاجپا کے پاس کوئی مثبت پیغام نہ تھا۔ اس نے دو بڑے فرقوں کے درمیان چھپی ہوئی

تاریخی نفرت کو استعمال کیا، مگر اس کی بھی ایک حد تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو خود اسی کے ساتھ اس کی آخری حد آگئی۔ اب ملک میں ایک قسم کا سیاسی خلا ہے، اور ملک کسی ایسے نئے گروہ کا منتظر ہے جو ظاہر ہو اور دوبارہ ملک کو سیاسی استحکام دے سکے۔

نارتھ ایسٹ انڈیا سات مختلف ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ان کو سات بہنیں کہا جاتا ہے۔ دھنک میں چوں کہ سات الگ الگ رنگ ہوتے ہیں، اس لئے ان ریاستوں کے مجموعہ کو زمینی دھنک کا نام بھی دیا گیا ہے:

a rainbow on the ground.

ان سات ریاستوں میں آپ گھومیں پھریں تو آپ کو ہر طرف وہاں مسائل ہی مسائل دکھائی دیں گے۔ مگر الفاظ کی دنیا میں اس کی تصویریں بالکل برعکس دکھائی دیتی ہیں۔ جو لوگ صرف الفاظ کو دیکھ کر حقیقت کے بارہ میں رائے قائم کریں وہ ہمیشہ اصل حقیقت کے ادراک سے محروم رہیں گے۔

۵ جنوری کو صبح ۳ بجے نیند کھلی۔ مجھے ٹی وی کا کوئی شوق نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ دیکھیں کیا رات کو بھی ٹی وی کے پروگرام آتے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لئے ٹی وی سیٹ کھولا تو اس وقت کئی پروگرام آرہے تھے۔ ایک چینل سے کھیل کا پروگرام آرہا تھا۔ دوسرے چینل پر غالباً کوئی انگریزی فلم دکھائی جارہی تھی۔ اس کا جو منظر میرے سامنے آیا اس میں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے ہوئے تھے۔ عورت اپنے اتارے ہوئے کپڑے کو پہن رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلے جسم پر مختصر لباس پہنا اور مرد کی ناک پر پستول رکھ کر اسے گولی مار دی۔

ہندستان میں کچھ لوگ یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں کہ ہندو ایک منظم سازش کے تحت ہمارے ملی تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بے حد سادہ لوحی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے روایتی تشخص کو مٹانے کا کام سٹلائٹ ٹی وی کر رہا ہے جس کی زد سے اپنے آپ کو بچانا دونوں میں سے کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہ ٹی وی رات دن کھیل کود، مار دھاڑ اور سیکس کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ

زمین پر اگر آپ اس کو روکیں تو وہ آسمان سے آپ کے گھروں میں داخل ہو جائے گا۔ یہ طوفانی سیلاب نہ صرف ہندستان کو بلکہ تمام عرب دنیا اور مسلم دنیا کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ میری طرح کے کچھ لوگ جو اپنے ذوق کے تحت محفوظ نہ ہو سکتے ہوں وہی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ ورنہ نام نہاد دیندار گھرانے تک اس فتنہ سے محفوظ نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۵ کی صبح کو ناشتہ کی میز پر مسٹر تر ویدی (آئی اے ایس) سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مذہب کے بارہ میں گاندھی جی کے نظریہ کو پھیلایا جائے۔ یعنی یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر وہ یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر سے لے کر ڈاکٹر بھگوان داس (ایسنشل یونیٹی آف آل ریلیجنز) اور مہاتما گاندھی تک غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ نظریہ سراسر ناکام رہا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ناگالینڈ اور منی پور کی حیثیت ٹائم بام کی ہو چکی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ یہ صرف دو ریاستوں کی بات نہیں۔ بلکہ نارتھ ایسٹ کا پورا علاقہ آج اسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں لوگ کر رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اردو اخباروں میں ہمارے لکھنے والے جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے مطابق، اردو خواں مسلمانوں کو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب ہے اور بنگلہ دیشی کے نام پر مسلمانوں کو یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ حالانکہ "بنگلہ دیشی مسئلہ" اس علاقہ میں پیدا شدہ مسائل کا صرف ایک فیصد ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب اور کلچر کے اختلافات میں یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے مذہب کا احترام کریں:

We have to respect other religions while following our own.

میں نے کہاکہ اس معاملہ میں یہی صحیح ترین بات ہے اور یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں پریکٹیکل بننا چاہئے نہ کہ آئیڈیلسٹ۔ عجیب بات ہے کہ ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو تو ہر آدمی پریکٹیکل بن جاتا ہے۔ مگر جب ملک اور سماج کے بارہ میں گفتگو ہو تو ہر آدمی آئیڈیلزم کی بات کرنے لگتا ہے۔ اسی دو طرفہ معیار نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔

سیمنار کا مقصد ان لفظوں میں بتایا گیا تھا کہ ــــ نارتھ ایسٹ اور ملک کے بقیہ حصوں کے دانشوروں کو باہمی تبادلۂ خیال کا موقع دینا:

to facilitate interaction between the intellectuals of the North-East and the rest of the country.

مگر میرا تجربہ ہے کہ برصغیر ہند کے دانشوروں کا تبادلۂ خیال ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سننے اور ماننے کا مزاج نہیں۔ ہر ایک میں صرف سنانے اور منوانے کا مزاج ہے۔ یہاں کا ہر آدمی اعجاب کل ذی رأی برایہ کا مصداق ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان تبادلۂ خیال کبھی کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

گوہاٹی کا یہ انٹرنیشنل سیمنار بڑی امیدوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کا اہتمام ناگالینڈ گاندھی آشرم کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ خاص طور پر حسب ذیل ادارہ نے:

North-East Institute of Bank Management (NEIBM)

اس کا بنیادی موضوع تھا: نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی۔ اس کے چھ ذیلی موضوعات مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک موضوع یہ تھا:

North-East, a rainbow on the ground
Religious and ethnic pluralism—amity through diversity
—a future perspective.

آخری اجلاس میں منتظمین کی طرف سے ایک رزولیوشن کا ڈرافٹ پیش کیا گیا۔ اس پر بحث ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کو رد کر دیا گیا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک اسٹیٹمنٹ جاری کیا جائے۔

اس کا ڈرافٹ بھی رد ہوگیا۔ آخر میں طے ہوا کہ اجلاس کے دوران جو مختلف رائیں سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ تیار کیا جائے اور اس کو اشاعت کے لئے دے دیا جائے۔ دو آدمیوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کیا۔ مگر وہ بھی منظور نہ ہوسکا۔ آخر کار یہ سیمینار اس طرح ختم ہوا کہ اس کی طرف سے کوئی متفقہ چیز پریس میں اشاعت کے لئے نہ دی جاسکی۔

میں بے حد غم زدہ حالت میں یہ تمام بحثیں سن رہا تھا۔ آخر میں میں نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک سنگین قومی مسئلہ پر پورے ملک کے دماغ اکٹھا ہوئے۔ تین دن کے بحث و مباحثہ کے بعد اب وہ یہاں سے واپس جارہے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ ہم اتنا بھی نہیں کرسکے کہ ایک متفقہ بیان تیار کرکے کل کے اخبار میں دے دیتے تاکہ لوگ کم سے کم یہ جان لیں کہ ہم نے انھیں کیا پیغام دیا ہے۔

۶ جنوری کی شام کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ایرپورٹ تک کے سفر میں دو صاحبان کا ساتھ تھا۔ پرتاپ سنگھ اور عبدل بھائی۔ ایرپورٹ پر دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ پرتاپ سنگھ ایک سیاسی آدمی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام لیڈر کرپٹ ہیں، خواہ ایک پارٹی کے ہوں یا دوسری پارٹی کے۔ میں نے کہا کہ پالی ٹکس میں ہمیشہ کرپشن رہتا ہے۔ البتہ اس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہئے۔ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا کرپشن حد سے باہر چلا گیا ہے۔

عبدل بھائی مسلمانوں میں نکاح و طلاق کے مسائل سے بہت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں کچھ اصلاحی قانون بننا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل مسئلہ قانون کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ہی جانتا ہے کہ کیسے جینا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ اصلاح چاہتے ہیں تو قوم کو تعلیم یافتہ بنائیے، اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۸۹۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ گوہاٹی سے واپسی میں جہاز کے نیچے بادلوں کی گہری چادر نہیں تھی۔ ہمارا جہاز بنگلہ دیش کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہندستانی علاقہ میں

داخل ہوا۔ میں نے جہاز کے نیچے دیکھا تو درختوں سے ڈھکا ہوا بنگلہ دیش ایک جنگل کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر چنچل سرکار نے حال میں بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ایک تبصرہ دہلی کے انگریزی اخبار پانیر میں چھپا تھا۔ مسٹر سرکار نے بنگلہ دیش میں مختلف قسم کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ کوئی اسلامی سیاست کی بات کرتا تھا اور کوئی سیکولر سیاست کی۔ مگر ہر ایک کا اسلام بھی الگ تھا اور ہر ایک کا سیکولرزم بھی الگ۔ چنانچہ انھوں نے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی جنگل (political jungle) سے تعبیر کیا تھا۔

یہ صرف بنگلہ دیش کی بات نہیں۔ اختلافات کی کثرت نے آج پوری مسلم دنیا کو اسی طرح کی صورت حال میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحاد کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قوم کے پاس ایک کتاب اور ایک قرآن ہو۔ اگر لوگوں کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو وہ ایک کتاب کی سیکڑوں تعبیر کر کے دوبارہ قوم کو افکار کے ایک جنگل میں بھٹکا دیں گے۔

اس قسم کی صورت حال ہمیشہ نااہل لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بولنے کے قابل لوگوں کے لئے جتنا بولنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ لوگ جو بولنے کے قابل نہیں ہیں وہ نہ بولیں۔ ۹۹ آدمی چپ رہیں اسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی بولے اور اس کا بولنا لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

گوہاٹی سے دہلی تک ڈھائی گھنٹہ کا سفر تھا۔ درمیان میں کچھ اخبارات پڑھے۔ آسام ٹریبیون (گوہاٹی) کے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ریاستی حکومت کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ تری پورہ میں قبائلی جنگجوؤں (tribal militants) کے پاس جدید ہتھیاروں (sophisticated arms) کی بھاری مقدار پہنچ گئی ہے۔ وہ انسانوں کے اوپر ان ہتھیاروں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار کی اسی اشاعت میں کئی خبریں تھیں کہ اچانک موٹر سائیکل پر کچھ لوگ آئے اور بے قصور لوگوں پر فائر کر کے بھاگ گئے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو علاقہ کی آزادی کے نام پر اپنی متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں۔ اس

کے بجائے اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نراج اور بدامنی لانے کے لئے تحریک چلارہے ہیں تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی حال مسلم دنیا کا ہے۔ جگہ جگہ مسلم نوجوانوں نے اسلام کے نام پر ہتھیار اٹھا رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کی اس متشددانہ تحریک سے آج بھی صرف قتل وخون برآمد ہورہا ہے اور آئندہ بھی اس سے قتل وخون ہی کا تحفہ لوگوں کو ملنے والا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال افغانستان ہے۔

ہوائی جہاز کے نیچے جو پہیہ ہوتا ہے وہ ایئرپورٹ پر جہاز چلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جب جہاز اوپر اٹھ کر اڑنے لگتا ہے تو پہیہ اندر کی طرف اٹھالیا جاتا ہے۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا کہ لینڈنگ کے وقت اگر آپ پہیہ کو نیچے گرانا بھول جائیں تو کیا ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہوجائے گا۔ انھوں نے کہا کہ معمولی نقصان تو ہوگا، لیکن اس سے کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ انھوں نے بتایا کہ لینڈنگ کے وقت پہیہ نیچے گرانے کے لئے یاددہانی کے مختلف انتظامات کئے گئے ہیں۔ نئے ہوائی جہازوں میں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈنگ ہوتی ہے جو لینڈنگ کے وقت پائلٹ کو ان الفاظ میں مسلسل وارننگ دیتی ہے:

Check your landing gear, check your landing gear.

میں نے پوچھا کہ جہاز کا پہیہ (لینڈنگ گیر) اوپر کیوں اٹھالیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اونچی بلڈنگ یا پہاڑ وغیرہ کی ٹکر سے بچانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ پہیہ دس فٹ یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اگر پہیہ نیچے لٹکا رہے تو اس کی وجہ سے ہوائی رکاوٹ پیدا ہوجائے گی:

Drag is created if the landing gear is down.

جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہوکر ساڑھے پانچ بجے شام کو دہلی پہنچا۔ جہاز کے اندر اعلان میں مسافروں سے کہا گیا کہ اس دیری کے کارن آپ کو جو اسوبیدھا ہوئی اس کے لئے ہم چھما چاہتے ہیں۔ تاہم انڈین ایئرلائنز کے لئے یہ ایک معمول کی بات ہوچکی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔

آج کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند کے ایک ذمہ دار نے کہا کہ ترقی کا فائدہ ہمیں ہندستان کے عام شہریوں تک پہنچانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ تو خواص کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر پچاس سال کی قومی حکومت کے باوجود جب ترقی کا فائدہ ملک کے خواص تک بھی پوری طرح نہیں پہنچا تو ملک کے عوام تک ترقی کا فائدہ پہنچانے کے لئے آخر کتنا زیادہ وقت درکار ہوگا۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کی شام کو میں دہلی واپس پہنچا۔

میرٹھ کا سفر

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو دہلی سے میرٹھ (سردھنہ) کا سفر ہوا۔ یہ سفر بذریعہ کار تین گھنٹہ میں طے ہوا۔ میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی اور حکیم محمد کلیم صاحب شریکِ سفر تھے۔

دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے جگہ جگہ دکھائی دیا کہ صفائی کا کوئی اہتمام نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے تمام متعلق محکموں کے نام حکم جاری کیا تھا کہ وہ دہلی میں صفائی کا اعلیٰ اہتمام کریں اور اس کو خوب صورت شہر بنائیں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس ذیل) مگر دہلی آج بھی مجھے ویسی ہی نظر آئی جیسی وہ عدالت عالیہ کے اس حکم سے پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام اور سرکاری عملہ دونوں میں قانون کی تعمیل کا جذبہ موجود نہیں۔ پھر حکم جاری کرنے سے کیا فائدہ۔

عدالتِ عالیہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ گھروں گھروں میں پلاسٹک کی تھیلیاں فراہم کی جائیں۔ لوگ ان تھیلیوں میں اپنے گھر کا کوڑا ڈال کر اسے سڑک پر رکھ دیں اور صبح کو صفائی کرمچاری اسے اٹھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کوڑا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں اس کی سوسائٹی نے ایک سال پہلے اپنی کالونی کے لیے یہی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ گھر والے اپنا کوڑا

New Delhi, March 1: The Supreme Court today ordered all civic agencies to have Delhi cleaned and scavenged every day and directed both the state and the Union government to make it a "greener, cleaner place to live in". The directions were passed by a division bench comprising Mr Justice Kuldip Singh and Mr Justice Saghir Ahmed on a public interest litigation filed by a lawyer, B. L. Wadhera. The court approved an experimental scheme of the Municipal Corporation of Delhi and the New Delhi Municipal Committee for distribution of polythene bags for garbage disposal to the citizens of selected localities. The court directed that these garbage disposal bags should be collected in cleaned receptacles provided by the civic agencies to prevent garbage from being spread all over the garbage collection centres and on the nearby roads. The Central Pollution Control Board and the Delhi Pollution Committee will have the responsibility to ensure that this garbage disposal system works efficiently by deputing inspection teams and reporting the situation to the apex court every two months.

The Times of India, New Delhi, March 2, 1996.

پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کرکے سڑک پر رکھنے لگے۔ مگر جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کیوں کہ ردی پلاسٹک اکھٹا کرنے والے لڑکے یہ کرتے تھے کہ وہ کوڑا سڑک پر الٹ دیتے اور تھیلی لے کر بھاگ جاتے۔

کچھ عرصہ سے ہندستان میں ایک چیز کی بڑی دھوم ہے۔ اس کو جوڈیشیل ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔ اخباروں میں ہر روز اس کے بارہ میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ اس کے دفاع میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اے ایم احمدی نے دہلی میں ایک تفصیلی لکچر دیا۔ یہ لکچر دو قسطوں میں جوڈیشیل ایکٹوزم (Judicial Activism) کے عنوان سے ٹائمس آف انڈیا ۲۷ - ۲۸ فروری ۱۹۹۶ء میں چھپ چکا ہے۔

اس طویل تحریر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوڈیشیل ایکٹوزم یا عدالت کا جارحانہ رول (aggressive role) دستوری طور پر درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ قانونی نہیں ہے بلکہ عملی ہے۔ بہتر سماج یا بہتر سماج کی تشکیل میں قانون کا رول بہت جزئی ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ عوام کے اندر احساس ذمہ داری ہو اور انتظامی عملہ دل سے اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے آمادہ ہو۔ اس لیے پہلا کام اصلاح افراد کا ہے نہ کہ اصلاح حکومت کا۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ اسلام کے نام پر انقلابی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عام طور پر اسلامی بیداری (صحوۃ اسلامیہ) کہا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہیں اور ہر جگہ "اسلامی قانون نافذ کرو" کے مطالبہ کا ہنگامہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے وہ اسی طرح بے سود ہے جس طرح ہندستان کا موجودہ جوڈیشیل ایکٹوزم۔

ہندستان میں عدالتی فیصلوں کے نفاذ کے لیے اس کے موافق حالات موجود نہیں ہیں۔ اس لیے فیصلوں کے باوجود عملاً ان کا نفاذ نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں کسی بھی مسلم ملک میں وہ موافق سماجی فضا موجود نہیں ہے جو اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے بالفرض اگر کسی ملک میں نام نہاد اسلام پسندوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ حکومتی اداروں کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ شروع کر دیں تو وہاں اسلام کا قانون تو نافذ نہیں ہوگا،

البتہ اسلام لوگوں کی نظر میں مضحکہ ضرور بن جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد ہماری گاڑی دہلی سے نکل کر یوپی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اسی کے ساتھ ہم لوگ ایک اور ذہنی سفر میں مشغول ہوگئے۔ پورے راستہ میں سوال وجواب کی صورت میں مختلف موضوعات پر ہماری گفتگو جاری رہی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے موجودہ زمانہ میں انسان کو ایسی خودکار سواریاں دے دی ہیں کہ آدمی سفر بھی کرے اور عین اسی وقت وہ اپنا دوسرا کام بھی جاری رکھے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ آج کل سفر بہت آرام دہ ہوگیا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سفر میں کبھی کبھی طبیعت چاہتی ہے کہ قصر کرنے کے بجائے مکمل نماز پڑھی جائے تاکہ شکر ادا کیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں گنجائش بھی ہے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قصر ایک رخصت ہے، اور مکمل نماز پڑھنا افضل ہے۔ پھر سفر میں پوری نماز پڑھنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں اس کی بابت آیا ہے کہ تلك صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (یہ اللہ کی طرف سے ایک صدقہ ہے، پھر تم اللہ کے صدقہ کو قبول کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جو تقابل ہے وہ رخصت اور افضل کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ رخصت اور صدقہ کے درمیان ہے۔ یعنی آپ اگر رخصت پر عمل نہ کریں تو آپ افضل کو نہیں لیں گے بلکہ خدا کے ایک عطیہ کو لینے سے انکار کریں گے۔ اور خدا کے عطیہ کو نہ لینا نعوذ باللہ خدا کی ناقدری ہے نہ کہ کوئی افضل عمل۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بیشتر اقدامات تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کا سبب غلط تقابل کی یہی فکری غلطی تھی۔ مثلاً پچھلے دو سو سال میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں جہاد کے نام پر بار بار ٹکراؤ کیا۔ لیکن ہر بار صرف تباہی اور بربادی ان کے حصہ میں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جہاد کا تقابل فرار سے کیا۔ وہ سمجھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ فرار کو چھوڑ کر جہاد کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ حالاں کہ ایسے تمام مواقع پر اصل تقابل جہاد اور اعداد میں تھا۔ یعنی ٹکراؤ نہ کرکے ان کے لیے پرامن تعمیر کے میدان میں سرگرم ہونے کا موقع تھا۔ لیکن غیر ضروری طور پر وہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرامن تعمیر کے نہایت

قیمتی مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں عبادت گزاری بڑھ رہی ہے۔ مگر اخلاقیات میں تنزل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ایک دین داری وہ ہے جو معرفت کی سطح پر ہو۔ دوسری دین داری وہ ہے جو عادت کی سطح پر ہو۔ آج کل کے لوگ زیادہ تر عادت کے تحت عبادت گزار بن گئے ہیں۔ لیکن اخلاق میں تبدیلی عارفانہ عبادت گزاری سے پیدا ہوتی ہے، اس کو آپ شعوری عبادت گزاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ عادت کے تحت جو عبادت گزاری کی جائے اس سے ایک قسم کی نفسیاتی تسکین تو مل سکتی ہے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ آدمی کے اندر اخلاقی انقلاب پیدا کر سکے۔

ایک سوال یہ تھا کہ تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تنقید وہ ہے جو متعلق شخص کے اعلان کردہ یا ثابت شدہ موقف پر ہو۔ اور تنقیص وہ ہے جس کا خود آدمی نے اعلان یا اقرار نہ کیا ہو۔ اس مفہوم میں تنقید پوری طرح جائز ہے، اور تنقیص مکمل طور پر ناجائز۔

مثلاً الرسالہ میں صبر واعراض کی پالیسی پر زور دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صبر واعراض کا نام لے کر الرسالہ پر تنقید کرے تو یہ اپنے طریقہ کے اعتبار سے ایک جائز تنقید ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص الرسالہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ "الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے" اور پھر اس پر تنقید کرے تو یہ تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہوگی۔ کیوں کہ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ مسلمان بزدلی کی روش اختیار کرلیں۔ یہ دوسروں کی گھڑی ہوئی بات ہے نہ کہ ہمارا اپنا اعلان کردہ موقف۔

انھوں نے دوبارہ کہا کہ غیبت کی تعریف حدیث کی کتابوں میں یہ آئی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جائے۔ یہی تعریف خود تنقید پر بھی صادق آتی ہے، کیوں کہ تنقید میں بھی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جاتی ہے، حالاں کہ غیبت حرام ہے اور تنقید کو جائز ہونا چاہیے۔ پھر دونوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے۔

میں نے کہا کہ محض غیر موجودگی کی بنا پر کوئی تنقید غیبت نہیں بن جاتی۔ ہمارے مدارس میں اپنے امام کے سوا دوسرے اماموں کے مسلک پر تنقید کی جاتی ہے۔ حالاں کہ زیر تنقید امام وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مگر کوئی بھی اس کو غیبت نہیں قرار دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیبت کا تعلق اس

برائی سے ہے جو آدمی کا اپنا اعلان کردہ مسلک نہ ہو۔ جب کہ تنقید کا تعلق اس مسلک سے ہوتا ہے جس کا آدمی نے پہلے ہی علی الاعلان اقرار کر رکھا ہے۔ پھر اس کو غیبت کیسے کہا جائے گا۔

جو لوگ تنقید کو برا مانتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ہمارے مسلک کا ذکر کیوں کیا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مسلک پر تنقید کیوں کی۔ اگر ان کے مسلک کا صرف تذکرہ کیا جائے تو وہ خوش ہوں گے۔ البتہ جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ ناخوش ہوجاتے ہیں۔ گویا ان کی ناخوشی تذکرۂ مسلک پر نہیں ہے بلکہ تنقید مسلک پر ہے۔ جب کہ غیبت وہ ہے جس میں خود تذکرہ ہی آدمی کے لیے ناخوشی کا باعث بن جائے۔

"جو لوگ پیغامِ حق سننے سے پہلے مر گئے ان کا انجام کیا ہوگا" ——— اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں، اور ہم غیب کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے مکلف نہیں۔ میں نے کہا کہ پچھلے زمانہ میں لوگوں نے اس طرح کے سوالات پر بہت زیادہ بحثیں کیں۔ مگر یہ تمام تر فلسفہ کے زیر اثر تھا نہ کہ اسلام کے زیر اثر۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ تم کو علم قلیل (الاسراء ۸۵) دیا گیا ہے، اس لیے تم ان پر بحث نہ کرو۔ مگر قدیم فلسفہ کا موقف چوں کہ یہ تھا کہ انسان علم کلی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے زیر اثر لوگ اس طرح کے سوالات میں تعمق کرنے لگے۔

مگر موجودہ زمانہ کا غالب علم سائنس ہے۔ اور سائنس نے اس قسم کے تمام سوالات کا آخری جواب دے دیا ہے۔ سائنس نے بتایا کہ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر علم کلی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کو اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہیے۔ اس تحقیق کے بعد اب قرآن کا موقف ہی خود علمی اعتبار سے بھی واحد صحیح موقف بن گیا ہے (تفصیل کے لیے : مذہب اور سائنس)

جب بھی بذریعہ روڈ میں کسی سفر پر جاتا ہوں تو ایک منظر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہ سڑک کے کنارے الٹی ہوئی گاڑیاں ہیں۔ اس سفر میں بھی ایک ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ یہ منظر خود دہلی کے اندر تھا۔

اس طرح کے روڈ ایکسیڈنٹ پہلے زمانہ میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف جدید مشینی دور کی خصوصیت ہے۔ سست رفتار سواریوں کا دور اس قسم کے حادثات سے تقریباً خالی تھا۔ جب

دنیا میں تیز رفتار سفر کا زمانہ آیا تو ساری دنیا کی سڑکوں پر ایکسیڈنٹ ہونے لگے۔ ہر چیز کے کچھ ایڈوانٹج ہیں اور کچھ ڈس ایڈوانٹج۔ موجودہ دنیا میں معیاری زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

سواریوں کو گزارنے کے لیے سڑک کا طریقہ بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً موریہ سلطنت جس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے، اس کے حکمرانوں نے ایسی سڑکیں بنائی تھیں جن کے ذریعہ وہ اپنی پوری سلطنت میں سفر کر سکیں۔ واضح ہو کہ ان کی سلطنت ایک طرف دریائے سندھ سے دریائے برہم پتر تک اور دوسری طرف ہمالیہ پہاڑ کے کناروں سے لے کر وندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم جدید طرز کی پختہ (hard-surfaced) سڑکیں اس وقت بنائی گئیں جب کہ صنعتی انقلاب آیا اور مشینی سواریاں انسانوں کو لے کر دوڑنے لگیں۔

انڈیا میں سڑکوں (یا ریل کی پٹریوں) کا معیار ابھی ترقی یافتہ ملکوں کے معیار سے بہت کم ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں اور قصبات میں جو سڑکیں میں نے دیکھی ہیں ویسی سڑکیں یہاں دہلی اور بمبئی میں بھی ابھی تک پائی نہیں جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا میں نہ ریل زیادہ تیز چلائی جا سکتی ہے اور نہ کار۔

راستہ میں ہمیں میرٹھ سے گزرنا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ اور میرٹھ کے کچھ افراد سے ملاقاتیں کیں۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب کونسلر (Tel. 24610) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کچھ مسلمان بدظن ہیں اور وہ آپ کو بھاجپا کا آدمی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ لکھنؤ کے ایک بھاجپائی مسلمان کی دعوت پر لکھنؤ گئے اور وہاں ان کے زیر انتظام گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر کی۔

یہ ۱۹ اپریل ۱۹۹۵ کی بات ہے۔ محمد یامین صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ اتفاق سے اس وقت وہ لکھنؤ میں تھے اور وہ گنگا پرشاد میموریل ہال کے مذکورہ پروگرام میں شریک ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر تو فیصلہ بہت آسان ہے، آپ بتائیے کہ وہاں میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ انھوں نے کہا کہ شروع سے آخر تک سب آپ نے قرآن و حدیث کی باتیں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہاں اسٹیج پر نہ بھاجپا کا بینر تھا اور نہ اس کا اور کوئی نشان موجود تھا۔

میں نے کہا کہ پھر یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ وہاں کے اسٹیج سے لوگوں کے سامنے قرآن و حدیث کی بات پیش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مشرکوں کے بلانے پر ان کے یہاں گئے۔ مدینہ میں آپ یہود کے بلانے پر ان کے پاس گئے۔ یہی ہمیشہ علماء کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور جہاں اور جس اسٹیج پر بھی اسلام کی بات کہنے کا موقع ملے گا وہاں اس کو پیش کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل قدر بات ہے نہ کہ قابل اعتراض بات۔

محمد یامین صاحب نے میلہ نوچندی میگزین (۱۹۹۳) کی ایک کاپی دی۔ اس میں میرٹھ کے بارہ میں کئی مضامین تھے۔ مگر سب کے سب ادبی زبان میں تھے۔ کوئی بات بھی محدد انداز میں نہ تھی۔ اس لیے میں ان سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

یہ صرف ایک میگزین کی بات نہیں۔ یہی اردو زبان کا عام مزاج ہے۔ بدقسمتی سے اردو زبان کا مزاج اقبال جیسے شاعروں اور ابوالکلام آزاد جیسے ادیبوں نے بنایا ہے۔ یہ لوگ لفاظی اور حقیقت نگاری کا فرق نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حقیقت کو بھی لفظی گل کاری کے انداز میں بیان کیا۔ یہی روایت اردو زبان میں عام طور پر قائم ہو گئی۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص نے کہا: الرسالہ پہلا پرچہ ہے جو اردو زبان میں سائنٹفک اسلوب کو رواج دے رہا ہے۔

اردو کا مسئلہ غلط رول ماڈل کا مسئلہ ہے۔ انگریزی زبان میں نیوٹن سے پہلے شاعروں اور ادیبوں کو رول ماڈل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد جب سائنس کا غلبہ ہوا تو سائنس داں رول ماڈل بن گئے۔ اس طرح انگریزی زبان ادبی اسلوب کے دور سے نکل کر سائنسی اسلوب کے دور میں داخل ہوئی۔ اردو میں اس قسم کا انقلابی عمل پیش نہیں آیا۔ کچھ شاعر اور ادیب جو ایک بار اردو میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، سائنسی انقلاب جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آنے کی بنا پر، آج بھی وہی اشخاص لوگوں کا رول ماڈل بنے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کو بدلے بغیر اردو کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سردھنہ پہنچے جو کہ ضلع میرٹھ کا ایک قصبہ ہے۔ سب سے پہلے ہماری گاڑی تحصیل والی مسجد پر رکی۔ یہاں عصر کی نماز تیار تھی۔ چنانچہ یہاں عصر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے جو قصبہ کے بیرونی حصہ میں واقع ہے۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ سردھنہ میں ۳۶ مسجدیں ہیں۔

کسی نئی بستی میں داخل ہونے کا یہی اسلامی طریقہ ہے۔ اگر وقت ہو گیا ہو تو پہلے مسجد میں داخل ہو کر مقامی مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اور اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو دو رکعت سنت پڑھ کر اپنے لیے اور بستی والوں کے لیے دعا کریں، اس کے بعد بستی کے اندر جائیں۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ روانہ ہو کر جناب تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی رہائش گاہ پہنچے جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۱ میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے بار بار وہ مجھے سردھنہ آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ پانچ سال بعد اب اس کی تکمیل ہوئی۔

یہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آج کل ہر انسان پریشانی میں ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں خاموش تھا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: اس لیے کہ وہ پڑوسی کو سکھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

تسلیم احمد صاحب کے اندر ایک عجیب صفت ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں وہ ان کو مستقل طور پر یاد ہو جاتا ہے۔ سردھنہ کے ہزاروں آدمیوں کے نام ان کو ولدیت کے ساتھ یاد ہیں۔

اس قسم کے حافظہ کو انگریزی میں فوٹوگرافک میموری کہا جاتا ہے۔ ایک صاحب سے ایک بار بات ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران مولانا آزاد کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ ان کو تو فوٹوگرافک میموری حاصل تھی۔ انھوں نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا: فوٹوجینک میموری۔ انھوں نے انگلش لٹریچر سے فرسٹ کلاس ایم اے کیا تھا۔ وہ سمجھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ میں خاموش رہا۔ چند دن کے بعد انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ تصویری حافظہ کے لیے فوٹوجینک کا لفظ نہیں ہے۔ اس کے لیے فوٹوگرافک میموری ہی ہے، جیسا کہ آپ نے کہا تھا۔

"انگریزی داں" طبقہ میں اس طرح کا اعتراف عام ہے۔ لیکن "عربی داں طبقہ" میں یہ اعتراف اتنا کم ہے کہ کم از کم میں نے ابھی تک اس کا تجربہ نہیں کیا۔

تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی یادداشت ایسی ہے کہ ملاقات ہوتے ہی انھوں نے کمپیوٹر کی طرح ہر بات تاریخ وار بتانا شروع کر دیا ——— ۱۹۸۷ سے میں مسلسل الرسالہ کا قاری ہوں۔ آپ سے میری پہلی ملاقات ۵ مئی ۱۹۹۱ کو دہلی میں ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات پونہ میں ۲ اکتوبر ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ تیسری ملاقات ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ کو دہلی میں ہوئی۔ اس ملاقات میں آپ نے سردھنہ آنے کے لیے ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ مگر چند دن بعد آپ کا خط آگیا کہ آپ اس تاریخ کو نہ آسکیں گے۔

انھوں نے اور بھی کئی باتیں یاد دلائیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ پونہ کی مجلس میں آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ لاتور کے علاقہ میں جو زلزلہ آیا ہے، کیا وہ عذاب الٰہی ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ وہ عذاب نہیں ہے بلکہ تنبیہہ ہے۔ شرعی اصطلاح میں عذاب آنے کے لیے اہل حق کی ہجرت شرط ہے۔ مشترک آبادی میں کبھی عذاب مستأصل نہیں آتا۔

مغرب کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھی گئی۔ اس کا نام مسجد کمرہ نوابان ہے۔ بوڑھے امام صاحب نے یہ آیت تلاوت کی: والسماء بنیناھا باید وانا لموسعون (الذاریات ۴۷)

اس آیت میں پھیلتی ہوئی کائنات کی فلکیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (تذکیر القرآن ۲/۱۳۰-۱۲۹) تاہم اس میں ایک بالواسطہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو توسیع پسند ہے نہ کہ جمود۔ مگر اس توسیع سے مراد سیاسی یا جغرافی توسیع نہیں ہے بلکہ فکری توسیع

یعنی غور وفکر کے ذریعہ آدمی اپنے ذہن کو مسلسل وسیع کرتا رہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ کی وہ حالت نہ آئے جس کو فکری جمود کہا جاتا ہے۔

جناب تسلیم احمد ایڈووکیٹ کے مکان پر دیر تک نشست رہی۔ اس میں مختلف موضوعات پر گفت گو ہوئی۔

مسجد کرہ نوابان کے امام مولانا بدرالاسلام قاسمی نے بتایا کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد وہاں جو لڑائی ہوئی، اس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں موجود تھے۔ اس زمانہ میں مصری حکومت نے عربی زبان کے دو استاد دیوبند بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک شیخ عبدالمنعم النمر تھے۔ وہ آئے تو ان کے چہرہ پر داڑھی نہیں تھی۔ دیوبند کی فضا میں انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو دہلی ہوائی اڈہ پر پہنچ کر انھوں نے اپنی داڑھی منڈوا دی۔ اور اس کا بال اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: خذوا لحيتكم يا اهل الهند (اے ہندستان والو، یہ اپنی داڑھی لو)

امام صاحب قاری محمد طیب صاحب کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قاری طیب صاحب نے ایک بار کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس ایک شخص آیا اور سوال کیا کہ حضرت، یزید کیسا تھا۔ مولانا نانوتوی نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: شاعر بہت اچھا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو انگریزی میں ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے جس کا براہ راست جواب دینا کسی وجہ سے مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے موقع کے لیے جواب کا یہ طریقہ بہت موزوں اور مفید ہے۔

ایک اور صاحب نے بتایا کہ ایک بار الکشن کے زمانہ میں کانگرس والوں کو معلوم ہوا کہ فلاں حلقۂ انتخاب میں تبلیغ والے بہت ہیں۔ اور اگر مولانا یوسف صاحب (سابق امیر تبلیغ) کہہ دیں تو تمام تبلیغی لوگ کانگرس کو ووٹ دے دیں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہو جو مولانا یوسف صاحب سے یہ بات کہے۔ کسی کانگرسی نے بتایا کہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں آدمی مولانا حسین احمد مدنی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ کچھ لوگ مولانا حسین احمد مدنی کے پاس جائیں اور ان سے

درخواست کریں کہ وہ مولانا یوسف سے یہ بات کہہ دیں۔

یہ خبر تبلیغی مرکز میں پہنچ گئی۔ یہاں مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ مولانا یوسف صاحب تبلیغی سفر پر باہر چلے جائیں تاکہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے ان کی ملاقات ہی نہ ہو سکے۔ مولانا یوسف صاحب نے کہا کہ اس کے بجائے کیوں نہ ہم لوگ مل کر دعا کریں کہ اللہ ہمیں اس آزمائش سے بچا لے۔ اس کے مطابق لوگ دعا میں مشغول ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا وفد جب دیوبند جا کر مولانا حسین احمد مدنی سے ملا اور مذکورہ درخواست کی تو انھوں نے وفد کو یہ جواب دے دیا : بھائی، مولوی یوسف ایک کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم کیوں ان کے کام میں خلل ڈالیں۔

دعا مخصوص اوقات میں کچھ یاد کیے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں، دعا ایک عمل اور ایک طریقِ زندگی ہے۔ دعا بجائے خود ایک تدبیر ہے۔ آدمی جب کسی معاملہ میں دعا کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنے اس یقین کو پختہ کرتا ہے کہ اس دنیا کا اصل مالک خدا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اسی کے اذن سے ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر یہاں کچھ ہونے والا نہیں۔ دعا ایک پکار ہے جو اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ کے عجز کی تلافی کے لیے اس کا خدا اس کی حمایت پر آجائے۔

اسی کے ساتھ یہ کہ آدمی جب اپنے کسی معاملہ میں دعا کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان بناتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو مثبت سمت میں متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو خارج رخی سوچ بنانے کے بجائے اس کو داخل رخی سوچ بناتا ہے۔ اس طرح دعا آدمی کی اندرونی قوتوں کو جگا کر اس کو پہلے سے زیادہ طاقت ور انسان بنا دیتی ہے۔

زیادہ عمر کے ایک صاحب نے بتایا کہ میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں کہ یا اللہ، تو میرے بیٹے کو دولت دینا تو پہلے اس کے استعمال کا سلیقہ دینا۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے زمانہ کی ماؤں کا طریقہ تھا۔ آج کے ماں باپ کا حال یہ ہے کہ وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا خوب دولت کمائے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کے بارہ میں نہ انھیں کوئی خبر ہے اور نہ کوئی تڑپ۔

ایک صاحب نے بعض اردو اخبارات کے حوالے سے عالمی سیاست پر ایک تیز و تند

تبصرہ کیا۔ میں نے کہا کہ محض اردو اخبارات پڑھ کر عالمی سیاست کے بارہ میں اس طرح کی رائے قائم کرنا درست نہیں، کیوں کہ اردو اخبارات نہایت ناقص ہیں۔ محدود اقتصادی ذرائع کی بنا پر وہ زیادہ لائق افراد کو اپنے ادارہ کے لیے حاصل نہیں کر پاتے۔ تمام اردو اخبارات میں تیسرے درجہ کے کارکن بھرے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اردو اخبارات ناقص خبر رسانی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ ابھی چند دن پہلے دہلی کے سب سے بڑے اردو اخبار کے شمارہ ۴ اپریل میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر چھپی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ برطانیہ میں بنائے گئے اس جہاز کی پرواز سات سال بعد شروع ہوگی۔ میں حیران ہوا کہ جب جہاز بن کر تیار ہو چکا ہے تو آخر وہ اتنی زیادہ دیر کے بعد کیوں اپنی پرواز شروع کرے گا۔ اس کے بعد یہی خبر جب ٹائمس آف انڈیا میں دیکھی تو اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ اگلے صفحہ پر دونوں اخباروں کی تصویر مع کیپشن نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس میں مدارس کے طرز تعلیم کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مفسر طنطاوی جوہری (۱۳۵۸-۱۲۸۷ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن میں فقہی نوعیت کے مسائل کے بارہ میں صرف ۱۵۰ آیتیں ہیں۔ جب کہ کائنات میں غور وفکر کے بارہ میں ۷۵۰ آیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے دینی تعلیم کے مدارس میں علوم کائنات کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ مدارس میں علوم کائنات سرے سے پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ جب کہ فقہی مسائل کا یہ حال ہے کہ وہی پورے تعلیمی نظام پر غالب آ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں قرآن وحدیث کو بھی فقہ کے تابع کر دیا گیا ہے۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر شاندار گھر بنائے تو وہ اس کے اوپر لکھ دیتا ہے کہ ھذا من فضل ربی۔ مگر یہ قرآنی آیت کا ادھورا استعمال ہے۔ اگر کوئی لکھے تو اس کو پوری آیت لکھنا چاہیے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا کلمہ ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا تھا، اس پر آپ نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا میں ناشکری کرتا ہوں (النمل ۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی نعمت حقیقۃً فضل کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ ابتلاء (آزمائش)

SUPERJUMBO: An artist's view of the Airbus A3XX which will be capable of carrying 600 passengers. It could be in service within the next seven years, it was announced in London on Wednesday.

کے لیے ہوتی ہے۔ دنیوی نعمت کو پاکر آدمی کے اندر ناز کی کیفیت پیدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے اندر مسئولیت کا احساس مزید اضافہ کے ساتھ جاگنا چاہیے۔

قرآن کی اس آیت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا جو معاملہ ہے وہی اقتدار کا معاملہ بھی ہے۔ اقتدار بھی بطور نوازش نہیں ملتا بلکہ بطور ابتلاء ملتا ہے۔ اگر آج آپ کے پاس دولت ہے، اور کل دوسرا آدمی دولت مند ہو جائے تو آپ اس کو غاصب قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار نہیں کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس بھی دولت خدا کی طرف سے آئی تھی اور اس کے پاس بھی دولت خدا ہی کی طرف سے آئی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اقتدار کا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار یا زمینی خلافت کسی قوم کا ابدی حق نہیں، جس طرح دولت کسی گروہ کا ابدی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ مصلحتِ امتحان کے تحت خلافت ارضی کبھی ایک قوم کو دیتا ہے اور کبھی دوسری قوم کو۔ سیاسی اقتدار بھی بہت سے امتحانی پرچوں میں سے ایک پرچہ ہے۔ جس طرح دوسرے پرچے باری باری سب کو دیے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسی پرچہ بھی ایک کے بعد دوسرے کو ملتا ہے، اور اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا۔

یہ تبدیلی کسی صلیبی یا صہیونی سازش کے تحت نہیں ہوتی بلکہ براہ راست خدائی قانون کے تحت ہوتی ہے (آل عمران ۲۶) اس بنا پر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کو قبول کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ خلافت ارضی جب ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہو تو محروم گروہ ایسا نہ کرے کہ اس کو سازش اور غصب کا معاملہ قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دے۔ ایسا کرنا محرومی پر ہلاکت کے اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ اس کے بجائے محروم گروہ کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس کو خدا کا فیصلہ مان کر اس پر راضی ہو جائے۔

اس معاملہ میں خدائی فیصلہ کو مان لینا محروم قوم کے لیے عبادت کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر حقیقت پسندی پیدا ہوگی۔ اس کے اندر مثبت فکر جاگے گا۔ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے میں لگ جائے گا۔ اس کے افراد سیاست کے سوا دوسرے خالی میدانوں میں سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ اس کی یہ روش عین ممکن ہے کہ خدا کی رحمت کو دوبارہ متوجہ کرے اور دوبارہ اس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سردھنہ کے سید برہان الدین صاحب (ایم اے معاشیات) کی عمر اب ۶۵ سال ہوچکی ہے۔ انھوں نے پاکستان سمیت بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات بتاتے ہوئے کہا : مسلمانوں کو نہ یہود سے خطرہ ہے ، نہ عیسائیوں سے اور نہ ہندوؤں سے۔ مسلمانوں کو خطرہ صرف اپنی ذات سے ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مجلس میں کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی خاص کمزوری کیا ہے جس نے انھیں دوسری قوموں سے پیچھے کر دیا۔ مولانا محمد رضوان قاسمی نے کہا : "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب شعور کی کمی ہے "۔ یہ دور مقابلہ کا دور ہے۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بس دوسروں کی شکایت کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے رہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں زیادہ تر غیر مسلموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات آپ تجربہ کے تحت نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ کسی سے سن کر کہہ رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اپنے پاس سے کوئی رسالہ نکالیے۔ یہ بات خود ان کے گھر پر ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ گھر کے اندر سے الرسالہ کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ لے کر آئے۔

اس کی ورق گردانی کی تو اس میں غیر مسلموں کے دو حوالے تھے۔ مثلاً صفحہ ۸ پر پروفیسر مارگولیتھ کا وہ حوالہ جس میں انھوں نے اصحاب رسولؐ کو ہیروؤں کی قوم کہا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ میں غیر مسلموں کے حوالے غیر مسلموں کے خیالات کی تبلیغ کے لیے نہیں ہوتے ، وہ اسلام کی صداقت بیان کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا ایک مثل ہے کہ فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں (الفضل ما شهدت به الأعداء)

میں نے کہا کہ اس اعتبار سے غیر مسلموں کا حوالہ تو ایک خوبی کی بات ہے ، اور ماضی سے لے کر حال تک کے تمام علماء اسلام اس قسم کے حوالے دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تو خوشی کی بات ہے ، نہ یہ کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

سردھنہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۰ ہزار ہے۔ مگر ان کا اپنا کوئی قابلِ ذکر تعلیمی ادارہ

نہیں۔ جب کہ جینیوں کی تعداد صرف چار ہزار ہے۔ اس کے باوجود وہ تعمیری و تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں، یہاں ان کے تین تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ لڑکیوں کا انٹر کالج، لڑکوں کا انٹر کالج، اور جونیر ہائی اسکول۔ اس کے علاوہ جین ہاسپٹل ہے جس میں آپریشن وغیرہ کا معقول انتظام ہے۔ ان حضرات کی باقاعدہ ایک سوسائٹی "جین ملن سوسائٹی" کے نام سے ہے جس کے تحت یہ تمام تعمیری کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہی حال عیسائی حضرات کا ہے وہ بھی تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار بھی کافی اونچا ہے۔

جین فرقہ اور عیسائی فرقہ کے خلاف ملک میں کوئی تعصب کی فضا نہیں۔ جبکہ مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بڑے پیمانہ پر تعصب پایا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ جین اور عیسائی جہاں ہیں وہاں وہ لوگوں کے لیے نفع بخش بن کر رہتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ مزاج نہیں پایا جاتا۔ دونوں کے معاملہ میں فرق کا اصل سبب یہی ہے۔

میرٹھ کے ایک گاؤں کا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہاں ایک خاندان ہے، اس کا مزاج یہ ہے کہ نہ کسی سے کچھ لو اور نہ کسی کو کچھ دو۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ان لوگوں نے اپنی زمینوں میں محنت کر کے کافی پیسہ کمایا۔ مزید زمینیں خریدیں۔ نیا مکان بنایا۔ بستی میں ان کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہو گئی۔ گاؤں کے ماحول میں وہ شہر کی طرح رہنے لگے۔

اس کے نتیجہ میں گاؤں والوں میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے مگر دوسرے انھیں تکلیف دینے کے درپے ہو گئے۔ پہلے یہ کیا کہ ان کے ٹیوب ویل سے موٹر نکال لے گئے۔ ان کا ٹریکٹر غائب کر دیا۔ اس طرح کی حرکتوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑا تو اب یہ کیا کہ خود اپنے اندر کے ایک بوڑھے کو قتل کر کے مذکورہ خاندان کے تمام لوگوں کو فوجداری کیس میں پھنسا دیا۔ حتیٰ کہ اس خاندان کے ایک ہونہار نوجوان کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ۔

یہ بلاشبہ کمینہ پن ہے۔ مگر اس طرح کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی تعمیر کے ساتھ ایک اور تدبیر یہ کرنا چاہیے کہ وہ شر پسندوں کے شر سے کس طرح بچے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی جہاں رہے وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن کر رہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ انھیں اپنا احسان مند بنائے رہے۔ لوگوں کے شر سے بچنے کا یہ سب سے زیادہ آسان اور موثر طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں دونوں فریق کے درمیان جو جھگڑے ہوئے اس میں دونوں کا ملا کر تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ ہندستان کی کوئی بستی یا کوئی شہر نہیں جہاں مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے نزاعات نہ پائے جاتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے شمار جماعتیں، ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو مسلمانوں کے ان باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کر رہی ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کے نام پر ہر جگہ دھوم مچی ہوئی ہے، مگر اسلام کے لیے کسی گہرے اور دور رس کام کا کہیں وجود نہیں۔

مولانا محمد رضوان قاسمی یہاں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ دیا۔ اس پر سر دھنہ کے ایک صاحب کا تاثر حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا تھا :

"الرسالہ پڑھنے کے بعد تمثیل احمد خاں نے کہا کہ مولانا صاحب یہ کام تنہا نہیں کرتے بلکہ ایک ٹیم ہے جن کو مولانا نے مختلف میگزین اور کتابیں پڑھنے پر مامور کیا ہے۔ کسی کا کام اردو اخبار پڑھنا ہے۔ کسی کا کام عربی چیزیں پڑھنا۔ اور کسی کا کام انگریزی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا۔ یہ لوگ حسب ہدایت واقعات کی تعیین کر کے مولانا کو پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا ان واقعات کو مذہب پر منطبق کر کے الرسالہ کے لیے مضامین تیار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کام تنہا ایک آدمی نہیں کر سکتا۔ البتہ کمپوٹر کر سکتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسلسل چالیس سالہ مطالعہ کے بعد مولانا نے الرسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن نہیں ہوئے انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں اس قدر معیاری کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا اور ترتیب دینا ایک آدمی کا کام ہی نہیں۔"

ایک اور صاحب تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ الرسالہ تو سب کا سب سرقہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اتنی باتیں نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے یقین ہے کہ وہ اِدھر اُدھر سے سرقہ کر کے ان کو مرتب کر دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ الرسالہ دعا کی طاقت سے نکل رہا ہے مگر لوگ دعا کی طاقت کو نہیں جانتے۔ عام طور پر لوگ صرف رسمی دعاؤں سے واقف ہیں۔ یا وہ کسی بزرگ کے دعائیہ جلسہ میں شریک ہو کر آمین کہنے کو دعا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دعا اس سے بلند تر ایک شے ہے۔ دعا دراصل خدا کی یافت ہے۔ دعا معرفتِ حق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ دعا انسان کا حقیقتِ اعلیٰ کے ساتھ

اتصال ہے۔ دعا گویا خزانۂ قدرت تک ایک انسان کی رسائی ہے۔ دعا جب اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو انسان کا سینہ تجلیاتِ الٰہی کا ہبط بن جاتا ہے۔ یہ دعا جب وجود میں آتی ہے تو کسی انسان کے لیے وہ لمحہ آجاتا ہے جس کی بابت حضرت مسیح نے فرمایا : مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔

ایک صاحب نے اپنا قصہ بتایا کہ سڑک پر میں ایک سواری کی زد میں آکر گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ اٹھا تو میں اسپتال میں تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہندوؤں نے مجھ کو زخمی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی گاڑی میں لٹا کر انھوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میری ہر طرح مدد کی۔ یہ قصہ بتا کر انھوں نے کہا: انسانیت ابھی زندہ ہے۔ شر پسندوں میں کچھ خیر پسند بھی موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ بہت سے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وہ جب ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہوتا ہے کہ بروں کی بھیڑ میں کچھ اچھے افراد بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح بات نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ غیر مسلم سب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی دشمن نہیں ہے تو وہ استثنا رہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے۔ ہر ایک کے اندر انسانیت موجود ہے۔ فسادات کا سبب دشمنی نہیں۔ فسادات کا سبب وقتی اشتعال ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ جذباتی قسم کے لوگ اپنی کسی نادانی سے ایک بھیڑ کے نفس امارہ کو جگا دیتے ہیں۔ اور وہ بھڑک کر فساد پر اتر آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جذباتی لوگوں میں صبر وتحمل کی صفت پیدا کردیں تو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے فسادات کا خاتمہ ہو جائے۔ اور ہر آدمی خیر پسند دکھائی دینے لگے۔

ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ میں نے اس کی ڈائری میں حسب ذیل نصیحت لکھ دی: زندگی کا راستہ ہموار راستہ نہیں۔ یہاں اونچ نیچ دونوں ہی آتے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر ہمت نہ ہارے، جو ہر حال میں یکساں عزم کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔

۱۱ اپریل کو عشاء کی نماز سردھنہ کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں نماز کے بعد تقریر کا پروگرام

تھا، نماز کے بعد بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ نماز کی اصل اسپرٹ کیا ہے اور ملت کی تعمیر میں اس کا رول کیا ہے۔

تقریر کے بعد دیر تک مصافحہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ مصافحہ کے بعد لوگ چلے جائیں گے۔ مگر کافی لوگ اس کے بعد دوبارہ بیٹھ گئے۔ چنانچہ سوال و جواب کی صورت میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران کئی اخبار کے رپورٹر آ گئے۔ ان میں ہندی اخبار کے رپورٹر بھی تھے اور اردو کے رپورٹر بھی۔ آخر میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ زندگی کا ایک سادہ اصول یہ ہے کہ جتنی محنت اتنی کامیابی۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے بڑی اخلاقی صفت اپنے خلاف سوچنا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں میں سرے سے موجود نہیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو یہاں میں نے جو تقریر کی تھی، اس کی رپورٹ اس علاقہ کے اخباروں میں بھی چھپی۔ اس وقت کچھ اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے جنھوں نے تقریر کے آخر میں سوالات کیے۔ چوں کہ ۲۷ اپریل کو اور پھر ۳، ۷ مئی ۱۹۹۶ کو لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے الکشن ہونے والے ہیں، اس لیے الکشن کی بابت بھی سوالات کیے گئے۔ اگلے صفحہ پر ہندی روزنامہ امر اجالا (۱۲ اپریل ۱۹۹۶) کی شائع شدہ رپورٹ نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس تھی۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ہر ایک سے سوال کرکے اس کے اپنے میدان کے تجربات پوچھ رہا تھا۔ اس درمیان میں محمد حنیف صاحب نے سوال کیا کہ الرسالہ آپ اکیلے ہی لکھتے ہیں، یا اور بھی کچھ لکھنے والے لوگ ہیں، میں نے جواب دیا کہ میں اکیلا ہی لکھتا ہوں، مگر اس کی تیاری میں بہت لوگ شامل ہیں۔ حتیٰ کہ آپ لوگ بھی اس میں شریک ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ نے دیکھا، میں ہر ایک سے اس کے دائرہ کی معلومات لیتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرے پاس بہت سے لوگوں کے تجربات اکٹھا ہو جاتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ الرسالہ کو مرتب کرتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ اگرچہ ایک شخص کے قلم سے لکھا جاتا ہے مگر اس میں تنوع اتنا زیادہ

ہوتا ہے کہ وہ ۲۰ سال سے نکل رہا ہے۔ مگر آج تک لوگوں کی دل چسپی اس سے ختم نہیں ہوئی۔ اس کا نیا پن مسلسل باقی ہے۔

رات ہوئی تو سردھنہ کے آسمان پر ستارے جگمگاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کسی شخصیت کی بڑائی بتانا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا تھا جیسے ستاروں کے درمیان سورج۔ مگر یہ صرف ایک ادبی اسلوب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سورج خود بھی ایک ستارہ ہے۔ مزید یہ کہ فلکیاتی تقسیم میں سورج نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ سمجھا جاتا ہے:

The Sun is classified as a dwarf star.

آسمان کے بیشتر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ معلوم کیا گیا ہے کہ ان کی جسامت (Volumes) سورج کے مقابلہ میں ایک ملین سے لے کر دس ملین گنا تک زیادہ ہے۔

رات کے وقت ستاروں کا خوب صورت منظر اب دہلی جیسے شہروں میں گویا معدوم ہو گیا ہے۔ دہلی میں فضائی کثافت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ وہاں اب نہ سانس لینے کے لیے

मौलाना वहीदुद्दीन खान ने सरधना में कहा: समृद्धि का आधार मेहनत है, आरक्षण नहीं

अमर उजाला ब्यूरो: सरधना, १२ अप्रैल। जाने-माने विचारक मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि आरक्षण की अपेक्षा मेहनत त्याग के बल पर अर्जित सफलता आत्मिक, सामाजिक, आर्थिक समृद्धि प्रदान करती है। नगर के बुध बाजार स्थित जामा मस्जिद में आज इशा की नमाज के बाद अकीदतमंदों को खिताब करते हुए उन्होंने नमाज की विस्तृत व्याख्या भी की। उन्होंने कहा कि नमाज सदर बनने के जज्बों से बचाती है। उन्होंने इत्तेहाद पर बल देते हुए कहा कि यह सबसे बड़ी ताकत है और इसमें जिस प्रकार नमाज के दौरान हम एक इमाम के पीछे सभी मुकतदी होते हैं, उसी प्रकार हमें सदर बनने की होड़ से स्वयं को उबारना चाहिए। बाद में मुस्लिम बुद्धिजीवियों व पत्रकारों के सवालों का जवाब देते हुए उन्होंने कहा कि इस्लाम यह सिखाता है कि दुश्मन से भी अच्छा सुलुक करो। जो आज दुश्मन है, कल वह मित्र बन जाएगा। भाईचारा कायम करने के मिशन पर निकले मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि इस्लाम के मुताबिक हम दुनिया भर में फैले हैं, अपनी बात को रखने के दो माध्यम हैं। एक दादागिरी, दूसरा दाई (देने वाला)। दादागिरी के बल पर कोई मिशन कामयाब नहीं हो सकता। आरक्षण संबंधी प्रश्न के उत्तर में मौलाना ने कुरान और हदीस की रोशनी में कहा कि हम तुमसे कोई अज्र नहीं मांगते। मांगना अपने आप को फकीर बनाना है। तरक्की का राज मेहनत है, आरक्षण नहीं। इंसान अपनी ताकत को पहचाने। हदीस में आया है कि रिजक का नब्बे फीसदी हिस्सा तिजारत में है। सीताराम केसरी (कल्याण मंत्री) के मुस्लिमों को आरक्षण देने की सिफारिश पर टिप्पणी करते हुए उन्होंने कहा कि 'वो बेवकूफ बना रहे हैं और हम बेवकूफ बन रहे हैं।' उन्होंने और कुरेदने पर कहा कि वे (कांग्रेस) १९४७ से लगातार हुकूमत कर रहे हैं, अब से पूर्व आरक्षण क्यों नहीं दिया गया। मौलाना ने आर्थिक मजबूती के लिए सहकारी समितियां बनाकर सहयोग का आह्वान किया। चुनाव के दौरान किस पार्टी का समर्थन किया जाए, सवाल के जवाब में उन्होंने कहा कि सही मायने में हालात ये है कि यदि चुनाव अच्छे-बुरे में हो तो बेशक अच्छे को चुनने के लिए कहा जा सकता है, लेकिन यहां तो चुनाव 'मिस्टर करप्ट' व 'श्री भ्रष्ट' के बीच है।

خالص ہوا ہے، اور نہ دیکھنے کے لیے فطرت کے آسمانی مناظر۔

موجودہ دنیا میں انسان دو مسئلے کے درمیان ہے۔ اگر تمدنی ترقی حاصل کی جائے تو فطرت کا حسن رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اگر فطرت کا ماحول اختیار کیا جائے تو وہ صرف تمدنی ترقیوں سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دونوں خوبیاں اپنی کامل اور معیاری صورت میں جنت کے سوا کہیں اور ملنے والی نہیں۔

۱۲ اپریل کو نماز فجر سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ صبح کی چائے جناب محمود علی خان صاحب کے مکان پر ہے۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ چنانچہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

محمد حنیف ملتانی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، راستہ میں نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے جگہ بنا کر نماز ادا کی۔ ایک ہندو مسافر نے دیکھ کر کہا کہ آپ تو بڑے دھارمک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ بھی تو پورے دھارمک ہیں۔ دیکھئے، آپ ہردوار سے گنگا جل لیے چلے آرہے ہیں، اور جب پانی پینا ہوتا ہے تو اسی کو پیتے ہیں۔ اس کے بعد مذہب پر گفتگو ہونے لگی۔

محمد حنیف صاحب نے کہا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی قیمتی چیز میں ساجھا گوارا نہیں کرتا۔ پھر خدا تو سب سے زیادہ قیمتی ہے، اس میں ساجھا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔ اس طرح مثالوں کے ذریعہ انھوں نے شرک اور توحید کا فرق بتایا۔ اور کہا کہ شرک کا عقیدہ فطرت کے خلاف ہے اور توحید کا عقیدہ عین فطرت کے مطابق۔ مذکورہ ہندو مسافر نے بڑے دھیان سے سنا اور آخر میں کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاط کس طرح بجائے خود اشاعتِ اسلام کا ذریعہ ہے، کسی بھی طرح اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اختلاط بڑھ جائے تو دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد میرٹھ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد ہوتا رہا ہے۔ سردھنہ اس سے صرف ۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، مگر یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ میں نے لوگوں سے اس

کی بابت گفتگو کی۔ بظاہر یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب عمومی اختلاط ہے۔ سردھنہ کی آبادی ۶۰ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان ہیں۔ یہاں کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ بار بار دونوں فرقہ کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اس طرح تقریباً سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، یہی سماجی اور کاروباری میل ملاپ اس فرق کا اصل سبب ہے۔

میں نے کہا کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اختلاط مانع فساد ہے۔ اگر صرف اتنا ہو جائے کہ دونوں فرقوں کا اختلاط بڑھ جائے تو فساد کے اسباب اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۱۹۸۷ میں میرٹھ میں بہت بڑا فساد ہوا۔ اس کے بعد سردھنہ میں کسی نے شرارت کی اور مسجد میں خنزیر کا گوشت ڈال دیا۔ اس طرح کے کچھ واقعات کیے گئے تاکہ سردھنہ میں بھی فساد برپا ہو جائے۔ مگر یہاں کے لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ وہ مشتعل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے لوگ اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا، اب اس کو آگے بڑھنے نہیں دینا ہے۔ چنانچہ یہ چنگاری آغاز ہی میں بجھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرٹھ میں سخت نقصان ہوا۔ مگر سردھنہ میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہاں کے مسلمان آج ترقی کر رہے ہیں بزنس اور تعلیم دونوں میدانوں میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں میرٹھ فساد کے موقع پر سردھنہ کے تین مسلمانوں کو قریب کے گاؤں کساولی میں مار ڈالا گیا جب کہ وہ وہاں باغ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ مگر سردھنہ کے مسلمان اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ اس طرح ایک طرف مجرمین کو قانونی سزا ملی اور دوسری طرف سردھنہ فساد کی مصیبت سے بچ گیا۔

۱۲ اپریل کی صبح کو شیخ محمد حنیف ملتانی (۵۱ سال) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ غیر رسمی انداز میں دیر تک لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ سردھنہ میں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر بزنس کے میدان میں ہیں۔ تاہم ایک صاحب کے الفاظ میں "مسلمان تو زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں۔ ہندو بزنس میں ہم سے بہت آگے ہیں"۔ میں نے سبب پوچھا تو ایک صاحب نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب صرف علم کی کمی ہے۔

ایک صاحب سے اس پر گفتگو ہوئی کہ کافر کون ہے۔ میں نے کہا کہ کافر کسی نسلی گروہ کا نام نہیں۔ یہ ایک انفرادی رویہ ہے۔ کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس سے مراد وہ انسان ہے جو اتمام حجت کے باوجود حق کا انکار کرتا رہے، یہاں تک کہ انکار ہی کی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔

قرآن (البقرہ ۱۶۱) میں ہے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ کافر ہی مر گئے تو وہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولئک علیھم لعنۃ اللہ الخ)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا منکر وہ شخص ہے جو موت کے آخر وقت تک کافر بنا رہے۔ اب چوں کہ کوئی انسان کسی کے بارہ میں یہ جان نہیں سکتا کہ اس کا خاتمہ آخر کار کس چیز پر ہوا ہے، یہ وہ چیز ہے جو صرف خدا کو معلوم ہے۔ اس لیے ہمیں یہ حق نہیں کہ پیشگی طور پر ہم کسی کو کافر قرار دے دیں۔ ہمیں دوسروں کو صرف غیر مسلم کہنا ہے۔ یا انسان یا برادرانِ قوم جیسے الفاظ سے انھیں خطاب کرنا ہے۔ اور اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر دینا ہے کہ آخری طور پر اس کی موت کس حال میں ہوئی۔ کافر وہ ہے جو خدا کے نزدیک کافر قرار پائے نہ کہ انسانوں کے نزدیک۔

سردھنہ کا تعارف سب سے پہلے مجھے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس کے شمارہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۸ کے ذریعہ ہوا۔ اس میں مسٹر شوچی بنسل (Shuchi Bansal) کے قلم سے ایک باتصویر مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— سردھنہ، بیگم کا مامن :

Sardhana: The Begum's Haven

اسی وقت سے یہ خواہش تھی کہ سردھنہ کو دیکھا جائے۔ مگر ہر کام اپنے مقرر وقت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ آٹھ سال کے بعد یہ وقت آیا اور میں سردھنہ کو دیکھنے کی خواہش پوری کر سکا۔

سردھنہ ریلوے لائن پر نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ انڈیا کے سیاحتی نقشہ (ٹورسٹ میپ) پر نہیں ہے۔ تاہم اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ پورے ہندستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں عیسائی حضرات اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس کے بارہ میں اخباروں میں رپورٹیں بھی چھپتی رہتی ہیں۔ مذکورہ انڈین اکسپریس کے علاوہ دہلی کے ہفت روزہ انڈین کرنٹس

(۷ مارچ ۱۹۹۶) میں ایک معلوماتی مضمون مسٹر گلشن مہرا کے قلم سے چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــ بیگم سمرو کی سرزمین میں :

In the land of Begum Samru

۱۲ اپریل کو جمعہ سے پہلے ہم لوگ سردھنہ کا مشہور سینٹ میری چرچ (St. Mary's Church) دیکھنے کے لیے نکلے۔ یہ سفر جناب علاؤالدین صاحب کی گاڑی میں طے ہوا۔ اس چرچ کا ذکر پہلی بار میں نے مذکورہ اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ ایک وسیع حصار بند علاقہ ہے جو گویا سردھنہ کے اندر ایک عظیم تر سردھنہ ہے۔ تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی یہ وسیع دنیا ایک خاتون نے بنوائی تھی جو عام طور پر بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہیں۔ عظیم چرچ کے گیٹ کے اوپر حسب ذیل فارسی قطعہ لکھا ہوا ہے :

بامدادِ خدا فضلِ مسیحا بسالِ ہجدہ صد عشرین واثنا
بدل زیب النساء، عمدہ اراکین بنا فرمود عالی شان کلیسا

چرچ کے ایک کتابچہ سے معلوم ہوا کہ بیگم سمرو کا اصل نام فرزانہ تھا۔ ان کے باپ کا نام لطیف علی خان تھا۔ وہ میرٹھ ضلع کے ایک گاؤں کوتانہ میں ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی عمر چھ سال تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ذریعہ معاش کی تلاش میں ان کی ماں انھیں لے کر دہلی آگئیں۔ ان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی۔ چنانچہ انھوں نے رقص وسرود کا پیشہ اختیار کرلیا۔

جب ان کی عمر پندرہ سال تھی، ایک فرانسیسی افسر (Walter Reinhardt) نے ان کو ایک رقص پارٹی میں دیکھا۔ وہ اس کو پسند آگئیں اور اس نے ان سے نکاح کرلیا۔ ۱۷۶۵ء میں بیگم کا نکاح مسٹر سمرو سے خالص اسلامی روایات کے مطابق ہوا۔

مذکورہ فرانسیسی افسر کا اصل نام والٹر رین ہارٹ تھا۔ مگر وہ سیاہ فام تھا، اس بنا پر اس کے یورپی ساتھی اس کو سومبرے (Le Sombre) کہنے لگے جس کے معنی تاریک کے ہیں۔ یہ لفظ بول چال میں بگڑ کر سُمرو (Sumru) بن گیا۔ اس طرح یہ فرانسیسی افسر سُمرو کہا جانے لگا۔ اور جب اس کا نکاح مذکورہ خاتون سے ہوا تو وہ بھی بیگم سمرو کے نام سے مشہور ہوگئیں۔

مذکورہ فرانسیسی ابتداءً راجہ جواہر سنگھ (بھرت پور) کی فوج میں افسر تھا۔ اٹھارویں صدی

کے آخر میں دہلی کی برائے نام مغل سلطنت پر شاہ عالم ثانی تخت نشین تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں بغاوت ہوگئی۔ شاہ عالم کو دہلی سے بھاگنا پڑا۔ اس بغاوت کا سردار زبتہ خان تھا۔ شاہ عالم نے بغاوت کو فرو کرنے کے لیے والٹرین ہارٹ کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ایک فوجی ماہر تھا، وہ بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد شاہ عالم ثانی نے والٹرین ہارٹ کو مظفر نگر سے علی گڑھ تک کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔

۱۷۷۸ میں والٹرین ہارٹ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت بیگم سمرو اس کے نکاح میں آچکی تھیں۔ مگر ابھی تک انھوں نے عیسائیت قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے بیگم سمرو کو وارث کے طور پر مان لیا۔ اس طرح بیگم سمرو مذکورہ ریاست کی حاکم بن گئیں جس کی راجدھانی سردھنہ تھی۔ والٹرین ہارٹ کے انتقال کے تین سال بعد ۷ مئی ۱۷۸۱ کو بیگم سمرو نے مذہب تبدیل کرکے باقاعدہ عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔

اس زمانہ میں بیگم سمرو کی فوج میں ایک یورپی افسر جارج ٹامس (George Thomas) تھا۔ اس کو بیگم سے دل چسپی ہوگئی۔ وہ بیگم سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر بیگم نے انکار کیا۔ اس کے بجائے انھوں نے ایک اور فرانسیسی فوجی افسر لاویسا (Le Vaisseau) سے نکاح کرلیا۔

اس کے بعد بیگم سمرو کے مصیبت کے دن شروع ہوتے ہیں۔ بیگم سمرو کے سوتیلے لڑکے ظفر یاب خان نے جارج ٹامس کو ساتھ لے کر بغاوت کردی۔ بیگم کو سردھنہ چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ اس سلسلہ میں بہت لمبی کہانی ہے جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔

۶۵ ایکڑ کے رقبہ میں یہاں جو مسیحی دنیا ہے اور جس میں چرچ وغیرہ شامل ہیں وہ سب انھیں بیگم سمرو کی بنوائی ہوئی ہیں۔ بیگم نے اسپتال کے نام سے ایک رقم چھوڑی تھی۔ چنانچہ ان کے بعد یہاں ایک اسپتال بنایا گیا جو اب تک قائم ہے۔ یہ اسپتال ۱۸۱۸ میں تیار ہوا تھا۔

اس مسیحی احاطہ کے اندر چرچ کے بعد جو سب سے بڑی اور شاندار عمارت ہے وہ بیگم سمرو کا محل ہے۔ اب وہ ایک انٹر کالج کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بیگم سمرو کی قدیم رہائش گاہ میں ایک پرائمری اسکول قائم ہے۔ اس کی ایک جھلک اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بیگم سمرو کا تعلق اپنے پہلے فرانسیسی شوہر والٹرین ہارٹ سے ۱۷۶۵ میں ہوا تھا۔ پھر

دوسرے سے۔ مگر کتابچہ میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بیگم سمرو اپنے فرانسیسی شوہروں سے بات کس زبان میں کرتی تھی۔ آیا اس کے شوہروں نے اردو یا فارسی سیکھ لی تھی یا خود بیگم نے فرانسیسی زبان میں بقدر ضرورت واقفیت حاصل کرلی تھی۔ بیرونی شخصیتوں سے تو وہ ترجمان کے ذریعہ بات کرسکتی تھی۔ مگر اپنے شوہر سے بات کرنے کے لیے تو ضروری ہے کہ دونوں براہ راست گفتگو کرسکیں۔ مگر اس سوال کا جواب مذکورہ کتاب میں موجود نہیں۔

چرچ کے گیٹ پر لکھا ہوا تھا : (St. Mary's Church) یہ بلند و بالا چرچ بیگم سمرو نے اٹلی کے معماروں کے ذریعہ بنوایا تھا۔ ہم لوگ اندر داخل ہو کر دیکھنے لگے۔ اس وقت چرچ کے اندر سروس (مسیحی عبادت) ہو رہی تھی۔ مگر اس میں اتنے کم آدمی تھے کہ وسیع چرچ کے اندر وہ ہمیں دکھائی نہیں دیے۔ مقامی مسیحی گائڈ جو ہمارے ساتھ تھا، اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے بعض ساتھی آپس میں بولنے لگے۔ ان کی آواز گونج کی وجہ سے زور زور سنائی دینے لگی، تاہم میں حسب عادت بالکل خاموش تھا اور کچھ بھی بولے بغیر چپ چاپ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

آواز سن کر ایک بھاری بھرکم خاتون اندر سے نکلی۔ اس نے غصہ کے انداز میں کہنا شروع کیا کہ یہاں سروس ہو رہی ہے اور یہ پتہ نہیں کون لوگ ہیں جو اس طرح یہاں آکر زور زور سے بول رہے ہیں۔ میں دوبارہ حسب عادت کچھ بھی جواب دیے بغیر باہر آگیا۔ اتنے میں گائڈ اندر

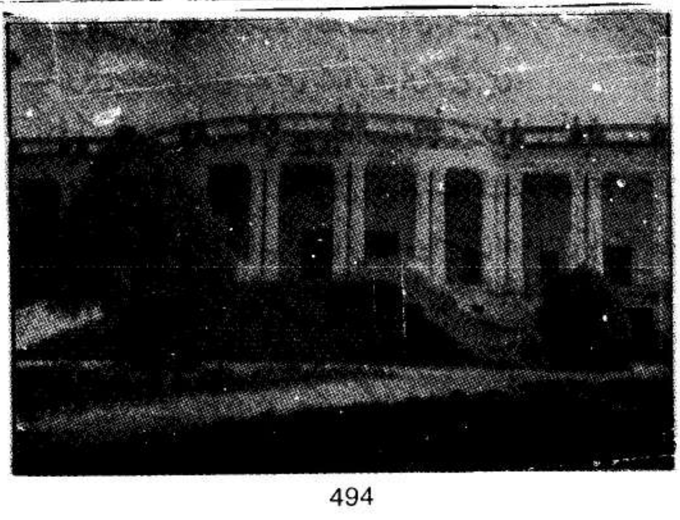

سے آیا۔ اس نے کہا کہ چلئے، آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ مگر میں نے دوبارہ اندر جانے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کے بعد بڑے پادری کو خبر ہوئی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر خود آگیا اور معذرت کر کے ہم لوگوں کو دوبارہ اندر لے گیا۔ وہ اگرچہ ایک خاص پروگرام میں مصروف تھا۔ لیکن پروگرام چھوڑ کر وہ آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہا۔ اور وسیع احاطہ کے مختلف شعبے ہمیں دکھائے اور ہر ایک کا تعارف کرایا۔

وسیع پھیلے ہوئے چرچ کے اندر ایک خاص کمرہ ہے جو سال میں صرف دو بار مخصوص تاریخوں پر کھولا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے اور برکت لینے کے لیے لاکھوں عیسائی یہاں جمع ہوتے ہیں۔ فادر نے اس کمرہ کو خصوصی طور پر آج ہمارے لیے کھلوا دیا۔ چرچ میں داخلہ کے وقت جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا، یہ غالباً اسی کا ایک خوش گوار نتیجہ تھا۔

اس کمرہ میں کچھ مسیحی تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ اور سامنے دیوار پر قدآدم مسیح کا اسٹیچو صلیب پر لٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا نقشہ اس طرح ہے کہ موت کے بعد سر ایک طرف لٹکا ہوا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں میں کیل گاڑنے کا خونی نشان ہے۔ سینہ پر بھالا مارنے کی وجہ سے خون بہہ رہا ہے۔ غرض یہ کامل طور پر ایک بے بس انسان کی تصویر تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں "بے بس خدا" کو ماننے والے ساری دنیا میں حرکت وعمل کا طوفان بن گئے۔ مگر "طاقت ور خدا" کو ماننے والے اپنی بے عملی کے نتیجہ میں ساری دنیا میں سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم بنے ہوئے ہیں۔

اس مصلوب مجسمہ کے اوپر لکھا ہوا تھا انری (INRI)۔ میں نے پادری صاحب سے پوچھا کہ اس کا فل فارم کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ لکھ کر دیے:

Iesus Nazarenus Rex Iudeorum

یہ لاطینی زبان ہے۔ اس کا مطلب ہے ——— یسوع ناصری، یہودیوں کا بادشاہ:

Jesus, The Nazarene, King of the Jews

یہ ۱۲ اپریل کو ساڑھے دس بجے دن کا وقت تھا۔ ایک سن رسیدہ مسٹر نے آکر اس کمرہ کا تالا کھولا اور کہا: مجھ کو ہندی بہت نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ آپ انگلش میں بتائیے۔ چنانچہ وہ انگریزی

میں تعارف کراتی رہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ سسٹر، آپ کا شکریہ (Thank you, Sister)
اس نے جواب میں کہا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں :

We all are children of one Father.

میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کے اندر آپ نے جو اخلاق دیکھا اس کا راز کیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اس کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے ——— مشنری اسپرٹ۔

چرچ کے بڑے پادری (Fr. John Monteiro) کی طرف سے انگریزی میں ۸۰ صفحہ کا ایک کتابچہ ہمیں دیا گیا جس میں اس مسیحی سنٹر کے بارہ میں تاریخی تفصیلات درج تھیں۔ ۸۰ صفحہ کے کتابچہ میں بہت سی تفصیلات ہیں۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیگم فرزانہ جب ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوئی تھی تو اس نے کیوں مسیحیت قبول کر لیا۔ کتابچہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فادر گریگوری (Fr Gregory) ایک پرجوش مشنری (zealous missionary) تھے۔ وہ اٹلی میں ۲۲ نومبر ۱۷۴۳ کو پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرہ آئے۔ یہاں غالباً انھوں نے ہندستانی زبان سیکھی۔ اس کے بعد وہ سردھنہ منتقل ہوئے۔ ۷ مئی ۱۷۸۱ کو انھوں نے بیگم فرزانہ کو مسیحیت میں داخل کیا۔ ان کا نیا نام یوہانہ سمرو (Yohanna Sumru) رکھا گیا۔ فادر گریگوری کا انتقال دہلی میں ۲۹ مئی ۱۸۰۷ کو ہوا۔ دہلی میں رہتک روڈ پر اب بھی ان کی قبر موجود ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے بیگم سمرو سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ وہ ہندستانی زبان کے علاوہ فارسی زبان اچھی جانتی تھی۔ اس بنا پر علماء اس سے بہت اچھی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ مگر غالباً کسی بھی عالم کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ اس طرح مسیحی پادری کو یک طرفہ طور پر یہ موقع مل گیا کہ وہ خاتون پر کوشش کرے اور اس کو بیگم فرزانہ سے بیگم یوہانہ بنا دے۔

مذکورہ کتاب میں یہ درج ہے کہ ——— اس میں شک نہیں کہ اس سفید پوش اطالوی راہب کو بیگم کی تبدیلیٔ مذہب کے لیے بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ اس نے بیگم کو اور اس کے سوتیلے لڑکے (ظفریاب خان) کو آگرہ کے قدیم اکبر چرچ میں ۱۷۸۱ء میں بپتسمہ دیا۔ بارہ سال بعد اسی نے بیگم کا نکاح ایک فرانسیسی افسر سے کیا :

Undoubtedly this Italian Carmelite must have had a lot to do with the begum's conversion. He baptised her in the old Akbar Church of Agra along with Sumru's son in 1781. 12 years later he blessed her marriage with the Frenchman, Le Vaisseau. (p. 64)

یہ مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا جس نے دہلی سلطنت پر ۱۷۵۹ سے لے کر ۱۸۰۶ تک حکومت کی۔ خود بیگم سمرو کی جاگیر یا ریاست اسی سلطنتِ دہلی کے ماتحت تھی۔ اس اعتبار سے مسلم علماء کے لیے اس معاملہ میں دخل دینے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا اتنا بڑا واقعہ ہوا جس کا تعلق سردھنہ سے لے کر آگرہ تک سے تھا، اور جس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ لیکن اس مدت میں کوئی ایسا عالم سامنے نہیں آیا جو بیگم سمرو سے ملاقات کر کے اس کو اسلام کی اہمیت بتائے۔ بیگم سمرو صرف اردو اور فارسی زبان جانتی تھی مگر فرنچ اور انگریزی کے علماء سے تو اس کا ربط قائم ہوا، لیکن اردو اور فارسی کے علماء سے اس کا ربط قائم نہ ہو سکا۔

یہ وہ وقت ہے جب کہ دہلی میں شاہ عبد العزیز صاحب (۱۸۲۳-۱۷۶۲) موجود تھے۔ انھوں نے ۱۸۰۶ء میں فتوی دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ علماء "حرب" کے معاملہ میں تو ضرورت سے زیادہ باخبر تھے، مگر "دعوت" کے معاملہ میں وہ کبھی باخبری کا ثبوت نہ دے سکے۔ ورنہ شاید آج سردھنہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

عین اسی زمانہ کا ایک اور ملتا جلتا قصہ ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر حرب بوائنے (Benoit de Boigne) ہندستان آیا تھا۔ وہ ۱۷۵۱ء میں چیمبری (Chambery) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ ہندستان میں وہ گوالیار کے راجہ مادھوجی سندھیا کی فوج میں افسر مقرر ہوا۔ جہاں وہ ۱۷۸۴ سے ۱۷۹۴ تک رہا۔

بوائنے نے شاہ عالم دوم کے ایک ایرانی افسر کی لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام علی بخش تھا۔ علی گڑھ میں موجودہ مسلم یونی ورسٹی جس زمین پر قائم ہے وہ پہلے اسی فرانسیسی مہم باز (French Adventurer) کی ملکیت تھی۔ ۱۸ سال ہندستان میں رہ کر ۱۸۱۲ میں جب وہ فرانس واپس چلا گیا تو اس کے بعد یہ زمین کچھ اور لوگوں کو ملی۔ یہاں تک کہ

پھر وہ مسلم یونی ورسٹی کے حصہ میں آئی۔

بیگم سمرو کی زندگی اس دور کے ہندستان کو بتاتی ہے جو یہاں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت کسی سلطنت کے تین اہم شعبے ہوتے تھے ـــــ زراعت، انتظام حکومت اور فوج۔ ان میں بھی فوج کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ کیوں کہ اقوام متحدہ سے پہلے دنیا میں کوئی بین اقوامی قانون نہیں تھا اور اس قسم کے معاملات کو طے کرنے والی واحد طاقت صرف فوج تھی۔

اُس زمانہ میں حوصلہ آزما افراد کے لیے سب سے بڑی چیز فوجی سردار یا فوجی جنرل بنتا تھا۔ چنانچہ اکثر راجہ اور مہاراجہ کے یہاں یورپ کے لوگ بڑے بڑے فوجی عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح افغانی سردار یہاں آکر مسلم بادشاہوں اور ہندو راجاؤں، دونوں کے یہاں اعلیٰ فوجی عہدہ حاصل کرتے تھے۔ گویا کہ آج جس طرح مغربی ملکوں کے ٹکنکل ماہرین ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح پچھلے زمانہ میں یورپ کے فوجی ماہرین یہاں کی فوجوں میں عہدے حاصل کیے ہوئے تھے۔ آج کے ماہرین ہوائی جہازوں پر سفر کر کے آتے ہیں، اُس زمانہ کے ماہرین پانی کے جہازوں پر سفر کر کے یہاں پہنچتے تھے۔

سردھنہ کے عظیم چرچ کے اندر بہت سے اسٹیچو ہیں۔ وہ سب سنگ مرمر کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کو اٹلی کے فنکاروں نے بنایا ہے۔ ایک سیاح کے الفاظ میں، وہ تعجب خیز حد تک خوب صورت (breathtakingly beautiful) ہیں۔ بیگم سمرو کا ایک مجسمہ ہے جس میں وہ چہرے پر لمبا گھونگھٹ نکالے ہوئے ہے۔ اور ہاتھ میں سانپ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے وہ ایک شرمیلی خاتون تھیں۔ لیکن مجرمین کو سزا دینے کے لیے وہ سانپ بن جاتی تھیں۔ یہ اسٹیچو پورا ایک ہی پتھر کا ہے۔ اس کو اتنی مہارت سے بنایا گیا ہے کہ وہ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔

ایک بڑی عمارت کے سامنے لکھا ہوا تھا سینٹ جان کی سیمنری (St. John's Seminary) اس کے اندر کچھ نوجوان پڑھتے ہوئے نظر آئے۔ سیمنری اس عیسائی مدرسہ کو کہا جاتا ہے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کا خالص مقصد یہ ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ فادر اور

عہدے دار تیار کیے جائیں جو چرچ کے نظام کو سنبھال سکیں۔

سردھنہ کا یہ مسیحی مرکز (کیتھولک مشن) تقریباً ۶۵ ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ کتابچہ میں بتایا گیا تھا کہ بیگم سمرو کے انتقال کے بعد ان کی اسٹیٹ حکومت برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ مگر مذکورہ ۶۵ ایکڑ کا علاقہ بیگم کی ذاتی ملکیت تھا، چنانچہ وہ محفوظ رہا۔ اس کے بعد وہ مختلف مراحل سے گزرا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۷ میں آگرہ کے آرچ بشپ نے اس کو ۲۵ ہزار روپے میں خرید لیا۔

سردھنہ کے اس مسیحی مشن کا آرکیٹکٹ ایک اطالوی میجر اینتھونی (Major Anthony Reghelini) تھا۔ وہ یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ اس کا رہائشی مکان اب بھی یہاں موجود ہے جو اینتھونی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد، اب یہ عمارت بچوں کے اسکول کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ کیتھولک مشن کی طرف سے مجھ کو جو تعارفی کتاب دی گئی اس کا نام تھا:

Sardhana: its Begum, its Shrine, its Basilica

۸۰ صفحہ کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھ کو سب سے زیادہ جس بات پر حیرت ہوئی وہ یہ کہ اس مشن کی تاریخ دو سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں اس کے ساتھ طرح طرح کے نشیب و فراز پیش آئے۔ ملک کے سیاسی حالات میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ سردھنہ اور آگرہ سے لے کر اٹلی اور فرانس تک کے مختلف لوگ اس سے وابستہ رہے۔ حتیٰ کہ خود بیگم سمرو کو خودکشی کا اقدام کرنا پڑا، اگرچہ وہ بچ گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

طرح طرح کے اونچ نیچ پیش آنے کے باوجود ادارہ نہ ٹوٹا اور نہ تقسیم ہوا۔ اور نہ اپنے مقصد کے اعتبار سے اس میں کوئی خلل واقع ہوا۔ وہ بدستور ترقی کے راستہ پر چلا جا رہا ہے۔

یہی ساری دنیا کے ہزاروں مسیحی اداروں کا حال ہے۔ میں نے خود کئی ایسے ادارے دیکھے ہیں جو سیکڑوں سال سے پر سکون طور پر چلے جا رہے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو اس طرح تسلسل کے ساتھ چلا جا رہا ہو۔

یہ فرق روایات کی وجہ سے ہے۔ مسیحی قوموں میں روایات کا انتہائی احترام پایا جاتا ہے۔ کسی روایت کو توڑنے والے ہمیشہ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر مسیحی لوگوں کی اطاعت کیتنی کا

یہ حال ہے کہ ان کا کوئی بڑا آدمی کبھی کسی روایت کو نہیں توڑتا۔ وہ اپنے آپ کو روایت کے تابع رکھتا ہے، نہ کہ روایت کو اپنا تابع بنانے لگے۔ اور تاریخ کا تجربہ ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ روایات کے تحت چلتا ہے۔ جس سماج میں روایات توڑ دی جائیں وہاں کوئی قانون یا کوئی حکومتی اقتدار اس کا بدل نہیں بن سکتا۔

پیغمبر اسلامؐ کے لائے ہوئے انقلاب میں اس حقیقت کا کامل شعور پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو احیاء اسلام، صفحہ ۶۰ - ۶۳) مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کو اس کا مطلق شعور نہ تھا۔ چنانچہ ہر مسلم لیڈر جوش جہاد میں روایتوں کو توڑتا رہا۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب عالم گیر نے انتہائی بے دردی کے ساتھ اپنے زمانہ کی تمام قیمتی روایات کو توڑ ڈالا۔ اس وقت سے آج تک مسلمان ایک ایسی قوم بنے ہوئے ہیں جن کے درمیان کوئی روایت ہی نہ ہو۔ جب کہ روایت کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اس کو توڑنا آسان ہے۔ لیکن دوبارہ روایت قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ایک پوری تاریخ کا عمل درکار ہوتا ہے :

It requires a lot of history to make a little tradition.

میں نے معلوم کیا کہ سردھنہ میں کیا ان لوگوں کی کوشش سے کچھ مسلمانوں نے عیسائیت قبول کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں صرف ایک خاندان ہے جس کے چھ افراد عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کے سوا کسی اور مسلمان نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا۔

یہی صورت حال ساری دنیا میں ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے بڑے پیمانہ پر اپنا تبلیغی عمل جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرلے۔ دوسری طرف دیگر مذاہب کے لوگ ساری دنیا میں ہر روز بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اسلام دین محفوظ ہونے کی وجہ سے فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب نے تحریف کی بنا پر فطرت سے اپنی مطابقت کھو دی ہے۔

سردھنہ میں، میرے خیال سے زیادہ بڑی کمی تعلیم کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر اسکول یا مدرسہ نہیں۔ تاہم مولانا محمد رضوان قاسمی تعلیم کے میدان میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی کوششوں سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا ہے۔ اور اس کو اعلیٰ معیار پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ ادارہ ترقی کرے گا۔ اور وہ سردھنہ کے مسلمانوں کی اس کمی کو پورا کرنے کا باعث بنے گا۔

میں نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ سردھنہ میں ایک لائبریری بنائیں۔ لائبریری صرف کتابوں کا ایک کمرہ نہیں، وہ دراصل لوگوں کو باشعور بنانے کی ایک خاموش تحریک ہے۔ اور اس کو ہر بستی اور ہر مقام پر ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں لائبریریوں کا عام رواج تھا۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی قائم کی ہوئی لائبریریوں میں بسا اوقات ایک لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں ہوتی تھیں۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ جن کتابوں کے ذریعہ ظہور میں آئی، اس کا بڑا حصہ مسلم کتب خانوں میں جمع شدہ عربی کتابوں سے حاصل ہوا تھا جن کو لے کر یورپی زبان میں ان کا ترجمہ کیا گیا (۱۵/۶۴۶)

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم اور کتب خانوں کا یہ بڑھا ہوا ذوق پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ تم علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے کچھ قیدیوں کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ان میں کا جو شخص مخصوص تعداد میں بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے تو وہ رہا کر دیا جائے گا (۱۵/۶۴۵)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا کوئی ایک سبب بتانا ہو تو یقیناً وہی تعلیمی پچھڑاپن ہوگا۔

چرچ سے واپسی کے بعد کچھ دیر جناب عمران الزماں صاحب کے مکان پر ٹھہرے۔ انھوں نے چائے کے ساتھ ایک پورا دستر خوان بچھا دیا تھا جس پر کھانے کی مختلف چیزیں موجود تھیں۔ میں نے کہا کہ بھائی، میں ان مولویوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے سفرناموں میں لکھتے ہیں کہ "پر تکلف کھانے کا انتظام تھا، ڈٹ کر کھایا" میرا اصول اس کے برعکس یہ ہے: کم کھانا، اور سادہ زندگی گزارنا۔

باہر خوانچہ والا آواز لگا رہا تھا: چیکو میٹھے، چیکو میٹھے۔ میں نے کہا کہ چیکو میٹھے ہی ہوتے ہیں۔ پھر وہ بار بار میٹھا کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ دراصل اس کے جوش تجارت کی بنا پر ہے۔ اس کو صرف چیکو کہہ کر اطمینان نہیں ہوا۔ اس لیے اس نے اس میں مزید الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ یہ گویا عملِ مزید ہے۔ اور اس کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ لوگوں کے اندر حقیقی تڑپ ہو تو دین میں بھی اس عملِ مزید کے مظاہر دکھائی دینے لگیں گے۔

الرسالہ کے ایک قاری سے میں نے پوچھا کہ آپ کو اس سے کتنا اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا کہ ۹۰ فی صد۔ میں نے پوچھا کہ بقیہ ۱۰ فی صد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی تلقین کرتے ہیں، اور اس سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ صبر و اعراض تو خالص قرآنی تعلیم ہے، پھر کیا آپ کو قرآن سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن سے کس مسلمان کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے قرآن کے نظریۂ صبر سے نہیں بلکہ الرسالہ کے نظریۂ صبر سے اختلاف ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں کا فرق مثال کے ذریعہ بتائیے۔ مگر وہ کوئی فرق نہ بتا سکے۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر صبر و اعراض کی بات کو قبول نہیں کر پاتے۔ ان کو ٹکراؤ والا عمل تو معلوم ہے مگر انھیں صبر والا عمل معلوم نہیں۔ وہ ٹکراؤ کو عمل سمجھتے ہیں اور صبر کو بے عملی۔ اب چونکہ ان کے اندر قرآن سے اختلاف کی جرأت نہیں، اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں قرآن والے صبر سے نہیں بلکہ الرسالہ والے صبر سے اختلاف ہے۔ اس معاملہ میں ان کی غیر سنجیدگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان سے جب دونوں کا فرق پوچھا جائے تو وہ فرق بتانے سے عاجز ثابت ہوتے ہیں۔

دوسری بات میں نے یہ کہی کہ صبر کوئی الرسالہ کی بات نہیں، وہ فطرت کا قانون ہے۔ صبر اس دنیا میں جینے کی قیمت ہے۔ اس لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ صبر کرنا ہے یا نہیں۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آپ کو یہاں جینا ہے یا نہیں جینا ہے۔ اگر صبر نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ اس لیے یہ نہ کہیے کہ ہمیں صبر نہیں کرنا ہے، بلکہ یہ کہیے کہ ہمیں جینا نہیں ہے، ہم کو تو صرف برباد ہونا ہے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے اپنا ایک تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ "چند سال پیشتر آپ کے خلاف فکر کی غلطی نامی کتاب چھپی تھی ۔ وہ میری نظر سے گزری ۔ پڑھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ مصنف نے آپ کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے مشترک بنیادی فکر کی نشان دہی کی ہوگی۔ پھر اس بنیادی فکر کو قرآن وحدیث کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی ہوگی ۔ لیکن کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف خود تبصرہ وتنقید کے اصول سے ناواقف ہیں ۔ اپنی کتاب میں تبصرہ وتنقید کا جو انداز انھوں نے اختیار کیا ہے ، اس کی غلطی اسی سے ثابت ہے کہ اگر اس کو تبصرہ کا معیار مان لیا جائے تو حدیث کی تمام کتابوں پر بھی بعینہ یہی تبصرہ صادق آئے گا جو انھوں نے فکر وحید پر چسپاں کیا ہے ۔ مثلاً انھوں نے تعارض کی مثال دی ہے ۔ جب کہ حدیث کے اندر بھی بظاہر اسی قسم کے تعارضات موجود ہیں ۔ حالاں کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے کہ حدیث میں تعارض کا دعویٰ کیا جائے ۔ تبصرہ نگار نے ایک اور بڑی غلطی یہ کی ہے کہ ایک جزئی اور وقتی حالات سے متاثر کیفیت کو قاعدۂ کلیہ مان کر نتیجہ اخذ کیا ہے "۔

قرآن میں ہے کہ ـــــ اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کی خبر پاتا ہے تو وہ اس کو مذاق بنالیتا ہے (و اذا علم من آیاتنا شیئا اتخذ ھا ھزوا) الجاثیہ ۹

یہاں یہ سوال ہے کہ قرآن تو مکمل طور پر ایک برحق کتاب ہے ۔ پھر کوئی شخص قرآن میں کس طرح ایسی شئ (چیز) پالیتا ہے جس کا وہ مذاق اڑا سکے ۔ جواب یہ ہے کہ قابل استہزاء شے کتاب میں نہیں ہوتی بلکہ غیر سنجیدہ آدمی کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے ۔ کسی بھی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے ۔ آدمی کے اندر سنجیدگی نہ ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی الٹی بات نکال کر اس کا مذاق اڑانے لگے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہدایت یابی کے لیے تقویٰ کو ضروری قرار دیا گیا ہے ۔

مولانا محمد عرفان قاسمی پابندی کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا : "صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو دین کی بے آمیز دعوت پر اٹھائی جائے ۔ اور الرسالہ کو میں اسی معیار پر پاتا ہوں ۔ میرا احساس ہے کہ الرسالہ جو حقیقت پسندی اور جو گہری نظر پیدا کرنا چاہتا ہے ، آج اسی کی ضرورت ہے ۔ اگر آدمی کے اندر یہ صفات پیدا نہ ہوں

تو اس دنیا میں وہ آخرت کی کمائی کرنے والا نہیں بن سکتا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الرسالہ لٹریچر ہی عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہے اور الرسالہ بلاشبہ عصر حاضر میں اسلامی تجدید کا کام انجام دے رہا ہے۔"

سردھنہ میں نوابوں کا ایک خاندان ہے۔ ہندستان میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے بعد انھیں بہت نوازا۔ ان نوازشوں کا فائدہ اب تک انھیں مل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارے رہنما دو سو سال سے بتا رہے ہیں کہ انگریز ایک مسلم دشمن اور اسلام دشمن قوم ہے۔ اور اس کے ثبوت میں بتاتے ہیں کہ اس نے ہزاروں مسلمانوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مگر تُعرفُ الاشیاءُ باضدادھا کے اصول پر سوچنا چاہیے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی انگریز سردھنہ میں (نیز دوسرے علاقوں میں) مسلمانوں کے ساتھ نوازش کا معاملہ کر رہے ہیں۔

اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اصل معاملہ مسلم دشمنی کا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے دشمنی کا ہے جو مفاد کے راستہ میں حائل ہو۔ دوسرے تمام لوگوں کی طرح، انگریز اپنے دشمن کا دشمن اور اپنے دوست کا دوست ہے۔ جس مسلمان کو اس نے اپنا مخالف پایا اس کو اس نے اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور جس مسلمان نے اس سے موافقت کی اس پر اس نے نوازشیں کیں۔

دہلی واپس آنے کے بعد ۱۳ اپریل ۱۹۹۶ کو میں نے سردھنہ کے نواب صاحبان کا قصہ عطاء اللہ صاحب (بنگلور) کو بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا ہی واقعہ ہماری ریاست کرناٹک میں ہوا ہے۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے کافی کے باغات ہیں۔ ان کے مالک پہلے انگریز تھے۔ جب وہ اپنے ملک واپس جانے لگے تو انھوں نے بالقصد اپنے باغات مسلمانوں کو دیے۔ ہندو زیادہ قیمت دینے کے لیے تیار تھے، مگر انھوں نے کم قیمت پر اسے مسلمانوں کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس کا سبب بھی یہی ہے کہ جنوب کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اس نوعیت کا باغیانہ سلوک نہیں کیا جو شمال کے مسلمانوں نے کیا۔ اس لیے انھوں نے جنوب

کے مسلمانوں کو نوازا اور شمال کے مسلمانوں کو انھوں نے سزائیں دیں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو قومیں مسلمانوں کے اوپر غالب آئیں یا آج غالب ہیں، ان سب کے بارہ میں ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ سو سال سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اسلام دشمن لوگ ہیں اور سازش کے تحت انھوں نے غلبہ حاصل کیا ہے۔ مگر یہ تصور لغویت کی حد تک غلط ہے۔

خدا کی اس دنیا میں کوئی گروہ محض دشمنی اور سازش کے ذریعہ سے کسی کے اوپر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ غلبہ کے لیے خدا کا قانون واضح ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس گروہ میں انسانی اوصاف زیادہ ہوں گے وہی گروہ یہاں غلبہ اور اقتدار حاصل کرے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب قوموں کے اندر انسانی اوصاف مسلم قوموں سے زیادہ تھے، اسی لیے وہ ان کے اوپر غالب آئے۔ اس کا ایک سادہ ثبوت یہ ہے کہ جن ملکوں کو مسلم قائدین اپنے اعلان کے مطابق، دشمن اسلام قرار دیے ہوئے ہیں، خود ان کے بیٹے اور پوتے پہلی فرصت میں بھاگ کر انھیں ملکوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں سٹل ہو سکیں۔

سردھنہ میں مجھے ایک مسلمان کے گھر میں دعا کے لیے لے جایا گیا۔ صاحب خانہ حال میں چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اب گھر میں ان کی بیوہ اور تین چھوٹے بچے ہیں۔ مرحوم نے اپنے بعد جائداد اور مکان وغیرہ چھوڑا ہے۔ اب کچھ لوگ ظالمانہ طور پر ان جائدادوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بیوہ کے اوپر فرضی مقدمات قائم کیے ہیں اور طرح طرح سے ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ حتی کہ بیوہ کے وکیل صاحب گھبرا کر یہ کہنے لگے ہیں کہ تم دوسرا وکیل کر لو۔ کیوں کہ وہ لوگ میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے ہر روز ہندو ظلم پر لکھتے اور بولتے ہیں۔ لیکن اگر مسلم آبادیوں کا جائزہ لیا جائے تو برعکس طور پر معلوم ہوگا کہ ہندو کا ظلم مسلمان پر اگر ایک فیصد کے درجہ میں ہے تو مسلمان کا ظلم مسلمان پر ۹۹ فی صد کے درجہ میں ہے۔

سردھنہ کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں مجھے دوسرے قصبوں کے مقابلہ میں زیادہ صفائی نظر آئی۔ صفائی کا وہ معیار جو یورپ کے قصبات میں پایا جاتا ہے، اس سے

اگرچہ سردھنہ ابھی بہت دور ہے۔ تاہم ہندستان کے دوسرے قصبات کے مقابلہ میں ضرور وہ زیادہ صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر شمالی ہند کے قصبات کے مقابلہ میں۔

ایک مجلس میں مختلف سوالات ہوئے۔ ان کا تعلق اسلام سے بھی تھا اور مسلمانوں سے بھی۔ چند سوال وجواب یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جناب نبیل الرحمٰن صاحب پرنسپل انٹر کالج کی ایک تحریر مجھے دستی طور پر ملی۔ اس میں موصوف نے لکھا تھا :

"عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کے مضامین اخبار و الرسالہ وغیرہ میں پڑھے لیکن میں ان سے پوری طرح متفق نہیں تھا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کو سردھنہ تشریف لائے۔ عشار بعد اور جمعہ بعد دونوں تقریر آپ کی سنی الحمدللہ بہت پسند آئیں سب خدشات دور ہو گئے۔

میری صاجزادی میڈیکل لائن اختیار کرنا چاہتی تھی میں اس بارے میں مذبذب تھا۔ کسی محقق عالم دین کی جو دور جدید کے تقاضوں سے بھی واقف ہو، تلاش میں تھا یہ اوصاف آپ کی شخصیت میں نظر آئے۔ آپ نے بچی کے متعلق تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ دعا کی بھی تاکید کی کہ بچی کے بارے میں دعا کرتے رہو۔ اس سے طبیعت میں جو ایک قسم کی کھٹک تھی وہ دور ہو گئی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے"

ایک سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں کے یہاں کھانا پینا مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ کھانے پینے کے معاملہ میں جو فرق ہے وہ مسلم دستر خوان اور غیر مسلم دستر خوان کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ خود کھانے اور پینے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جس چیز کو کھانا یا پینا جائز ہے وہ ہر جگہ جائز ہے۔ اور جس چیز کو کھانا یا پینا حرام ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں یہ قاعدہ بتایا جاتا ہے کہ عدد ہمیشہ خاص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور خاص لفظ کے معنی میں کمی یا زیادتی نہیں کی جا سکتی۔ پھر احادیث میں عدد کی تعیین کے ساتھ رسول اللہ ؐ کے جو ارشادات ہیں، مثلاً تین سانس میں پانی پینا، تو آیا اس سے تعیین مراد لیا جائے گا یا تیسیر۔

میں نے کہا کہ چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کمیاتی نوعیت کی، اور دوسرے کیفیاتی نوعیت

کی ۔کمیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا ذکر ہو تو وہ متعین صورت میں مراد ہو گا، جیسے کعبہ کا سات بار طواف ۔لیکن کیفیاتی نوعیت کی چیزوں میں عدد کا لفظ محض تفہیم کے لیے ہوتا ہے ۔مثلاً "ایمان کے ستر شعبے ہیں" کا مطلب متعین مفہوم میں ستر نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب سادہ طور پر کثرت سے ہے ۔کیوں کہ ایمانی کیفیات کے اظہار کی گنتی نہیں کی جا سکتی ۔

جہاں تک تین سانس میں پانی پینے کی بات ہے وہ تیسیر کے لیے ہے نہ کہ تحدید کے لیے ۔

ایک فاضلِ دیوبند نے یہ سوال کیا کہ حدیث میں تجدید دین کے بارے میں روایتیں آئی ہیں کہ ہر سو سال کے بعد ایک مجدد آئے گا وہ تجدید دین کرے گا، تو اس حساب سے اب تک ۱۴۰۰ مجدد ہونا چاہیے ۔حالاں کہ مجددوں کی فہرست کے اندر اتنے نام نہیں ہیں ۔پھر یہ کہ تجدید دین سے مراد ، جزء دین کی تجدید ہے یا کل دین کی ۔اگر کل دین کی تجدید مراد ہے ۔تو ایسا کوئی مجدد اب تک نظر نہیں آیا جس نے کل دین کی تجدید کی ہو ۔اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے لیکن تاریخ اسلام میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جس نے دعوت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ۔

میں نے کہا کہ حدیث میں "سو سال" کا لفظ اعتباری ہے ۔اس کی مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی ۔دوسری بات یہ کہ جزئی تجدید کی ضرورت حالات کی تبدیلی کے تحت پیش آتی ہے ۔کیوں کہ حالات ہمیشہ بار بار بدلتے رہتے ہیں ۔جہاں تک کلی تجدید کا تعلق ہے وہ دور کی تبدیلی پر آتی ہے ۔کلی تجدید کی ضرورت پہلی بار صرف موجودہ زمانہ میں پیش آئی ہے آج کا زمانہ ہر اعتبار سے ایک بدلا ہوا زمانہ ہے ، اس لیے وہ کلی تجدید دین کا تقاضا کرتا ہے ۔ماضی میں کلی تجدید کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔

ایک سوال یہ تھا کہ کبر میں اور جرأت مندی میں کیا فرق ہے ۔میں نے کہا کہ کبر کے پیچھے ذات کی برتری کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور جرأت مندی کے پیچھے حق کی برتری کا جذبہ ۔

ایک سوال یہ تھا کہ تواضع اور احساس کمتری میں کیا فرق ہے ۔میں نے کہا کہ تواضع کی کیفیت خدا کو بلند و برتر ماننے سے ابھرتی ہے ۔اور کمتری کا احساس انسان کو بلند و برتر سمجھنے سے ۔

ایک سوال یہ تھا کہ مصلحت پسندی میں اور مداہنت میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ مصلحت کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ اور مداہنت ہمیشہ ذاتی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

کون آدمی دینی مصلحت پر ہے اور کون آدمی ذاتی مداہنت پر، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جو آدمی دینی مصلحت کی بنا پر ایک طریقہ اختیار کرے، اس کی زندگی میں تضاد نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جو آدمی ذاتی مداہنت کی روش پر ہو، اس کی زندگی میں لازماً تضاد پیدا ہو جائے گا۔

مثلاً آپ ایک دولت مند ملک میں ہیں۔ وہاں آپ کو بہت بڑی تنخواہ مل رہی ہے اور آپ دفتر کے نظام میں حد درجہ موافقت کر کے رہتے ہیں۔ اب اگر آپ کی موافقت اصول کی بنا پر ہو تو اپنے گھر کے اندر بھی آپ اس نظام کی تعریف کریں گے جس طرح آپ دفتر میں کرتے ہیں۔ اور اگر آپ با اصول نہ ہوں تو آپ کا حال یہ ہوگا کہ دفتر کے اندر نظام کے حق میں اچھے الفاظ بولیں گے اور گھر کے اندر اس کے حق میں برے الفاظ۔ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ انسان بن کر رہ جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصلحتِ دینی ایک با اخلاص عمل ہے، اور مداہنت سرتاسر ایک منافقانہ عمل۔ ایک عمل سے انسان کی شخصیت بلند ہوتی ہے، جب کہ دوسرا عمل آدمی کی شخصیت کو کثیف بنا کر رکھ دیتا ہے۔

۱۲ اپریل کو جمعہ تھا۔ سردھنہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے، اندر سے باہر تک نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ موجودہ مسلمانوں سے جو سب سے بڑی چیز اٹھ گئی ہے وہ شکر خداوندی کا جذبہ ہے۔ چنانچہ ایک مسجد کے ساتھ کسی وجہ سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو ہر زبان اور ہر قلم اس کے پرجوش تذکرہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مگر اسی ملک میں لاکھوں مسجدیں شاندار طور پر آباد ہیں اور اس کے تذکرہ میں کوئی رطب اللسان نہیں۔

جمعہ کے بعد میری تقریر کا اعلان ہوا۔ بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں علم کی اہمیت بیان کی۔ میں نے کہا کہ قرآن میں پہلی آیت اقرأ (پڑھ) کا اترنا بتاتا ہے کہ علم سفرِ اسلام کا

آغاز ہے۔ اس سلسلے میں تاریخی مثالیں دیتے ہوئے بتایا تھا کہ علم سے مراد سند اور سرٹیفکٹ والا علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ علم ہے جو آدمی کو باشعور بنائے۔ جو مومن کو صاحب فراست انسان بنا دے۔ جو عسر میں یسر دیکھنے کی نظر پیدا کرے۔ جس کا یہ نتیجہ ہو کہ آدمی پہاڑوں کو دیکھ کر اس سے تقویٰ اور خشیت کی غذا لینے لگے۔

سفر کے آخر میں مولانا محمد عرفان قاسمی (استاذ حدیث) نے اپنا تاثر تحریری صورت میں لکھ کر دیا۔ یہ انھیں کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"اسلامی تاریخ میں بے شمار دُعاۃ و مبلغین پیدا ہوئے ہیں، لیکن صاحب الرسالہ اپنی نوعیت کے پہلے داعی ہیں جنھوں نے اسلام کے دعوتی پہلو کو نمایاں کیا ہے، موصوف نے دین کے اساسی اصول کو مرکز توجہ بنایا ہے، حق تعالیٰ نے آنجناب کو عصر حاضر میں تجدید دین و احیاء اسلام کے لیے مبعوث فرمایا۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں جہاں دین کے اندر غیر دین کی آمیزش ہو گئی تھی، وہیں احیاء اسلام کے لیے موافق اسباب بھی جمع ہو گئے تھے، حضرت مولانا نے نہ صرف دین کو بے آمیز بنایا بلکہ موافق اسباب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ، اس کو بھرپور استعمال کی کوشش کی، تاکہ فکر اسلامی کو دنیا کے اندر غالب فکر کا مقام عطا ہو سکے، سچ تو یہ ہے کہ دعوت دین کی تحریک کو جس پیغمبرانہ طریقہ پر چلایا، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علماءُ امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے آنجناب واحد حقیقی مصداق ہیں"

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کو جمعہ کی نماز اور تقریر کے بعد ایک صاحب کے مکان پر چائے کی نشست ہوئی۔ یہاں دوبارہ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

آج کے اخبار میں "ضلع میرٹھ" کا خبرنامہ چھپا ہوا تھا۔ اس میں قتل یا حادثاتی موت کے آٹھ واقعات درج تھے۔ کسی دیہات میں گھریلو جھگڑوں میں ایک آدمی نے دوسرے کو مار ڈالا۔ کہیں سڑک پر دو سواریوں کی ٹکر میں کوئی شخص ہلاک ہو گیا۔ وغیرہ۔ (قومی آواز ۱۲ اپریل ۱۹۹۶)

میں نے کہا کہ دیکھئے، میں دو دن سے میرٹھ کے علاقہ میں ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات میرے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ گویا کہ چار ملین آبادی کے ضلع میں یہ محض استثنائی واقعات ہیں نہ کہ عمومی واقعات۔ لیکن اگر میں میرٹھ سے دور ہوتا اور صرف اخبار ہی میرے لیے میرٹھ ضلع کو جاننے کا ذریعہ

ہوتا تو یہی استثنائی واقعات میرے لیے کل واقعات بن جاتے۔ میں انھیں سے میرٹھ ضلع کی تصویر بناتا۔ پھر میں سمجھ لیتا کہ میرٹھ تو صرف قتل اور موت کا ایک علاقہ ہے۔

میں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں ہزار سال سے امن اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ سو سال پہلے جب یہاں اخبار کا دور آیا اسی وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کی مصنوعی تصویر دکھانے لگے۔ پچھلے زمانہ میں باہمی اختلاط ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ تھا، اب اخبارات ایک دوسرے کو جاننے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر سردھنہ میں دونوں فرقے باہم مل کر رہتے ہیں۔ مگر یہ بات اخبار میں نہیں چھپے گی۔ البتہ کبھی کسی ہندو اور کسی مسلمان میں لڑائی ہو جائے تو وہ فوراً اخبار میں چھپ جاتا ہے۔ اس قسم کی منفی رپورٹنگ دونوں طرف ہو رہی ہے۔ ہندی اخبار اس قسم کی ادھوری رپورٹنگ کے ذریعہ ہندوؤں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ اسی طرح اردو اخبار اسی قسم کی ناقص رپورٹنگ کے ذریعہ مسلمانوں کا ذہن بگاڑ رہے ہیں۔ یہی غیر فطری ذہن کبھی کسی اتفاقی سبب سے بھڑک اٹھتا ہے تو وہ فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہو کر دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ سردھنہ سے گزر کر ہماری گاڑی میرٹھ کے بازار میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں سرگرم طور پر مختلف تجارتوں میں مشغول ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مسلمان اس نظریہ کو رد کر رہے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ اسی طرح ہندو اس پروپگنڈے سے باہر نکل آئے ہیں کہ مسلمان ان کے لیے ایک غیر مطلوب فرقہ ہیں۔ اب دونوں از سر نو ایک دوسرے کو قبول کر رہے ہیں۔ مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ انڈیا ان کے لیے مواقع سے بھرا ہوا ایک ملک ہے۔ ایک عرصہ تک وہ نااہل لیڈروں اور بے بصیرت دانش وروں کے بہکاوے میں رہے۔ اب وہ اس فریب سے باہر آ گئے ہیں۔

اسی طرح ہندو جو بعض پروپگنڈوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو "بابر کی سنتان" کے روپ میں دیکھنے لگا تھا، اب وہ ان کو فرزندان وطن کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ ان کو ہندستان کی

متحدہ قومیت کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھ رہا ہے۔ وہ ان کو اپنے بھائی کے روپ میں دیکھ رہا ہے نہ کہ رقیب اور حریف کے روپ میں۔ یہ صورت حال جو آج ہر جگہ دکھائی دے رہی ہے وہ بلاشبہہ ایک صحت مند سماج کی علامت ہے، اور وہ یقینی طور پر ملک کے لیے ایک نئے اور بہتر مستقبل کی آمد کی خبر دے رہی ہے۔

ضلع میرٹھ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقی کے وافر مواقع موجود ہیں۔ مگر میرٹھ کو، خاص طور پر یہاں کے مسلمانوں کو جتنی ترقی کرنا چاہیے تھا، اتنی ترقی وہ نہ کر سکے۔ اس کا سبب غالباً یہاں کے لوگوں کا وہ مزاج ہے جو ۵۹-۱۸۵۷ کی بغاوت میں شرکت کے نتیجہ میں فطری طور پر بنا۔

میرٹھ سے آگے ایک نہر ہے جس کے اوپر پل بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ گنگا نہر ہے۔ ۱۹۸۷ کے فساد میں پچاس سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو گولی مار کر اس نہر میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کی ضروری تفصیل الرسالہ نومبر ۱۹۸۸، صفحہ ۳۴-۳۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جب گنگا نہر کے بہتے ہوئے پانی پر میری نگاہ پڑی تو میں نے سوچا کہ کیا یہ پانی نو سال پہلے ہونے والے واقعہ کی تفصیل بتائے گا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ وہ پانی اب یہاں کہاں ہے۔ وہ وہ تو بہہ کر سمندر میں جا چکا۔ پھر خیال آیا کہ وہ پانی اب سمندر میں بھی نہیں ہوگا۔ وہ بھاپ بن کر فضا میں چلا گیا ہوگا اور پھر بادل بن کر کہاں کہاں برسا ہوگا، اب کسی کو بھی یہ معلوم نہیں۔

مگر خدا کے علم میں یہ ساری باتیں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کی قدرت میں ہے کہ وہ حکم دے اور تمام چیزیں دوبارہ اکھٹا ہو کر پورے واقعہ کو ٹھیک اسی طرح سنا دیں جس طرح وہ ۲۳ مئی ۱۹۸۷ کو پیش آیا تھا۔ اس دن کون ظالم ثابت ہوگا اور کون مظلوم قرار دیا جائے گا، اس کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں۔

راستہ میں ہم مودی نگر سے گزرے۔ یہاں ایک شوگر مل ہے۔ اس کے پاس دور تک سڑک کے کنارے گنّا لانے والوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی، کسان اپنا اپنا گنا ٹریکٹر پر لاد کر یہاں لائے تھے اور اب اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

سب سے پہلے یہ منظر میں نے مشرقی یوپی میں شاہ گنج کی مل میں دیکھا تھا۔ اس وقت

کسان اپنا گنا بیل گاڑیوں پر لادکر لاتا تھا۔ اس کے بعد کرایہ کے ٹرک کے اوپر لدے ہوئے گنے سڑکوں پر دکھائی دینے لگے۔ اب کسان اپنا گنا اپنے ٹریکٹر پر لادکر لاتا ہے۔ یہ ملک میں کسان کی ترقی کا ایک علامتی واقعہ ہے۔ بیل گاڑی کے بعد کسان کرایہ کے ٹرک استعمال کرتے تھے، اب انھوں نے خود اپنے ٹریکٹر خرید لیے ہیں جو پیداوار حاصل کرنے کا کام بھی کرتا ہے اور فصل کو لادکر بازار بھی پہنچاتا ہے۔

مودی نگر پہلے میرٹھ ضلع کا ایک حصہ تھا۔ اب وہ انتظامی اعتبار سے غازی آباد میں شامل کردیا گیا ہے۔ یہاں ۲۷ اپریل کو ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ یوپی روڈویز کی ایک بس جو دہلی سے رڑکی جارہی تھی، وہ مودی نگر پہنچی تو اس کے اندر ایک بم پھٹا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن آدمی مر گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں گیارہ مہینہ کا ایک بچہ بھی شامل تھا۔ بم بس کے اگلے حصہ میں ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ باہر کی دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ہندستان ٹائمس (۲۹ اپریل) کے مطابق، کشمیر کے ایک عسکری گروہ اسلامی حرکت المومنین نے اس بم دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ (تباہ شدہ بس کی تصویر نیچے ملاحظہ فرمائیں)

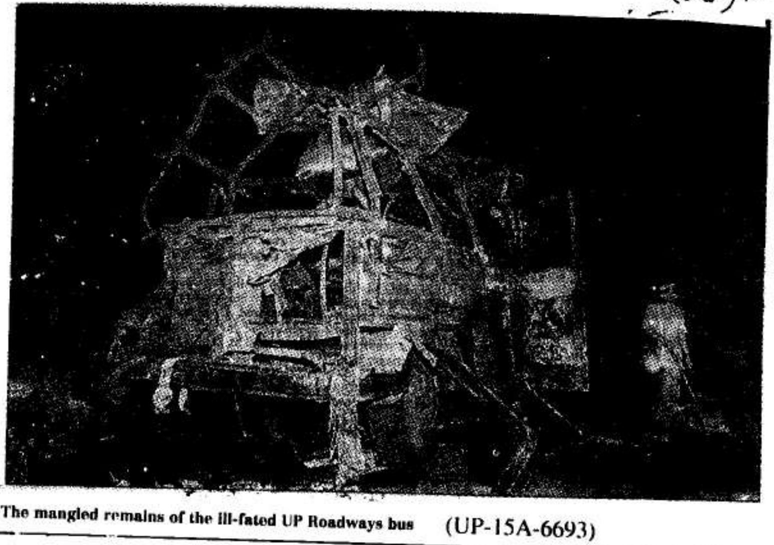

The mangled remains of the ill-fated UP Roadways bus (UP-15A-6693)

موجودہ زمانہ میں ناراض عناصر اس قسم کی وحشیانہ کارروائیاں ساری دنیا میں کررہے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہے کہ ان کا کوئی آدمی جب ایسا فعل کرتا ہے تو اس کا عمل جہاد قرار پاتا ہے۔ اور وہ خود مجاہد کا لقب پاکر اپنی قوم کے درمیان ہیرو بن جاتا ہے۔

راستہ میں ایک جگہ ریلوے کراسنگ تھی، کوئی ٹرین آرہی تھی، اس لیے دونوں طرف کے گیٹ بند کردیے گئے تھے۔ ہماری گاڑی کھڑی ہوگئی۔ میں نے اتر کر دیکھا تو دونوں طرف سڑک کے اوپر دور تک گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر کوئی کہے کہ صرف ایک ٹرین کو گزارنے کے لیے اتنی زیادہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ٹریفک کا یہ اصول بالکل غیر منصفانہ ہے تو یہ جملہ قواعد کے لحاظ سے درست مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوگا۔ کیوں کہ یہ کم تعداد اور زیادہ تعداد کا مسئلہ نہیں، یہ ترجیح اور تنظیم کا مسئلہ ہے۔ اور جہاں اس طرح کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کم ہے اور کون زیادہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ کو دیکھنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے، اور دوسرا غلط رخ۔ فرق کی اس حکمت کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کسی معاملہ میں ایک فیصلہ کرے گا۔ اپنی جگہ پر وہ سمجھے گا کہ میں درست ہوں۔ حالاں کہ وہ سراسر غلطی پر ہوگا۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہوگی کہ وہ معاملہ کو غلط رخ سے دیکھ رہا ہوگا۔

مثلاً آج کل دنیا بھر کے مسلم علماء اور دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر متحد ہوگئی ہیں۔ یہود و ہنود اور صہیونی طاقتیں اور صلیبی طاقتیں سب کی سب چاہتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹادیں۔

یہ نظریہ سراسر بے بنیاد ہے۔ پھر ایک بے بنیاد بات پر مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے کیوں اس طرح متفق ہوگئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک واقعہ کو وہ غلط رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا بھر میں غیر موافق حالات کا تجربہ پیش آرہا ہے۔ مگر اس معاملہ کا تعلق قانون فطرت سے ہے نہ کہ انسانوں کی مخالفانہ کارروائیوں سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کا نظام اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں انسانوں

کے درمیان مقابلہ ہو۔ یہاں ترقی کا عمل مقابلہ اور مسابقت کے ذریعہ جاری رہتا ہے۔ جو کبھی کبھی عداوت تک پہنچ جاتا ہے (بعضکم لبعض عدو) ہمارے علماء اور دانشوروں کی غلطی یہ ہے کہ جس واقعہ کو انھیں قانونِ فطرت کے رخ سے دیکھنا چاہیے تھا اس کو وہ انسانی سازش اور انسانی عداوت کے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ معاملہ کو قانون فطرت کے رخ سے دیکھتے تو موجودہ صورت حال کو ایک چیلنج سمجھ کر اس کے حل کی تدبیر ڈھونڈتے۔ مگر جب انھوں نے اس کو انسانی سازش کی نظر سے دیکھا تو ان کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ مفروضہ دشمنوں کی سازش اور عداوت کا انکشاف کریں اور سمجھیں کہ ہم ایک کام کر رہے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو ہم سے بھی زیادہ سازش اور مخالفت کا سامنا پیش آیا۔ مگر وہ تمام سازشوں اور مخالفتوں کو عبور کرکے آگے بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ شعوری اور کرداری طاقت کا ہے۔ وہ لوگ شعور اور کردار میں طاقت ور تھے اس لیے کوئی سازش انھیں نقصان نہ پہنچا سکی۔ موجودہ مسلمان شعور اور کردار کے اعتبار سے بے جان ہو چکے ہیں اس لیے وہ بآسانی ہر سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب میں دہلی واپس آرہا تھا تو میں نے سوچا کہ سردھنہ کے سفر سے مجھ کو کیا ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سردھنہ کے دو روزہ قیام کے دوران میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا وہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ بظاہر اس غیر اہم مقام پر بہت سی ایسی باتیں میرے علم میں آئیں جو اس سفر سے پہلے مجھے معلوم نہ تھیں۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے "معلوم" ہی کو وہ سب کچھ سمجھ لے۔ عین ممکن ہے کہ یہاں اور بھی بہت سے باتیں ہوں جو آدمی کے لیے ابھی تک لامعلوم ہوں، حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے اسی دنیا میں وہ پوری طرح موجود ہوں۔

یہ بات انسان کے لیے بھی ہے اور دوسری چیزوں کے لیے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے سلسلہ میں ہمیشہ حسن ظن کی تاکید کی گئی ہے۔ حسن ظن آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ کسی کے بارہ میں ایسی رائے قائم کرلے جو بطور واقعہ درست نہ ہو (الحجرات ۶)

یہی معاملہ دوسری چیزوں کا ہے۔ آدمی سفر میں نئے نئے مقامات دیکھتا ہے اور

نئی نئی باتیں سیکھتا ہے ۔ اسی لیے سیاحت کو قرآن میں مومن کی ایک صفت بتایا گیا ہے ۔ امام رازی نے سائحون اور سیاحت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے : السائحون فی الارض لطلب العلم ۔ السیاحۃ ھی الذھاب فی المدن للعظۃ والاعتبار ۔ اگر آدمی کے اندر توسم (الحجر ۷۵) کی صفت موجود ہو تو ہر سفر اس کے لیے ایک عظیم درس عبرت بن جائے گا ۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو مغرب کے وقت میں دہلی واپس آگیا ۔ زندگی پوری کی پوری اسی قسم کا ایک وسیع تر سفر ہے ۔ آدمی اپنی قیام گاہ سے نکل کر کہیں جاتا ہے اور دوبارہ اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا ہے ۔ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا ، یہاں تک کہ انسان اپنی آخری منزل ، آخرت تک پہنچ جائے ۔

جب میں دہلی پہنچا تو کل کے دن مکان کے جس گیٹ سے نکل کر میں گاڑی میں بیٹھا تھا ، آج گاڑی سے نکل کر دوبارہ اسی گیٹ کے اندر داخل ہو گیا ۔ اس وقت مجھے یہ دعا یاد آئی :

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل ۸۰)

کچھ سیاسی ذوق رکھنے والوں نے لفظی مشابہت کی بنا پر یہاں سلطان کو سیاسی اقتدار کے معنی میں لے لیا ہے ۔ یہ اس کی معنویت کو غارت کرنا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں سلطان سے مراد نصرتِ لدنی یا نصرتِ الٰہی ہے ، جیسا کہ دوسرے مقام پر حضرت موسیٰ کے لیے فرمایا : سنشد عضدک باخیک ونجعل لکما سلطانا فلا یصلون الیکما (القصص ۳۵) یہ مدد کی وہ قسم ہے جو خصوصی طور پر داعیٔ حق کو ملتی ہے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے ۔

اس دعا کا تعلق مُدخل اور مُخرج دونوں سے ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ، نکلنے میں بھی تو میری مدد فرما اور داخل ہونے میں بھی تو میری مدد فرما ۔ ہر وقت اور ہر لمحہ کے لیے تو میرا طاقت ور مددگار بن جانا ۔

پونہ کا سفر

پونہ کے ایک بڑے سائنسی ادارہ ایم آئی ٹی کے زیر انتظام پونہ میں ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی جو ۲۴ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۹۶ تک جاری رہی۔ اس کانفرنس کا نام ورلڈ فلاسفر میٹ تھا۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے پونہ کا سفر کیا۔ ذیل میں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی سے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز مکمل طور پر بھرا ہوا تھا جب کہ ہر دن بہت سے لوگ ٹرینوں اور بسوں کے ذریعہ بھی دہلی سے پونہ کا سفر کرتے ہیں۔ جدید وسائل سفر سے پہلے دہلی اور پونہ کے درمیان روزانہ ایک آدمی کے سفر کا اوسط بھی نہیں ہوگا مگر آج دونوں شہروں کے درمیان ہزاروں آدمی روزانہ آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ یہ صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ صنعتی انقلاب نے زندگی کے نقشہ میں جو تبدیلیاں کی ہیں اس کا ایک پہلو انسانی اختلاط میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ اس طرح جدید دور نے دعوت کے امکانات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ مگر جن لوگوں کو ان جدید دعوتی مواقع کو استعمال کرنا تھا وہ ان سے باخبر ہی نہ ہو سکے، پھر وہ ان کو استعمال کس طرح کرتے۔

دو گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترا وہاں کانفرنس کے نمائندوں کے علاوہ حلقۂ الرسالہ کے افراد بھی موجود تھے۔ ایرپورٹ پر کچھ وقت گزارنے کے بعد ہمارا قافلہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں میرا قیام اسپیش پلازہ (روم ۴۰۷) میں تھا۔ یہ ہوٹل تاریخی فرگوسن کالج کے عین سامنے واقع ہے اور نہایت صاف ستھرا ہے۔ ہوٹل کا عملہ بھی مستعد نظر آیا۔

پونہ کی یہ فلسفیانہ کانفرنس مہاراشٹر کے ایک قدیم فلسفی شاعر جنانیشور (۱۲۹۶-۱۲۷۴) کے نام پر کی گئی تھی۔ دوسری کتابوں کے علاوہ انھوں نے گیتا کی ایک شرح مراٹھی زبان میں لکھی تھی جس کا ترجمہ یونیسکو کی طرف سے انگلش، فرنچ، اسپینش میں کیا جا رہا ہے۔ یہ بات کانفرنس میں بتائی گئی۔

۲۴ نومبر کو کانفرنس کے افتتاح کا دن تھا۔ ایک وسیع پنڈال میں دلائی لامہ نے اس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ لوگ اپنے کٹرپن کو ختم کریں اور مل جل کر امن کے ساتھ زندگی گزاریں۔

چند دوسری شخصیتوں کے علاوہ میری بھی ایک تقریر اس افتتاحی پروگرام میں رکھی گئی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد ہندستان مطلوب ترقی حاصل نہ کر سکا اس کی واحد وجہ کردار کی کمی ہے۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ملک کے اندر کردار سازی کی مہم چلائی جائے۔ کوئی بھی دوسری ترقی کردار کا بدل نہیں بن سکتی۔

کانفرنس کے آغاز میں اسکول کے بچے اپنے مخصوص یونیفارم میں قطار در قطار اسٹیج کے سامنے سے گزرے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں تمام دنیا کے ملکوں کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور عالمی اتحاد کے گیت گا رہے تھے۔ یہ ایک دلکش منظر تھا میں نے سوچا کہ گیت اور جھنڈے کی سطح پر عالمی اتحاد کا مظاہرہ کتنا آسان ہے۔ اس کے مقابلہ میں حقیقی زندگی کی سطح پر عالمی اتحاد حاصل کرنا کتنا زیادہ مشکل۔

یہ کانفرنس ۲۴ نومبر سے لے کر ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ تک جاری رہی۔ ہر روز مختلف مذاہب اور مختلف فلسفیانہ اسکول پر الگ الگ اجلاس ہوتے رہے۔ اس کانفرنس میں تقریباً ایک ہزار ڈیلی گیٹ شریک تھے جس میں ہندستان کے علاوہ بیرونی ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تمام ڈیلی گیٹ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

میں اپنے ذوق کے مطابق روزانہ کسی ایک اجلاس میں شریک ہوتا رہا۔ چند مواقع پر مختصر طور پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں سے انفرادی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح انفرادی گفتگو کی صورت میں مختلف ملکوں، مختلف مذاہب اور مختلف فلسفیانہ اسکول کے لوگوں سے تبادلۂ خیال جاری رہا۔

۲۵ نومبر کو ایک پورا سیشن اسلام کے موضوع پر رکھا گیا تھا۔ اس سیشن کا صدر مجھ کو بنایا گیا۔ مجھے اس سیشن میں تقریر کرنے کے لیے یہ موضوع دیا گیا تھا ـــــــ اسلام کا فلسفۂ امن : (The Philosophy of peace in Islam) اس سیشن میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہاں ہر مقرر کو بیس منٹ کا وقت دیا جاتا تھا۔ مگر ہر مقرر نے زیادہ وقت لے لیا۔ آخر میں یہ ہوا کہ ایک خاتون جو پروگرام کو کنڈکٹ کر رہی تھیں انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب آپ کے لیے صرف دو منٹ باقی ہیں۔ میں نے کسی ناراضگی کے بغیر دو منٹ میں اپنی بات ختم کر دی۔ میں نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی

فوراً کانفرنس کے ذمہ داران (ڈاکٹر بار لنگے، پروفیسر کرارڈ وغیرہ) اسٹیج کے پاس آگئے۔ اور کہنے لگے کہ اتنا مختصر کیوں۔ ہم تو آپ کی تقریر تفصیل کے ساتھ سننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب یہ خاتون دیں گی۔ خاتون نے بتایا کہ مجھے سیشن کو مقرر وقت پر ختم کرنا تھا اور دوسرے مقررین کی لمبی تقریروں کی وجہ سے مزید وقت باقی نہیں تھا۔

اس سیشن کے فوراً بعد دوسرا سیشن تھا جو جین دھرم کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ منتظمین نے فوری طور پر پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے مجھے اگلے سیشن میں بولنے کا موقع دیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ دوبارہ تیس منٹ تک اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ چنانچہ میں نے اس کے فوراً بعد اپنے مقرر موضوع اسلام میں فلسفۂ امن پر اپنی تقریر شروع کی۔ اس تبدیلی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حاضرین کی تعداد کافی بڑھ گئی، کیوں کہ جین مذہب کو سننے کے لیے مزید کافی لوگ وہاں آگئے تھے۔

اس کانفرنس میں بیرونی ملکوں (یورپ، امریکہ وغیرہ) کے لوگ بھی موجود تھے چنانچہ اس کی تمام کارروائی مکمل طور پر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی تقریر انگریزی میں کی۔ آخر میں پہنچ کر جب میں نے کہا کہ :

In the end, I would like to add

فوراً پروفیسر کرارڈ جو کہ کانفرنس کے منتظم اعلیٰ تھے اٹھ کر میرے پاس آئے اور کہا کہ دس منٹ اور، چنانچہ میں مزید دس منٹ تک بولا۔ اس طرح میری تقریر چالیس منٹ تک جاری رہی۔

پروگرام کے بعد کئی دن تک لوگ مجھ سے ملتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ آپ کی تقریر بہت پسند آئی۔ اس میں بہت زیادہ وضوح (clarity) تھا۔ آپ کی ہر بات دل میں اترتی جا رہی تھی۔ ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ آپ ہی کی تقریر پورے کانفرنس کا حاصل تھی۔ پروفیسر کرارڈ نے کئی بار لوگوں کے سامنے کہا "مولانا صاحب کی آواز میں اللہ بولتا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کئی بار کہا کہ مجھے آپ کی آواز بہت پسند ہے۔ مجھے آپ کی آواز میں کیسٹ چاہیے۔

ایک ڈیلی گیرٹ نے اپنی پوری تقریر میں مذاہب کے اتحاد پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اور سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں :

All religions are true and equal

میں نے کانفرنس کے بعض افراد سے گفت گو کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بظاہر خوب صورت معلوم ہوتی ہے مگر اس کی کوئی عملی معنویت نہیں۔ دوسرے تمام معاملات میں سچائی صرف ایک ہوتی ہے۔ پھر مذہب کے معاملہ میں ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ ہر چیز سچی ہو جائے۔ صداقت بلاشبہہ ایک ہے۔ البتہ سماجی زندگی کے نظام کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے ہر ایک کو دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

ایک صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ ویدوں کا یہ کہنا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اہل دانش اس کو مختلف طریقہ سے بیان کرتے ہیں:

Truth is One; Wise speak of it in many ways.

یہ بات عام طور پر اس طرح دہرائی جاتی ہے جیسے کہ وہ سائنٹفک فیکٹ کی طرح کوئی ثابت شدہ چیز ہو۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دو سوالات بہت بنیادی ہیں جن کا جواب ابھی نہیں دیا گیا ہے۔

۱۔ کہنے والے کا استناد (authenticity) کیا ہے۔

۲۔ جب کہنے والا آج زندہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کے نام سے صرف کچھ کتابیں موجود ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کتابوں کی تاریخی اعتباریت (historical credibility) کیا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک ان دونوں سوالوں کا کوئی معتبر جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اور جب تک ان دونوں سوالوں کا معتبر جواب نہ دیا جائے مذکورہ بیان کی صداقت غیر ثابت شدہ رہے گی۔

یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک سادھو تھے۔ گفت گو کے دوران انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا: یہ دونوں آنکھیں تو کیمرہ ہیں باہر دیکھنے کے لیے۔ بھیتر کو تو آنکھیں بند کرکے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ بات مجھے پسند آئی۔ یہ صحیح ہے کہ آنکھیں صرف بیرونی چیزوں ہی کو دیکھ پاتی ہیں۔ اندر چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھنے کے لیے بصیرت درکار ہے نہ کہ صرف بصارت۔ تاہم یہ بات مطلق معنوں میں صحیح نہیں۔ کیوں کہ آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزوں کی حیثیت ڈاٹا (data) کی ہے۔ آنکھیں گویا باہر سے

ڈاٹا اکٹھا کر کے اندرونی بصیرت کو فراہم کرتی ہیں پھر بصیرت اس جمع شدہ ذخیرۂ معلومات کی مدد سے گہرے نتائج تک پہنچتی ہے۔ اگر آنکھ کا مشاہداتی عمل رک جائے تو اندرونی بصیرت کا عمل ختم تو نہ ہوگا البتہ بہت زیادہ محدود ہو جائے گا۔

اس کانفرنس میں بہت بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو شریک تھے۔ کئی ہندوؤں نے اپنے مخصوص ذوق کے مطابق یہ بات کہی کہ سب دھرم ایک ہیں۔ لوگ ناحق مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مذہبی اختلاف کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سب مذہب ایک ہیں۔ اس کا حقیقی حل یہ ہے کہ ٹالرنس پر زور دیا جائے۔ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے نہ صرف مذہب میں بلکہ ہر معاملہ میں اختلافات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں پرامن سوسائٹی بنانے کا راز یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدے کو مانتے ہوئے دوسرے کا احترام کریں۔ گویا کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

پونہ کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں سے ایک پٹنہ کے ڈاکٹر احسان اشرف (Tel. 368037) بھی تھے۔ ان کا مضمون فلسفہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اقبال کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ اقبال کو فلسفی کہنا بذاتِ خود درست نہیں۔ اگر آپ اقبال کی اس کتاب (The Reconstruction of religious thought in Islam) کی بنا پر ان کو فلسفی کہیں تو میں کہوں گا کہ وہ فلسفہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ علم کلام کی کتاب ہے۔ اور فلسفہ اور علم کلام میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اور اگر آپ اقبال کے اشعار کی بنا پر ان کو فلسفی کہیں تو یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے کیونکہ فلسفہ ایک انتہائی سنجیدہ نظامِ فکر کا نام ہے اور کسی سنجیدہ نظام فکر کو کبھی بھی درست طور پر شاعری کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

ان سے دو دن ملاقات ہوئی پہلے دن وہ اس موضوع پر دیر تک اختلافی بحث کرتے رہے مگر جب اگلے دن ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں آپ کی بات پر غور کرتا رہا اور آخر میں یہ سمجھ میں آیا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ اقبال کو فلسفی کہنے کے لیے سب سے پہلے خود فلسفہ کی تعریف کو بدلنا ہوگا۔

فلسفہ کیا ہے ؛ فلسفہ دراصل حقیقت کے عقلی اور منطقی مطالعہ کا نام ہے۔ فلسفی اور سائنسداں میں یہ فرق ہے کہ سائنس داں فطرت کے قانون کو اصولی طور پر بطور واقعہ تسلیم کر کے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلسفی کسی بھی چیز کو پیشگی طور پر واقعہ نہیں مانتا۔ وہ آزادانہ عقلی جستجو کے ذریعہ آخری حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے :

Philosophy is a logical and rational analysis of principles underlying the ultimate nature of the universe, and related fields.

کچھ لوگ اسلام کو ایک فلسفہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فلسفہ کے مشابہ علم نہیں ہے بلکہ سائنس کے مشابہ ایک علم ہے۔ اسلام میں حقیقت کا مطالعہ آزادانہ عقلی جستجو کے ذریعہ نہیں کیا جاتا جیسا کہ فلسفہ میں ہوتا ہے۔ بلکہ وحی کو مان کر اس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اسلام کا یہ طریقہ سائنسی طریق مطالعہ کے عین مطابق ہے۔

اسلام میں جس چیز کو عقیدہ کہا جاتا ہے اسی کا نام سائنس میں مفروضہ (hypothesis) ہے۔ سائنس داں فطرت کے اٹل نظام کی بنیاد پر ایک بات کو بطور نظری اساس (مفروضہ) مان کر شواہد خارجی کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے جو اس کے عقیدہ یا مفروضہ کے مطابق پیشگی طور پر کائنات میں موجود ہے۔ ٹھیک یہی طریقہ اسلام کا ہے۔

اسلام کا ایک طالب علم وحی کو بطور نظری اساس تسلیم کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ شواہد خارجی کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ یہ بے لاگ مطالعہ آخر کار اس حقیقت کی تصدیق کر دیتا ہے کہ جس چیز کو اس نے بطور نظری اساس مانا تھا وہ عین صداقت تھی۔ یہ مطالعہ کا عین وہی اصول ہے جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک طریق مطالعہ کہا جاتا ہے۔

یہاں ایک نوجوان اسکالر، مسٹر گر بخش سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک قیمتی اسکالرشپ پر ٹوکیو میں ریسرچ کے لیے گئے۔ ان کا موضوع خاموشی (silence) کی سائنسی اور مذہبی اہمیت ہے۔ وہ ٹوکیو میں کومازاوا یونی ورسٹی انٹرنیشنل سنٹر کے تحت یہ کام کر رہے ہیں۔

میں نے ان کو ایک حدیث سنائی جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اسی وقت

اپنے نوٹ بک میں درج کیا۔ وہ حدیث یہ ہے : مَن صَمَت نجا (جو چپ رہا اس نے نجات پائی)
میں نے کہا کہ خاموشی کوئی صلبی فعل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایجابی فعل ہے۔ آدمی جب خاموش ہوتا ہے تو وہ دراصل اندرونی فکر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ خارجی فکر آدمی کو بہت کچھ دیتی ہے مگر اندرونی فکر سے آدمی جو کچھ پاتا ہے وہ اپنی گہرائی کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ ہے۔

بنارس کے ڈاکٹر رام جی سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں گاندھین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ (Tel. 330125, 330871)

انھوں نے کہا کہ میں آپ کے مضامین اخباروں میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ دیش میں سدھار لانے کے لیے آپ ہی جیسے سوچ والے انسان کی ضرورت ہے۔ یہ بات اکثر ہندوؤں نے مختلف الفاظ میں کہی۔

مسلم رہنما پچھلے پچاس سال سے ہندی اور انگریزی میں اپنا اخبار نکالنے کی بات کرتے رہے ہیں مگر موجودہ حالات میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود ان کے اخباروں میں مضامین شائع کیے جائیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ملکی اخبارات ہمارے مضامین نہایت شوق سے چھاپنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ وکیلانہ انداز میں نہ لکھے گئے ہوں بلکہ سنجیدہ اور سائنٹفک انداز میں لکھے گئے ہوں۔

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر الگزینڈر ہندو فلاسفی کے اسکالر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک معلوماتی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوازم فل اسٹاپ میں یقین نہیں رکھتا حتیٰ کہ کامیں بھی نہیں۔ یہ سچائی کی تلاش کا ایک ابدی بہاؤ ہے :

> Hinduism does not believe in full stop, not even comma. It believes in perennial flow of search for truth.

بظاہر یہ ایک خوب صورت بات معلوم ہوتی ہے مگر وہ درست نہیں۔ یہ بیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے خود بھی ایک فل اسٹاپ ہے۔ مذہب کے مختلف تصورات میں سے کسی ایک تصور کو حتمی قرار دینا اس تصور کو مطلق سچائی کا درجہ دینا ہے۔ جب کہ قائل کا دعویٰ یہ ہے کہ مطلق سچائی ابھی دریافت ہی نہیں ہوئی۔ جو لوگ اس قسم کی بات کریں ان کے لیے علمی طور پر یہ درست نہیں کہ

وہ مذکورہ قسم کا ایجابی بیان دیں۔ اس کے بجائے انھیں اپنے آپ کو تشکک (sceptic) بتانا چاہیے۔ اپنے کو تشکک نہ کہہ کر مذکورہ بالا قسم کا بیان دینا گویا کہ اپنی پہلی بات کو خود اپنی ہی دوسری بات سے رد کر دینا ہے۔

نوبیل فیملی کی ایک ممتاز شخصیت مسٹر کلیس نوبل بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ انھوں نے چیرمین کی حیثیت سے جو اسپیچ دی اس کے آغاز میں یہ مقولہ نقل کیا —— جہاں بصیرت نہ ہو وہاں لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں :

Where there is no vision, the people perish.

ان کی تقریر کافی عالمانہ تھی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ انسان کو فطرت کے قوانین کی پیروی کرنا چاہیے اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں انتہائی حد تک زور دے کر کہوں گا کہ انسانی نسل کو قانون فطرت کی خلاف ورزی چھوڑنی پڑے گی ورنہ وہ خود ختم ہو جائے گی :

With all the emphasis I have at my command, I say: The human race must cease breaking the laws of Nature or Nature, will break us.

وہ ایک عالمی تنظیم یونائیٹڈ ارتھ کے فاؤنڈر اور چیرمین ہیں۔

ایم آئی ٹی پونہ کا ایک ممتاز ٹیکنکل ادارہ ہے۔ اس کے فاؤنڈر ڈائرکٹر پروفیسر وی ڈی کراڈ (V.D. Karad) نے اپنی اسپیچ میں مذہب اور فلسفہ کے متعلق بہت سی باتیں کہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تھامس ہارڈی کا یہ قول دہرایا کہ مذہب کا بنیادی مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان کو جنت میں داخل کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ جنت کو انسان کے اندر داخل کر دے :

The main object of religion is not to get a man into heaven; but to get heaven in him.

مگر اصل حقیقت ان دو کے علاوہ ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب انسان کو جنتی اوصاف کے ساتھ دنیا میں رہنا سکھاتا ہے تاکہ وہ آخرت کی جنت میں داخلہ کا استحقاق پا سکے۔

ایک اور بات انھوں نے یہ کہی کہ مذہب اور سائنس کا حقیقی اتحاد ہی انسان کو دنیا میں امن دے سکتا ہے :

چترلیکھا ویکلی جو مراٹھی اور گجراتی دونوں زبانوں میں نکلتا ہے اس کے نمایندہ ششی کانت سوانت نے ۲۷ نومبر کو انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام سرتاپا امن کا مذہب ہے۔ اسلام کی تمام سرگرمیاں پر امن جد و جہد کے اصول پر مبنی ہے اسلام میں جنگ کوئی ایجابی حکم نہیں وہ صرف دفاع کے لیے ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ جنگ سے بچنے کی تمام ممکن کوشش ناکام ہو چکی ہو اور مقابلہ کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار باقی ہی نہ رہے۔

میرا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ مسلم آبادی سے الگ تھا۔ تاہم روزانہ کچھ نہ کچھ مسلمان یہاں آتے رہے اور ان سے گفتگوئیں جاری رہیں۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اورنگ زیب کے زمانہ سے لے کر اب تک مسلمانوں کا صاحب علم طبقہ مرہٹوں کو مسلمانوں کا حریف سمجھتا رہا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مسلمانوں اور مرہٹوں کے درمیان معتدل انسانی تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ اس کا نقصان سب سے زیادہ خود مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

میں نے کہا کہ اس سے پہلے مرہٹوں کا جو ٹکراؤ پیش آیا وہ اصلاً مغل حکومت سے تھا نہ کہ مسلمانوں سے۔ یہ ایک تباہ کن نظریہ ہے کہ مسلم وجود کی شناخت سیاسی اقتدار کو بنایا جائے۔ سیاسی اقتدار ایک ایسی چیز ہے جس کے خلاف ہمیشہ رقابتیں جاری رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ خود اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں بھی شدید ترین نوعیت کی سیاسی رقابتیں ابھر آئیں۔ اور اس کی بنا پر زبردست قتل و خون ہوا۔

ایسی حالت میں اگر سیاسی اقتدار کو مسلمانوں کے وجود ملی کی شناخت بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان ابدی طور پر وقت کے حکمرانوں سے ٹکراتے رہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں انھیں کبھی وہ سکون حاصل نہ ہو جو ہر قسم کی ترقیاتی کاموں کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

پونہ کے آٹھ روزہ قیام کے دوران مقامی مسلمانوں سے مسلسل ربط قائم رہا۔ انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ ہر روز چھوٹے بڑے اجتماعات ہوتے رہے۔ ایک اجتماع ایک ہال میں ہوا۔ کچھ مسجدمیں اور کچھ لوگوں کے گھروں پر۔ ان اجتماعات کا مشترک موضوع یہ تھا ـــــ اسلام اور مسلمان عہد جدید میں۔

ایک اجتماع میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم تحریکیں حبط اعمال کا شکار ہوگئیں۔ اس کی خاص وجہ ہمارے رہنماؤں کا دہرا معیار ہے۔ مثلاً ہندستان کا ہندو اگر ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کی بات کرے۔ تو تمام بے ریش اور باریش رہنما اس کے خلاف پرشور تحریک چلانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر گھر میں پہلی بیوی نے دوسرے نکاح کو عملاً پوری طرح بند کر رکھا ہے۔ میں نے حاضرین سے کہا کہ آپ میں سے جس کو میرے اس بیان پر شبہ ہو وہ اپنے گھر میں دوسری بیوی لاکر دیکھے۔

تمام حاضرین نے میری بات سے اتفاق کیا۔

میں نے کہا کہ یہ واضح طور پر ڈبل اسٹینڈرڈ کا معاملہ ہے۔ ایک مسئلہ اگر ہندو پیدا کرے تو ہمارے تمام چھوٹے اور بڑے رہنما بھڑک کر اس کے خلاف سرگرم ہو جاتے ہیں۔ مگر ٹھیک وہی مسئلہ مسلمان پیدا کرے تو کوئی بھی اس پر تحریک چلانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

جو کام اس دہرا معیار کے ساتھ کیا جائے اس کو کبھی بھی خدا کی مدد نہیں مل سکتی۔ اور نہ اس سے کسی بابرکت نتیجہ کی امید کی جا سکتی ہے۔

پونہ میں جناب فاروق فیصل صاحب سے ملاقات ہوئی وہ گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ناندیڑ (مہاراشٹر) میں تبلیغی جماعت کا ریاستی جوڑ ۲۲-۲۴ نومبر ۱۹۹۶ کو تھا۔ وہ خود بھی اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ شارٹ سپلائی اسکیم کے تحت دوسرے مقامات کی طرح ناندیڑ میں بھی مختلف علاقوں میں باری باری بجلی کی کٹوتی کرتے رہتے ہیں۔ مگر تبلیغی جماعت کے اجتماع میں مسلسل تین دن تک بجلی کی سپلائی جاری رہی۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود میرے سامنے سینیر پولس انسپکٹر شری دیش مکھ نے بجلی محکمہ (ایم ایس ای بی) کے انجینیر کو بلایا اور اس سے کہا دیکھو، یہاں مسلمانوں کا دھارمک کاریہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں میں یہاں بجلی کٹ مت کرنا۔

پچھلے کچھ برسوں کے اندر ہندستان کے مسلمانوں میں تعمیری کام کی ایک نئی لہر آئی ہے۔ اس کی ایک مثال پونہ بھی ہے۔ پونہ کے ایک مسلم تاجر نے بتایا کہ پونہ کے مسلمانوں نے پچھلے دس سال میں کافی ترقی کی ہے۔ تجارت اور صنعت دونوں میدانوں میں وہ مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں انھوں نے بتائیں۔

اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی پونہ کافی ترقی کر رہا ہے۔ یہاں ایک قدیم وقف تھا جس میں کافی بڑی زمین تھی مگر وہ تقریباً غیر استعمال شدہ پڑی ہوئی تھی۔ آج کل وہ جناب انعام دار صاحب کے زیر انتظام ہے اور انھوں نے اس کے اندر ایک پوری تعلیمی دنیا آباد کر دی ہے۔ وہ طلبہ کے داخلہ میں یا اساتذہ کے انتخاب میں صرف میرٹ کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ان کے تعلیمی اداروں کا معیار کافی اچھا ہے۔

پونہ کی کانفرنس میں میری جو تقریر تھی اس میں میں نے امن سے متعلق قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کیں۔ اس پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے اسلام کے ایک جزئی پہلو کو پیش کیا۔ آپ نے اسلام کو اس کی جامعیت (Totality) کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ یہ تو ناقص نمایندگی تھی، اور دین کی ناقص نمایندگی ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اگر آپ کو اسلام کے تعارف کے طور پر ایک جامع کتاب لکھنا ہو تو اس میں آپ مختلف ابواب مقرر کرکے اسلام کی تمام تعلیمات بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر دعوت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دعوت میں ہمیشہ مخاطب کی رعایت کی جاتی ہے۔ مذکورہ قسم کی کتاب میں اگر اسلام کی فہرست احکام کو ملحوظ رکھا جائے گا تو دعوتی خطاب میں ہمیشہ سامعین کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں زیادہ تر دوسری نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان میں عام طور پر وہی اسلوب کلام ملتا ہے جس کو آپ نے جزئی تعارف یا ناقص تعارف کا نام دیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں (المسلم من سلم الناس من لسانہ ویدہ) اس طرح کی ہزاروں حدیثیں ہیں جن میں آپ نے اسلام کو جامع نظام کے طور پر پیش نہیں فرمایا بلکہ اسلام کے صرف کسی ایک پہلو کو پیش فرمایا۔ اسی کا نام مخاطب کی رعایت ہے۔ اور مخاطب کی رعایت اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے اَن فٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ آغاز اسلام کے بعد ہزار سال تک مسلم دنیا میں بادشاہی کا دور رہا۔ اس زمانہ میں سارا لٹریچر حاکمانہ فضا میں بنا۔ موجودہ زمانہ میں جب مسلمانوں کا زوال ہوا تو ہمارے تمام رہنماؤں نے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا ایک ہی نسخہ دریافت کیا۔ وہ تھا ماضی کی عظمت کو بیان

کرکے انھیں اکسانا۔ اس طرح ماضی کا حاکمانہ مزاج حال میں بھی بدستور باقی رہا۔

مگر موجودہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ تھا۔ بادشاہی دور میں غیر مشترک اقتدار کا ماحول ہوتا تھا۔ جمہوریت کے دور میں اشتراک اقتدار (Power sharing) کا ماحول ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے عوام و خواص دونوں ہی اقتدار میں شرکت کے تصور سے ناآشنا ہیں۔ وہ جمہوریت کے دور میں حاکمانہ نفسیات کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ اس سبب سے وہ دور حاضر میں بالکل اَن فٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔

قدیم حاکمانہ دور صرف اپنی رعایت کرنا جانتا تھا۔ جدید جمہوری دور دوسروں کی رعایت کا متقاضی ہے۔ قدیم دور میں بلاشرکت صرف اپنا اقتدار تھا۔ اب نئے زمانہ میں دوسروں کی شرکت کے ساتھ رواداراانہ نظام پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے مقررین اور محررین نے ان کے اندر نئے حالات کے مطابق ذہن نہیں بنایا۔ اس کے بھیانک نتائج ہر مسلم ملک اور ہر مسلم معاشرہ میں پیش آرہے ہیں۔

ایک خطاب میں میں نے کہا کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ امت محمدیؐ کا ثواب زیادہ ہے۔ یہ سادہ طور پر کوئی فضیلت کا معاملہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ امت محمدیؐ کی ذمہ داری زیادہ ہے اس لیے اس کا انعام بھی زیادہ ہے۔ پچھلی امتوں کی نجات کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ عبادت اور اخلاق کے معیار پر پورے اتریں۔ مگر امت محمدی کی ایک اور لازمی ذمہ داری ہے اور وہ غیر اقوام میں حق کا پیغام پہنچانا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی مگر کار نبوت بدستور باقی ہیں۔ یہ کار نبوت دعوت الی اللہ ہے۔ پچھلے زمانوں میں پیغمبر براہ راست طور پر دعوت کا کام کرتے تھے۔ اب ختم نبوت کے بعد امت محمدی کو آپؐ کی نیابت میں یہ کام انجام دینا ہے۔ اس طرح چونکہ ان کی ذمہ داری زیادہ ہے اس لیے ان کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پچھلی امتوں کی نجات اگر ایک عمل پر موقوف تھی تو اب امتِ محمدی کی نجات کا انحصار دو عمل پر موقوف ہوگئی ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ تو بہت مشکل معاملہ ہے۔ ہر مسلمان دعوت کا کام کس طرح کر سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ عام شرعی اصول کے مطابق یہ ذمہ داری بھی حسب استطاعت ہے۔ اصل

یہ ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ نیت کا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مخالفِ دعوت اعمال سے روکنا ہے اور تیسرا مرحلہ براہ راست دعوت دینے کا ہے۔ جس مسلمان یا جس مسلم گروہ کی جو استطاعت ہوگی اسی کے مطابق اس سے خدا کا مطالبہ ہوگا۔

نیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں دعوت کی سچی تڑپ پیدا ہو جائے اور اس کا معیار یہ ہے کہ آپ اپنی تنہائیوں میں مدعو کی ہدایت کے لیے دعا کرنے لگیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر اس کارروائی سے اپنے کو بچایا جائے جو داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور کشیدگی پیدا کرنے والی ہو۔ اس معاملہ میں مسلمان کا حال یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے لیے یک طرفہ نقصان کو برداشت کر لیں مگر وہ کوئی ایسی تحریک نہ اٹھائیں جو داعی اور مدعو کے تعلقات کو غیر معتدل بنانے والی ہو۔ تیسری چیز براہ راست دعوت ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اِس کام کو دعوت اسلام کے نام پر کرنے کے بجائے تعارف اسلام کے نام پر کیا جائے۔ عنوان کا یہ فرق ایک نیا دعوتی امکان ہے جو جدید تبدیلیوں کے نتیجہ میں ہمارے لیے پیدا ہوا ہے۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے ان کے موقف میں ایک عجیب تضاد محسوس کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا عجیب حال ہے۔ اگر میں عقلی دلیل سے کوئی بات کہوں تو آپ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی دلیل لاؤ۔ اور جب میں قرآن و حدیث کی دلیل پیش کرتا ہوں تو آپ اس کے خلاف اپنی عقلی قیاسات پیش کرنے لگتے ہیں۔

یہ حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے مانوس افکار میں جیتے ہوں اور سچائی کو جاننے کے لیے سنجیدہ نہ ہوں۔ انھیں وہی بات اپیل کرتی ہے جو ان کے اپنے ذہن کی تصدیق کر رہی ہو۔ جو چیز ان کے مانوس ذہن سے ٹکرائے وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ خواہ کتنی ہی زیادہ دلیل ان کے سامنے پیش کر دی جائے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی غلط فکری ہے۔ اور غلط فکری کی وجہ یہ ہے کہ وہ صحیح معیار اور غلط معیار کے فرق کو نہیں جانتے۔ مثلاً کسی سے غیر مسلموں میں دعوت کی بات کیجئے تو وہ فوراً کہے گا کہ ابھی تو مسلمانوں ہی کی اصلاح نہیں ہوئی تو غیر مسلموں میں دعوت کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ دعوت کا یہ معیار

ہی نہیں کہ مسلمان سب کے سب اصلاح یافتہ ہو جائیں تب وہ دعوتِ عام کا کام کریں۔ دعوت بذاتِ خود مطلوب ہے جس طرح نماز خود مطلوب ہے۔ مسلمانوں کے اصلاح یافتہ ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کسی روش پر انھیں نصیحت کیجئے تو فوراً اپنے "اکابر" کا قول اپنی تائید میں پیش کر دیں گے۔ حالاں کہ دین میں اکابر کا قول معیار نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کو واحد معیار کا درجہ حاصل ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ استدلال کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کے اندر صحیح سوچ اور صحیح فیصلہ کی صفت پیدا کی جا سکتی ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلموں میں بہت بڑی بڑی جماعتیں اور تحریکیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد کسی نہ کسی طور پر ان سے جڑی ہوئی ہے۔ مگر دین کی اصل روح (تقویٰ) کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ تحریکیں تقویٰ کے اصول پر اٹھائی ہی نہیں گئیں۔ پھر ان سے تقویٰ کا نتیجہ کیوں کر برآمد ہو سکتا ہے۔

آپ غور کیجئے تو تمام تحریکیں اور جماعتیں دین کے مظاہر پر اٹھائی گئیں نہ کہ دین کی روح (اسپرٹ) پر۔ کسی نے مظاہر عبادت کو، کسی نے مظاہر شرک کو، کسی نے مظاہر سیاست کو، کسی نے کسی اور مظاہر کو۔ چنانچہ ہر جماعت اور ہر تحریک میں مظاہر کی دھوم دکھائی دے رہی ہے۔ دین کی روح یا دین کی اسپرٹ کسی کا نشانہ نہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں نہ روح دین پر زور رہے اور نہ ان سے وابستہ لوگوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ روح پر زور دیا جائے تو روح اور مظاہر دونوں پیدا ہوں گے۔ اور اگر صرف مظاہر پر زور دیا جائے تو مظاہر تو پیدا ہو جائیں گے مگر اصل روح کا کہیں وجود نہیں ہوگا۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کی مخالفت اب کافی کم ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ یہ کہئے کہ بعض غلط فہمیاں دور ہو گئیں اس لیے مخالفت بھی ختم ہو گئی۔ مثلاً ہندوؤں کے اجتماعات میں میری شرکت کو کچھ لوگوں نے اس معنی میں لے لیا تھا کہ میں ہندو نوازی کر رہا ہوں۔ مگر اس کی جو رپورٹیں چھپیں ان کو دیکھ کر لوگوں نے جانا کہ میں وہاں اس لیے جاتا ہوں کہ اسلام کا مثبت تعارف پیش کروں اور اس کے خلاف ان کی غلط فہمیوں کو دور کروں۔ یہ جاننے کے بعد لوگ اپنے آپ مطمئن ہو گئے۔

الرسالہ کے ایک قاری نے سوال کیا کہ آپ باتوں کو پیشگی طور پر کیسے جان لیتے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ افغان، روس لڑائی جب ختم ہو گی تو افغانی لوگ آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے، اور واقعۃً ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح آپ نے لکھا تھا کہ بابری مسجد کا ڈھایا جانا فل اسٹاپ ہے وہ کاما نہیں ہے اور اس معاملہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی پیش آیا ہے۔

اسی طرح جب تمام لوگ فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ وہ صرف حکومت کے روکنے سے رکے گا اس وقت آپ نے یہ کہا کہ مسلمان اگر صبر و تحمل کی پالیسی اختیار کر لیں تو فرقہ وارانہ فساد کا بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر رہ جائے گا، اور اس معاملہ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہی پیش آیا۔ اب ایک عرصہ سے مسلمان اس معاملے میں صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں چنانچہ فرقہ وارانہ فساد بھی عملاً تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی پراسرار بات نہیں ہے۔ آپ بھی اسی طرح باتوں کو پیشگی طور پر جان سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ اپنے اندر غیر متعصبانہ اور غیر جانبدارانہ طرز فکر پیدا کر لیں۔ بابری مسجد کے معاملہ کو دوسرے لوگ اس لیے نہیں سمجھ پائے کہ وہ ہندو نفرت میں مبتلا تھے۔ یہ نفرت اصل بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ میں خدا کے فضل سے ہندو نفرت سے خالی تھا۔ اس لیے میں اس کی حقیقت سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح افغانستان کے معاملہ کو سمجھنے سے دوسرے لوگ اس لیے قاصر رہے کہ وہ افغانی لڑائی کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھ بیٹھے تھے۔ میں اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ساری جنگ قبائلی جذبہ کے تحت ہو رہی ہے نہ کہ خدائی جذبہ کے تحت۔ اسی لیے مجھے اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ یہی معاملہ فرقہ وارانہ فساد کا بھی ہے لوگ اس کو ظلم اور تعصب اور سازش کی اصطلاحوں میں دیکھ رہے تھے اس لیے وہ معاملہ کو زیادہ گہرائی سے سمجھ نہ سکے۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اس کو فطرت کے قانون کی روشنی میں دیکھا اس لیے میں اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔

ایک مجلس میں گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ کسی شخص کے اندر اعلیٰ انسانیت موجود ہے یا نہیں، اس کا ایک معیار مقرر کرنا ہو تو وہ اعتراف ہو گا۔ اور اگر دو معیار مقرر کرنا ہو تو اعتراف اور احسان مندی۔ اس میں شک نہیں کہ دلیل سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے وزن کو محسوس کرنا اور اپنی غلطی کا اعتراف

کر لینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اسی طرح کسی شخص سے دوسرے آدمی کو فائدہ پہنچے تو اس فائدہ پہنچانے والے شخص کا احسان مند ہونا اعلیٰ ترین انسانی خصوصیت ہے۔

پونہ میں کچھ لوگوں سے دعوت کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ اکثر لکھتے ہیں کہ مسلمان دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ آج دعوت کا کام ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ قول، قرآن کے الفاظ میں یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳ : ۱۸۸) کا مصداق ہے۔ یعنی ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا جس کو آدمی نے کیا نہ ہو۔

میں نے کہا کہ دعوت کا سرچشمہ محبت انسانی ہے، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں محبت انسانی کا بظاہر وجود ہی نہیں۔ اور جب انسان سے محبت ہی نہ ہو تو اس کو آپ دعوت حق کا مخاطب کس طرح بنا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پریس کا دور آنے کے بعد ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کے درمیان مسلم اہل قلم نے کروروں کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں مگر آپ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں کسی ایک کتاب کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتے جو حقیقی معنوں میں محبت انسانی کے موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اسی طرح اس دور میں بے شمار تعداد میں جلسے کیے جا رہے ہیں مگر میرے علم کے مطابق کوئی ایک بھی مسلم جلسہ نہیں جس کے پیچھے حقیقۃً محبت انسانی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا واحد اثاثہ ان کا قومی فخر ہے۔ ان کے درمیان وہی تحریکیں اور جماعتیں فروغ پاتی ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی نخوت قومی کی تصدیق کر رہی ہوں۔ اور جو تحریک یا جماعت ان کی قومی نخوت کو اپیل نہ کرے وہ ان کے درمیان فروغ بھی نہیں پاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان سے محبت کرنا خود ایک عبادت ہے۔ وہ اسلامی اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ مگر موجودہ مسلمانوں میں اسلام کا یہ پہلو کامل طور پر اجنبی ہے۔ اسی کا ایک ظاہرہ ساری دنیا میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کوئی ایسی بات کہہ دے جو مسلمانوں کے قومی وقار سے ٹکراتی ہو تو وہ فوراً بپھر کر اس کے خلاف متشددانہ تحریک شروع کر دیتے ہیں۔ آج سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ مزاج ختم کیا جائے۔ غیر مسلموں کے تئیں یہ مزاج رکھتے ہوئے وہ دعوتی کام کے اہل ہی نہیں۔ انھیں غیر مسلموں کے حق میں یک طرفہ طور پر خیر خواہ اور متحمل بننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خدا کے یہاں اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ انھوں نے خدا کی مخلوق کو خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ فقہ کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جس چیز کے بغیر کسی واجب کو پورا نہ کیا جاسکتا ہو وہ بھی واجب ہو جاتا ہے (مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب) مثلاً سمت کا علم اگر نہ ہو تو بیرونی علاقہ کے لوگوں کے لیے قبلہ کے رخ کا تعین کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے جس طرح نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے اسی طرح سمت کے علم کا حصول بھی ضروری ہے تاکہ قبلہ کے رخ کا تعین ہو سکے۔

یہی معاملہ دعوت کا ہے۔ دعوت کا کام صحیح طور پر صرف اس وقت انجام دیا جاسکتا ہے جبکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات ہوں۔ اس لیے داعی گروہ پر جس طرح دعوت دینا لازم ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان تعلق کو بگڑنے نہ دے۔ وہ یک طرفہ کوشش کے ذریعہ دونوں کے درمیان تعلق کو برقرار رکھے۔ کیوں کہ اس کے بغیر دعوت کے عمل کی بجا آوری ممکن ہی نہیں۔

پونہ کے ایک صاحب نے ایک پاکستانی عالم کی ایک کتاب دکھائی وہ شرک کے بارے میں تھی۔ اس میں شرک کی چند قسمیں بتائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاسی شرک بھی تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ "سیاسی شرک" کا تصور اسلام میں ایک اضافہ ہے جو میرے نزدیک ناقابل معافی جسارت ہے۔ اس قسم کی بات حضرت علی رضؓ کے زمانہ میں خوارج نے کی تھی۔ اس کے بعد پوری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی گئی۔ موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد مفکرین نے خوارج کے نظریہ کو از سر نو سیاسی شرک کے نام سے زندہ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ شرک سیاسی کا نظریہ اتنا ہی بے اصل ہے جتنا کہ نبوتِ ظلی کا نظریہ۔ دونوں یکساں طور پر قابل رد ہیں۔ اس قسم کے نظریہ کی تبلیغ ایک فتنہ ہے نہ کہ اسلام کی کوئی خدمت۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی نظریہ نے ساری دنیا میں مسلمانوں کو حکمراں طبقہ سے ٹکرا رکھا ہے جس کے نتیجہ میں اسلام کے خلاف اتنی زیادہ نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ دعوت توحید کا کام کرنا ہی سخت مشکل ہو گیا ہے۔

الرسالہ میں ایک مسلّم شخصیت کی ایک بات پر تنقید چھپی تھی۔ اس پر ایک صاحب نے شکایت کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے جوش میں آکر کہا: وہ اتنے بڑے تھے کہ ان سے کوئی چھوٹا بھی نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ تو صرف آپ کے کچھ الفاظ ہیں۔ یہ کوئی دلیل نہیں۔ اگر صرف لفظ ہی بولنا ہو تو دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ: وہ اتنے چھوٹے تھے کہ ہر شخص ان سے بڑا ہے۔

آج کل اس طرح کا استدلال عام ہے۔ لوگ ادبی انداز میں کچھ الفاظ بول دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے دلیل دی۔ حالاں کہ الفاظ خواہ وہ نحو اور صرف کے لحاظ سے کتنا ہی درست ہوں، حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے معنی ہو سکتے ہیں۔ اوپر کے دونوں جملے اسی کی ایک مثال ہیں۔ استدلال نام ہے حقائق کی بنیاد پر علمی اور منطقی تجزیہ کرنے کا، نہ کہ محض کچھ الفاظ بول دینے کا۔

حیدرآباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارے میں حیدرآباد کے اردو اخبار میں یہ چھپا ہے کہ آپ نے حال میں حیدرآباد کا خفیہ دورہ کیا۔ اس کے پیچھے کوئی یہودی سازش کارفرما نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک لغویات ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی خفیہ دورہ نہیں کیا۔ نہ حیدرآباد کا نہ کسی اور جگہ کا۔

پھر میں نے پوچھا کہ آپ کس طرح کہتے ہیں کہ وہ "خفیہ دورہ" تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے حیدرآباد کے دورہ کی خبر وہاں کے اخباروں میں نہیں چھپی۔ میں نے کہا کہ آپ یہاں اپنے بیان کے مطابق ایک دورہ پر آئے ہیں مگر آپ کے آنے کی کوئی اطلاع یہاں کے اخبارات میں نظر نہیں آئی۔ پھر کیا آپ کا یہ دورہ کوئی خفیہ دورہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔

رات کو فجر سے پہلے چار بجے سو کر اٹھا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز لمبی قرأت کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد اپنے کمرہ میں بیٹھا تو اچانک یاد آیا کہ سٹری گر وگولوالکر اور مسٹر ارن شوری نے لکھا ہے کہ ایک گڈ مسلم کبھی گڈ انڈین نہیں بن سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کہ یہ لوگ انسان کو کتنا کم جانتے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ انسان سے واقف انیسویں صدی کا امریکی شاعر والٹ وھٹ مین (Walt Whitman) تھا جس نے کہا کہ:

I am large enough to contain all these contradictions.

میں یہ کہہ رہا تھا اور رو رہا تھا کہ بخدا میں ایک گڈ مسلم ہوں اور اسی کے ساتھ میں گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ میری شرافت انسانی کی توہین ہے کہ یہ کہا جائے کہ میں جس ملک میں پیدا ہوا، اس کا میں اچھا شہری نہیں ہوں۔ وطن کی محبت ایک خالص فطری جذبہ ہے۔ اور جس چیز کی جڑیں خود فطرت انسانی میں ہوں اس

سے کوئی انسان کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر مہاتما گاندھی پیدا ہوں اور کہیں کہ میں تم کو گڈ انڈین ہونے کا سرٹیفکٹ دیتا ہوں تو میں ایسا سرٹیفکٹ لینے سے انکار کر دوں گا۔ میں کہوں گا کہ کیا کسی بیٹے کو اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ماں کا اچھا بیٹا بننے کے لیے کسی اور کا سرٹیفکٹ حاصل کرے۔ بخدا میں کسی گرو گولوالکر یا کسی گاندھی کے سرٹیفکٹ کے بغیر ہی ایک گڈ انڈین ہوں۔ انڈیا کی محبت میں نکلنے والے میری تنہائیوں کے آنسو جن کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ بذات خود اس کے لیے کافی ہیں کہ میں اپنے آپ کو پورے معنی میں ایک گڈ انڈین سمجھوں۔

ایک بار میں مسلمانوں کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے حدیثِ رسولؐ کے طور پر یہ جملہ سنایا: "حب الوطن من الایمان" اس مجلس میں ایک عالم بھی تھے انھوں نے کہا کہ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ وہ ایک عربی مقولہ ہے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ وطن کی محبت کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حوالہ موجود نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ "حب الوطن من الایمان" کوئی حدیث رسولؐ نہیں۔ مگر اس کو عربی مقولہ کہنا بھی درست نہیں ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ فطرت کا مقولہ ہے یہ انسانی فطرت کی آواز ہے جو ہر زبان میں مختلف الفاظ میں پائی جاتی ہے اور جو چیز عین فطرت کا حصہ ہو اس کا ذکر قرآن وحدیث میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ کیا قرآن میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ اے ماں، تو اپنے بیٹے سے محبت کر۔ اے انسان، تو ہوا میں سانس لے۔ اے پیاسا، تو ٹھنڈا پانی پیا کر۔ یہ باتیں قرآن وحدیث میں درج نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب فطرت کے لازمی تقاضے ہیں اور جو چیز فطرت کا لازمی تقاضا ہو وہ اپنے آپ آدمی کی زندگی میں شامل رہتی ہے اس کے لیے کسی خارجی حکم کی ضرورت نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں میں دعوت کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے۔ یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے اور نہ عقل سے۔ اس کے بجائے غیر مسلموں میں دعوت کے کام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کشیدگی کی فضا کو ختم کیا جائے۔ غیر مسلموں میں

دعوت کے نفوذ کی راہ میں اصل رکاوٹ یہی کشیدگی ہے نہ کہ مسلمانوں کی عملی کوتاہی۔ اگر مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوجائیں تو فوراً ہی دعوت کا عمل شروع ہوجائے گا۔ اس کے بعد دونوں کا باہمی اختلاط ہی دعوت کے لیے کافی ہوجائے گا جس طرح وہ پچھلے زمانوں میں ہوا تھا۔

ایک مسلمان نے کہا کہ کانفرنس میں آپ کی دونوں تقریریں امن و اخوت کے موضوع پر تھیں۔ آپ نے براہ راست اسلامی دعوت پیش نہیں کی۔ میں نے کہا کہ کانفرنس والوں کی طرف سے جو موضوع دیا گیا تھا، مجھ کو بہرحال اسی موضوع پر بولنا تھا۔ اگر میں خود ساختہ طور پر کسی اور موضوع پر بولنے لگتا تو وہ غیر متعلق (irrelevant) ہوجاتا۔ اور پھر اہل علم کی اس کانفرنس میں میری تقریر کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح براہ راست دعوت ایک کام ہے اسی طرح تقریب دعوت بھی ایک ضروری کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریب دعوت براہ راست دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس حکمت کے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ یہی پیغمبرانہ سنت ہے اور فطرت کا تقاضا بھی۔

پونہ ہندستان کے ان چند مقامات میں سے ہے جس کی معتدل آب وہوا کی بنا پر انگریزوں نے اس کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونہ میں برٹش حکومت کے ابتدائی زمانہ ہی میں تعلیم کا رواج ہوگیا چنانچہ آج یہاں بہترین تعلیمی ادارے قائم ہیں اور عمومی طور پر لوگ تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی کا یہ فائدہ ہے کہ پونہ کے لوگوں میں جو شعور اور ڈسپلن نظر آتا ہے وہ ملک کے دوسرے حصوں میں کم ملے گا۔ مثلاً یہاں کی سڑکوں پر یہ ایک عام منظر ہے کہ سواریاں اپنی اپنی لین میں چلتی ہیں۔ وہاں دہلی والی صورت نہیں ہے جہاں سڑکوں پر ہر آدمی ضابطہ کو توڑ کر اپنی گاڑی بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ پونہ کی سڑک پر آپ اپنی گاڑی چلا رہے ہوں اور اوور ٹیک کرنے کے لیے اپنا ہارن بجائیں تو اگلا آدمی فوراً ہی اپنی گاڑی کو کنارے کرلے گا۔ دلی جیسے شہروں میں ایسا نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ فوراً ہی اس کو وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں جب کہ پونہ میں بار بار مجھے اس کا تجربہ ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر کوئی آدمی اس کو وقار کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ سادہ طور پر صرف یہ دیکھتا ہے کہ میں ہلکی رفتار سے چل رہا ہوں اور پیچھے والا تیز رفتار سے تو مجھے کنارے ہٹ جانا چاہیے تاکہ پیچھے والا رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ جائے۔

پونہ مرہٹوں کا تاریخی علاقہ ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف نام کے اعتبار سے مہاراشٹر ہے بلکہ یہ علاقہ ہندستان

کے سب سے زیادہ اہم علاقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بمبئی بھی اسی علاقہ کا ایک حصہ ہے جو ہندستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ دولت مند شہر سمجھا جاتا ہے۔

اورنگ زیب سے لے کر بعد کے تمام مسلم رہنما بشمول شاہ ولی اللہ دہلوی سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کو سمجھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ مرہٹوں کے زور کو توڑنا مسلم عہد کو دوبارہ واپس لانے کے ہم معنی ہے۔ یہ تصور بیک وقت دو اعتبار سے سطحی تھا۔ ایک یہ کہ حال کے اعتبار سے یہ دراصل انگریز تھے جو ہندستان میں مسئلہ بن رہے تھے۔ اور مستقبل کے اعتبار سے مراٹھا قوم مزید زور آور ہو کر دوبارہ اس علاقہ کی طاقت نمبر ایک بننے والی تھی ــــــ سطحی مشاہدہ اور گہری بصیرت میں کتنا زیادہ فرق ہے، اس کی ایک مثال اِس واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہمارے ہوٹل کے عین سامنے فرگوسن کالج ہے۔ یہ کالج سوا سو سال پہلے انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ یہ تاریخی کالج بہت بڑے کیمپس میں واقع ہے۔ پونہ میں تعلیم کے عمومی رواج میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد اس وقت کے برٹش حکمرانوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ہندستانیوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم پڑھائے جائیں۔ اس سے وہ یہ امید رکھتے تھے کہ ہندستانیوں کے باغیانہ جذبات ختم ہو جائیں گے اور وہ اس ملک میں آسانی کے ساتھ حکومت کر سکیں گے۔ اس فیصلہ کے تحت انھوں نے ملک کے مختلف مقامات پر انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کے ادارے قائم کیے یا قائم کرنے میں مدد کی۔ انھیں میں سے ایک علی گڑھ کا تعلیمی ادارہ ہے جو اب مسلم یونی ورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج اس ادارہ کو "عظمت ملی" کا نشان بنایا جاتا ہے۔ انگریزی دور میں جب سرسید اور ان کے ساتھیوں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کیا تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی زبردست مخالفت کی گئی۔ یہ دراصل انگریز تھے جن کی براہ راست یا بالواسطہ مدد سے اس ادارہ کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

پونہ کی سڑکوں سے بار بار گزرنا پڑا۔ اس دوران مختلف ایسے مناظر دیکھے جو کافی سبق آموز تھے۔

مثلاً ایک بار سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اسکول کے طلبہ جو سب کے سب یونیفارم میں تھے دو، دو کی قطار بنائے ہوئے لمبی لائن میں فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں۔ یہ ڈسپلن شمالی ہند کے شہروں میں کم نظر آتا ہے۔ اسی طرح اتوار کے دن یہی منظر دوبارہ نظر آیا۔ فٹ پاتھ پر بڑی

تعداد میں لوگ لمبی لائن میں خاموشی کے ساتھ چلے جارہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ چرچ جارہے ہیں۔
اس واقعہ میں دو سبق ہے۔ ایک یہ کہ پوری سڑک پر بکھر کر چلنے کی صورت میں یہ لوگ دوسرے مسافروں کے لیے مسئلہ بن جاتے۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ دریافت کیا کہ فٹ پاتھ پر اپنی لمبی لائن بنالیں۔ دوسرا سبق یہ تھا کہ جب دائیں بائیں پھیلنے کے مواقع نہ ہوں تو آگے اور پیچھے کی طرف لمبی لائن میں پھیل جاؤ۔ اس دنیا میں ہر مشکل کا سادہ حل موجود ہوتا ہے بشرطیکہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کرے۔
اسی طرح دو بار یہ صورت پیش آئی کہ ہماری گاڑی بھیڑ میں کسی سائیکل یا اسکوٹر سے ٹکرا گئی۔ دونوں بار ایسا ہوا کہ سائیکل اور اسکوٹر والے نے پیچھے مڑکر ایک بار دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ حالاں کہ اس قسم کا واقعہ اگر دلّی میں ہو جائے تو دونوں میں تکرار ہونا لازمی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجائے ۔۔۔ ایک ہی ملک کے دو حصوں میں مزاج کا اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ غالباً پالیٹکس ہے۔ دہلی جیسے علاقوں میں مدت سے پالیٹکس کی دھوم جاری رہی ہے جس نے لوگوں کو بے برداشت اور اشتعال پسند بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس پونہ جیسے علاقوں میں سیاست کا زور کم تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگ عام طور پر متحمل اور تعمیر پسند ہیں۔
ڈاکٹر بارلنگے (۶۴ سال) پونہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ انتہائی حد تک سیکولر اور غیر متعصب آدمی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ پاکستان کی تجویز مسٹر جناح سے پہلے اقبال نے پیش کی تھی۔ اس اعتبار سے پاکستان کے اصل فکری قائد اقبال ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ یہ بات مجھے بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف اقبال نے یہ شعر کہا کہ :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

مگر انھیں اقبال نے برصغیر ہند میں مذہب کے نام پر پارٹیشن کی تائید کی۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل طور پر مذہبی بیر کا سبب بن گیا۔
میں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ مذہب محبت سکھاتا ہے وہ بیر نہیں سکھاتا۔ لیکن جب مذہب کو زر اور زمین کے مسئلہ سے جوڑا جائے گا تو ہمیشہ وہی الٹا نتیجہ نکلے گا جو برصغیر ہند میں نکلا۔ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب کو صرف دل سے جوڑنا چاہیے۔ مذہب کا اصل کام آدمی کے اندر فکری اور روحانی انقلاب لانا ہے۔ بقیہ خارجی اصلاحات اپنے آپ انسانی انقلاب کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ خارجی چیزوں کو اگر

براہ راست تحریک کا نشانہ بنایا جائے تو اس سے صرف فساد پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

ڈاکٹر سریندر بارلنگے نے یکم دسمبر کی صبح کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا تھا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر بارلنگے کی عمر تقریباً ۵۰ سال ہے اور وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے برت کو انگریز وائسرائے نے اپنی فوجوں سے زیادہ طاقت ور بتایا تھا۔ پھر مہاتما گاندھی نے ملک کے بٹوارے کو روکنے کے لیے اپنی یہ طاقت کیوں نہیں استعمال کی۔

ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ مہاتما گاندھی سے براہ راست یہ سوال کیا گیا تھا انھوں نے جواب دیا کہ میرے برت کی طاقت اس وقت ہے جب کہ عوام میرے ساتھ ہوں۔ اور اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ بٹوارے کے سوال پر دیش کے عوام میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ اس وقت میں ایک مراٹھی اخبار 'انقلاب' نکالتا تھا۔ میں نے خود اپنے اخبار میں اس پر اداریہ لکھا تھا جس میں میں نے کہا تھا کہ —— پاکستان دو، آزادی لو۔ انھوں نے کہا کہ اس سوال پر اگر مہاتما گاندھی برت رکھتے تو یقیناً ان کا برت ناکام ہو جاتا۔ کیوں کہ عوام آزادی کے لیے مزید انتظار پر تیار نہ تھے۔

اس گفتگو کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب (آزادیٔ ہند) یاد آئی۔ انھوں نے اس معاملہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں مذکورہ پہلو کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ انھوں نے ملک کی تقسیم کے معاملہ کو صرف چند سیاسی شخصیتوں کا معاملہ بنا دیا ہے وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ جمہوری دور میں کسی سیاسی شخصیت کی طاقت صرف اس وقت ہے جب کہ عوام کی بھیڑ اس کے ساتھ ہو۔ عوامی بھیڑ سے کٹتے ہی سیاسی لیڈر کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ترازو کے پلڑے پر گرام کا باٹ چھوڑ کر کوئنٹل کا باٹ اس سے اتار لیا جائے۔

۳۰ نومبر کو کانفرنس ختم ہو گئی مگر اس کے معاً بعد یکم دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ ایک بڑے پنڈال میں کافی لوگ اکٹھا تھے۔ یہ جلسہ ورلڈ پیس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں دوسرے ممتاز افراد کے علاوہ ڈاکٹر کلیس نوبیل (فاؤنڈر چیرمین، یونائیٹڈ ارتھ، نیویارک) فرانسین فورنیر (اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل، یونیسکو، فرانس) شامل تھے۔

اس موقع پر دوسروں کے علاوہ میری بھی ایک تقریر ہوئی۔ میں نے کہا کہ امن کے مقصد کے لیے ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ قائم کرنا بہت خوش آیند بات ہے۔ میں دل سے بے حد امن پسند آدمی ہوں۔

چنانچہ امن وانسانیت کی باتیں کرتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔ میں بے اختیار رونے لگا۔میرے درد بھرے انداز کو دیکھ کر مجمع بھی رو پڑا۔ اختتام پر جب میں اسٹیج سے نیچے اترا تو بہت بڑی تعداد میں لوگ برکت لینے کے لیے میرے گرد اکٹھا ہو گئے۔ یہ انگریزی تقریر ان شاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو پونہ سے واپسی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ انڈین ایرلائنز طے ہوا۔ پونہ ایرپورٹ پر اتفاقاً مسٹر ارن شوری سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی اسی جہاز سے دہلی جارہے تھے۔ یہاں وہ مسٹر انا ہزارے سے ملاقات کے لیے آئے تھے جو اس وقت کرپشن کے خلاف برت رکھے ہوئے ہیں۔ مسٹر انا ہزارے ایک سچے دیش بھگت ہیں مگر جہاں تک ان کے برت کا تعلق ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ ہندستان کا کرپشن کسی آدمی کے برت سے ختم نہیں ہوسکتا خواہ برت رکھنے والے خود مہاتما گاندھی کیوں نہ ہوں۔

مسٹر ارن شوری سے میں نے پوچھا کہ انڈیا میں آج کل جوڈیشل ایکٹیوزم زوروں پر ہے۔ بہت سے لیڈر عدالتی کارروائیوں کی زد میں ہیں۔ کیا اس سے ملک میں کچھ سدھار آئے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ صرف جوڈیشل ایکٹیوزم سے تو کسی سدھار کی امید نہیں۔ ہمارے ملک کا کرپشن بہت گمبھیر ہے۔ پھر انھوں نے مسکراکر کہا کہ کم ازکم اس معاملہ میں اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کچھ لوگوں کو کڑی سزا نہ دی جائے حالات میں سدھار ہونے والا نہیں۔

واپسی میں جہاز کے اندر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے بتایا کہ میرا پونہ کا سفر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج کل ہر روز جگہ جگہ کانفرنسیں ہورہی ہیں، کیا ان کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہر چیز کا ایک براہ راست فائدہ ہوتا ہے اور ایک بالواسطہ فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ ان کانفرنسوں کا براہ راست فائدہ نسبتاً کم ہے مگر ان کا بالواسطہ فائدہ بہت زیادہ ہے۔ اور اسی کے لیے میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک ہوتا ہوں۔ ان کانفرنسوں میں مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں کے لوگ آتے ہیں۔ عام حالات میں اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو یہ ایک بے حد مشکل کام ہوگا۔ مگر کانفرنس میں یہ مختلف قسم کے لوگ ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ ان سے ملاقات اور انٹرایکشن کی صورت میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ یہ فائدہ

کتابوں کے مطالعہ سے یا اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے انٹرایکشن سے انسانی تجربات میں اور عمومی طور پر انسانیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کانفرنسوں کے دوران تعمیری موضوعات کا جو چرچا ہوتا ہے اس سے ان کے حق میں ایک عمومی فضا بنتی ہے جو کسی اور طرح نہیں بن سکتی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی واپسی ہوئی تو مغرب بعد کا وقت ہوچکا تھا۔ میرا یہ سفر خلاف معمول کافی لمبا تھا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک دن کے لیے پونہ آیا تھا۔ مگر اس بار پورے آٹھ دن پونہ میں گزرے۔ میں نے سوچا کہ یہی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ کچھ لوگ دنیا میں بہت تھوڑا وقت گزار کر مر جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ میں اصل اہمیت مدت کی نہیں ہے۔ اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا سیکھا۔ کبھی زندگی کا ایک لمحہ اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ وہ صدیوں پر بھاری ہوجاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان دنیا میں آکر سو سال تک جیتا ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسا آیا تھا ویسا ہی واپس چلا گیا۔

پونہ سے واپسی کے بعد جو خطوط ملے ان میں سے ایک خط میری لڑکی ام اسلام کا بھی تھا۔ اس نے پونہ کے پروگرام کے بارے میں اخبار میں پڑھا۔ اس کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس کا ایک حصہ یہ تھا:

پونہ کے سمیلن کا پروگرام مرہٹی اخبار میں آیا۔ اس میں شمع جلاتے وقت آپ کا فوٹو ہے سب کے ساتھ۔ مگر سب سے زیادہ کمزور اور دبلے آپ دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور بار بار دل میں یاد آتی رہی کہ سب لوگ کیسے صحت مند ہیں اور میرے ابا کی ایسی حالت۔ اللہ تعالےٰ سے خوب خوب دعا کی آپ کی صحت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین۔

میری لڑکی کو مجھے دبلا دیکھ کر تعجب ہوا۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہے کہ لوگ موٹے کیوں ہیں۔ اگر لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہوجائے کہ ہر لمحہ وہ ایک ناقابل بیان قسم کے سنگین حادثہ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں جس کا نام موت اور قیامت ہے تو لوگوں کا سکون ان سے چھن جائے۔ قہقہے کی آوازیں بلند نہ ہوں۔ فربہ جسم کے مناظر کہیں دکھائی نہ دیں۔

پونہ کے سفر سے واپسی کے بعد جناب عبدالصمد شیخ صاحب کا ایک خط موصول ہوا جو انھیں

کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آپ پونہ میں ۲۳ نومبر کی شام میں آئے۔ سب سے پہلے یعنی اتوار کے دن ۲۴ نومبر کو حاجی یونس میمن کے گھر پہلی مجلس عصر سے عشاء کی نماز تک ہوتی رہی۔ امت محمدیؐ کے کردار کے بارے میں آپ نے جو نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ اس امت کے لیے دہرا اجر کیوں ہے؛ اس لیے کہ اس کی ذمہ داری بھی ڈبل ہے۔ خود عمل کرنا اور دوسروں تک پیغام پہنچانا۔

۲۸ نومبر کی رات میں بعد نماز عشاء تنظیم والدین اردو مدارس ضلع پونہ کی جانب سے ایک پروگرام ہوا۔ جس میں پہلے ڈاکٹر فریدہ خانم نے اور پھر آپ نے گفتگو فرمائی۔ جس میں مولانا سید نور صاحب نے تلاوت کی جو سورہ بقرہ کی آخری آیات تھیں جس پر آپ نے تقریر کی۔ اس میں اہم بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خود ایک دعا مسلمانوں کو سکھائی کہ ہم پر پہلے جیسے لوگوں والا بوجھ نہ ڈال۔ آپ نے اس میں جو بات کہی وہ یہ تھی کہ سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ بغیر کسی خطرے کے اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔

۲۹ نومبر کی رات، عشاء بعد جناب عبد الغفار عبد الرحمٰن صاحب کے مکان پر جو نیو ایرا سوسائٹی گول ٹیکڑی پونہ میں ہے۔ جہاں پر تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے تھے تقریر کی۔ اس میں یہ بات بہت ہی نئی تھی کہ یہود انسان کی رسی پر رہیں گے (آل عمران ۱۱۲) تشریح میں یہ کہا گیا تھا کہ رسی سے مراد کسی کی گارنٹی پر رہیں گے جیسے امریکہ کی۔ اور آج مسلمان بھی اسی طرح کسی نہ کسی کی گارنٹی پر زندہ ہیں۔

یہ چند باتیں جو مجھے یاد تھیں لکھ رہا ہوں۔ ایک بات جو آپ نے خلیفہ کے تعلق سے امام ابن تیمیہ کے حوالے سے کہی تھی کہ ابن تیمیہ کا فتویٰ ہے کہ خلیفۃ اللہ کہنا ناجائز ہے وہ بہت اہم تھی (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲/۴۶۴)

ایک بات آپ نے اور کہی وہ یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے نبی کریمؐ کی پیشین گوئی ہے کہ وہ لوگ جو یہاں دین توحید کے لیے کوشش کریں گے ان کا ثواب بہت زیادہ ہوگا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت اہم معلوم ہوئی۔

جنوری ۱۹۹۷ کے الرسالہ میں صفحہ ۱۴ پر "زکوٰۃ کا مسئلہ" کے تحت مدوں کے بارے میں جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ پہلی بار شاید آپ نے ہی پیش کی ہے۔ خاص کر اسلام کی اشاعتی مہم کے بارے میں۔

(عبد الصمد شیخ، پونہ، ۱۴ دسمبر ۱۹۹۶)

راجستھان کا سفر

بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر راجستھان کا سفر ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ یکم اپریل کی شام کو دوبارہ دہلی واپس آگیا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکیں اور راستے بالکل سنسان نظر آئے۔ کہیں کہیں کوئی کار یا اسکوٹر رینگتا ہوا دکھائی دیا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہاں کچھ انسان بھی بستے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بڑے بڑے شہروں کی رونق اسی وقت ہے جب کہ وہاں زندہ انسان بھی موجود ہوں۔ شہر اگر زندہ انسانوں سے خالی ہو جائے تو اپنے تمام مادی اور ظاہری ساز وسامان کے باوجود یہ شہر شہر نہ رہیں بلکہ بھوت نگر دکھائی دیں۔

دہلی سے مودی لفٹ کی فلائٹ ۱۲۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہندستان میں اب پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں کا دور آچکا ہے۔ مودی لفٹ انھیں میں سے ایک ہے جو ایک انڈین کمپنی اور جرمن کمپنی کے اشتراک سے قائم ہوئی ہے۔

پرائیویٹ کمپنیوں کی کارکردگی ہر لحاظ سے سرکاری کمپنیوں سے بہتر ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان کی سیاسی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی جو ۱۹۳۶ میں اپنی آٹو بیا گرافی میں لکھ چکے تھے کہ وہ صرف سوشلسٹ نظام (socialist order) کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ آزادی کے بعد جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگرس کا خصوصی اجلاس ہوا۔ اس میں جواہر لال نہرو کی پرجوش تحریک اور تجویز پر سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں نے اس کے بعد ہی اس کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سوشلزم (معاشی عمل پر حکومت کا کنٹرول) ایک تباہ کن نظریہ ہے۔ اس وقت شاید میں اکیلا تھا جو اس نظریہ کا اتنا شدید مخالف تھا۔ اب یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے۔

چالیس سالہ تجربہ میں ملک تباہی کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے۔ اب نئی دہلی کی حکومت اپنی نئی اقتصادی پالیسی کے تحت برلائزیشن کا دور لا رہی ہے۔ مگر حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ بظاہر مزید چالیس سال تک بھی اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص تھا۔ بظاہر وہ نان ریزیڈنٹ انڈین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ غالباً دو بیگ تھے۔ کسی معاملہ پر وہ ایئر ہاسٹس سے بحث کر رہا تھا۔ غالباً ایئر ہاسٹس کا اصرار تھا کہ وہ اپنا سامان لاکر (اوپر کے خانہ) میں رکھے۔ اور وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ آخر وہ اس سیٹ سے اٹھ کر کسی دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہہ رہا تھا ــــــ ہندستان میں رہنا کتنا مشکل ہے:

It is so difficult to live in India.

مودی لفٹ کی مذکورہ فلائٹ کا وقت صبح پانچ بج کر ۵۵ منٹ تھا۔ گھڑی کی سوئی نے جیسے ہی ۵۵ - ۵ کا وقت بتایا فوراً جہاز میں حرکت شروع ہو گئی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر اودے پور پہنچ گیا۔

جہاز میں داخل ہو کر ہم لوگ بیٹھے تو ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا: مودی لفٹ کی یہ فلائٹ جے پور ہوتی ہوئی اودے پور جا رہی ہے، دہلی سے جے پور کی دوری چالیس منٹ میں پوری کی جائے گی۔

میں نے سوچا کہ میری قریبی منزل جے پور ہے، مگر میری آخری منزل اودے پور ہے تاہم اور آگے بڑھ کر سوچا جائے تو اودے پور بھی میری قریبی منزل ہے، وہ میری آخری منزل نہیں۔ اصل منزل جو اس کے بعد آنے والی ہے وہ موت اور آخرت ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم راہ چلتے ہوئے ایک مسافر ہو۔

مودی لفٹ کا فلائٹ میگزین (Take Off) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون پرواز (Flight) کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فلارنس کے قریب ۱۴۵۲ میں پیدا ہونے والا لیونارڈو (Leonardo) پہلا شخص ہے جس نے ہوائی پرواز کے لئے ایک علمی

بنیاد (scientific basis) فراہم کی۔ اس نے گہرائی کے ساتھ چڑیوں کا مطالعہ کیا کہ وہ کیسے اڑتی ہیں۔ اس طرح دس سالہ مطالعہ کے بعد اس نے ہوائی پرواز کے ابتدائی اصول وضع کئے۔

"چڑیا" شاید اس لئے تھی کہ انسان کو ہوائی جہاز کی صنعت کی طرف متوجہ کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس دنیا میں اشارہ کے انداز میں رکھ دیا ہے تاکہ آدمی ان کا مطالعہ کرکے تمدن کی تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت میں پیش آنے والی حقیقتوں کے پیشگی اشارے بھی اس دنیا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ یہاں بھی انسان سے مطلوب ہے کہ ان اشاروں کا مطالعہ کرکے وہ آخرت کی حقیقتوں پر اپنے یقین کو مستحکم کرے۔

ہندستان ٹائمس (۳۱ مارچ ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک نمایاں تصویر تھی۔ اس میں وہ فوٹو چھاپا گیا تھا جو امریکہ کی فرسٹ لیڈی (Hillary Clinton) اور ان کی بیٹی (Chelsea) نے آگرہ میں تاج محل کے سامنے بیٹھ کر کھینچوایا تھا۔ صدر امریکہ کی اہلیہ نے تاج محل کو دیکھنے کے بعد بار بار کہا کہ یہاں سے جانے کا جی نہیں چاہتا:

I don't feel like leaving the place.

مغل حکمرانوں نے اس ملک میں عمارتی کشش کے نمونے تو قائم کیے مگر اسلام کی کشش کے اسباب فراہم کرنے میں وہ ناکام رہے۔ انھوں نے اگر ملک میں اسلام کا تاج محل بنایا ہوتا تو شاید یہاں کی سیاحت کرنے والا یہ کہتا کہ ـــ اسلام کے سوا کوئی اور دین اب مجھے پسند نہیں آتا۔

جہاز میں دوسرے اخباروں کے ساتھ اکنامک ٹائمس (The Economic Times) کا شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ بھی تھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک لیبل علیحدہ سے چپکا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فلاں سفری کمپنی (Tours and Travels) کی اسپانسر کی ہوئی کاپی (sponsored copy) ہے۔ اور یہ کہ وہ آپ کی اپنی کاپی ہے:

This is your copy.

مسافروں کے ساتھ اس فیاضی کا سبب کیا تھا۔ اخبار کا ہر صفحہ خاموش زبان میں اس کو بتا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس فیاضی کا مقصد مسافر کو "اخبار"

دینا نہیں تھا۔ بلکہ صرف اپنا اشتہار دینا تھا۔ تاکہ وہ ان کے سامانوں کا خریدار بن سکے۔ اپنے انٹرسٹ کے لئے لوگ مفت اخبار تقسیم کر رہے ہیں۔ مگر دوسروں کے انٹرسٹ کے لئے مفت اخبار فراہم کرنے والا کوئی نہیں۔

درمیان میں جہاز چالیس منٹ کے لئے جے پور میں ٹھہرا۔ کچھ مسافر یہاں اترے، اور کچھ نئے مسافر سوار ہوئے۔ وسیع نگاہ سے دیکھا جائے تو زمین بھی اسی قسم کی ایک زیادہ بڑی سواری ہے۔ ہر روز کچھ لوگ اس سے اترتے ہیں اور کچھ نئے افراد اس پر سوار ہوتے ہیں۔ جہاز کے مسافروں کے لئے ہم اترنے اور چڑھنے کا لفظ بولتے ہیں، اور زمین کے مسافروں کے لئے پیدائش اور موت کا لفظ۔

جے پور راجستھان کی ریاستی راجدھانی ہے۔ جے پور ۱۷۲۷ میں آباد کیا گیا تھا تاکہ امبر کی جگہ اس کو راجدھانی بنایا جاسکے۔ یہ ایک منصوبہ بند شہر ہے جس کی سیدھی سڑکوں کے کنارے گلابی رنگ کی عمارتوں کی قطاریں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری بہت سی تاریخی عمارتوں کے علاوہ یہاں ایک رصدگاہ (جنتر منتر) ہے جو اٹھارویں صدی میں بغداد کی رصدگاہ کے نمونہ پر بنائی گئی تھی۔

جے پور کی ریاست کو بارھویں صدی میں راجپوتوں نے قائم کیا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ مغل سلطنت کے ماتحت آگئی۔ ۱۸۱۷ میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۹ میں اس کو راجستھان میں ضم کر دیا گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ سو سال پہلے ریاست جے پور کی سرکاری زبان اردو تھی۔ اور عدلیہ اور انتظامیہ دونوں شعبوں میں اردو ہی میں کام ہوتا تھا۔ (ماہنامہ ہدایت جنوری ۱۹۹۵، صفحہ ۸۹)

جے پور میں ایک بڑا مدرسہ (جامعۃ الہدایت) قائم ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دینی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر اور صنعت وحرفت کو بھی اپنے کورس میں داخل کیا ہے۔ اس کی طرف سے ایک ماہنامہ ہدایت نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ جنوری ۱۹۹۵ میں ایک مضمون کی چند سطریں یہ تھیں:

(غدر کے بعد) علماء کرام نے انگریزوں سے نفرت کے ساتھ انگریزی سے بھی نفرت کرکے

اور انگریزی کی تعلیم کو ناجائز بلکہ حرام قرار دے کر مسلم قوم کے لئے علوم جدیدہ کی تحصیل کے دروازے بند کر دئے۔ اور اس فیصلہ سے برطانی حکومت کے انتقامی اور عیارانہ وشاطرانہ عزائم کے پر لگا دئے۔ انگریزوں سے نفرت حق بجانب تھی۔ لیکن انگریزی جو علوم جدیدہ کے حصول کا ذریعہ تھی اور جس سے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کر کے مسلم قوم پستی سے ابھر سکتی تھی اور برادران وطن کے شانہ بشانہ چل سکتی تھی، اس کے دروازے مسلم قوم پر خود مسلم علماء نے بند کر دئے (صفحہ ۸۹)۔

میں اضافہ کروں گا کہ انگریزوں سے نفرت کرنے میں بھی ہمارے علماء یقینی طور پر حق بجانب نہ تھے۔ کیوں کہ یہ انگریز ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مدعو سے داعی کا متنفر ہونا ہرگز جائز نہیں۔

جہاز جے پور سے روانہ ہو کر اودے پور پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا ایئر پورٹ ہے۔ یہاں صرف چند جہاز اترتے اور روانہ ہوتے ہیں۔

اودے پور راجستھان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۵۶۸ء میں چتوڑ کے بعد وہ مہاراجہ اودے پور کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد راجہ نے یہاں دو بڑے محل تعمیر کرائے۔ شاہجہاں نے ۱۶۲۸ میں مغل تخت پر قبضہ کرنے سے پہلے جب اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی تو اس وقت اس نے اودے پور کے ایک محل میں پناہ لی تھی۔ اودے پور کی ریاست سیسودیا راجپوتوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں قائم کی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔ ۱۹۴۸ میں اودے پور کو راجستھان میں شامل کر دیا گیا۔

آریہ سماج (۱۸۷۵) کے بانی دیانند سرسوتی نے اودے پور ہی میں اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش لکھی تھی (15/495)

اودے پور ایئر پورٹ پر مسٹر رادھے شیام چیچان اور پربھو دیال برلا موجود تھے۔ ان کے ساتھ بذریعہ کار بھیل واڑہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں حسب معمول میں ان لوگوں سے معلوماتی انداز کی گفتگو کرتا رہا۔

مسٹر رادھے شیام چیچان ایک صنعت کار ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مرکزی حکومت

کی لبرلائزیشن کی پالیسی سے کیا آپ لوگ متفق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لبرلائزیشن اصولی طور پر تو درست ہے۔ مگر حکومت کو اسی کے ساتھ ملکی صنعتوں کو انفراسٹرکچر (بجلی، پانی، سڑک وغیرہ) بھی فراہم کرنا چاہئے۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ باہر کی کمپنیوں کو ہر قسم کی سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ مثلاً ان کے سارے کام ایک 'ونڈو' پر ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم کو دسیوں ونڈو پر لائن لگانا پڑتا ہے۔ یہ تو کامپٹیشن نہیں ہے۔ یہ تو ایک کو پیچھے کرکے دوسرے کو آگے بڑھنے کا موقع دینا ہے۔

"راجستھان" کا عام تصور یہ ہے کہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔ راجستھان کی علامتی تصویروں میں اکثر اونٹ اور صحرا دکھایا جاتا ہے۔ مگر مجھے ایئرپورٹ سے بھیل واڑہ تک کہیں صحرا اور ریگستان نظر نہیں آیا۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور سبزہ اور کھیت کے مناظر تھے۔ میں نے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا تو مسٹر برلا نے کہا کہ میں ایک بار ٹرین سے دہلی سے بھیل واڑہ آرہا تھا۔ راستہ میں ایک خاتون کے ساتھ ان کا بچہ تھا۔ سفر کرتے ہوئے جب ہماری ٹرین راجستھان میں داخل ہوئی تو لڑکے نے اپنی ممی سے کہا: ممی، راجستھان تو آگیا۔ مگر وہ ریگستان کہاں ہے۔

مسٹر برلا نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ راجستھان کے صرف ایک علاقہ میں ریگستان ہے۔ مگر ایسا چوں کہ دوسری ریاستوں میں نہیں ہے اس لئے راجستھان کی پہچان ریگستان بن گیا۔ اس غلطی کا تعلق صرف راجستھان سے نہیں۔ اکثر معاملات میں لوگ اس قسم کی غلطی کرتے ہیں، وہ جزئی پہلو کو کل کی پہچان بنا لیتے ہیں۔

راجستھان کا قدیم نام راجپوتانہ تھا۔ برٹش دور میں یہاں اٹھارہ ریاستیں تھیں۔ جہاں راجپوت راجہ راج کرتے تھے۔ اس لئے اس کا یہ نام پڑا۔ ۱۹۴۷ میں آزادی کے بعد ریاستیں ختم ہوگئیں اور اس کا مجموعی نام راجستھان رکھ دیا گیا۔

اس علاقہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں کھدائی میں مٹی کے کچھ برتن ملے ہیں۔ کاربن ڈیٹنگ سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی تاریخ ۲۷۰۰ قبل مسیح تک جاتی ہے۔ سولھویں صدی میں یہاں طاقت ور راجپوت سلطنت قائم تھی۔ لیکن رانا سنگرام سنگھ (سانگا) اور بابر کی لڑائی

میں راناسانگا کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ مغل سلطنت کے تحت آگیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں راجپوت ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ (15/495)

راجستھان راجاؤں کی سرزمین رہی ہے۔ چنانچہ یہاں کثرت سے تعمیری یادگاریں ہیں جو دور قدیم کو یاد دلاتی ہیں۔ ذیل میں اسی قسم کی ایک خوبصورت عمارت کی تصویر دی جارہی ہے۔ یہ اودے پور کے پاس ہے۔ اس کو راج سمدر یا جے سمدر کہا جاتا ہے۔

اودے پور سے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کرکے ہم لوگ بھیل واڑہ پہنچے۔ بھیل واڑہ میں میرا قیام یہاں کے سرکٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ سرکٹ (circuit) کے معنی ہیں گھیرا۔ سرکٹ ہاؤس کا لفظ انگریزوں کے زمانہ میں رائج ہوا۔ انگریزی حکومت نے شہری مقامات پر ایک رقبہ مخصوص کرکے اس کے اندر بنگلہ نما مکانات بنائے تھے تاکہ انگریز عہدیدار اپنے دوروں کے وقت وہاں قیام کرسکیں۔ اس قسم کے مخصوص علاقے اب بھی ہر شہر میں موجود ہیں، اور

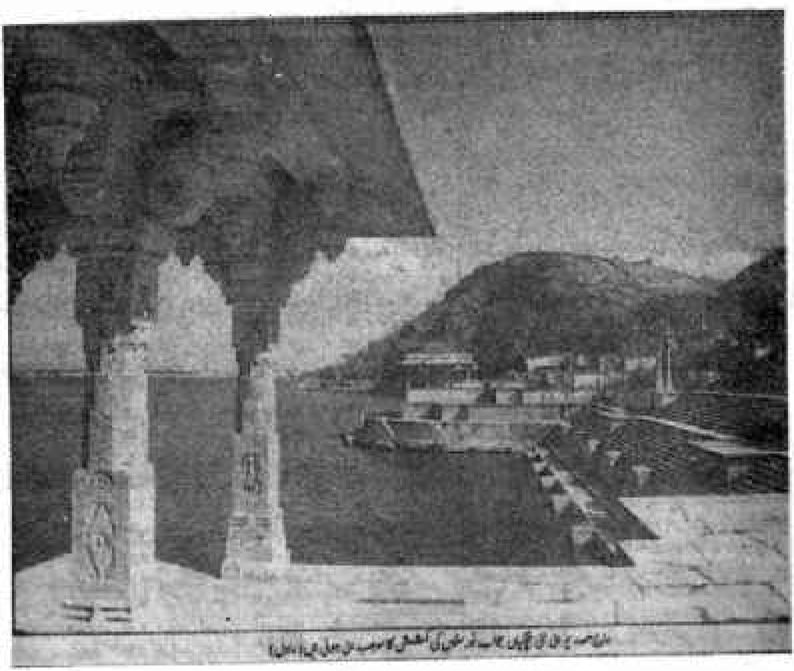

حکومت کے ذمہ دار اپنے سفروں کے دوران وہاں وقتی قیام کرتے ہیں۔ انھیں کو سرکٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔

بھیل واڑہ نے صرف دس سال کے اندر نمایاں ترقی کی ہے۔ بھیل واڑہ نے بھیونڈی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ بھیونڈی کو مقابلۃً بہت سے ایڈوانٹج حاصل تھے۔ "سوٹنگ" میں وہ سارے ملک سے آگے نکل گیا ہے۔

مسٹر گووند نارائن راٹھی جو خود بھی بزنس مین ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "یہاں کے لوگوں میں رسک لینے کی استعداد (capacity) ہے مزید یہ کہ یہاں کے لوگ دنگے سے بہت دور رہتے ہیں۔ یہاں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اور بزنس کے لئے امن بہت ضروری ہے۔

بھیل واڑہ کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ اس میں ۱۰ فیصد سے کچھ زیادہ مسلمان شامل ہیں۔ یہاں دس مسجدیں ہیں اور اتنی ہی تعداد میں دینی مدرسے ہیں۔ دستور ہند نے مسلمانوں کو برابر کے شہری کا درجہ دیا ہے۔ مگر تعلیم اور اقتصادیات میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے عملاً ہر جگہ وہ "دوسرے درجہ" کی کمیونٹی نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر صرف مسلمانوں کے نااہل رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔

بھیل واڑہ کا یہ سفر بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر ہوا۔ بھارت وکاس پریشد کا قیام ۱۹۸۵ میں ہوا تھا۔ اس کے آل انڈیا پریسیڈنٹ سپریم کورٹ کے سابق جج شری آر ایچ کھنا ہیں۔ راجستھان میں اس کی چالیس شاخیں ہیں۔

بھارت وکاس پریشد ایک غیر سیاسی ادارہ ہے۔ یہ لوگ تعمیری کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً اسکول، اسپتال، رفاہ عامہ، خدمت خلق، وغیرہ۔ انھوں نے سوامی دویکانند کے اس قول کو اپنا ماٹو بنایا ہے کہ راشٹر نرمان۔ ویکتی نرمان۔ یعنی فرد کی تعمیر سے ملک کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کے پروگراموں کے چار اجزا ء یہ ہیں: سیوا، سنسکار، سہیوگ، سمپرک۔

ایک بات کا میں نے خود تجربہ کیا۔ اور وہ وقت کی پابندی ہے۔ ان کے تمام پروگرام وقت کی پوری پابندی کے ساتھ انجام دئے گئے۔ ۳۱ مارچ کی شام کے پروگرام میں بھیل واڑہ

کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چندمنت کی تاخیر سے پہنچے۔ مگر منتظمین نے کلکٹر صاحب کا انتظار کئے بغیر ٹھیک وقت پر اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ ہر پروگرام ٹھیک مقررہ وقت پر شروع اور ختم ہوتا رہا۔ یکم اپریل کو مجھے بھیل واڑہ سے بذریعہ کار چل کر ساڑھے چار بجے اودے پور پہنچنا تھا۔ اودے پور میں دوپہر کا کھانا تھا۔ اور یہاں کا مشہور قلعہ دیکھنا تھا۔ پھر ایئرپورٹ پہنچنا تھا جس کا وقت ساڑھے چار بجے مقرر تھا۔ سارے پروگراموں کو پورا کرنے کے بعد جب ہماری کار ایئرپورٹ پہنچ کر کھڑی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ گھڑی کی ایک سوئی چار پر تھی اور دوسری سوئی ۳۰ پر۔

مسٹر نریندر لودھا (بھارت وکاس پریشد کے مقامی صدر) کا ٹیلیفون دہلی میں آیا تھا کہ ۳۱ مارچ کو جمعہ کا دن ہوگا۔ اس دن آپ لوگوں کی خاص نماز ہوتی ہے۔ پھر اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ آپ کسی مسلمان سے کہہ دیں کہ وہ مجھ کو مسجد میں لے جائے۔ وہاں میں نماز پڑھ لوں گا۔

چنانچہ جمعہ سے پہلے سرکٹ ہاؤس میں کئی مسلمان آگئے۔ ان کے ساتھ جا کر یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ دہلی کی مسجد میں جس طرح میں اپنے آپ کو دوسروں سے مانوس پاتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی اور ساری دنیا میں باہمی انسیت کا احساس ہوتا ہے۔

اس تجربہ کے بعد خیال آیا کہ اسلامی اتحاد کی بنیاد یہی روحانی یگانگت ہے۔ آپ دنیا کے جس حصہ میں جائیں، آپ محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کا عقیدہ، ان کی سوچ، ان کا اخلاقی اصول، ان کی عبادت کا طریقہ، وہی ہے جو میرا ہے۔ یہی اشتراک عالمی اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ مگر کچھ انتہا پسند لوگوں نے بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سیاسی ادارہ اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ یعنی ساری دنیا کا ایک خلیفہ ہو اور تمام لوگ اس کے سیاسی عصا کے تحت منظم ہوں۔ یہ ایک بے اصل نظریہ ہے۔ قرآن وسنت میں اس کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۳۱ مارچ کو دوپہر کا کھانا سرکٹ ہاؤس میں کھایا۔ لمبی میز پر کئی معزز لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

भारत विकास परिषद, भीलवाड़ा
नववर्ष कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995 व 1-4-1995
मौलाना वहीदुद्दीन खान सा. का कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995

प्रातः काल 5.55 पर देहली से उड़ान
प्रातः काल 7.50 पर डबोक (उदयपुर) पहुंच
प्रातः काल 8.15 पर डबोक से भीलवाड़ा के लिए कार द्वारा प्रस्थान
दोपहर 12.00 बजे भीलवाड़ा (सर्किट हाउस पर) पहुंच
दोपहर 12.30 भोजन (सर्किट हाउस)
दोपहर 1.20 प्रस्थान नमाज हेतु
दोपहर 1.30 से 2.30 तक नमाज
दोपहर 2.55 बजे बैठक हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 3.00 से 4.00 बजे तक सदस्यों के साथ बैठक (सूचना केन्द्र)
अपरान्ह 4.00 से 5.00 बजे तक पत्रकार वार्ता (सूचना केन्द्र)
सांय 5.15 से 7.15 तक विश्राम (सर्किट हाउस)
सांय 7.15 पर प्रस्थान विचार गोष्ठी (सभागार हेतु)
रात्रि 9.15 सभागार से सर्किट हाउस
रात्रि 9.30 भोजन (सर्किट हाउस)
रात्रि 10.30 बजे दीप विसर्जन

दिनांक 1-4-1995

प्रातः काल 8.00 बजे अल्पाहार
प्रातः काल 9.00 बजे चुनिन्दा मुस्लिम बन्धुओं के साथ बैठक, वार्ता
प्रातः काल 10.00 बजे चाय
प्रातः काल 10.30 बजे प्रस्थान चित्तौड़ के लिए (कार द्वारा)
दोपहर 11.30 बजे चित्तौड़ पहुंच
दोपहर 11.30 1.30 से तक दुर्ग भ्रमण
मध्यान्ह 1.30 से 2.00 तक भोजन चित्तौड़
अपरान्ह 2.00 बजे डबोक (उदयपुर) हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 4.30 बजे डबोक पहुंच
सांय 5.55 बजे डबोक से उड़ान
रात्रि 8.00 बजे दिल्ली पहुंच

میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا: بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اس کا مطلب جاننا چاہا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے میں شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے جو نہایت رحیم اور مہربان ہے۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ آدمی جب بھی کوئی کام شروع کرے تو وہ ان الفاظ کو اپنی زبان سے دہرائے۔ یہ بندہ کی بندگی کا اظہار اور خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔

۳۱ مارچ کو ۳ بجے سہ پہر میں سوچنا کیندر (انفارمیشن سنٹر) میں نوجوانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ تمہیدی تقریروں کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دو باتیں اگر ہمارے اندر آجائیں تو ملک کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آجکل یہ حال ہے کہ لوگ دیش سے صرف لینا جانتے ہیں، وہ دیش کو دینا نہیں جانتے۔ یہ مزاج نہ صرف ملک کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ طویل مدت کے اعتبار سے خود افراد کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دیش کے مفاد کو اونچا رکھیں۔

دوسری چیز یہ کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ یہ جھگڑا اتمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا اور وہاں دونوں ایک ساتھ رہے تو ہر ایک نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے کے بارہ میں ان کے خدشے بے بنیاد تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اگر کسی طرح صرف اختلاط بڑھ جائے تو تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

اس میٹنگ کے بعد کافی سوالات آئے جن کا میں نے جواب دیا۔ خاص بات یہ تھی کہ سوالات کے لئے نہایت منظم طریقہ اختیار کیا گیا۔ لوگوں نے کاغذ پر لکھ کر اپنے سوالات صدر صاحب کے پاس بھیج دیئے۔ یہ سوالات ہندی میں لکھے ہوئے تھے۔ صدر صاحب نے ایک ایک سوال کو باری باری پڑھا اور میں نے ہر ایک کا جواب دیا۔ کسی بھی جواب کے بعد دوبارہ سوال نہیں کیا گیا۔ سوالات اور ان کے جوابات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

سوال: آپ دیش میں آنے والے سمے میں کس پرکار کی راج نیتک شاشن ویوستھا کی سمبھاونا دیکھتے ہیں۔ ورتیش کرور تمان سندربھ میں (پرکاش چندر نکل)

جواب : بظاہر حالات امید کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۹۲ کے آخر میں میں نے بھاجپا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگ کانگریس کے سیکولرزم کو سوڈو سیکولرزم کہتے ہیں۔ اور خود ہندتو کا نام لیتے ہیں۔ مگر سوڈو سیکولرزم کا بدل ہندتو نہیں ہے بلکہ ٹرو سیکولرزم ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ خود بھاجپا کے لیڈر (آڈوانی اور باجپئی) ٹھیک اسی قسم کے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک صحت مند تبدیلی کی علامت ہے۔

سوال : بھارتیہ سنسکرتی ایوم اسلامک سنسکرتی میں کیا فرق ہے۔ دونوں سنسکرتیوں میں ہم کیا سمانیتا دیکھیں۔ کیا دونوں سنسکرتیاں راشٹر کو سنگٹھت کرنے ایوم نو نرمان میں سہائک ہو سکتی ہیں (جگبیر سنگھ چودھری)

جواب : ہماری موجودہ سنسکرتی ایک نئی سنسکرتی ہے۔ اس کا قدیم بھارتی سنسکرتی سے بہت کم تعلق ہے۔ یہ دراصل ہندستانی تہذیب، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے امتزاج سے بنی ہے۔ اور تہذیب یا سنسکرتی ہمیشہ اسی طرح امتزاج ہی سے بنتی ہے۔ یہی مشترکہ تہذیب ہندستان کی تہذیب ہے اور وہی ہماری ترقی کا ذریعہ ہے۔

سوال : شری رام مندر۔ ایوم بابری مسجد کا مدا مندر ایوم مسجد تک سیمت نہیں رہ کر اب یہ ہندوؤں کی ایوم مسلمانوں پرتی شودکا کارن بن گیا ہے۔ اس کمی کو اب کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایوم اس سمسیا کا کیا سمائک سمادھان ہو سکتا ہے۔ کرپیا پرکاش ڈالیں۔ (دامودر اگروال)

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ وقتی طور پر ضرور ایسا ہوا تھا کہ یہ اشو دونوں فرقوں کے لئے پرسٹیج اشو بن گیا تھا۔ مگر حالات کے زور پر اب وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ ایک نان اشو تھا۔ جس کو ہم نے جذبات میں آ کر اشو بنا لیا۔

سوال : ہندو شبد راشٹر وادشبد ہے۔ پھر بھی راشٹر کے سبھی ورگ کے لوگ اس کو جاتی کا دھرم سمجھ رہے ہیں۔ اس کا کیا کارن ہے۔ آپ کا اس سمبندھ میں کیا وچار ہے (ریکھا رام چندرانی)

جواب : یہ بات کہ ہندو شبد ایک راشٹر وادشبد ہے، یہ صرف کچھ ہندوؤں کا کہنا

ہے جو بہت چھوٹی مائناریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک کا جو کانسٹی ٹیوشن بنا وہ تمام تر ہندو افراد ہی کا بنایا ہوا تھا۔ مگر اس میں ملک کے شہری کو ہندو نہیں کہا گیا۔ بلکہ انڈین (یا ہندستانی) کہا گیا۔ آپ جب تک کانسٹی ٹیوشن میں ترمیم نہ کرلیں آپ کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔

سوال: ایسا کہا جاتا ہے کہ بھارتیہ مسلم آج بھی راشٹر کی مکھیہ وچار دھارا تتھا سے کٹا ہوا ہے۔ تتھا اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ ایسا مانتے ہیں۔ انھیں کیسے جوڑا جاسکتا ہے۔ (ہری کرشن رام چندانی)

جواب: میں اس کو نہیں مانتا کہ مسلمان کسی فیصلہ کے تحت نیشنل مین اسٹریم سے کٹا ہوا ہے۔ جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ نکمے قسم کے مسلم لیڈروں نے جذباتی تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے کر دیا۔ اس پچھڑے پن کی وجہ سے مسلمان ملک کی عمومی سرگرمیوں میں جڑ نہیں پاتے۔ اس بنا پر وہ کارنر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو اپنے آپ وہ تمام ملکی سرگرمیوں میں شریک ہو کر مین اسٹریم میں دکھائی دینے لگیں گے۔

سوال: ہندستان کے مسلم سماج میں ابھی بھی یہ ابھیمان بنا ہوا ہے کہ ہم نے بھارت ورش پر راج کیا۔ اسی اَنک کے کارن وہ بھارتیہ سنسکرتی میں گھل مل نہیں پائے ہیں۔ اس بارہ میں آپ کے کیا وچار ہیں۔ اس کمی کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ (رام کمار سیجانی)

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ "مسلم سماج" میں یہ ابھیمان نہیں ہے۔ البتہ کچھ نام نہاد مسلم دانشوروں میں ضرور یہ ابھیمان پایا جاتا ہے اور وہ اس قسم کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ مگر مسلم سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اور حالات کا رخ بتاتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ بہت جلد تاریخی میوزیم کا حصہ بن کر رہ جائیں گے۔

سوال: کوئی بستی ہندو بستی نہیں۔ پھر کوئی بستی مسلم بستی کیوں (سنجیو اگروال)

جواب: میرے جاننے میں کسی بستی کا نام مسلم بستی نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بستی میں سب مسلمان ہوں تو اس کو کوئی مسلم بستی کہنے لگے۔ اسی طرح کسی بستی میں سب ہندو ہوں تو اس کو کوئی شخص ہندو بستی کہنے لگے گا۔

سوال: انتر راشٹریہ استر سے دیکھا جائے تو آج سامپردایے واد کا زہر ہندستان میں

ہی زیادہ دکھ دائی ہوتا جارہا ہے، ایسا کیوں (نام درج نہیں)

جواب: اس کا سبب ہندستان کا تعلیم میں پچھڑاپن ہے۔ مزید یہ کہ قوموں میں اس طرح کی خرابیاں ہمیشہ انٹرایکشن نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں سے ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد نہرو کی "پروٹکشن" کی پالیسی نے یہ انٹرایکشن ختم کردیا۔ اسی کے یہ سب نتائج ہیں۔ اب نئی سرکاری پالیسی کے تحت دوبارہ ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اپنے آپ یہ برائی ختم ہوجائے گی۔

سوال: کیا دوردرشن یا آکاش وانی سے ایکتا کے نعرے لگانے سے راشٹریہ ایکتا ہوسکتی ہے۔ یدی نہیں تو دونوں ورگوں میں بھائی چارہ کی نیو مضبوط کرنا ہے تو ملّاؤں تنتھا سنتوں کو نیترت کرنا ہے تو کون پریرنا دے گا۔ کہیں نہ کہیں دوش ورگوں کا ہے۔ اسے کیسے دور کیا جاسکتا ہے (نام درج نہیں)

جواب: دوردرشن اور آکاش وانی کے پروگراموں سے قومی ایکتا نہیں آسکتی۔ اس کے لئے سچی کوشش ضروری ہے۔ اور یہ سچی کوشش مذہبی اور روحانی لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ ماضی میں صوفیوں اور سنتوں نے ہی میل ملاپ کی فضا بنائی تھی، آج بھی وہی لوگ ایسا کرسکتے ہیں۔

سوال: ایسا کیوں ہے کہ بھارت میں کئی ورگوں کے ہوتے ہوئے بھی ساپردائک تناؤ صرف دو ورگوں ہی میں پھیلتا ہے۔ کیا اس کا کارن مسلم ورگ کی تناشک منوورتی ہے یا دھارمک کٹرپن۔ ہندستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلم ورگ کو ہزار درش ہونے کے باوجود سنگھرش کو منوورتی کیوں ہے۔ (نام درج نہیں)

جواب: اس کا صحیح جواب وہ ہے جو ہمایوں کبیر نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان میجاریٹی کمیونٹی کے مقابلہ میں نکسٹ ٹو میجاریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہی نفسیات ہے جس کو ہندی میں ترپریا کہا جاتا ہے۔ بھائی بہن اگر ترپریا ہوں تو ان میں نوک جھونک ہوتا رہتا ہے۔ یہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تاہم بھائی بہن جب بڑے ہوجائیں تو یہ نفسیات ختم ہوجاتی ہے۔ ہندو اور مسلمان تعلیم کی کمی کی بنا پر

ابھی پختگی کی عمر کو نہیں پہنچے۔ تعلیم پڑھنے کے بعد جب دونوں کا شعور پختہ ہوگا تو یہ حالت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

۱۳ مارچ کی شام کو چار بجے سوچنا کیندر (انفارمیشن سنٹر) کے ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ تقریباً سبھی اخباروں کے نمائندے یہاں موجود تھے۔

بہت سے سوالات کئے گئے۔ اکثر ٹیڑھے قسم کے سوالات تھے۔ مگر میں نے تمام سوالوں کا جواب بالکل ٹھنڈے انداز میں دیا۔ پریس کانفرنس کی رپورٹ، نیز پبلک میٹنگ کی رپورٹ یہاں کے تمام اخباروں میں شائع ہوئی۔

پریس کانفرنس میں ایک ہندو جرنلسٹ نے سوال کیا کہ آجکل دیکھا جارہا ہے کہ مندر اور مسجد دونوں جگہ جانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کی مذہبی کٹرتا میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا حل آپ کے نزدیک کیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ مفروضہ درست نہیں۔ مندر اور مسجد میں جانے کا کوئی تعلق کٹرتا سے نہیں ہے۔ وہاں جانے والے من کی شانتی یا روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج ہی کی مثال لیجئے۔ آج میں نے جمعہ کی نماز یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں پڑھی۔ دو ہندو بھائی اپنی گاڑی پر مجھ کو وہاں لے گئے تھے جو اس پریس کانفرنس میں اب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے۔ جب میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکلا تو سیکڑوں مسلمان مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ میں کٹرتا کے خلاف ہوں۔ اگر وہ لوگ مسجد سے کٹرتا کا سبق لے کر نکلتے تو کبھی بھی مجھ سے ملنے کے لئے اس طرح نہ دوڑ پڑتے۔

میں نے کہا کہ مذہبی کٹرتا کی بات وہ لوگ کرتے ہیں جو سرے سے مذہبی ہی نہیں۔ وہ اپنے سیاسی انٹرسٹ کے لئے مذہب کا اکسپلائیٹیشن کر رہے ہیں۔

۱۳ مارچ کی شام کو ساڑھے سات بجے یہاں کے ٹاؤن ہال میں پروگرام تھا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ضلع کلکٹر سے لیکر تاجر اور وکیل اور ڈاکٹر اور پروفیسر تک سبھی لوگ جمع تھے۔ اس میں اصل تقریر میری ہی تھی۔ اور اسی پروگرام کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا تھا۔

میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ملک کو امن اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے ، دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ کسی قوم کے دانشور قوم کا ذہن بنانے والے (opinion makers) ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے دانشوروں نے اس معاملہ میں صحیح کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے رہے ۔لوگوں میں صحیح سوچ نہیں ابھری۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۷۱ میں انڈیا نے شیخ مجیب الرحمان کا ساتھ دیا اور پاکستان ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا تو پاکستان کے دانشوروں نے اپنی قوم میں انتقام کی آگ بھڑکانا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں انڈیا سے اس کا بدلہ لینا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر کے علاحدگی پسند عناصر کی ہمت افزائی کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۹ میں باقاعدہ طور پر وہاں گن کلچر چلوادیا۔

ایسا ہی کام ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے کیا۔ انھوں نے بابری مسجد کے معاملے میں ہندو قوم کو یہ بتایا کہ یہ تمہارے لئے دوسری ہار (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہار ہوئی تھی۔ اب دوسری بار تم کو ہار پر راضی نہیں ہونا ہے۔

دونوں فرقوں کے دانشوروں کو وہ کرنا چاہئے تھا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانی دانشوروں نے کیا۔ امریکہ نے ایٹم بم گرا کر جب ہیروشیما کو تباہ کیا تو جاپانی انتقامی نفسیات سے بھڑک اٹھے۔ اس وقت جاپانی دانشوروں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۱ میں ہم نے امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کیا تھا، انھوں نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کر دیا۔ معاملہ برابر ہوگیا۔ اب ماضی کے انتقام کو چھوڑ کر مستقبل کی تعمیر کی فکر کرو۔ اس طرح جاپانیوں کو عمل کا صحیح تعمیری رخ مل گیا۔

اسی طرح پاکستانی دانشوروں کو کہنا چاہئے تھا کہ ہم نے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑا تھا، انھوں نے ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو توڑ دیا۔ معاملہ برابر ہوگیا۔ اسی طرح ہندستانی دانشوروں کو کہنا تھا کہ ۱۹۴۷ میں انھوں نے ہمارے ملک کو بٹوارا تھا جس کا ہمیں غم تھا ، ۱۹۷۱ میں ہم نے ان کے ملک کو دو حصے کر کے معاملہ برابر کر لیا۔ اب اس بات کو چھوڑو اور تعمیر و ترقی کی طرف دھیان لگاؤ۔ مگر بدقسمتی سے دونوں میں سے کسی ملک میں بھی جاپان جیسے دانشور نہیں

ابھرے۔ اس لئے ہم جاپان کی طرح ترقی بھی نہیں کر سکے۔

یکم اپریل کی صبح کو میں سرکٹ ہاؤس (کمرہ نمبر ۴) میں سو رہا تھا کہ باہر سے اذان کی آواز آئی۔ مسجد اگرچہ یہاں سے دور تھی۔ مگر لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ نئے زمانہ کی ٹکنیک نے کس طرح ہم کو یہ موقع دیدیا ہے کہ ہم خدا کی آواز کو وہاں تک پہنچا سکیں جہاں ہم اپنی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کو پہنچا نہیں سکتے۔

میں نے اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔ دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا رہا۔ نئی جگہ پر جب آپ نماز پڑھیں اور رکوع اور سجدہ کریں تو آپ کے اندر نئی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ آپ نئی کیفیات کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔

صبح کو کچھ لوگ سرکٹ ہاؤس میں آگئے۔ ان سے ملکی اور ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ صبح کی چائے کے لئے "سیرت سرائے" والوں نے بلایا تھا۔ ڈاکٹر چھیپا کے ساتھ انھیں کی گاڑی پر سیرت سرائے گیا۔ یہاں ایک مختصر نشست ہوئی۔

سیرت سرائے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "سیرت سرائے" کے لفظ سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی ٹوٹی پھوٹی گندی جگہ ہوگی۔ مگر یہ نہایت صاف ستھری جگہ تھی۔ اس میں تقریباً ایک سو کمرے ہیں۔ یہ کمرے مسافروں کو معمولی کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک مفید ملی خدمت ہے جس کی تقلید ہر جگہ کے مسلمانوں کو کرنا چاہئے۔

اس کے بعد صبح ۹ بجے سوچنا کیندر میں جلسہ تھا۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں اکٹھا ہوئے۔ ایک ہندو بھائی نے قرآن کا ذکر کیا۔ چنانچہ میں نے اپنی تقریر میں قرآن ہی کو موضوع بنایا۔

میں نے کہا کہ پہلی آیت جو قرآن میں اتری وہ اقرأ تھی۔ یعنی علم حاصل کرو۔ اس وقت مکہ میں بہت سے مسائل تھے، مگر ان مسائل کا ذکر نہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ علم حاصل کرو۔ اس سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کا طریق عمل ہے ــــ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ان کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے عمل کا آغاز ہمیشہ علم اور شعوری بیداری سے کرنا۔ اس سلسلہ میں قرآن اور اسلامی تاریخ سے تفصیلات بیان کی گئیں۔

اس درمیان میں مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے اور میں اپنے انداز میں ہر ایک کو جواب دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کیا غیر مسلموں کے تئیں نفرت کی تعلیم دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام تمام انسانوں کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور انسان سے نفرت یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کسی دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس سلسلہ میں مختلف حدیثیں پیش کیں جو بتاتی ہیں کہ ایمان کس طرح آدمی کے اندر اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کرتا ہے۔

یکم اپریل کو واپسی تھی۔ بذریعہ کار بھیل واڑہ سے اودے پور کے لئے روانہ ہوا جہاں سے جہاز لینا تھا۔ راستہ میں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے چتوڑ میں ٹھہرے جو بھیل واڑہ اور اودے پور کے بیچ میں ہے۔

چتور گڑھ میں ایک بہت بڑی درگاہ ہے۔ اس کا نام ہے "درگاہ قاضی چل پیر شاہ" اس درگاہ کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ درگاہ کی سیڑھیوں پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی عمر کافی ہوچکی تھی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر میرے ساتھی سے کہا: حضرت چل پیر شاہ انھیں کی طرح تھے۔ میں نے ان کو اپنی نوجوانی کی عمر میں دیکھا ہے۔

چتور گڑھ نہایت تاریخی مقام ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ سولھویں صدی تک یہ شہر ریاست میواڑ کی راجدھانی تھا۔ یہاں سیسودیا راجپوت راج کرتے تھے۔

مسلم عہد میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ گجرات کے بہادر شاہ نے ۱۵۳۴ میں اور اکبر نے ۱۵۶۷ میں اس کا محاصرہ کیا۔ لیکن راجپوتوں نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مرد بڑی تعداد میں مارے گئے اور عورتوں نے اجتماعی خودسوزی کی رسم (جوہر) کے تحت اپنا خاتمہ کرلیا۔ مگر انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ پہلی بار ۱۵۶۸ء میں اکبر اس کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار راجپوت ہلاک ہوگئے (9/380)

اس وسیع قلعہ کے اندر بہت سی عمارتیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پدمنی محل بھی ہے۔ یہاں فاصلہ کے ساتھ نیچے اوپر دو عمارتیں بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان خلجی کی فرمائش پر نیچے کی عمارت میں رانا پرتاپ سنگھ کی رانی پدمنی بیٹھی جو بہت خوبصورت تھی۔ دوسری طرف سامنے کی عمارت میں بڑا سا آئینہ دیوار پر لگا تھا۔ اس آئینہ میں نیچے کی بالمقابل عمارت دکھائی دیتی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس آئینہ میں رانی پدمنی کا عکس دیکھا۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ مگر پدمنی نے سلطان کا پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری راجپوت خواتین کے ساتھ جوہر (خود سوزی) کے ذریعہ اس نے اپنا خاتمہ کر لیا۔ بورڈ میں اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ سلطان خلجی نے پدمنی کو آئینہ کے ذریعہ دیکھا تھا:

Khilji is said to have seen her through mirrors.

چتور گڑھ کی ایک قابل دید چیز وجے استمبھ (Tower of victory) ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کے اندر یہ استمبھ واقع ہے:

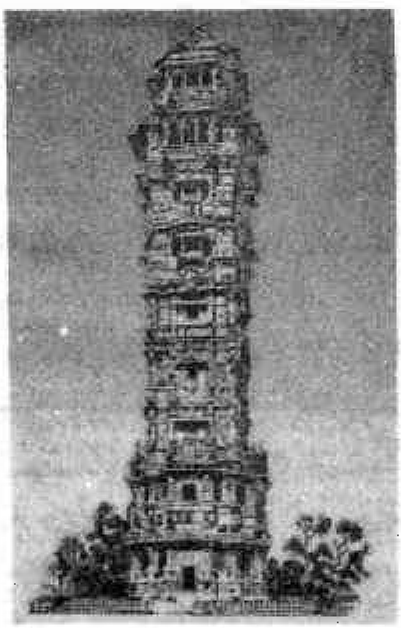

یہ ۱۲۲ فٹ اونچا ایک مینار ہے۔ اس کا اصل نام وجے استمبھ ہے۔ یعنی منارۂ فتح۔ یہاں آرکیالوجی کی طرف سے جو بورڈ لگایا گیا ہے اس پر لکھا ہوا ہے کہ رانا کمبھا کو ۱۴۴۰ء میں سلطان محمود خلجی (مالوہ) پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر رانا نے ۱۴۵۸-۱۴۶۸ء میں یہ استمبھ بنوایا۔ اس کی تعمیر پر جو پتھر لگائے گئے ہیں ان پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہتھیاروں اور موسیقی کے سامانوں کی تصویریں بھی تراشی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ استمبھ کے اندر عربی رسم الخط میں اللہ بھی لکھا ہوا ہے۔

استمبھ کے باہر آرکیالوجی کا جو بورڈ لگا ہوا ہے اس پر اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ استمبھ کی تیسری اور آٹھویں منزل پر عربی میں لکھا ہوا لفظ اللہ بتاتا ہے کہ راجہ دوسرے مذہبوں کا بھی کتنا احترام کرتا تھا:

The word "Allah" inscribed in Arabic in 3rd and 8th stories shows the regard of other faiths also.

مہارانا پرتاپ سنگھ (میواڑ) اور شہنشاہ اکبر کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ پرتاپ سنگھ کا سپہ سالار ایک مسلمان حکیم خاں سوری تھا۔ اور اکبر کا سپہ سالار ایک ہندو راجہ مان سنگھ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ صرف سیاسی بالادستی کی لڑائیاں تھیں۔ ان کا کچھ بھی تعلق مذہب سے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو راجہ کی فوج میں مسلمان اور مسلم بادشاہ کی فوج میں ہندو ہوتے تھے۔ حتی کہ مذکورہ مثال کے مطابق، ہندو راجہ نے مسلم بادشاہ پر اپنی فتح کا مینار تعمیر کیا۔ تو اس کی دیواروں پر اس نے ہندو مذہبی علامتوں کے ساتھ عربی رسم الخط میں اللہ کا نام بھی درج کیا

اودے پور کا قلعہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم اپنے پروگرام کے مطابق، ٹھیک وقت پر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ مگر وہاں معلوم ہوا کہ جہاز لیٹ ہے۔ میری واپسی انڈین ایئر لائنز کے جہاز سے تھی۔ لیکن انڈین ایئر لائنز میں تاخیر ایک عام چیز ہے۔ اور وقت پر روانگی صرف ایک استثنا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے باصرار کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ مگر وہ لوگ آخر وقت تک ایئر پورٹ پر ٹھہرے رہے۔ جہاز کا مقرر وقت پونے چھ بجے

تھا۔ مگر جہاز عملاً ساڑھے سات بجے روانہ ہوا۔

اودے پور سے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۹۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین ایئرلائنز کے دو فلائٹ میگزین (سواگت) دیکھے۔ مارچ ۱۹۹۵ کے شمارہ میں ایک مضمون آگرہ کی کیتھولک سیمٹری (مسیحی قبرستان) کے بارہ میں تھا۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ آگرہ کے اس قبرستان میں جو انگریزوں کی قبریں ہیں ان میں سے ایک انگریز سوداگر ملڈن ہال (Johan Mildenhall) ہے۔ وہ ۱۶۰۳ میں مغل دربار میں آیا۔ اس کے پاس الزبتھ اول کا ایک تعارفی خط تھا۔ اس میں مغل حکمراں سے ہندستان میں تجارت کی اجازت مانگی گئی تھی۔ اکبر نے کسی قدر تردد کے ساتھ تجارت کی اجازت دے دی۔ بعد کو سرٹامس رو (Sir Thomas Roe) جہاں گیر کے دربار میں آیا اس نے جہانگیر سے بات کر کے اس سے مزید رعایتیں حاصل کرلیں۔ اس طرح ہندستان میں انگریزوں کے نفوذ کے لئے دروازہ کھل گیا:

Thus heralding the rise of the British in India (p. 42)

انڈین ایئرلائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (اپریل ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں تقریباً انگریزی اور نصف ہندی مضامین ہوتے ہیں۔ ہندی شعبہ میں ایک مضمون کا عنوان تھا: رہے گا بانس تو بجے گی بانسری۔ عنوان سے بظاہر یہ خیال ہو رہا تھا کہ یہ مضمون "بانسری" کے بارہ میں ہوگا۔ لیکن پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بانسری کا ذکر اس میں محض ضمنی طور پر ہے۔ اصلاً یہ مضمون بانس کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بانس ایک بہت مفید درخت ہے اور بانسری کے علاوہ اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ مختلف ملکوں میں بانس کے استعمالات بتائے گئے تھے۔

میں نے سوچا کہ محض عنوان یا کوئی ظاہری پہلو دیکھ کر کسی چیز کے بارہ میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس کو پوری طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ جز کو دیکھ کر بظاہر جو رائے بنی تھی، وہ کل سے واقفیت کے بعد بدل جائے۔

انگریزی روزنامہ ہندو کا شمارہ یکم اپریل ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک خبر یہ تھی کہ گجرات کی حکومت نے ریاست کے تمام پرائمری اسکولوں، سکنڈری اسکولوں اور ہائر سکنڈری

اسکولوں کے لئے لازم قرار دیدیا ہے کہ تمام طلبہ روزانہ اجتماعی طور پر بندے ماترم کا ترانہ گائیں ۔ ایجوکیشن منسٹر مسٹر نلین بھٹ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وندے ماترم بچوں کے اندر حب الوطنی، قومیت کا جذبہ پیدا کرنے میں مددگار ہوگا اور پوری قوم کو متحد کرنے کا ذریعہ بنے گا:

Vande Mataram would help the children in developing patriotism and nationalism and would be a vehicle to unite the entire nation. (p. 9)

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ترانوں سے کبھی کوئی قوم نہیں بنتی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے پوری پاکستانی قوم نے یہ ترانہ گایا تھا اور اب بھی گاتی ہے کہ ـــــ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔ لیکن مزاج اور کردار کی تعمیر کے اعتبار سے اس کا ایک پرسنٹ فائدہ بھی نہیں ہوا۔ یہی انجام بندے ماترم کا بھی ہوگا۔ اسکول کے بچے تو درکنار، اگر انڈیا کے تمام لوگ ہر روز صبح کو یہ ترانہ گائیں تب بھی اس کا کوئی حقیقی عملی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ اس طرح کے ترانے صرف بڑوں کو خوش کرتے ہیں، وہ بچوں کے تعمیر کردار میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتے۔

یکم اپریل ۱۹۹۵ کی شام کو ۹ بجے دہلی واپس آگیا۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے یہاں ایئرپورٹ پر لوگ دیر میں پہنچے۔ مجھ کو تقریباً پندرہ منٹ کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ پندرہ منٹ اتنا لمبا معلوم ہوا کہ میری زبان سے نکلا کہ خدایا، اس دنیا میں پندرہ منٹ کا انتظار بھی برداشت نہیں ہوتا۔ قیامت میں انسان کا حال کیا ہوگا جب اس کو لامعلوم مدت تک انتظار کی حالت میں کھڑا رہنا پڑے گا، جب کہ وہاں کا ہر منٹ دنیا کے منٹ سے بے حساب حد تک زیادہ سخت ہے۔

ظہور اسلام
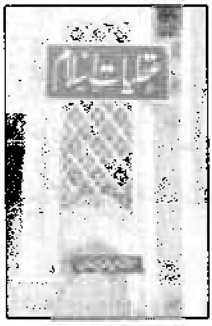
تعلیمات اسلام

دین انسانیت

مذہب اور جدید چیلنج
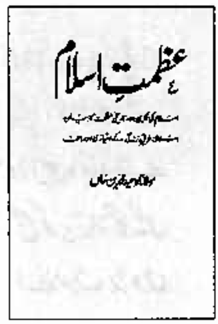
عظمتِ اسلام
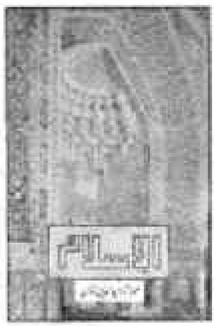
الاسلام
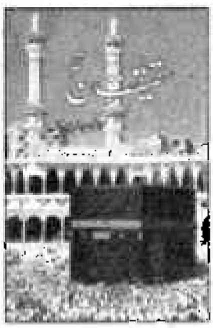
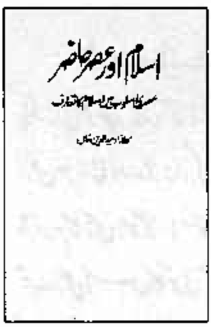
اسلام اور عصر حاضر

قیادت نامہ
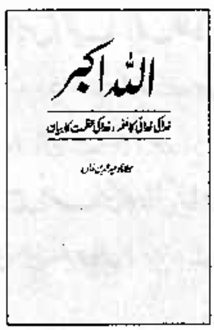
اللہ اکبر
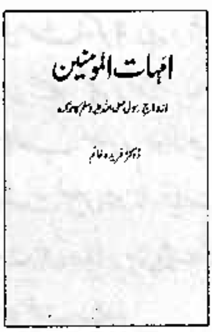
امہات المومنین
ڈاکٹر فریدہ خانم
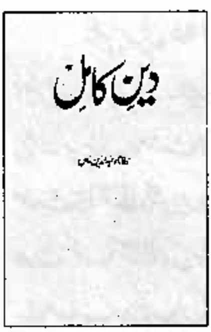
دینِ کامل
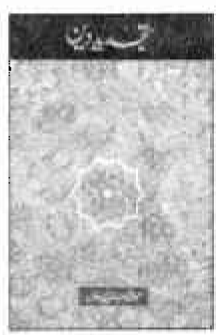
تجدید دین

خاتون اسلام
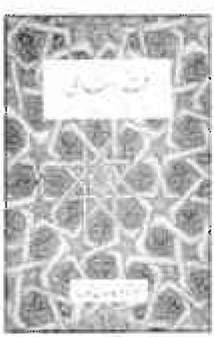

اسلامی زندگی

اِس مجموعے میں راقم الحروف کے وہ ملکی سفر نامے شامل کیے گئے ہیں جو خاص طور پر غیر مسلموں کے جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کے بعد لکھے گئے۔ اِس قسم کے ملکی اسفار کی تعداد بہت زیادہ ہے، تاہم اس کا ایک حصہ اِس مجموعے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ سفر نامے سادہ طور پر سفر نامے نہیں ہیں، بلکہ وہ وسیع تر ہندستان کا مطالعہ ہیں۔ ان میں دوسرے فرقوں اور مذہبوں کے بارے میں ضروری معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا سفر نامے کی صورت میں ملک کی تاریخ کا ایک مطالعہ ہے۔

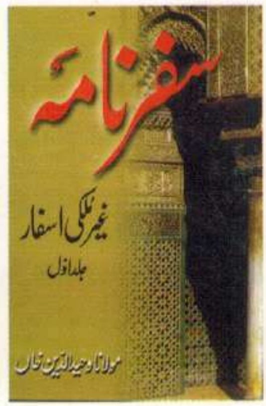

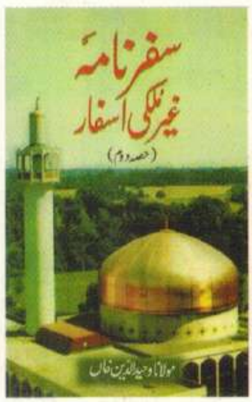

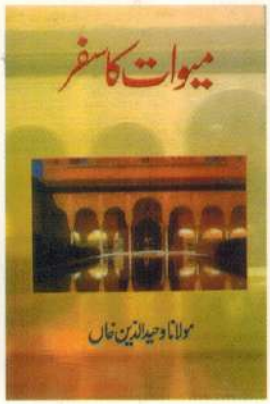

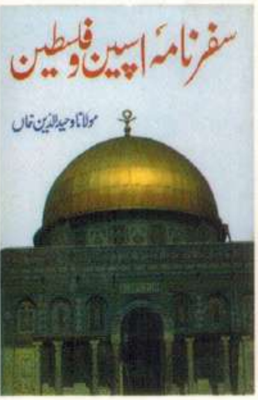

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-876-4
9 788178 988764

₹ 140.00